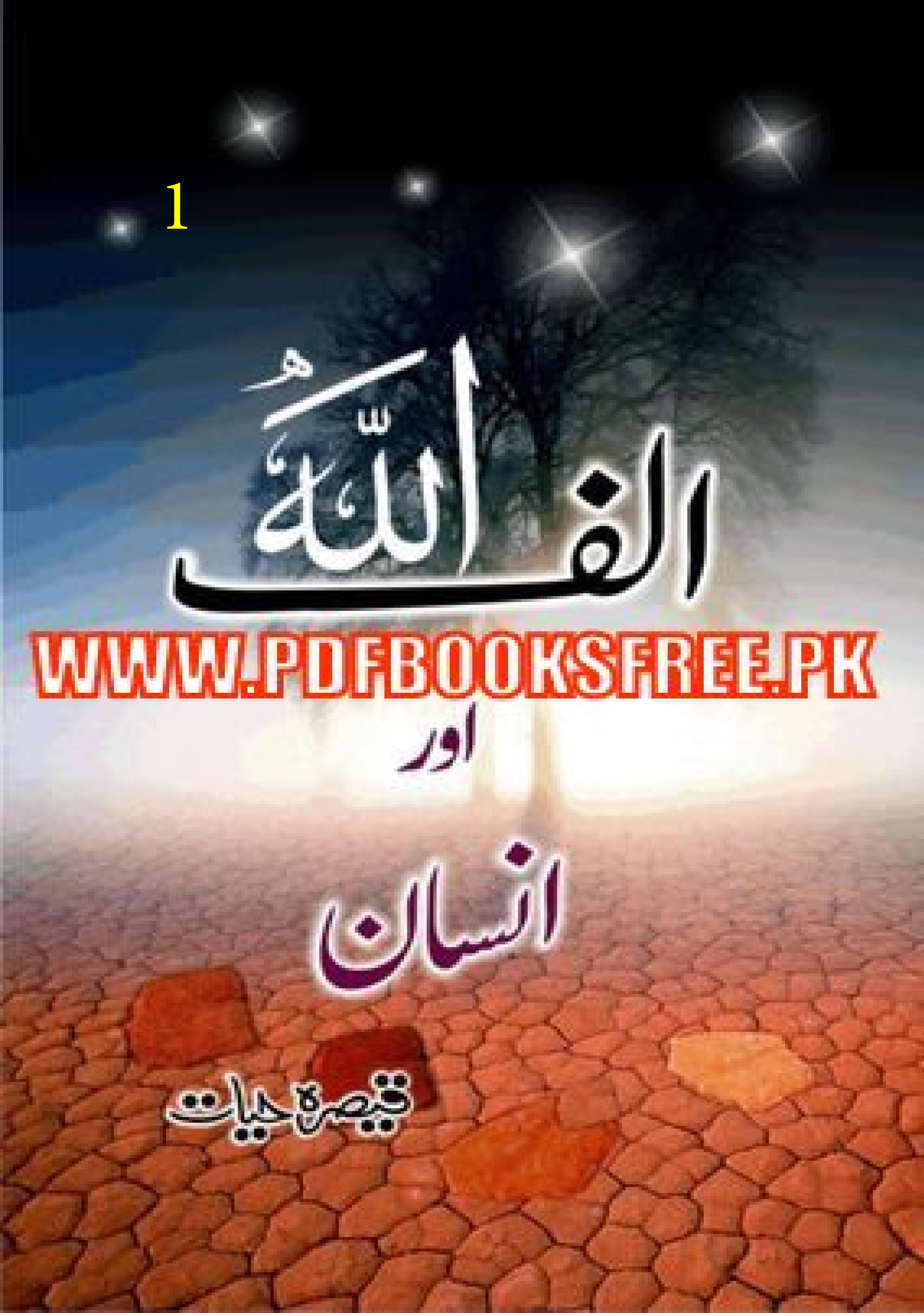

WWW.PDFBOOKSFREE.PK

اللہ اور انسان کے امتزاج "قریبی مگر پُر اسرار تعلق" پر لکھی گئی ایک منفرد تحریر...... کتاب گھر کے قارئین کے لیے ایک تحفہ خاص

الف اللہ اور انسان

قیصرہ حیات

علم و عرفان پبلشرز
الحمد مارکیٹ، 40۔اُردو بازار، لاہور
فون:37352332-37232336

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

جملہ حقوق بحق مصنفہ محفوظ ہیں

نام کتاب	....	الف اللہ اور انسان
مصنفہ	....	قیصرہ حیات
ناشر	....	گل فراز احمد
		علم و عرفان پبلشرز، لاہور
مطبع	....	زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ	....	اکرم، انیس احمد
سن اشاعت	....	جون 2011ء
قیمت	....	=/700 روپے

بہترین کتاب چھپوانے کے لئے رابطہ کریں: 0300-9450911

......ملنے کے پتے......

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40۔ اُردو بازار، لاہور

فون: 7352332-7232336

ادارہ علم و عرفان پبلشرز کا مقصد ایسی کتب کی اشاعت کرنا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اس ادارے کے تحت جو کتب شائع ہوں گی اس کا مقصد کسی کی دل آزاری یا کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ اللہ کے فضل و کرم، انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کمپوزنگ طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری احتیاط کی گئی ہے۔ بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی یا صفحات درست نہ ہوں تو ازراہ کرم مطلع فرماویں۔ انشاء اللہ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کیا جائیگا۔ (ناشر)

انتساب!

اللہ اور انسان کے انتہائی
''قریبی مگر پُر اسرار تعلق''
کے نام

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

دیباچہ

لفظ ''شاہکار'' بولتے ہی ذہن میں ایک ایسی چیز کا تاثر ابھرتا ہے جو انتہائی خوبصورت اور ہمہ جہت ہو۔ جس کے ہر ہر زاویے میں مکمل ہم آہنگی اور خوبصورت تناسب ہو جو منفرد بھی ہو اور مربوط بھی۔ جس کا ہر پہلو حیران کن اور ہر جہت دلفریب اور چونکا دینے والی ہو۔

جس کا 'ظاہر' بھی حیران کرے اور باطن بھی۔ مگر اتنا خوبصورت اور 'مکمل' ہونے کے باوجود بھی اس کا ہر پہلو منظرِ عام پر آنے تک ایک 'سوال' بنا رہے۔ اپنے لیے بھی......اور......دوسروں کے لیے بھی......جس کے بارے میں حتمی طور پر کچھ بھی نہ کہا جا سکے۔

اس کے 'اسرار' کھلنے کے باوجود بھی وہ پھر بھی اک 'اسرار' رہے۔

کائنات اور اس کی مخلوقات کا مشاہدہ کرنے کے بعد ذہن اس کرۂ ارض کی سب سے منفرد مخلوق 'انسان' پر آ کر رک جاتا ہے اور انسان کے بارے میں کئی سوالات سر اٹھانے لگتے ہیں۔

'انسان' کیا ہے؟

اسے خود بھی معلوم نہیں......

انسان کس شے سے بنا ہے......؟

مٹی سے یا نطفے سے......؟ وہ حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔

اس کے اندر کیا کچھ پوشیدہ ہے؟

دنیا کے تمام علوم پر مہارت اور دسترس رکھنے کے باوجود بھی وہ اس کا جواب دینے سے قاصر ہے۔

وہ اگلے لمحے کیا کرے گا؟ وہ خود بھی نہیں جانتا۔

اس کے 'ظاہر' اور 'باطن' میں تضاد کیوں ہے؟ اسے اس کی کوئی آگہی نہیں۔

اس کے جسمانی اعضاء اور نظام کے افعال کی کارکردگی کا اصل سرچشمہ کون سی قوت ہے؟ اسے اس کا بھی شعور نہیں۔

اس کی ہر لحہ بدلتی سوچ، نت نئے خیالات، احساسات، جذبات کس کس طرح اس کی نفسیات اور دنیاوی معاملات پر اثر انداز ہوتے ہیں؟ وہ خود بھی سوچ کر حیران رہ جاتا ہے۔

اپنی پیدائش سے لے کر موت تک وہ اپنے لیے بھی ایک سوال بنا رہتا ہے اور دوسروں کے لیے بھی۔

اس کا آغاز بھی مبہم ہے اور انجام بھی اک راز ہے۔ اس کے اپنے دعوے ہی کھوکھلے ثابت ہوتے ہیں۔ اس کی سوچیں قدم قدم پر اس کو مات دیتی ہیں۔ اس کی منصوبہ بندیاں کبھی کبھی اسے بری طرح ناکام کرتی ہیں اور کبھی کبھی معمولی کوشش اسے کامیابیوں کی معراج تک پہنچا دیتی

ہے۔ ذرۂ خاک دنیائے آسمان پر آفتاب بن کر چمکنے لگتا ہے۔ انسان خود بھی حیران رہ جاتا ہے اور دوسرے لوگ بھی حیرت سے اسے دیکھتے رہ جاتے ہیں، قدرت کا تخلیق کردہ یہ شاہکار انسان۔ کئی ہزار پرت کا مجموعہ ہے اور ہر پرت کھلنے پر وہ اک نئے اسرار سے آشنا ہوتا ہے اور ہر 'اسرار' اس پر اس کی نئی حقیقت واضح کرتا ہے تو وہ خود ہی چونک جاتا ہے اور پھر چونک کر کائنات کی دائمی اور ابدی قوت 'اللہ' کی طرف دیکھتا ہے۔

جو خود بھی ایک ایسا 'اسرار' ہے جس کی حقیقت کو سمجھنا انسان کے بس سے باہر ہے مگر اس 'اسرار' کی جستجو کی طلب اس نے ہر انسان کے دل میں ڈال دی ہے یوں جیسے انسان ایک ایسی نظر نہ آنے والی ڈور سے بندھا ہے جس کے سرے قدرت کے ہاتھ میں ہیں۔ وہی انسان کو رلاتا بھی ہے، ہنساتا بھی ہے اور چلاتا بھی ہے وہ انسان کے رگ و پے میں ایک ایسی طاقت ہے جو انسان کو ہر دم متحرک رکھتی ہے۔

'اللہ' اور 'انسان' کا کیا تعلق ہے؟

یہی اس ناول کا حقیقی موضوع ہے جو اپنے موضوع کی طرح پیٹرن میں بھی منفرد ہے اور میری دوسری تحریروں سے بہت مختلف ہے۔ اس کی انفرادیت اور تخلیق کا کریڈٹ میں صرف اللہ رب العزت کو دیتی ہوں۔ جس نے مجھے اس کام کے لیے منتخب کیا ہے اور یقیناً اس ناول کو پڑھنے کے بعد ہر قاری کے ذہن میں یہ سوال ضرور ابھرے گا کہ یہ ناول میں نے کیا سوچ کر...... اور...... کس سے متاثر ہو کر لکھا ہے؟

اس کا جواب یہی ہے کہ دسمبر 2008ء کی ایک صبح نمازِ فجر کے بعد اس ناول کا پیٹرن، نوری مخلوق (فرشتوں) کا بڑی سرکار (اللہ) سے انسان کے پتلے کے بارے میں بحث و مباحثہ اور ٹائٹل 'الف اللہ اور انسان' میرے ذہن میں نمودار ہوئے۔ میں خود بھی چونکی اور اس پر کام شروع کر دیا اس لیے میں اسے مکمل طور پر intutive ناول کہوں گی۔

اس ناول کی تقسیم جہاں بہت منفرد ہے وہیں اپنے اندر بے پناہ وسعت لیے ہوئے ہے۔ اس کے چار مخصوص حصے ہیں۔

حصہ اوّل: اس حصے میں نوری مخلوق کی بڑی سرکار سے انسان کے پُتلے کو دیکھ کر اس کی ظاہری و باطنی خصوصیات کے بارے میں بحث ہے۔ انسانی جسم کے اہم اعضاء یعنی دل، دماغ، معدہ اور آنکھیں بتلا کر ان کی مخصوص باطنی صفات محبت، عقل، خواہش اور عشق کو ڈسکس کیا گیا ہے۔

حصہ دوم: اس حصے میں محبت، عقل، خواہش اور عشق کے موضوعات پر انسانوں کی چار کہانیاں ہیں۔ جن میں انسانوں کے احساسات، جذبات، غم و خوشی، دکھ، درد، مصائب و آلام اور جسمانی و روحانی اذیتوں کو پیش کیا گیا ہے۔ لیکن ان کہانیوں کے آغاز میں بہت مختصر انداز میں دل، دماغ، معدے اور آنکھوں کے بارے میں سائنسی معلومات دی گئی ہیں ان کو لکھنے کا مقصد صرف یہی ہے کہ کس طرح سب انسانوں میں دھڑکنے والے دل، سوچنے والے دماغ اور دیکھنے والی آنکھیں ظاہری طور پر ساخت میں اور افعال میں ایک جیسی ہیں مگر باطنی خصوصیات میں سب ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ایک انسان کی سوچ دوسرے سے کبھی نہیں ملتی۔ ایک کی خواہشات اور جذبات کبھی دوسرے کی طرح نہیں ہو سکتے۔ اگر ایک چیز کسی انسان کی زندگی کا حاصل ہے تو دوسرے کے لیے بے معنی۔

حصہ سوم: ''انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا! یہ اس کی نفسیات ہے۔ وہ نہ کبھی مطمئن ہوتا ہے اور نہ ہی مکمل طور پر پر سکون۔ وہ ذرا سی تکلیف پر پریشان اور رو اویلا کرنے لگتا ہے اور ذرا سی خوشی پر اچھلنے کودنے لگتا ہے۔ اتنی طویل زندگیاں گزارنے کے بعد بھی انسان یہی سوچتا ہے کہ اس کی زندگی ضائع گئی اور انسانوں کی اکثریت ہر وقت قدرت سے یہی شکایت کرتی ہے کہ اسے کیوں پیدا کیا گیا؟ اس حصے میں

انسانوں کی اکثریت شکوے شکایات اور اپنی پریشانیوں پر واویلا کرتی ہے سوائے چند لوگوں کے جو اللہ کی رضا پر راضی رہتے ہیں۔

حصہ چہارم: حصہ اوّل کا اختتام انسان کو قدرت کا 'شاہکار' کہنے پر ہوتا ہے اور حصہ چہارم میں انسان کو قدرت کا 'شاہکار' ثابت کیا گیا ہے اور یہی اس ناول کو لکھنے کا مقصد ہے۔ یعنی اللہ اور انسان کے تعلق کو واضح کرنا۔ جب انسان اپنے آپ کو سمجھ کر اللہ سے اپنے تعلق کو مضبوط بناتا ہے تو انسان اللہ کے قریب ہوتا جاتا ہے۔ اس قربت سے اس کے اندر روحانی بصیرت اور اللہ کی ذات کا عرفان پیدا ہونے لگتا ہے اور اس عرفان سے اس کے اندر وجدان کے ایسے در وا ہونے لگتے ہیں۔ جو اسے اسرارِ حقیقی سے آشنا کرتے ہیں۔ ظاہری طور پر عام شکل و صورت اور حلیے کا انسان بھی اپنے اندر ایسی کائنات سمیٹے ہوئے ہے جس سے وہ خود بھی واقف نہیں۔ اس لیے انسان اس دنیا میں اللہ کا ایک ایسا 'شاہکار' ہے جو خوبصورت بھی ہے اور ہمہ جہت بھی۔ جو مکمل بھی ہے اور ہم آہنگ بھی۔ جو حیران کن بھی ہے اور حیرت انگیز بھی۔ قدرت کا 'شاہکار' انسان مادیت کے اس دور میں اپنی اہمیت کھو رہا ہے۔ اسے شعور ہی نہیں کہ قدرت نے اسے کن بیش بہا صلاحیتوں اور خوبیوں سے نوازا ہے۔ اس کے لیے نہ اپنی زندگی کی کوئی اہمیت رہی ہے اور نہ دوسروں کی زندگی و عزت کی...... ایک دوسرے کو ذہنی و جسمانی تکالیف پہنچانے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا گویا ہر طرف اک افراتفری اور مایوسی کی فضا پھیلی ہے۔

آج کا انسان اپنے آپ سے بھی مایوس نظر آتا ہے اور خدا سے بھی...... اور یہ اس دور کا بہت بڑا المیہ ہے کہ بے شمار خوبیوں کا مالک انسان 'ناامید' ہو جائے اور وہ 'ناامید' تب ہی ہوتا ہے جب اس کا ایمان اس ہستی پر سے اٹھنے لگتا ہے جو 'امرِ کُن' سے کائنات کو نیست و نابود بھی کر سکتی ہے اور بنجر و ویرانوں کو نخلستانوں میں بھی بدل سکتی ہے۔ اس ناول میں اللہ اور انسان کے درمیان اس پُر اسرار تعلق کو واضح کر کے انسان کو 'پُر امید' رہنے کا پیغام دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ جوں جوں انسان 'پُر امید' ہو کر اللہ کی طرف دیکھے گا اس کے لیے زندگی اور اس کی مشکل راہیں آسان ہوتی جائیں گی ضرورت صرف یقینِ کامل اور غیر متزلزل ایمان کی ہے۔ میں اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوئی ہوں فیصلہ قارئین کے ہاتھ میں ہے۔

اس ناول کی معاونت میں، میں اپنی چھوٹی بہنوں سنبل، خولہ اور بہت پیاری دوست رفعت منظور کی بے حد مشکور ہوں اور ان کی صحت اور زندگی میں کامیابیوں کے لیے دعا گو ہوں۔

منجانب

قیصرہ حیات

محرم الحرام، جنوری 2011ء

PVL
PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

حصہ اوّل

تمام نوری مخلوق انتہائی مئودبانہ انداز میں بڑی سرکار کے شاہی دربار میں کھڑی تھی۔ ان کے ساتھ ان کا لیڈر سب سے آگے کھڑا تھا، جو بڑی سرکار سے بہت محبت اور عقیدت کا دعویدار تھا اور جس کی اطاعت اور عبادت کی وجہ سے بڑی سرکار کے دربار خاص میں اسے انتہائی اہم مقام حاصل ہوا تھا۔ اس کے مقام و مرتبے کی وجہ سے بھی نوری مخلوق اس کی بہت عزت کرتی تھی۔ وہ سب حیران ہو رہے تھے کہ بڑی سرکار نے انہیں کس خاص مقصد کے لئے جمع ہونے کا حکم دیا ہے، کیونکہ بڑی سرکار اپنے ارادے، فیصلوں اور احکامات میں مختارِ کل تھی۔ اسے کسی کے مشورے کی ضرورت نہ تھی۔

پھر ایسی کیا خاص بات ہے......؟ کیا اہم واقعہ رونما ہونے والا ہے کہ بڑی سرکار نے انہیں حاضر ہونے کو کہا تھا۔

انتہائی سفید، چمکدار اور آنکھوں کو خیرہ کرنے والی روشنی نے تمام دربار کو اپنی پرنور تابانیوں سے منور کر رکھا تھا۔ کسی کی آنکھ میں اتنی سکت نہ تھی کہ وہ اس روشنی کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھ سکتا۔ روشنی کی بدلتی چمک سے وہ بڑی سرکار کے تاثرات کا اندازہ کر لیتے۔ اس روشنی سے انتہائی پر جلال اور بارعب آواز بلند ہوتی۔ جس کے سامنے کسی کو بولنے کی جرات نہ تھی، مگر آج ان کو بڑی سرکار کے حکم سے بولنے کی اجازت دی گئی تھی۔ اس اذن نے ان کو مزید حیران کر دیا تھا۔ وہ منتظر تھے اور مضطرب بھی...... کہ نجانے کیا ہونے والا ہے۔ بالآخر بڑی سرکار کے حکم سے مٹی کا ایک پتلا ان کے سامنے پیش کیا گیا۔ مجمع میں سراسیمگی سی پھیل گئی۔ وہ حیرت اور تجسس سے اس کی جانب دیکھنے لگے۔ ان کے لیڈر نے پتلے کو دیکھا تو اس کے اندر اضطراب پیدا ہونے لگا۔ یہ...... یہ...... کیا ہے؟ لیڈر نے پوچھا۔

”مٹی کا پتلا...... جب اس میں...... میں اپنی روح پھونکوں گا تو یہ زندہ...... چلتا پھرتا...... باتیں کرتا ہوا...... بھاگنے دوڑنے والا ”انسان“ ہوگا۔“ بڑی سرکار نے جواب دیا۔

”انسان......؟“ لیڈر نے حیرت سے پوچھا۔

ہاں...... اشرف الخلوقات۔ میری پیدا کردہ تمام مخلوقات میں سب سے افضل...... اور مجھے سب سے عزیز تر ہوگا...... اور پوری کائنات میں یہ میرا ”شاہکار“ ہوگا۔ بڑی سرکار نے فخریہ انداز میں جواب دیا۔

شاہکار......؟ سب چونکے اور آہستہ آہستہ بڑبڑائے۔

”ہاں...... شاہکار......؟ بڑی سرکار نے جواب دیا۔

”حقیر مٹی سے تخلیق ہونے والا...... حقیر انسان؟ لیڈر نے قدرے حقارت سے پتلے کی جانب دیکھ کر کہا۔

”یہ زمین کے لئے تخلیق کیا جا رہا ہے اور زمین مٹی سے بنی ہوگی۔ یہ مٹی سے ہی جنم لے گا اور اسی میں دفن ہوگا...... زمین کی تخلیق کے اہم عناصر مٹی ہوا اور پانی مل کر اس کا وجود تشکیل دیں گے اور یہ حقیر ہرگز نہیں ہوگا۔“ بڑی سرکار نے پرسکون انداز میں جواب دیا۔

اچانک سفید، چمکدار روشنی کی چند شعاعیں پتلے پر پڑیں تو کہیں سے یہ سفید، کہیں سے کالا، کہیں سے بھورا اور کہیں سے سیاہی مائل نظر آنے لگا۔ سب چونک کر اسے دیکھنے لگے۔

یہ ایک جیسا کیوں نظر نہیں آتا؟ حاضرین محفل میں سے ایک نے انتہائی حیرت سے پتلے کی جانب دیکھا اور سوال کیا، جس پر روشنی کی شعاعیں مختلف انداز میں پڑ رہی تھیں۔

انسان جسمانی طور پر ایک جیسے ہوں گے، مگر رنگ، شکل وصورت اور جسامت میں دنیا کے سب انسان مختلف ہوں گے۔ کسی کو میں سفید، کسی کو کالا، کسی کو بھورا، کسی کو پتلا، کسی کو لمبا اور کسی کو چھوٹا، کسی کو اپاہج، کسی کو عقل سے عاری، کسی کو ذہین اور عقلمند بناؤں گا اور انہی میں سے اس کے ہم جنس اور جنس مخالف، یعنی مرد وزن پیدا کروں گا۔ جن کے ملاپ سے نسل انسانی نشو ونما پائے گی۔ بڑی سرکار نے جواب دیا۔

ایک انسان دوسرے سے کیسے مختلف ہوگا؟ مجمع میں سے کسی نے پوچھا۔

''میں زمین کو مختلف رنگوں کا بناؤں گا، کہیں ہموار زمین، کہیں ریگستان، کہیں سرسبز وشاداب پہاڑ، کہیں میخوں جیسے سنگلاخ پہاڑ، کہیں برف پوش چوٹیاں، کہیں پانی کے وسیع سمندر، کہیں زمین کے اندر تہیں تخلیق کروں گا۔ ان مختلف زمینی حصوں میں مختلف قسم کی ہوائیں چلاؤں گا ان ہواؤں سے وہاں کے موسم بدلیں گے۔ یہ موسم اور ہوا وہاں کی مٹی پر اثر انداز ہوں گے اور انہی عناصر کی وجہ سے زمین کے ایک حصے کے لوگ دوسروں سے مختلف ہوں گے، نہ صرف یہ بلکہ وہاں پر پیدا ہونے والے پھل، پھول، اناج اور انسان کی ضروریات کی تمام چیزیں زمین کے دوسرے حصوں سے مختلف ہوں گی۔ یہاں تک کہ ہوا میں اڑنے والے پرندے ان کے رنگ، زمین پر چلنے والے جانور اور رینگنے والے کیڑے مکوڑے، سب کچھ ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے۔ بڑی سرکار نے جواب دیا۔

''آپ پھل، پھول، پرندے، جانور اور کیڑے مکوڑے کیوں پیدا کریں گے.....؟ کسی نے سوال کیا۔

''میں یہ سب کچھ انسان کے لئے تخلیق کروں گا۔ اسے زندہ رہنے کے لئے جس شے کی بھی ضرورت ہوگی وہ میں کثرت سے اسے فراہم کروں گا۔ زمین کے ہر حصے کے انسانوں کی ضروریات مختلف ہوں گی اور میں زمین کے اندر اور باہر کو ان کی ضروریات کی چیزوں سے بھر دوں گا۔'' بڑی سرکار نے جواب دیا۔

''صرف انسان کے لئے..... اتنا کچھ؟ نوری مخلوق میں سے ایک اور نے سوال کیا۔

''ہاں..... میں اس کے لئے بے شمار مخلوقات، پانی میں زمین کے اندر، زمین کے اوپر تخلیق کروں گا۔ اس کے علاوہ زمین کے اوپر خوبصورت نیلا آسمان اس پر چمکنے والا سورج، جو زمین کو دن کے وقت روشن اور گرم رکھے گا، وہ تخلیق کروں گا، تاکہ دن میں انسان کام کرے اور اس کے آرام کے لئے سیاہ، خاموش، پرسکون اندھیری رات بناؤں گا اور جب رات کو آسمان تاریک ہو جائے گا تو اس پر روشنی کے ننھے منے ستارے اور خوبصورت روشنی سے بنا ہوا چاند بناؤں گا۔ یہ سب چیزیں زمین کی خوبصورتی میں اضافہ کریں گی اور انسان ان سے لطف اٹھائے گا۔ اس آسمان میں اڑنے والے رنگ برنگی، خوبصورت، گنگناتے چرند پرند سب کچھ انسان کے لئے تخلیق کروں گا۔'' بڑی سرکار نے محبت سے جواب دیا تو تمام نوری مخلوق حیران ہوگئی۔

''آپ انسان کو کیوں تخلیق کر رہے ہیں؟ لیڈر نے قدرے مضطرب ہو کر پوچھا۔

''سفید روشنی چمکی ...... مگر کوئی جواب نہ دیا گیا ...... جیسے بڑی سرکار اس سوال کا جواب ابھی نہ دینا چاہتی ہو۔ لیڈر اور مضطرب ہونے لگا۔ ہر طرف گہرا سکوت چھا گیا۔

''کیا انسان ہمیشہ زمین پر رہے گا؟'' کسی نے سوال کیا۔

''میں اس پتلے سے بہت سے انسان مختلف شکلوں اور رنگوں کے پیدا کروں گا۔ نسل انسانی مختلف ادوار سے گزرے گی۔ بچپن سے جوانی، جوانی سے بڑھاپا اور پھر ان کو ایک خاص مدت یعنی عمر گزارنے کے بعد میں ان کو موت دوں گا اور مر کر وہ زمین میں دفن ہو جائیں گے......'' بڑی سرکار نے جواب دیا

''وہ زمین پر رہ کر کیا کرے گا؟'' کسی ایک نے پوچھا۔

''دنیا کے سب انسان کچھ کام ایک جیسے کریں گے جیسے کھانا، پینا، سونا، جاگنا اپنی نسل کو بڑھانا......'' بڑی سرکار نے قدرے توقف کیا۔

''اتنے سب کام آپ سب انسانوں کو کیسے سکھائیں گے؟'' حاضرین میں سے ایک نے پوچھا۔

''یہ سب انسان کی جبلت میں شامل ہوں گے ...... یعنی پیدائش کے ساتھ ہی وہ ان کاموں کو خود بخود کرنا سیکھ لے گا۔ میں تخلیق کے وقت یہ سب کچھ اس کے اندر پیدا کر دوں گا اور تا حیات یہ سلسلہ جاری رہے گا۔'' بڑی سرکار نے جواب دیا۔

''کیا انسان اپنی موت تک صرف یہی کام کرے گا؟'' لیڈر نے پوچھا۔

''نہیں ...... ان کاموں کے علاوہ میں انسان کو کچھ مخصوص کاموں میں مصروف رکھوں گا ...... جن کے ذریعے وہ اپنی بنیادی ضروریات یعنی کھانے پینے اور زندگی گزارنے کے لئے کئی دیگر ضروریات کو پورا کرے گا۔'' بڑی سرکار نے جواب دیا۔

''کیا انسان زمین پر صرف اس مقصد کے لیے بھیجا جا رہا ہے؟'' لیڈر نے معنی خیز انداز میں قدرے حقارت سے پوچھا۔

''نہیں ...... ہر انسان کے اندر میں ایسی جستجو بھر دوں گا، جو اسے ان بنیادی کاموں کے علاوہ اور بہت کچھ کرنے پر مجبور کرے گی۔ کوئی پرندوں کی طرح ہوا میں اڑنے کی جستجو کرے گا، کوئی پانی کی مخلوق کی طرح تیرنا چاہے گا، کوئی پہاڑوں اور برف پوش چوٹیوں کو سر کرنے کی کوشش کرے گا، کوئی مختلف اور انوکھی اچھوتی چیزیں بنانے کا شوقین ہوگا، ہر وہ چیز جو اسے حیران کرے گی۔ وہ متجسس ہو کر اس کے بارے میں سوچے گا اور اس جیسا بننے کی کوشش کرے گا۔'' بڑی سرکار نے جواب دیا۔

''انسان یہ سب کام کیوں کرے گا؟'' حاضرین میں سے ایک نے سوال کیا۔

''میں انسان کے اندر ایسا اضطراب پیدا کروں گا جو اسے ہر وقت بے چین اور بے قرار رکھے گا۔ اس اضطراب کو دور کرنے کے لئے وہ کبھی زمین کی تہوں کو کھود ڈالے گا ...... کبھی پہاڑوں کی چوٹیوں کو سر کرے گا اور کبھی چاند ستاروں تک بھی پہنچ جائے گا، مگر اس کو سکون نہیں ملے گا۔'' بڑی سرکار نے جواب دیا۔

''اور ...... سکون ...... اسے کہاں ملے گا؟ انتہائی حیرت سے سوال کیا گیا۔

''اگر سکون...... میں پہاڑوں کی چوٹیوں، زمین کی تہوں اور سمندروں کی گہرائی میں رکھوں تو انسان اسے وہاں سے بھی حاصل کرنے کی کوشش کرے گا، مگر میں سکون کو انسان کے اندر رکھوں گا۔ جس کے بارے میں وہ بہت کم سوچے گا۔'' بڑی سرکار نے جواب دیا۔

''انسان کے اندر، کیسے......؟اور کیا؟ کسی نے حیرت سے پوچھا۔

''جسمانی طور پر دنیا کے سب انسان ایک جیسے ہوں گے اور انسان کو متحرک رکھنے والے جسمانی نظام اور پرزے بھی ایک جیسے ہوں گے، مگر انسان کے اندر ایک اور انسان ہوگا جو اسے خود بھی نظر نہیں آئے گا، مگر جس کے وجود کو وہ اچھی طرح محسوس کرے گا۔ اندر کا یہ انسان اس کے نفس...... باطن......اور روح سے تشکیل پائے گا۔'' بڑی سرکار نے جواب دیا۔

''نفس...... کیا ہوگا؟ پوچھا گیا۔

''خیر وشر......اور خوبیوں وخامیوں کا مجموعہ، لامحدود خواہشات اس کے نفس میں جنم لیں گی اور ان کے حصول کے لئے وہ جائز و ناجائز ہر طریقے سے جدوجہد کرے گا۔ نیکی وبدی، لالچ وحسد، خودغرضی اور حرص وہوس سب اس کے نفس میں ہوگا اور نفس ہر وقت کسی نہ کسی خواہش اور اس کے حصول کے لئے مضطرب و بے چین رہے گا۔ انسان ہر وقت اپنے نفس کی قید میں رہے گا، جو انسان اس پر قابو پالے گا اور اس کی قید سے آزاد ہوگا۔ ''نفس کی اچھائی یا برائی۔ اس کے باطن کو تشکیل دے گی، جو انسان اپنے نفس پر قابو پائے گا تو اس کا باطن اچھا ہوگا۔ نفس کی خصوصیات اس کے باطن کی خوبصورتی اور بدصورتی میں اضافہ کریں گی۔'' جواب دیا گیا۔

''کیا انسان کا باطن نفس سے تشکیل پائے گا؟'' حیرت سے پوچھا گیا۔

''ہاں...... انسان کا نفس ہر وقت انسان کے اندر ہلچل، ہنگامہ اور بے قراری پیدا کرے گا، نفس کی پاکیزگی سے باطن روشن اور برائی سے باطن تاریک ہوگا۔'' بڑی سرکار نے جواب دیا۔

''اور...... روح کیا ہوگی؟'' حاضرین میں سے ایک نے پوچھا۔

''ہر مٹی کے پتلے میں جب میں اپنی روح پھونکوں گا تو وہ زندہ اور متحرک انسان ہوگا۔ انسان کے جسم کا تعلق ''نفس'' سے ہے...... اور انسان کا اس کے باطن سے اور باطن کا روح سے اور روح کا تعلق مجھ سے ہوگا۔ باطن کی اچھی خصوصیات اس کی روح کو طاقتور بنائیں گی اور ہر طاقتور روح مجھ سے اپنے تعلق کو مضبوط بنائے گی۔ منفی خصوصیات سے تشکیل پانے والا باطن روح کو کمزور کرے گا اور کمزور روح مجھ سے اس انسان کو بہت دور لے جائے گی۔ جب تک روح انسان کے اندر ہوگی وہ زندہ رہے گا۔ زندہ رہنے کے اس عمل کو 'زندگی' کا نام دیا جائے گا اور جب میں اس کی روح قبض کرلوں گا تو وہ مرجائے گا اور انسان کا تعلق ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے ختم ہوجائے گا۔ اس عمل کو 'موت' کا نام دیا جائے گا۔ موت کے بعد انسان کے بے جان اور مردہ جسم کو...... جو اس پتلے کی مانند ہوگا۔ مٹی کے اندر دفنا دیا جائے گا، جبکہ روح میرے پاس زندہ رہے گی، کیونکہ وہ میرا امر ہوگی جسے کبھی فنا نہیں ہونا۔'' بڑی سرکار نے جواب دیا۔

''کیا انسان کا اندر اس کے جسم سے زیادہ مضبوط ہوگا؟'' ایک نے سوال کیا۔

''ہاں......انسان کا اندر کئی ہزار پرت کا مجموعہ ہو گا اور ہر پرت دوسرے سے مختلف ہو گا۔اس لئے وہ ہر لمحہ بدلتا ہوا،ایک مختلف انسان ہو گا۔وہ کبھی بھی ایک جیسے کام نہیں کرے گا،جو وہ سوچے گا اس کے مطابق عمل نہیں کرے گا اور جو کہے گا،اس پر خود ہی حیران ہو گا......اسے خود بھی ساری زندگی معلوم نہیں ہو پائے گا کہ وہ کیا ہے؟کیونکہ اس کی اپنے اندر تک رسائی بہت مشکل سے ہو پائے گی......اس لئے وہ جو کچھ نظر آئے گا وہ ہو گا نہیں اور جو کچھ نہیں ہو گا وہ نظر آنے کی کوشش کرے گا اور ہر انسان کا 'اندر' بھی دوسرے انسان سے مختلف ہو گا۔''جواب دیا گیا۔

''اتنا مشکل اور پیچیدہ انسان؟''کسی نے انتہائی حیرت سے سوال کیا۔

''ہاں......اسی لیے تو......وہ میرا 'شاہکار' ہو گا۔جواب دیا گیا۔

''مٹی کا پتلا......جو آپ کی پھونکی ہوئی روح سے زندہ ہو گا اور آپ کی دی ہوئی موت سے وہ فنا ہو جائے گا اور جس کو دنیا میں رہنے کے لئے آپ سب کچھ عطا کریں گے۔اس میں ایسا خاص کیا ہو گا کہ ہم اس کو شاہکار مانیں۔''لیڈر جو کافی دیر سے خاموش تھا۔بڑی سرکار کے اس دعوے پر قدرے نخوت سے بولا۔

سفید روشنی کی لو نہ کم ہوئی نہ زیادہ......ایک دم گہری خاموشی چھا گئی......یوں جیسے بڑی سرکار نے اس سوال کا جواب فوراً دینا مناسب نہ سمجھا ہو......اور محفل کو برخاست کر دیا گیا۔

'مٹی کا پتلا' اور اس کے بارے میں انکشافات نے نوری مخلوق کو بہت مضطرب اور بے چین کر دیا تھا۔

محفل کو برخاست کر دیا گیا،مگر تمام حاضرین محفل بہت مضطرب اور بے چین تھے کہ پتلے کے بارے میں مزید کیا انکشاف کیا جائے گا۔

خدا اور محبت

خدا اور محبت بہت ہی خوبصورت اور رومانی ناول ہے جو مصنف ہاشم ندیم کی اپنی محبت کی سچی داستان پر مبنی ہے۔یہ مصنف ہاشم ندیم کا پہلا ناول ہے اور اس کی کہانی کوئٹہ اور لندن شہر کے پس منظر میں لکھی گئی ہے۔یہ ناول ایک پرائیوٹ چینل پر ڈرامائی شکل میں بھی پیش کیا جا رہا ہے۔اس ناول کو نیشنل اور انٹرنیشنل دونوں سطح پر بہت سراہا گیا ہے اور بہت جلد علم و عرفان پبلیکیشنز والے اس ناول کا انگریزی ایڈیشن لندن سے شائع کرنے والے ہیں۔

(۱)

''محبت''

حاضرین محفل بہت پُر اشتیاق نگاہوں سے سفید روشنی کی جانب دیکھ رہے تھے، جو پہلے سے بھی زیادہ آب وتاب اور تمکنت سے چمک رہی تھی، جیسے مزید اسرار اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہو۔

ہر طرف گہرا سکوت چھایا تھا۔ ایک دم سفید روشنی پتلے کے سینے پر چمکی اور سب حیرت سے اس کے سینے کی جانب دیکھنے لگے۔

''یہاں انسان کا دل ہوگا، جو انسانی جسم کا سب سے اہم عضو ہوگا۔ جو جسمانی اور ظاہری طور پر انسان کو زندہ رکھے گا اور جیسے ہی یہ کام کرنا بند کردے گا، انسان موت سے ہمکنار ہوگا۔'' بڑی سرکار نے جواب دیا۔

''دل اتنا اہم حصہ کیوں ہوگا؟'' کسی ایک نے سوال کیا۔

''انسانی جسم ایک سرخی مائل سیال مائع یعنی خون کی گردش کی وجہ سے حرکت کرے گا اور دل اس خون کو تمام انسانی اعضاء تک پہنچانے کا ذمہ دار ہوگا، جب دل حرکت کرنا چھوڑ دے گا تو خون کی گردش بھی رک جائے گی اور انسان بھی مر جائے گا۔'' جواب دیا گیا۔

''کیا دل صرف یہی ایک کام کرے گا؟'' حاضرین میں سے ایک نے پوچھا۔

''ہاں...... ظاہری وجسمانی طور پر یہ یہی کام کرے گا، مگر باطنی طور پر اس میں محبت، نفرت کے احساسات اور کئی طرح کے جذبات جنم لیں گے۔'' جواب دیا گیا۔

''ایک ہی دل میں سے یہ سب کچھ کیسے جنم لیں گے؟'' سوال کیا گیا۔

''ظاہری طور پر یہ گوشت کا ایک لوتھڑا ہوگا، مگر اس کے اندر چار خانے ہوں گے، جو ظاہری طور پر خون کی گردش کے ذمہ دار ہوں گے، مگر حقیقت میں، میں ان خانوں کو تمام مثبت اور منفی جذبات سے بھر دوں گا۔ دو خانوں میں سچ اور محبت کے مثبت جذبات ہوں گے، جبکہ دو خانوں میں منفی جذبات جھوٹ اور نفرت ہوں گے۔ سچ سے خلوص، دیانت، نیک نیتی، اعتبار اور ایمان جنم لیں گے، جبکہ محبت سے پیار، وفا، ہمدردی، ایثار اور رحمدلی پیدا ہوگی۔ جھوٹ سے مکر وفریب، ریاکاری، مکاری، بدنیتی، بے ایمانی، وسوسے، اوہام، شکوک وشبہات، خودغرضی پیدا ہوگی اور نفرت سے کینہ، دشمنی، حسد، لالچ، طمع وحرص، انتقام، غرور اور تکبر، قتل وغارت اور تباہی وبربادی کے جذبات جنم لیں گے۔'' بڑی سرکار نے بتایا۔

''یوں محسوس ہو رہا ہے کہ آپ کے اس شاہکار میں شر، خیر سے زیادہ ہوگا؟'' کسی نے معنی خیز انداز میں سوال کیا۔

''نہیں...... یہ خیر وشر سے ملا جلا ہوا انسان ہوگا، جس میں تمام جذبے کثرت سے موجود ہوں گے، مگر جس انسان میں خیر غالب ہوگا، وہی

کامیاب ہوگا اور جس میں 'شر' حاوی ہوگا وہ خسارے میں رہے گا۔'' جواب دیا گیا۔

''اور...... دل میں خیر یا شر کے جذبات کس طرح غالب ہوں گے؟'' سوال کیا گیا۔

''دل میں بہت سے جذبات پیدا ہوں گے، مگر میں دل کو صرف 'محبت' کے لئے مخصوص کروں گا۔ ہر دل میں محبت ہوگی، مگر جس دل میں محبت زیادہ حاوی ہوگی وہ تمام منفی جذبوں پر غالب آجائے گی۔'' بڑی سرکار نے جواب دیا۔

''اور محبت کیسے غالب آئے گی؟'' پھر پوچھا گیا۔

''محبت کی بنیاد سوچ ہوگی، جو انسان زیادہ سچا ہوگا اور سچ کی جستجو کرے گا، خود بخود اس کے دل میں میری اس کے ہم جنسوں کی اور تمام دوسری مخلوقات کی محبت پیدا ہوتی جائے گی، جیسے جیسے انسان میں محبت کا یہ جذبہ شدت اختیار کرتا جائے گا تمام منفی جذبات ماند پڑتے جائیں گے۔ ہر محبت اور خیر کی بنیاد سچ پر ہوگی۔ دل میں جنم لینے والے تمام جذبات کو دل میں موجود سچ کا خانہ پرکھے گا اور جس جذبے میں ذرا سی جھوٹ کی آمیزش ہوگی وہی جذبہ انسان کے لئے 'آزمائش' بن جائے گا ہر سچا اور پاک دل ''قلب سلیم'' کہلائے گا۔'' بڑی سرکار نے جواب دیا۔

''قلبِ سلیم...... کیا وہ کوئی خاص دل ہوگا؟'' سوال کیا گیا۔

''ہاں...... ہر سچے انسان کا دل ''قلب سلیم'' ہوگا۔ میں 'انسان' کو فطرت سلیمہ پر پیدا کروں گا۔ یعنی ہر بچہ نیک و پاک روح کے ساتھ، اپنے اندر 'خیر' لے کر جنم لے گا۔ لیکن بعد میں دنیا کے حالات و واقعات اس پر اس طرح اثر انداز ہوں گے کہ اس کے دل میں موجود منفی جذبات، خیر پر غالب آکر اسے برا انسان بنا دیں گے۔ 'قلبِ سلیم' میں خیر اور میری محبت غالب ہوگی، جو مجھ سے سچی محبت کرے گا، میں اپنی محبت کے تمام در اس پر وا کر دوں گا جو مجھ پر سچے دل سے اعتبار اور یقین کرے گا، میں اس کا غیر متزلزل 'ایمان' بن جاؤں گا اور جو میرے بارے میں اچھا گمان کرے گا، میں اس کے لئے زندگی کی راہیں آسان کر دوں گا اور جو مجھ پر سچے دل سے ایمان رکھتے ہوئے اور سچی محبت کا دعویٰ کرتے ہوئے زندگی کی شاہراہ پر قدم رکھے گا تو میں اسے ایسے عرفان سے نوازوں گا، جس کا نعم البدل دنیا میں کوئی نہیں ہوگا۔ ذرا سا جھوٹ، بے ایمانی، بداعتقادی، بدنیتی دل کو آلودہ کر کے اسے قلب سلیم کے دائرے سے خارج کر دے گا۔'' بڑی سرکار نے جواب دیا۔

''آپ نے دل کو محبت کے لئے ہی کیوں مخصوص کیا ہے؟'' کسی نے پوچھا۔

''انسان کا دل بہت نازک ہوگا، جو لمحوں میں کرچی کرچی ہو جائے گا...... ذرا ذرا سی تکالیف پر دکھی ہو جائے گا...... اور چھوٹی چھوٹی باتوں سے پریشان ہو جائے گا۔ ظاہری طور پر مضبوط جسامت والے انسانوں کے دل بھی اندر سے بہت نازک ہوں گے۔ وہ ایک لمحے میں خوش اور دوسرے لمحے میں رنجیدہ ہو جائے گا۔ اس کے اندر بہت لطیف احساسات و جذبات جنم لیں گے اور تمام مثبت جذبوں میں محبت، ایسا لطیف نازک اور خوبصورت جذبہ ہوگا جو اپنی سرشاری کی قوت سے کائنات کو تسخیر کرے گا۔ ایک انسان اپنی محبت کی وجہ سے دوسروں کی نفرت پر غالب آجائے گا۔ ان کے دلوں پر حکومت کرے گا۔ محبت میں ایسی قوت، لطافت اور سرشاری ہوگی کہ باقی کے انسان خود بخود محبت سے سرشار انسان کی جانب کھنچے چلے آئیں گے اور میں بھی بہت محبت سے 'انسان' کو تخلیق کروں گا۔ میں اپنی محبت کا رس انسان کے دل میں بھر دوں گا، جب وہ اس کی مٹھاس اور خوشبو کو

محسوس کرتے ہوئے اردگرد کی ہر شے کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھے گا تو اسے ہر طرف میں ہی نظر آؤں گا اور میری محبت میں وہ میری تمام مخلوق سے محبت کرے گا اور محبت کی ایسی داستانیں رقم کرے گا کہ تم بھی حیران رہ جاؤ گے اور اس محبت کی وجہ سے یہ تمہیں بھی مات دے گا۔'' بڑی سرکار نے جواب دیا۔

''کیا...... یہ پتلا...... ہمیں...... مات دے گا؟ لیڈر نے انتہائی حقارت سے مٹی کے پتلے کی جانب دیکھ کر کہا۔

''ہاں...... تمہیں بھی......'' ٹھوس لہجے میں جواب دیا گیا۔

''کیا یہ صرف اپنی محبت کی وجہ سے دوسروں کو مات دے دے گا؟'' کسی اور نے سوال کیا۔

''ہاں...... نفرت میں یہ 'محبت' سے بھی بڑھ جائے گا، لیکن وہ نفرت بھی کسی سے شدید محبت کی وجہ سے کرے گا اور اس شے کو پانے کے لئے اس کے اندر حسد، کینہ، خودغرضی، لالچ، دشمنی اور انتقامی جذبات شدت سے پیدا ہوں گے۔ یہاں تک کہ وہ اس شے کو پانے کے لئے دوسروں کو حد درجہ نقصان پہنچائے گا۔ یہاں تک کہ ان کو ختم بھی کر دے گا۔'' جواب دیا گیا۔

''کیوں......؟'' انتہائی حیرت سے سوال کیا گیا۔

''وہ اپنی محبت میں اس قدر دیوانہ ہو جائے گا کہ محبت کو پائے بغیر اسے کچھ دکھائی نہیں دے گا۔ دنیا کی کوئی اور شے اسے سکون نہیں دے گی اور اس شے کو پانے کے لئے وہ اس قدر جنونی ہو جائے گا کہ اپنے آپ کو بھی ختم کرنے سے گریز نہیں کرے گا۔''

تم اس کی محبت کا شعور نہیں کر سکتے کہ یہ کیسی محبت کرے گا۔'' بڑی سرکار نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔

''کیسی محبت کرے گا؟'' کسی نے چونک کر پوچھا۔

''بہت منفرد...... شدید اور کٹھن۔'' جواب دیا گیا۔

''منفرد محبت...... کیسی ہوتی ہے؟'' سوال کیا گیا۔

''دنیا کا ہر انسان دوسرے انسان یا شے سے اپنے جبلی تقاضے چاہت اور خواہشات کے مطابق محبت کرے گا۔ ایک کی محبت کی نگاہ، دوسرے سے مختلف ہو گی۔ ضروری نہیں کہ ایک کی محبت، دوسرے کی بھی محبت ہو اور ایک کی چاہت، دوسرے کی بھی چاہت ہو۔ ہر انسان اپنی سوچ اور چاہت کے مطابق محبت کرے گا۔ اس لئے ہر انسان کی محبت منفرد ہو گی۔'' جواب دیا گیا۔

''اور...... شدید محبت، کیسی ہو گی؟'' حیرت سے پوچھا گیا۔

''اپنی محبت میں وہ کسی کی مداخلت برداشت نہیں کرے گا اور اس شخص یا شے کو پانے کے لئے وہ ہر ممکن کوشش کرے گا۔ بربریت اور درندگی پر اتر آئے گا۔ دوسروں کو بھی نقصان پہنچانے سے دریغ نہیں کرے گا اور اپنی جان کی بازی لگانے سے بھی نہیں ہچکچائے گا۔'' بڑی سرکار نے جواب دیا۔

''محبت...... کٹھن...... کیسے ہو گی؟'' سوال کیا گیا۔

''محبت کی راہ بہت مشکل اور کٹھن ہوگی۔ یہ پل میں انسان کو پُر امید اور پل میں مایوس کر دے گی۔ وہ اندر ہی اندر اس قدر مضطرب، بے چین اور بے قرار ہوگا اور اپنے آپ سے ایسی جنگ میں مصروف ہوگا، جس کی کسی دوسرے کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی، مگر وہ شدید اذیت میں سے گزر رہا ہوگا۔ یہ اذیت اسے ایسی آزمائش میں ڈالے گی، جس سے نہ فرار ممکن ہوگی نہ نجات۔ جب وہ اپنی محبت کو پانے کی جدوجہد میں ناکام ہو جائے گا تو دیوانہ ہو جائے گا......اور محبت میں دیوانگی کا دوسرا نام 'عشق' ہے۔'' بڑی سرکار نے جواب دیا۔

''عشق......وہ کیا ہوتا ہے؟'' وہ حیرت سے چلائے۔

''کسی کی محبت میں جب انسان اپنے آپ کو بھول جائے گا اور اسے ہر طرف وہی دکھائی دے اور وہی سنائی دے، ہر لحہ اس سے ہمکلام ہو، اسی سے دل کی باتیں اور راز و نیاز کہے، اس کو ہی اپنا سب کچھ سمجھے اور اس کے لئے مر مٹنے کو بھی تیار ہو جائے تو وہ محبت نہیں...... عشق کہلائے گا۔'' جواب دیا گیا۔

''کیا محبت...... 'عشق' سے مختلف ہے اور جو محبت کرے گا...... کیا وہ عشق نہیں کرے گا؟'' ایک نے سوال کیا۔

''محبت عشق کی سیڑھی پر پہلا قدم ہے......محبت ابتداء ہے اور عشق اس کی انتہاء۔ محبت میں بہت سے لوگ شامل ہو سکتے ہیں، مگر عشق صرف ایک ہی سے ممکن ہے، محبت سے عشق تک کا سفر بہت مشکل اور کٹھن ہوگا۔ محبت عام ہوگی اور عشق خاص۔ محبت کا مرکز دل ہوگا اور عشق کا روح۔ محبت میں پانا ممکن ہوگا اور عشق میں کھو کر پانا اور پا کر کھونا ہوگا۔ محبت میں سرشاری اور عشق میں بے قراری ہوگی۔ محبت اور عشق کا سفر انسان کے لئے بہت کٹھن اور تکلیف دہ ہوگا۔'' بڑی سرکار نے جواب دیا۔

''کیا ہر انسان زندگی میں محبت اور عشق کرے گا؟'' پوچھا گیا۔

ہر انسان اپنی زندگی میں کسی نہ کسی شے یا دوسرے انسان سے محبت ضرور کرے گا، مگر عشق ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوگی۔'' جواب دیا گیا۔

''سب انسان محبت کیوں کریں گے؟'' حیرت سے پوچھا گیا۔

''کیونکہ محبت، انسان کی سرشت اور خمیر میں شامل ہوگی۔ اس کے وجود کی مٹی کو محبت کے پانی سے گوندھا جائے گا، وہ محبت کے لمس، اس کی طاقت، احساس اور اس کی تلاش وطلب کے بغیر اپنے وجود کو ادھورا محسوس کرے گا، جہاں اسے محبت ملے گی یہ اس کی طرف خود بخود متوجہ ہوگا۔ محبت کو پانے کے لئے جستجو کرے گا۔ محبت کی خاطر اذیتیں اور تکلیفیں اٹھائے گا، کیونکہ اس کی طلب وہ اپنے اندر محسوس کرے گا۔ جب اسے محبت نہیں ملے گی تو وہ زندگی سے بیزار ہو جائے گا۔ اس لئے وہ اسے کسی نہ کسی طرح اسے پانے کی کوشش کرے گا۔'' جواب دیا گیا۔

''کیا محبت، انسان کے لئے بہت ضروری ہوگی کہ وہ اس کے بغیر زندگی سے بھی بے زار ہو جائے گا؟ کسی نے سوال کیا۔

ہاں......کائنات کی تمام خوبصورتیوں کا سرچشمہ محبت ہوگی۔ محبت، میٹھا لمس اور خوشگوار احساس ہوگا۔ جیسے خوبصورت پھول کی خوشبو...... جیسے چاند کی چاندنی جیسے ہوا کی لطافت...... جیسے نور کی کرنیں۔ یہ اتنا خوبصورت اور پیارا جذبہ ہوگا تم بھی انسانوں کی محبت دیکھ کر حیران رہ جاؤ گے۔ انسان محبت بھرے دل کے ساتھ جس طرف بھی دیکھے گا، اسے ہر شے مسکراتی نظر آئے گی، جس کو بھی محبت سے چھوئے گا......اس کی لطافت اس کی

روح کو سرشار کرے گی۔ محبت انسان کو ایسی خوشی دے گی، جس کا نعم البدل کائنات کی کوئی شے نہیں ہوگی۔ اسی لئے انسان محبت کو پانے کی خاطر انتہائی تکلیفیں اٹھائے گا۔'' بڑی سرکار نے بھی محبت بھرے انداز میں بتایا سب کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔

''آپ نے انسان کو محبت کی صورت میں اتنا بڑا اور خوبصورت تحفہ دے دیا ہے؟'' حیرت سے سوال کیا گیا۔

''تحفہ نہیں آزمائش۔'' جواب دیا گیا۔

''آزمائش......؟'' وہ حیرت سے چلائے۔

''ہاں......وہ محبت پاکر بھی مضطرب رہے گا اور نہ پاکر......اس سے بھی زیادہ مضطرب۔'' جواب دیا گیا۔

''کیوں......؟''

''محبت اضطراب سے جنم لے گی۔ اس لئے انسان کو کبھی قرار نہیں ملے گا۔ وہ اس کو پاکر بھی اندر ہی اندر مضطرب اور بے چین رہے گا۔'' جواب دیا گیا۔

وہ سب حیرت سے سوچ میں پڑ گئے۔ ان کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ مزید کیا پوچھیں۔ انہیں نہ محبت کی سمجھ آ رہی تھی اور نہ اس اضطراب کی، جو انسان کو بے قرار رکھے گا۔

ہر طرف گہرا سکوت چھا گیا......اور محفل برخاست ہوگئی۔

(۲)

''عقل''

حاضرین محفل پھر جمع ہو گئے تھے، کیونکہ بڑی سرکار کے شاہی دربار سے پھر فرمان جاری ہوا تھا، وہ حیران و پریشان تھے۔ مٹی کے انسان نے ان کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ ان کی سوچوں کو الجھا دیا تھا......اور......اب......پھر اس کے بارے میں کوئی نیا انکشاف ہونے والا تھا۔ ان کے اندر اضطراب اور گہرا تجسس تھا۔

ہر طرف گہری خاموشی چھا گئی......سفید روشنی چمکی اور سب اس کی ہیبت سے مرعوب ہو گئے۔

''تم انسان کے دل اور اس کی محبت کے بارے میں جان کر مضطرب ہو گئے ہو......کیا تم اب بھی اس کو میرا شاہکار نہیں مانتے؟'' بڑی سرکار نے پوچھا۔

''کیا صرف اس کی محبت کی وجہ سے ہم اسے آپ کا 'شاہکار' مان لیں......ایسی محبت، جس سے وہ خود بھی مضطرب اور پریشان رہے گا۔ جس کی تلاش میں وہ سرگرداں رہے گا، جو چیز خود اس کے لئے آزمائش ہوگی، اس کی وجہ سے ہم اسے کیسے شاہکار مان لیں؟'' جواب دیا گیا۔

''مجھے معلوم تھا......اس لئے اب میں تمہیں اس مٹی کے پتلے یعنی اس انسان کے بارے میں ایک اور انتہائی اہم بات بتانے والا ہوں۔ یہ دیکھو اور سفید روشنی پتلے کے عین سر پر چمکی اور سب متجسس ہو کر اس جانب دیکھنے لگے۔

''یہ......کیا ہے......؟'' سوال کیا گیا۔

''رئیس الاعضاء......یعنی......اس کا سر ہے......اور سر کے اندر 'دماغ'......۔ بتایا گیا

''دماغ......؟'' وہ حیرت سے چلائے۔

''ہاں......دماغ۔'' بتایا گیا اور پھر ہر طرف خاموشی چھا گئی۔

''انسان۔ دنیا میں جتنی ترقی کرے گا......جو کچھ سوچے گا......اس کی کامیابیاں، منصوبے، سازشیں سب اس دماغ سے وابستہ ہوں گے۔'' جواب دیا گیا۔

''کیسے......؟'' انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

''مٹی کا یہ پتلا دماغ کے بغیر نامکمل ہوگا۔ یہ بے جان اور مردہ رہے گا، جب تک کہ اس کے سر میں موجود دماغ ٹھیک طرح سے کام نہیں کرے گا۔ یہ اس کی وجہ سے حرکت کرے گا، اس کی وجہ سے بول سکے گا اور ایسے کام کرتے گا جو تم سوچ بھی نہیں سکتے۔'' پرسکون انداز میں بتایا گیا۔

''کیسے کام......؟'' حیرت سے پوچھا گیا۔

''بہت مشکل......بہت پیچیدہ......اور بہت کٹھن'' بتایا گیا۔

''کیا اس کے دماغ میں بھی محبت ہوگی؟'' انہوں نے پوچھا۔

''نہیں......اس کے دماغ میں ''عقل'' ہوگی۔''

''عقل......وہ کیا؟'' انتہائی حیرانگی سے پوچھا گیا۔

''عقل......ظاہری طور پر نظر نہیں آئے گی۔ جس طرح محبت دکھائی نہیں دے گی، مگر محبت کے بغیر انسان اپنے آپ کو نامکمل محسوس کرے گا، اسی طرح عقل کے بغیر انسان کچھ نہیں ہوگا۔ اپنی عقل سے وہ بلند و بالا عمارتیں بنائے گا۔ نت نئی چیزیں ایجاد کرے گا۔ کائنات کو تسخیر کرنے کے منصوبے بنائے گا۔ ایسی ایسی چیزیں بنائے گا کہ خود بھی حیران رہ جائے گا اور تم نہیں جانتے کہ عقل کی وجہ سے وہ کیا کیا کچھ کرے گا۔'' بڑی سرکار نے سنجیدگی سے کہا۔

''کیا کچھ کرے گا؟'' کسی نے حیرت سے پوچھا۔

''وہ زمین پر فساد بھی پھیلائے گا......اپنی عقل سے سازشیں سوچے گا اور دوسروں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا کہ اکثر اس کے ہم جنسوں کے لئے زندگی عذاب ہو جائے گی۔ وہ زمین پر اپنی حکومت اور سلطنت کو پھیلانے کے لئے لوگوں کا بے دریغ قتل کرے گا۔ ہر طرف شر پھیلائے گا۔ اپنے مفادات اور ہوس کو پورا کرنے کے لئے وہ سب کچھ کرے گا۔ دولت اکٹھی کرنے کے لئے نت نئے منصوبے سوچے گا۔'' جواب دیا گیا۔

''کیا عقل سے وہ اتنے برے کام کرے گا؟'' کسی نے سوال کیا۔

''نہیں......اپنی عقل اور سوچ سے دنیا کو نئی اور اچھی باتیں بھی بتائے گا۔ اپنی عقل مندانہ سوچ سے دوسرے لوگوں کو نئی راہیں دکھائے گا۔ اپنی خوبصورت گفتگو سے لوگوں کے دلوں کو ایسا قائل کرے گا کہ وہ کچھ بھی کرنے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ یعنی ان میں انقلابی روح بیدار کرے گا اور جب بہت سے لوگ اس کی پیروی کریں گے تو ان کی مدد سے دنیا میں اپنی کامیابیوں کے جھنڈے گاڑے گا اور وہ چاند، ستاروں تک پہنچنے کی کوشش کرے گا۔'' بڑی سرکار نے بتایا۔

''کیا واقعی؟'' انہوں نے چونک کر پوچھا۔

''ہاں......'' جواب دیا گیا۔

''تو......کیا......وہ؟ وہ کچھ کہنا چاہتے تھے مگر بڑی سرکار کے رعب اور دبدبے کی وجہ سے کچھ کہنے کی جرات نہ کر سکے۔

سفید روشنی ایک دم تیزی سے چمکی اور وہ بوکھلا گئے۔

''تم......جو کچھ سوچ رہے ہو۔ ایسا کچھ نہیں ہوگا......'' بڑی سرکار نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔

''کیا......؟ وہ ایک دم چونک کر بولے۔

''انسان...... چاہے زمین میں کتنی کامیابیاں کیوں نہ حاصل کرلے......اور......چاند ستاروں تک بھی کیوں نہ پہنچ جائے، مگر وہ میری سلطنت تک ہرگز نہیں پہنچ پائے گا......'' انتہائی مطمئن لہجے میں جواب دیا گیا۔ بڑی سرکار کے اس جواب سے گویا وہ سب مطمئن ہو گئے۔

''انسان اپنی عقل سے انتشار اور فساد کیسے پھیلائے گا؟'' کسی نے سوال کیا۔

''جس طرح انسان کے دل میں محبت پر نفرت غالب آئے گی اور وہ شر کی طرف مائل ہو کر اس کو پھیلانے کی کوشش کرے گا۔ اس طرح انسان کے دماغ میں موجود عقل پر برائی غالب آئے گی تو وہ دنیا کو تباہ و برباد کرنے کی کوشش کرے گا اور وہ برائی، غرور و تکبر اور اس کی خود پسندی ہو گی۔ انسان میں جب تکبر پیدا ہوگا تو وہ اپنے آپ کو دنیا کا سب سے اعلیٰ اور بہترین انسان سمجھے گا، اپنی ذات، اپنی سوچ اور باتوں کو سب سے زیادہ سراہے گا۔ اسے کوئی بھی اپنے جیسا نظر نہیں آئے گا، اپنے آپ کو منوانے کے لئے دوسروں کو نقصان پہنچائے گا۔'' جواب دیا گیا۔

''اس کے اندر تکبر کیسے پیدا ہوگا......اور یہ کیا ہوگا؟''

''کچھ سمجھ میں نہیں آرہا؟'' انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

''انسان کو اس کی کامیابیاں اور ان کامیابیوں کے بل بوتے پر حاصل ہونے والی دولت اور شہرت اسے متکبر بنا دیں گی۔ اسے اپنی ذات کے علاوہ کوئی اور اہم نہ لگے گا۔ یہ خود پسندی، ہی تکبر کا باعث بنے گی اور جانتے ہو تکبر کیا ہوگا......؟''

''نہیں......'' انہوں نے جواب دیا۔

''قدم زمین پر ہو اور نظر آسمانوں پر...... وہ اپنے ہم جنسوں کو زمین پر رینگنے والے معمولی اور بے وقعت کیڑے مکوڑے سمجھے گا اور اپنے آپ کو ہر ایک سے افضل اور بہترین۔ اپنے علاوہ نہ تو کسی کو اہمیت دے دگا اور نہ ہی ان کی عزت کرے گا۔ اپنے فائدے حاصل کرنے کے لئے ان کے حقوق غصب کرے گا۔ ان کی زندگیاں اس کے نزدیک جانوروں سے زیادہ اہم نہ ہوں گی اور یہ تکبر اس میں اس حد تک جنون اور دیوانگی پیدا کرے گا کہ وہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے دنگا فساد پھیلانے سے بھی گریز نہیں کرے گا۔ دنیا کو تباہ و برباد کرنے کے منصوبے بنائے گا۔'' انتہائی سنجیدگی سے بتایا گیا۔

''کیا آپ اسے اتنے لوگوں کے حقوق غصب کرنے اور پھر ظلم و زیادتی، تباہی و بربادی کرنے دیں گے...... کیا آپ چاہیں گے کہ آپ کے بنائے ہوئے دوسرے انسان اس متکبر و باغی انسان کے ظلم کا نشانہ بنیں؟'' انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں...... میں اسے عقل اور طاقت دے کر دیکھوں گا کہ وہ کس طرح اسے استعمال کرتا ہے...... وہ دیوانگی اور جنون کی کس حد تک جاتا ہے......اس کے اندر چھپا حیوان کیسی وحشت و بربریت پھیلاتا ہے؟

''کیا اس کے اندر حیوان بھی ہوگا؟'' حیرت سے پوچھا گیا۔

''ہاں......اس کے اندر حیوان ہی نہیں کائنات کی ہر شے چرند، پرند، جانوروں، درندوں کی ساری صفات بھی جمع ہوں گی، یہاں تک کہ زمین پر رینگنے والے زہریلے سانپ جیسا زہر بھی اس کے اندر ہوگا...... مگر......اس کے اندر رحم جیسی صفات بھی ہوں گی۔'' خوش کن لہجے میں بتایا گیا۔

''ہم جیسی......؟''

''ہاں...... جب وہ اپنی عقل، اور محبت کو مثبت انداز میں استعمال کرے گا۔ فرمانبرداری کرے گا۔''

''انسان کی عقل کیسے مثبت اور منفی باتوں کو جانچ پائے گی؟'' حیرت سے پوچھا گیا۔

''جس طرح دل کے اندر ایک باطنی دل 'قلب سلیم' ہوگا۔ اسی طرح دماغ کے اندر ایک باطنی دماغ یعنی انسان کا 'ضمیر' ہوگا۔ ضمیر سچ کا ایسا پیمانہ ہوگا، جس میں انسان اپنے اچھے اور برے اعمال کو جانچ سکے گا۔ انسان جو اچھے کام کرے گا اس پر ضمیر خوش اور مطمئن ہوگا اور بُرے اعمال پر ضمیر ناخوش ہو کر انسان کو ملامت کرے گا، وہ ملامت انسان کو اندر ہی اندر بہت بے چین اور مضطرب رکھے گی۔ اس ملامت سے انسان میں ندامت، شرمندگی اور پچھتاوے پیدا ہوں گے۔ ضمیر کی اس سرزنش پر انسان کی روح بھی بہت مضطرب اور بے چین ہوگی اور انسان اندر ہی اندر بہت دکھی اور پریشان بھی رہے گا۔'' بڑی سرکار نے بتایا۔

''کیا آپ ضمیر کو اس لئے تخلیق کریں گے کہ اس سے انسان کو دکھی اور پریشان رکھیں؟'' کسی نے پوچھا۔

''نہیں...... انسان کے لئے ضمیر ایک بہت بڑی نعمت ہوگی۔ یہ اس کے لئے ایسی خاموش عدالت ہوگی جو ایک منصف کی حیثیت سے اس کے اعمال پر اپنا فیصلہ سنائے گی۔ اگر میں انسان کو ضمیر عطا نہ کروں تو انسان اپنی سرکشی اور ظلم میں بہت آگے تک چلا جائے گا اور اسے روکنے والا کوئی نہ ہوگا۔ انسان کا ضمیر اسے بار بار روکے گا۔ اسے برے کام کرنے سے منع کرے گا۔ اس کے اندر ملامت کا احساس پیدا کر کے اسے پچھتاوے پر آمادہ کرے گا اور وہ ندامت کے آنسو بہا کر اپنی غلطیوں کی مجھ سے معافی طلب کرے گا اور آئندہ گناہ نہ کرنے کا وعدہ کرے گا۔ اگر میں انسان کو ضمیر عطا نہ کروں تو دنیا کا کوئی انسان بھی اپنے آپ کو گنہگار نہ سمجھے، کوئی گناہ پر نہ پچھتائے، کوئی توبہ طلب نہیں کرے گا، کوئی مجھ سے معافی نہ مانگے گا، سب اپنے آپ کو بے گناہ سمجھیں گے، بڑے بڑے غاصب اور ظالم بھی اپنے آپ کو معصوم اور گناہوں سے پاک سمجھیں گے۔ اس لئے میں نے ضمیر کو انسان کے اندر رکھوں گا کہ کوئی انسان دوسرے انسان کو اس کا گناہ یاد دلا کر شرمندہ نہ کرے، بلکہ انسان کا ضمیر اسے خود احساس دلا کر اسے شرمندہ کرے۔ میں جانتا ہوں کہ انسان کے لئے ندامت اور شرمندگی کا احساس بہت تکلیف دہ ہوگا اور خاص طور پر تب، جب اس کے ہم جنس اس کو اس بات کا احساس دلائیں گے، اس احساس سے بچانے کے لئے اس کے اندر ضمیر رکھ دیا کہ وہ انسان کو دوسروں کے سامنے شرمندہ ہونے سے بچائے ورنہ دوسروں کے احساس دلانے سے انسان کی فطرت میں موجود باغی عناصر اسے سرکشی پر مجبور کر دیں گے۔ انسان کو ان تمام منفی احساسات سے بچانا بہت ضروری تھا۔ اگر میں ایسا نہ کروں تو انسان بہت منتشر اور مضطرب ہو جائے۔ میں کائنات میں کسی اور مخلوق کو ضمیر عطا نہیں کروں گا، سوائے انسان کے۔ کیونکہ انسان سے بار بار غلطیاں اور گناہ سرزد ہوں گی اور انسان کو ان سے بچانا بہت ضروری ہے۔'' بڑی سرکار نے بتایا۔

''کیا قلب سلیم کی طرح ضمیر بھی چند خاص لوگوں کو عطا کیا جائے گا؟'' سوال پوچھا گیا۔

نہیں...... ضمیر ہر انسان کو عطا کیا جائے گا، مگر جن کے اندر خیر اور سچ غالب ہوگا ان کا ضمیر ان کے اندر ندامت کا احساس پیدا کر کے ان کو نیک کاموں کی ترغیب دے گا، وہ دوسروں کے ساتھ ظلم و زیادتی کر کے پچھتائیں گے۔ تاسف کا اظہار کریں گے اور اپنے آپ کو سیدھے راستے پر چلانے کی کوشش کریں گے، مگر جن کے اندر شر غالب ہوگا ان کا ضمیر آہستہ آہستہ مردہ ہو کر ختم ہو جائے گا۔ انسان کے اندر نہ ندامت باقی رہے گی اور

نہ پچھتاوے۔ ایسے انسان غاصب، ظالم اور جابر ہوں گے۔ وہ لوگوں کے حقوق غصب کر کے کبھی افسوس کا اظہار نہیں کریں گے۔ بڑے سے بڑا گناہ کر کے بھی وہ مطمئن رہیں گے۔ ایسے لوگ درندگی پر اتر آئیں گے اور وہ سرکشی و ظلم میں بہت دور نکل جائیں گے۔'' بڑی سرکار نے جواب دیا۔

'' کیا وہ محبت بھی عقل کی وجہ سے کرے گا؟'' پوچھا گیا۔

'' انسان کا دل تو دماغ کے تابع ہوگا۔ دماغ جسم کے سارے نظام کو چلائے گا، مگر 'محبت'...... عقل کے تابع نہیں ہوگی...... عقل اسے منطق دلیلیں دے کر روکنے کی کوشش کرے گی۔ اسے جنونی اور دیوانہ بننے سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرے گی، مگر محبت، عقل کی کوئی دلیل نہیں سنے گی اور اپنی من مانی کرے گی۔ جب انسان محبت کے نشے میں سرشار ہوگا تو وہ عقل کی کسی بھی بات کو اہمیت نہیں دے گا۔ عقل اس کی جنونی محبت سے ہار جائے گی اور جب اس کا دل ٹوٹے گا تب وہ عقل کی طرف توجہ دے گا، مگر تب سب کچھ بے معنی ہوگی۔'' انہیں بتایا گیا۔

'' یہ کیسی عجیب بات ہے کہ انسان کو چلانے والا...... اس کو حرکت دینے والا...... اس کی زندگی کا ضامن دماغ...... دل کے سامنے بے بس ہو جائے گا......؟'' حیرت سے پوچھا گیا۔

'' ہاں...... ایسا ہی ہوگا۔'' جواب دیا گیا۔

'' کیا محبت کی دیوانگی اور ہے؟ اور عقل کی دیوانگی کچھ اور......؟ کہ محبت میں دیوانہ انسان 'عقل' کی کوئی دلیل نہیں مانے گا اور اس کی کوئی بات نہیں سنے گا۔'' انہوں نے حیرت سے سوال کیا۔

'' محبت میں دیوانگی انسان کو عشق کی جانب لے جائے گی اور...... عقل میں دیوانگی انسان کو 'جنونی' بنا دے گی۔ وہ وہم، خدشات، وسوسوں کا شکار ہو کر اپنی ذہانت اور سمجھ بوجھ کھو بیٹھے گا، جبکہ محبت سے عشق اور عشق میں جنون انسان پر ایسے اسرار اور راز و نیاز واضح کرے گا کہ عقل بہت پیچھے رہ جائے گی...... عقل...... عشق کے سامنے ہار جائے گی۔ عقل اسے کھڑی دیکھتی رہے گی اور عشق محوِ پرواز ہوگا۔ عقل دلیل کو مانتے ہوئے چلے گی اور عشق دلیل کو ہی نہیں مانے گا۔ عقل کا حاصل سب کو نظر آئے گا اور عشق کا حاصل کسی کو بھی دکھائی نہیں دے گا۔ عقل کی منزل مکاں تک ہوگی اور عشق کی انتہا لامکاں تک...... عقل کی منطق کو سب مانیں گے اور عشق کے جنون پر سب حیران ہوں گے۔ عقل دیکھے گی اور عشق دکھائے گا۔ عقل سوال کرے گی، اور عشق خاموش رہ کر جواب دے گا۔ عقل انسان کو مطمئن کرے گی مگر عشق اسے ہمیشہ مضطرب رکھے گا۔'' پرسکون منطقی لہجے میں جواب دیا گیا۔

'' انسان کا دماغ بہت ہی حیران کن چیز ہے اور اس کی عقل اس سے بھی زیادہ حیران کن۔'' انہوں نے حیرت سے کہا۔

'' کیا تم اب بھی اسے میرا 'شاہکار' ماننے سے انکار کرتے ہو؟ بڑی سرکار نے پوچھا۔

'' وہ سب خاموش رہے اور سب نے سر جھکا لئے، جیسے وہ اس بات کو ماننے پر تیار ہوں بھی اور نہیں بھی...... مگر بڑی سرکار کی پرجلال اور پُر ہیبت ہستی کے سامنے کوئی بھی بولنے کی جرات نہ کر سکے۔ سب مؤدبانہ انداز میں کھڑے رہے۔ مگر خاموش...... سر جھکائے ہوئے۔

محفل پھر برخاست کردی گئی اور وہ پتلے کے بارے میں پہلے سے بھی زیادہ مضطرب اور پریشان ہو کر سوچنے لگے۔

(۳)

''خواہش''

بڑی سرکار کی نورانی محفل میں حاضرین کا ہجوم تھا۔ سب پہلے سے بھی زیادہ پُر اشتیاق تھے۔ سوالات، وسوسے اور خدشات ان کے اندر تھے۔ وہ بڑی سرکار کی اپنے عجیب وغریب شاہکار سے محبت اور لگاؤ دیکھ کر حیران بھی ہو رہے تھے اور مشکوک بھی۔ کم خوبیوں اور زیادہ خامیوں والے انسان کے ساتھ بڑی سرکار کی محبت ان کو حیران کر رہی تھی۔ خیر وشر کا مجموعہ، خوبیوں اور خامیوں والا انسان...... شاہکار کیسے ہوسکتا ہے؟ بڑی سرکار نے انہیں بھی بہت کچھ عطا کیا تھا...... مگر...... گارے سے بنا ہوا، کمزور وناتواں کس طرح شاہکار ہوسکتا ہے، مگر بڑی سرکار کا کہنا اور ان کا چونکنا، مخمصے میں پڑنا، الجھنوں کا شکار ہونا، اندر ہی اندر مضطرب ہونا، انہیں خود مشکوک و پریشان کر رہا تھا۔

''اب میں تمہیں اس شاہکار کی ایک اور اہم بات بتانے جارہا ہوں'' بارعب آواز بلند ہوئی۔

''سب محتاط ہوگئے اور دم سادھ کر کھڑے ہوگئے یہ جاننے کے لئے...... کہ...... کیا نیا انکشاف ہونے والا ہے۔

''سفید اور چمکدار روشنی پتلے کے درمیانی حصے کو چکانے لگی۔ سب نے چونک کر اسے دیکھا۔

''یہ...... پتلے کا پیٹ ہے۔ اس میں سب سے اہم حصہ معدہ ہے۔ انسانی دل اور دماغ کو کام کرنے کے لئے طاقت کی ضرورت ہوگی اور اس کی طاقت غذا مہیا کرے گی۔ میں اس کی غذا کا بندوبست زمین، اس کے پانی اور مختلف اشیاء سے کروں گا وہ منہ سے کھائے گا اور اس کی خوراک پیٹ میں یعنی معدے میں جا کر مختلف مراحل سے گزر کر اس کو طاقت، توانائی اور حرارت مہیا کرے گی، جس سے وہ حرکت کر سکے گا، کام کر سکے گا، زندگی میں محنت، مشقت کر سکے گا اور بھاگ دوڑ کر سارے کام سرانجام دے سکے گا۔ خوراک کے بغیر اس کا وجود ناممکن ہوگا، کیونکہ پیٹ کے اندر میں نے بھوک رکھی ہے۔ جو مرتے دم تک ختم نہیں ہوگی۔'' تفصیلاً بتایا گیا۔

''بھوک......؟'' انہوں نے چونک کر پوچھا۔

''بھوک یہ ہوس، حرص، لالچ کی ایسی طلب اور خواہش ہوگی جو کبھی ختم نہیں ہوگی۔ اس پتلے کی ساری زندگی اس بھوک کو مٹانے میں گزرے گی۔ صبح کھائے گا تو اسے دوپہر کے کھانے کی فکر ہوگی۔ دوپہر کو کھائے گا تو رات کے کھانے کی تیاری کرے گا۔ دن کا آغاز اور اختتام کھانے سے ہوگا، یوں محسوس ہوگا جیسے اس کی زندگی کا مقصد صرف کھانا پینا ہے مگر اس کی بھوک ختم نہیں ہوگی۔ انواع واقسام کے لذیز کھانے، مزیدار، خوش ذائقہ، رنگ برنگے پھل، ٹھنڈے میٹھے مشروبات، دنیا کی کوئی کھانے والی شے ان کی بھوک کو ہمیشہ کے لئے ختم نہیں کر سکے گی۔ انسان کی ساری زندگی اور زندگی میں ساری جدوجہد پیٹ کی بھوک مٹانے میں گزرے گی۔ وہ زندگی کے گورکھ دھندوں میں پھنستا چلا جائے گا۔ یہاں تک

کہ حلال وحرام کی تمیز بھی کھو بیٹھے گا۔'' انتہائی سنجیدگی سے بتایا گیا۔

''حلال وحرام کی تمیز کیا ہوتی ہے؟'' انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

''اپنی جدوجہد اور محنت سے کما کر کھانا حلال اور کسی دوسرے سے چھین کر کھانا حرام ہوگا...... حلال کھانے سے اس میں نیکی پیدا ہوگی اور حرام کھانے سے بدی۔'' جواب دیا گیا۔

''یہ کیسے ممکن ہے...... کہ...... کوئی کسی سے چھین کر کھائے اور اپنی طلب پوری کرے۔ اپنی بھوک مٹائے۔'' انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

''سب ممکن ہوگا۔ جب انسان اپنی سوچ کو بدلے گا۔''

''وہ اپنی سوچ، کو کیسے بدلے گا؟'' حیرت سے پوچھا گیا۔

''میں انسان کو ایسے تخلیق کروں گا کہ انسان کا جسم، اس کی گفتگو۔ اس کا رہن سہن۔ اس کی سوچ کے تابع ہوگا اور اس کی سوچ۔ اس کے ماحول اور اس کی فطرت میں گندھی، سچائی، شرافت اور دیانت میں پہنے گی۔ کبھی اندر کی سچائی اور دیانت پر اس کے ماحول کی آلودگی غالب آجائے گی اور کبھی برے ماحول سے جنم لینے والی عادات اور اطوار پر اندر کی سچائی اور دیانتداری غالب آجائے گی، جو انسان برائی سے جلد متاثر ہوگا وہ اپنی سوچ کو اسی برائی کے مطابق ڈھال لے گا، اس کے نزدیک اچھائی و برائی کا فرق مٹ جائے گا۔ حلال وحرام کی تمیز ختم ہو جائے گی۔ جائز و ناجائز طریقے سے وہ اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کی فکر کرے گا۔ مگر اس کے پیٹ کی بھوک اور طلب بڑھتی جائے گی۔ کسی طرح کم نہیں ہوگی اور جن کی سرشت میں اچھائی، دیانتداری اور شرافت کے عناصر غالب ہوں گے۔ ان پر برے ماحول کی برائی اثر نہیں کرے گی۔ وہ انتہائی مشکل حالات میں بھی جائز اور حلال کے کھانے کو ترجیح دیں گے۔ وہ پیاس مٹائیں گے تو پاک صاف پانی سے۔ کھائیں گے تو اپنے ہاتھ کی کمائی......'' انہیں تفصیلاً بتایا گیا۔

''اور انسان کی سرشت میں اچھائی کا عنصر کس طرح غالب رہے گا؟'' انہوں نے پوچھا۔

''انسان کے اندر اچھائی کا پیمانہ اور معیار میرے فیصلے اور حکمت پر مبنی ہوگا۔'' جواب دیا گیا۔

''کیا انسان دنیا میں سارے کام اور ساری جدوجہد صرف پیٹ کی بھوک کو مٹانے کے لئے کرے گا؟'' سوال کیا گیا۔

''نہیں...... مگر سب سے اہم پیٹ کی بھوک ہوگی۔ اس کے بعد جنسی بھوک...... پھر ذہنی و علمی و بھوک، روحانی بھوک ہوگی۔ جسمانی بھوک یعنی پیٹ کی بھوک تو وہ کھانے پینے سے مٹائے گا۔ حلال وحرام کھا کر، جائز و ناجائز طریقے سے رزق کما کر، مگر جنسی بھوک مٹانے کے لئے وہ 'شہوت زنی' اور بدکاری کرے گا...... میں انسان کی نسل کو پھیلانے کے لئے مرد و زن کے جنسی تعلقات کا مناسب اور خاطر خواہ انتظام کروں گا، مگر جس طرح جسمانی بھوک کو مٹانے کے لئے کچھ لوگ حرام طریقے اپنائیں گے پھر بھی ان کے اندر کی حرص اور طمع ختم نہیں ہوگی، اسی طرح بہت سے لوگ جنسی بھوک مٹانے کے لئے بدکاری پر اتر آئیں گے اور بعض اپنے اس عمل اور جذبے میں اتنے شدید ہوں گے کہ وہ درندوں اور چوپایوں سے بھی زیادہ رذیل ہوں گے...... پھر...... گمراہیاں ان کا مقدر ہوں گی اور شہوت زنی کا تعلق بھی پیٹ سے ہوگا۔ پیٹ تخلیق کا منبع اور مرکز ہوگا اور شہوت سے تخلیق جنم لے گی۔'' انتہائی سنجیدگی سے بتایا گیا۔

''کیا شہوت اور بدکاری میں کوئی فرق ہے؟'' سوال کیا گیا۔

''ہاں...... بدکاری، ناجائز اور حرام شہوت زنی کا نام ہے۔ مگر افسوس...... انسان...... اپنے اس جذبے میں بہت بدتر ہو جائے گا، مگر چونکہ انسان میں سے انسان اسی عمل سے جنم لے گا۔ اس لئے یہ بہت ضروری ہے۔'' ہر طرف گہری خاموشی چھا گئی......

''اور...... ذہنی و علمی بھوک، کیا ہوگی؟'' قدرے توقف کے بعد پوچھا گیا۔

''میں انسان کی ذات کے اندر جستجو اور تجسس کا ایسا عنصر رکھوں گا کہ وہ زندگی بھر اس کی تلاش میں سرگرداں رہے گا۔ وہ ہر وقت کسی نہ کسی چیز کا متلاشی رہے گا اور اسے پانے کے لئے جدوجہد کرے گا۔ جس انسان کو اپنا ہم خیال اور اپنے جیسی سوچ رکھنے والا کوئی دوسرا انسان نظر آئے گا تو وہ اس کی جانب لپکے گا۔ اس سے مل کر...... اس سے باتیں کر کے وہ اپنی ذہنی اور علمی بھوک مٹانے کی کوشش کرے گا...... اس کے دماغ میں خیالات او رسوچوں کا ذخیرہ ہوگا۔ لیکن وہ ہر گزرتے دن کے ساتھ اپنے اس ذخیرے میں اضافہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ اپنی علمی و ذہنی بھوک مٹانے کے لئے وہ دور دراز کے سفر کرے گا۔ علمی و سائنسی درس گاہوں اور تجربہ گاہوں کا رخ کرے گا اور ہر کسی کا علمی ذوق و شوق دوسرے سے مختلف ہوگا۔ کسی کو جسمانی بیماریوں میں دلچسپی ہوگی اور وہ اس کی تعلیم حاصل کرے گا۔ کسی کو ستاروں کی گردش، کسی کو زمین اور اس کے اندر چھپے خزانوں کی تلاش ہوگی اور کسی کو بلند و بالا عمارتیں بنانے کا شوق ہوگا۔ ہر ایک اپنے ذہن میں موجود اس شوق کی تسکین کے لئے اپنی اس بھوک کو مٹانے کی جدوجہد کرے گا اور جسمانی و جنسی بھوک کی طرح یہ بھوک کبھی ختم نہیں ہوگی۔'' پُر اعتماد لہجے میں بتایا گیا۔

''کیا روحانی بھوک بھی انسان کو بے قرار رکھے گی اور کبھی ختم نہیں ہوگی؟'' انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

''روح ہر انسان میں موجود ہوگی۔ روح کا جسم کے ساتھ وہی تعلق ہوگا، جو میرا، انسانوں کے ساتھ ہوگا جسم کا دل کے ساتھ، دل کا دماغ کے ساتھ اور معدے کے ساتھ اور مٹی کا پانی کے ساتھ۔ یعنی کہ بہت قریبی تعلق ہوگا۔ انسان کا جسم میری روح کے بغیر ادھورا ہوگا۔ مگر روحانی بھوک ہر ایک کو نصیب نہیں ہوگی؟

''کیا مطلب......؟ انہوں نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

''دنیا میں بہت سے انسان کیڑے مکوڑوں اور جانوروں کی طرح زندگی بسر کریں گے۔ کھائیں گے، پئیں گے، سوئیں گے، مختلف کام کریں گے اور موت آنے پر مر جائیں گے۔ ان کے ہونے اور نہ ہونے سے دنیا اور دوسرے انسانوں کو کوئی فرق نہیں پڑے گا، نہ وہ دوسروں کو کوئی فائدہ پہنچائیں گے اور نہ ہی کوئی خاص نقصان۔ ان کے اندر روحانی طلب بہت کم ہوگی۔'' سنجیدگی سے بتایا گیا۔

''روحانی طلب کیا ہوتی ہے......؟'' پوچھا گیا۔

''کچھ انسانوں کے اندر اپنی حقیقت کو پانے کی بہت طلب ہوگی...... اپنی حقیقت انہیں اپنے اندر روح کی سچائی سے آشنا کرے گی اور روح سے آشنائی انہیں مجھ تک لے آئے گی۔ وہ میری جستجو اور تلاش کے لئے عبادت و ریاضت کریں گے اور میرے لئے بہت مشقت اٹھائیں گے۔ وہ اپنے وجود کو فنا کر کے مجھے طلب کریں گے اور مجھے پانے کے لئے وہ کیا کچھ کریں گے۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔'' مثبت انداز میں بتایا گیا۔

"کیا واقعی......؟" انہوں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں......روحانی بھوک مٹانے کے لئے انسان اپنی ذات فنا کر دے گا......اپنے آپ کو مٹا کر مجھے پائے گا۔" قدرے خوش کن لہجے میں بتایا گیا۔

"کیا روحانی بھوک کا تعلق بھی پیٹ سے ہے؟" سوال کیا گیا۔

"نہیں......اس کا تعلق روح سے ہوگا......اور روح کے لئے میں نے کوئی مخصوص مقام انسان کو نہیں بتایا۔ روح میرا راز ہے، اسرار ہے اور انسان اس اسرار کو پانے کے لئے ہمیشہ سرگرداں رہے گا۔" جواب دیا گیا۔

"کیا انسان کا پیٹ صرف خرابیوں اور برائیوں کی آماجگاہ ہوگا، جس میں بھوک، لالچ، حرص، شہوت اور بدکاری پیدا ہوگی؟" انہوں نے پوچھا۔

"نہیں......اس میں نفس کشی، بھی ہوگی" پر مطمئن لہجے میں جواب دیا گیا۔

"نفس کشی......وہ کیا ہے؟" انتہائی حیرت سے پوچھا گیا۔

"بھوک لگی ہو......انواع واقسام کے کھانے سامنے ہوں۔ مگر انہیں کھایا نہ جائے......کسی شے کی بہت ضرورت اور حاجت ہو......مگر اسے طلب نہ کیا جائے......کسی شے کے بغیر زندگی ناممکن دکھائی دے اور اس کی اشد ضرورت بھی ہو۔ مگر اس کی طرف ہاتھ نہ بڑھایا جائے......" قطعیت سے بتایا گیا۔

"یہ......یہ......کیسے ممکن ہے؟ ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی اور انہوں نے انتہائی بے صبری سے پوچھا۔

"یہ ممکن ہوگا......جب انسان کے اندر روحانی بھوک بہت بڑھ جائے گی......تو......اسے دنیا کی کسی شے سے کوئی رغبت نہیں رہے گی...... نہ بھوک اسے مضطرب کرے گی نہ شہوت بے قرار۔ اس کا پیٹ بھرا ہوا اور جسم نفسانی خواہشات سے بیزار ہوگا۔ جب دنیا کے اندر رہ کر اس کے اندر دنیا کی طلب نہیں رہے گی۔ تو اسے کھانے پینے اور دوسری چیزوں سے کیا کام، مگر ایسے لوگ بہت کم ہوں گے، جو اپنے آپ کو نفس کشی پر آمادہ کریں گے۔ کیونکہ انسان کا نفس یعنی انسان کا اندر جو نظر نہیں آئے گا۔ وہ اسے کسی بھی لمحہ پُرسکون نہیں ہونے دے گا۔ انسان کسی شے یا کام سے باز رہنے کی کوشش کرے گا، مگر انسان کا نفس اس کے ارادے میں خلل ڈالے گا۔ اسے وہی بات کرنے کو کہے گا، جس کو نہ کرنے کا وہ سوچے گا۔ انسان کے نفس میں خواہشات کے انبار ہوں گے۔ ایک خواہش پوری ہونے کے بعد وہ دوسری کی تمنا کرے گا ساری زندگی ان خواہشات کی تکمیل میں گزرے گی۔ ایک خواہش پوری ہونے کے بعد وہ مطمئن نہیں، بلکہ اور مضطرب ہو جائے گا۔ پھر دوسری چیزوں کی طلب اور ہوس اس میں بڑھتی جائے گی۔ ساری زندگی خواہشات کا لامحدود سلسلہ جاری رہے گا اور یہ سلسلہ مرتے دم تک ختم نہیں ہوگا اور یہی خواہشات انسان کو مرتے دم تک زندہ رکھیں گی۔

بچپن سے لے کر جوانی، بڑھاپے اور موت تک انسان کے اندر ایک درخت کے لاتعداد پتوں کی طرح خواہشات پیدا ہوں گی، وہ ہر خوبصورت شے کو دیکھ کر اسے حاصل کرنے کی خواہش کرے گا، ہر اچھے اور خوبصورت انسان کو دیکھ کر اس جیسا بننے کی تمنا کرے گا، اس کی زندگی کی ساری تگ ودو کا مقصد اپنے اندر کی خواہشات کی تکمیل ہوگا۔ وہ انہیں جائز وناجائز طور پر پورا کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس کی خوشی کا زیادہ تر تعلق

ان خواہشات کے پورا ہونے سے ہوگا اور جب اس کی خواہشات پوری نہیں ہوں گی تو وہ بہت مایوس اور بددل ہو جائے گا۔" جواب دیا گیا۔

"انسان اپنی خواہشات کیسے پورا کرے گا؟" حیرت سے پوچھا گیا۔

"انسان اپنی خواہشات کو پورا کرنے کی جدوجہد ضرور کرے گا، مگران کی خواہشات پوری کرنا میرے اختیار میں ہوگا۔" بڑی سرکار نے کہا۔

"کیا آپ سب کی ساری خواہشات پوری کریں گے؟" کسی نے پوچھا۔

"نہیں...... بہت کم......" جواب دیا گیا۔

"کیوں......؟" حیرت سے پوچھا گیا۔

"انسان کی فطرت میں ناشکرا پن بہت ہوگا۔ اگر میں اس کی ساری خواہشات کو بھی پورا کردوں تو وہ ان خواہشات کے لئے مضطرب رہے گا جو پوری نہیں ہوں گی۔ اس لئے میں جو ضروری سمجھوں گا...... وہی خواہشات پوری کروں گا۔" جواب دیا گیا۔

"انسان جس وقت جو خواہش بھی کرے گا، کیا آپ اسی وقت اسے پورا کردیں گے؟ حیرت سے سوال کیا گیا۔

"نہیں...... اسے اپنی خواہش کو پورا کرنے کے لئے بہت کوشش، محنت، جدوجہد اور طویل انتظار کرنا پڑے گا۔" جواب دیا گیا۔

"انتظار...... کیوں؟" کسی نے چونک کر پوچھا۔

"انسان کی زندگی میں وقت کو بہت اہمیت حاصل ہوگی۔ اسے وقت کا احساس دلانے کے لئے انتظار کی کیفیت سے دوچار کروں گا۔ چونکہ انسان بہت بے صبرا اور جلد باز فطرت کا ہوگا، انتظار اس کے لئے کسی اذیت سے کم نہیں ہوگا، مگر وہ اس کیفیت سے بہت کوشش کے باوجود بھی نکل نہیں پائے گا۔ انتظار کا مقصد اس کے اندر صبر کے جذبات کو پروان چڑھانا ہوگا، مگر انسان انتظار کو اپنے لئے اذیت سمجھتے ہوئے جلد بازی میں انتہائی اقدام اٹھالے گا اور اپنے بہت سے کام خود خراب کرلے گا۔ جن کا الزام وہ مجھے دے گا۔" سفید روشنی یوں چمکی جیسے مسکرا رہی ہو۔

"خواہش اور انتظار کا مقصد کیا ہوگا؟" پوچھا گیا۔

"انسان کے اندر کو مضطرب رکھنا۔" جواب دیا گیا۔

"کیوں؟" انتہائی حیرت سے پوچھا گیا۔

"جب تک انسان کا اندر مضطرب نہیں ہوگا۔ وہ متحرک زندگی نہیں گزارے گا۔ وہ کسی بھی شے کی جستجو نہیں کرے گا، اس لئے میں نے ہر جذبے کے اندر اضطراب رکھا ہے، تاکہ انسان متحرک رہے۔" جواب دیا گیا۔

اور جانتے ہو جب انسان کی خواہشات پوری نہیں ہوں گی تو کیا ہوگا؟ معنی خیز انداز میں سوال کیا گیا۔

"کیا ہوگا......؟" حیرت سے پوچھا گیا۔

"انسان انتہائی، مایوس، بددل اور قنوطی ہو جائے گا۔ وہ اتنا بے زار، پریشان اور متنفر ہو جائے گا کہ مجھ پر بھی اسکو یقین نہیں رہے گا۔" بتایا گیا۔

"آپ پر یقین۔ نہیں رہے گا...... یہ...... یہ ناممکن ہے۔" "آپ کا شاہکار...... جسے آپ محبت سے تخلیق کررہے ہیں۔ کیا وہی آپ پر یقین نہیں کرے گا۔" حیرت سے پوچھا گیا۔

''ہاں...... مجھ سے لڑے گا، جھگڑے گا، شکوے کرے گا، سرکشی کرے گا اور بے ایمانی کرے گا'' بتایا گیا۔

''کیسی بے ایمانی......؟'' انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

''وہ محبت، یقین اور اعتماد جو اسے مجھ پر ہونا چاہئے اسے دوسروں پر ہوگا۔ انہیں مجھ جیسا سمجھے گا۔'' انتہائی سنجیدگی سے بتایا گیا۔

''کیا...... وہ اتنا سرکش اور ظالم بھی ہو جائے گا؟'' حیرت سے پوچھا گیا۔

''ہاں...... جب اس کے نفس میں میری جستجو اور میری طلب نہیں رہے گی۔ جب اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے حرص و ہوس اور لالچ سے بھر جائے گا تو جس شے کو اپنے لئے اہم سمجھے گا۔ اسے مجھ سے بڑھ کر چاہے گا۔ اس پر مجھ سے زیادہ یقین کرے گا۔ میری بجائے اس کی طلب زیادہ کرے گا۔'' بتایا گیا۔

''ہمیں...... آپ کے شاہکار پر حیرت ہو رہی ہے کہ وہ آپ سے بھی باغی ہو جائے گا۔'' حیرت سے پوچھا گیا۔

''مگر...... سب ایسے نہیں ہوں گے، جو نفس کشی کریں گے اور مجھے چاہیں گے میری تمنا کریں گے۔ انہیں میں اپنی محبت سے نوازوں گا۔'' مسکرا کر جواب دیا گیا۔

''انسان اپنے آپ کو نفس کشی پر کیسے آمادہ کرے گا؟'' سوال کیا گیا۔

''انسان کے وجود کے اندر تین اہم نفوس ہوں گے۔ پہلا نفس، یعنی نفس امارہ انسان کو برائیوں کی طرف مائل کرے گا۔ انسان کے اندر بے شمار خواہشات، آرزوئیں اور تمنائیں جنم لیں گی، وہ ان خواہشات کی تکمیل کے لئے جدوجہد کرے گا اور اس کا نفس ناجائز طریقوں سے بھی ان خواہشات کو پورا کرنے کے لئے اسے ترغیب دے گا۔ یہ بہت کمزور نفس ہوگا، یہ انسان کو برائی پر اکسائے گا اور جو انسان اس کے اسیر ہوں گے، خسارے ان کا مقدر ہوں گے۔

دوسرا نفس، نفسِ لوّامہ ہے، جو انسان کو برا کام کرنے پر ملامت کرے گا۔ اندر ہی اندر اس پر تنقید کرے گا۔ اچھے کام پر خوش اور برے کام پر انسان کو مضطرب رکھے گا۔ اس نفس میں انسان کا ضمیر اہم کردار ادا کرے گا، جو نفس لوامہ کا ہی دوسرا نام ہے، جو انسان نفس لوامہ کی آواز کو سنے گا۔ بہت حد تک برائیوں سے بچا رہے گا۔

نفس مطمئنہ...... تیسرا نفس، جو انسان اپنی ذات سے تمام برائیوں کو پاک رکھے گا، جو اپنی خواہشات کو میری رضا اور خوشی پر قربان کرے گا، میں جو کچھ اسے عطا کروں گا اس پر خوش ہوگا اور میرا شکر ادا کرے گا اور جو کچھ چھین لوں گا، اس پر صبر کرے گا۔ کوئی شکوہ نہیں کرے گا۔ ایسا نفس، حقیقت میں نفس کشی کرے گا، جو اپنی ذات اور اپنے نفس کو میرے حکم اور خواہش کے تابع کرے گا۔ میں ایسے نفس سے خوش ہوں گا اور ایسے انسانوں کو اپنے کرم سے نوازوں گا۔'' بڑی سرکار نے جواب دیا۔

سفید روشنی تیزی سے چمکی...... یوں جیسے پرامید انداز میں مسکرا رہی ہو۔

''کیا آپ اپنے اس شاہکار سے پرامید ہیں؟'' حیرت سے پوچھا گیا۔

''ہاں......'' مثبت انداز میں جواب دیا گیا۔

"اس کے ظلم...... سرکشی اور بے ایمانی کے باوجود بھی......؟"

"ہاں......"

"آپ سے متنفر ہونے کے باوجود بھی......؟"

"ہاں......"

"آپ سے مایوس اور ناامید ہونے کے باوجود بھی......؟"

"ہاں......"

"آپ کی باتیں اور حکم نہ ماننے کے باوجود بھی......؟"

"ہاں......"

"آپ سے لڑنے، جھگڑنے کے باوجود......؟"

"ہاں......"

"آپ سے محبت نہ کرنے کے باوجود بھی......"

"ہاں......"

"آپ کے بنائے ہوئے دوسرے انسانوں کو تباہ و برباد اور قتل کرنے کے باوجود بھی......؟"

"ہاں......"

"آپ کے بنائے ہوئے انسانوں پر ظلم اور ان کے حقوق چھیننے کے باوجود بھی......؟"

"ہاں......"

"کیوں......؟" انہوں نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

ہر طرف گہری خاموشی چھا گئی...... انہیں پختہ یقین ہونے لگا کہ بڑی سرکار انسان کی تخلیق کے راز میں ان کو شامل نہیں کرنا چاہتی...... اس لئے ان کو جواب دینا ضروری نہیں سمجھتی، وہ قدرے مایوس ہونے لگے...... بے چینی اور اضطراب ان کے اندر پیدا ہونے لگا۔ انہیں سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بڑی سرکار انسان کو اپنا شاہکار کیوں منوانا چاہتی ہے...... مگر اندر ہی اندر وہ اس پیچیدہ شاہکار کی خوبیوں اور خامیوں سے متاثر ہو رہے تھے۔ مگر کوئی ایسی بات اس میں نظر نہیں آرہی تھی کہ وہ فوراً اس کو شاہکار مان لیتے، اس کو شاہکار ماننے کے لئے انہیں اپنے اندر سے ایسی آواز کی ضرورت تھی جو فوراً ہی اس پر ایمان لے آتی۔ اس کو شاہکار سمجھ کر اس پر یقین کر لیتی، اس لئے وہ خاموش تھے۔ مگر اب کی بار ان کے پاس اور زیادہ سوالات تھے۔ وہ مزید الجھ گئے تھے...... محفل پھر برخاست کر دی گئی۔

(۴)

”عشق“

مجمع میں سراسیمگی کا عالم تھا۔حاضرین محفل میں اضطراب اور بے چینی تھی۔تجسس بھی تھا اور اشتیاق بھی۔حیرانگی بھی اور پریشانی بھی۔

نجانے اب کیا بتلایا اور کیا دکھایا جاتا تھا،مگر جو کچھ بھی بتلایا جا رہا تھا وہ ان کی توقعات اور سوچوں سے ماوریٰ تھا،مگر وہ اندر سے قدرے مطمئن تھے کہ مٹی کے اس انسان کو جو کچھ بھی عطا کیا جائے گا وہ مکمل خوبیوں سے پُر نہیں ہوگا۔یہ شاہکار،مکمل شاہکار نہیں ہوگا۔اس میں برائیاں زیادہ اور خوبیاں کم ہوں گی۔وہ انسان کو شاہکار ماننے پر متفق نہ تھے جبکہ بڑی سرکار کے نزدیک وہ ایک شاہکار تھا۔

ایک دم سفید روشنی تیزی سے چمکی۔سب اس کے جلال سے مرعوب ہونے لگے۔ہر طرف گہری خاموشی چھاگئی۔

”اب میں تمہیں اس مٹی کے پتلے یعنی انسان کی ایک بہت خاص اور اہم بات بتانے والا ہوں۔“ بارعب آواز بلند ہوئی۔سب حیرانگی سے ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگے کہ اب کیا انکشاف ہوتا ہے۔

”اس پتلے کے سر میں پیشانی کے نیچے دو سوراخ رکھے ہیں،تیز روشنی پتلے کے سوراخوں پر پڑی،تو انہیں دو گول خالی سوراخ نظر آئے۔

”جانتے ہو......ان سوراخوں میں کیا ہوگا؟بڑی سرکار نے پوچھا۔

”نہیں“ انہوں نے منفی انداز میں جواب دیا۔

”ان سوراخوں کو میں اپنے نور سے بھردوں گا۔“ انہیں بتایا گیا۔

”اپنے نور سے......؟“ انہوں نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

”ہاں......میں انسان کو دو آنکھیں عطا کروں گا......جو میرے نور کی روشنی سے چمکیں گی......اور ان آنکھوں سے وہ دنیا کی ہر شے دیکھے گا،جو میں نے اس کے لئے بنائی ہیں......“ بتایا گیا۔

”کیا مطلب......؟“ انہوں نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

”خوبصورت سرسبز و شاداب باغات،ان میں کھلنے والے رنگ برنگی انواع واقسام کے پھول جن کی خوشبو سے دماغ معطر اور دل مسرور ہوگا۔خوبصورت،خوش ذائقہ پھل،سرسبز لمبے درخت،اونچے نیچے پہاڑ،برف پوش بلند و بالا اونچی چوٹیاں،پہاڑوں کے جھرنوں سے بہتی گنگناتی آبشاریں،خوبصورت وادیاں،ڈھلوان،ہموار اور چٹیل میدان،ریت سے اٹے ہوئے ریگستان،بل کھاتی،شور مچاتی ندیاں،وسیع و عریض گہرے پانیوں سے بھرے ہوئے سمندر،نیلگوں آسمان پر چمکتا سورج اور چاند ستاروں سے مزین آسمان،آسمان اور زمین کے درمیان اونچی نیچی اڑانیں

بھرنے والے مختلف رنگ ونسل کے چہچہاتے، گنگناتے پرندے، زمین پر سرپٹ بھاگتے جانور، وحشی درندے، زمین کے اندر چھپے قیمتی خزانے اور سمندروں کی گہرائیوں میں چھپے انمول نگینے اور بہت کچھ، جس کا علم صرف مجھے ہے۔ یہ سب کچھ ادھورا ہی رہ جاتا۔ اگر میں انسان کو تخلیق نہ کرتا اور انسان کو میں اسی لئے تخلیق کر رہا ہوں کہ وہ میرے چھپے ہوئے خزانوں کو کھوجنے اور پانے کی جستجو کرے۔ میری کرشمہ سازیوں کو دیکھے۔ میں جتنی محبت اور خوبصورتی سے جو چیزیں اس کے لئے تخلیق کروں گا، وہ ان کو سراہے، اس کو کائنات کی ہر شے میں، جب میں نظر آؤں گا تو پھر وہ مجھے پانے کی جستجو کرے گا۔ میری طرف آنے کی جدوجہد کرے گا اور یہ تب ہی ممکن ہوگا، جب وہ اپنی آنکھوں سے میری ہر ہر چیز کو توجہ اور غور سے دیکھے گا...... تو جو دماغ، عقل، ذہانت اور سوچ میں اسے دوں گا۔ ان کے ذریعے ان کو سوچے گا اور جب وہ ان چیزوں کے بارے میں سوچے گا تو اس کے دل میں ان کی نزاکت، لطافت اور طاقت کو محسوس کرے گا اور پھر اس کا اثر اپنی روح میں محسوس کرے گا۔ جب اس کی سوچ سے اس کی روح میں سرشاری آئے گی تو وہ ایک ایسے حسین احساس سے مسرور ہوگا جو اسے میری طرف لائے گا۔ وہ کائنات کے حسن وخوبصورتی، تناسب وہم آہنگی کو دیکھ کر ان چیزوں کے بنانے والے کے بارے میں سوچے گا۔ اس کا فہم، ادراک اور تخیل مضبوط ہوگا۔ وہ ان چیزوں کو دیکھ کر اپنے تخیل میں حقیقی اور ابدی دنیا کے بارے میں تصویر بنائے گا۔ میرے بارے میں سوچے گا، وہ جتنا زیادہ میرے بارے میں سوچے گا، میرا اور اس کا تعلق اتنا ہی مضبوط ہوتا جائے گا۔ اس کے اندر روحانی صلاحیتیں تقویت پکڑیں گی۔ وہ جہاں جائے گا مجھے دیکھنے کی کوشش کرے گا اور جس شے کو چھوئے گا، اسے، اس میں میرا احساس محسوس ہوگا۔ اس لئے ان آنکھوں سے اس نے بہت اہم کام کرنے ہیں۔'' بڑی سرکار نے محبت بھرے انداز میں بتایا۔

''کیا وہ ان آنکھوں سے صرف خوبصورت چیزیں ہی دیکھے گا؟ انہوں نے معنی خیز انداز میں سوال کیا۔

''نہیں...... میری کائنات میں جہاں بہت خوبصورت اور پرکشش نظارے ہوں گے، وہاں بہت سی بدصورت چیزیں بھی ہوں گی، جس طرح انسان کے اپنے اندر خیر وشر ہوگا۔ وہی سب کچھ اس کے اردگرد کائنات میں بھی ہوگا۔ یہ جہاں بہت خوبصورت چیزیں تخلیق کرنے کی کوشش کرے گا، وہیں بدصورت اور کریہہ چیزیں بھی اپنے ذہن میں سوچے گا اور دنیا کو ویسا ہی بدصورت بنانے کی کوشش کرے گا۔'' انہیں بتایا گیا۔

''وہ کیسے......؟'' انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

''جب انسان کی آنکھوں پر خود بینی اور جہالت کے پردے پڑ جائیں گے۔'' سنجیدگی سے بتایا گیا۔''

''کیا...... آپ اس کی آنکھوں سے اپنا نور چھین لیں گے؟'' انہوں نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

''نہیں...... ان کی آنکھیں میرے نور سے ہی دیکھیں گی...... مگر جب ان کے دل ہوس، خودغرضی اور لالچ سے بھر جائیں گے اور ذہن ان کے دل کی خواہشات کے مطابق سوچیں گے تو ان کا دنیا کو دیکھنے کا زاویہ بدل جائے گا۔ وہ اپنے نفس، اپنی خواہشات اور اپنے مفادات کو دوسرے لوگوں کے مفادات، ان کے احساسات اور جذبات پر ترجیح دیں گے۔ ان کا مشاہدہ بدل جائے گا۔ دنیا کو دیکھنے کا نظریہ مختلف ہو جائے گا، تب ان کے سینوں اور ذہنوں میں چھپی جہالت ان کو سچ اور حقیقت نہیں دکھائے گی، بلکہ جہالت اور گمراہی کی طرف لے جائے گی۔'' بتایا گیا۔

''یہ کیسی جہالت ہوگی......؟'' حیرت سے سوال کیا گیا۔

''وہ سچ کو دیکھ کر بھی اسے جھٹلائے گا......اور......غلط و منفی باتوں کے بارے میں سوچے گا......شر کو پھیلانے کی جدوجہد کرے گا اور پھر تاریک راہوں کا مسافر بنے گا......'' سنجیدگی سے بتایا گیا۔

''کیا یہ آپ کے نور سے تاریک راہوں کی طرف جائے گا۔ کیا اسے سیدھا راستہ نظر نہیں آئے گا۔ جبکہ نور تو تمام اندھیروں کو ختم کر دیتا ہے۔'' انہوں نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

''نہیں......صرف وہی انسان تاریک راہوں کے مسافر بنیں گے۔ جن کی آنکھوں پر جہالت کے پردے غالب آئیں گے ان میں کچھ ایسے بھی ہوں گے، جن کی بصارت کے اندر میں ایسی بصیرت رکھوں گا، جس کے بارے میں تم سوچ بھی نہیں سکتے......'' خوش کن لہجے میں بتایا گیا۔

''کیسی بصیرت......؟'' انہوں نے حیرانگی سے پوچھا۔

''انسان کی سوچ، فہم و دراک، شعور اور میری طلب مل کر اس کے اندر ایسی روحانی بصیرت پیدا کریں گے، جو اس کے اندر وجدان اور عرفان کے ایسے در وا کریں گے کہ یہ چل تو زمین پر رہا ہوگا مگر اس کی نگاہیں آسمانوں کے پار مجھ تک پہنچیں گی۔ وہ بات چیت تو اپنے ہم جنسوں سے کر رہا ہوگا، مگر مخاطب مجھ سے ہوگا۔ وہ ظاہراً خاموش بیٹھا ہوگا مگر اندر ہی اندر مجھ سے سرگوشیاں کر رہا ہوگا۔ اس کی آنکھیں بند ہوں گی، مگر وہ مجھ کو دیکھنے کی کوشش کرے گا۔ لوگ اس سے سوال کریں گے اور وہ جواب مجھ سے لے گا۔ وہ جواب کسی اور کو دے گا، مگر مشورہ مجھ سے کر رہا ہوگا۔ وہ تکلیف سے تڑپ رہا ہوگا، مگر میرے حضور اندر ہی اندر گڑگڑا کر اپنا دکھ بیان کر رہا ہوگا۔ وہ اپنی محبت اور چاہت کو میری محبت پر قربان کر دے گا......وہ میری محبت اور جدائی میں تڑپے گا، آنسو بہائے گا اور اپنی جان بھی قربان کر دے گا۔ وہ اپنی قیمتی سے قیمتی شے کو میری چاہت پر فدا کرے گا۔ وہ مجھے چاہے گا اور میں اسے چاہوں گا......وہ مجھ سے کچھ طلب نہیں کرے گا......مگر میں پھر اسے سب کچھ عطا کروں گا......لیکن ایسے خاص انسان بہت کم ہوں گے۔'' مثبت انداز میں بتایا گیا۔

''اور......وہ......خاص انسان کون ہوں گے؟'' حیرت سے سوال کیا گیا۔

''وہ جو سچ کے متلاشی ہوں گے اور سچ کی جستجو کریں گے، جن کے لئے دنیا بے معنی اور فضول ہوگی......وہ اپنے اندر مجھے ہر جگہ اور ہر وقت محسوس کریں گے۔ وہ خود شناس ہوں گے، اپنے آپ کو پہچانتے ہوں گے، جنہیں معلوم ہوگا کہ ان کے دلوں میں حرکت کون پیدا کر رہا ہے۔ ان میں محبت کون بھر رہا ہے۔ نفرت، کینہ، حسد، عداوت، لالچ اور بغض سے ان کے دل کون صاف کر رہا ہے۔ ان احساسات میں جذبات کہاں سے آ رہے ہیں اور ان کے دماغوں میں ہر لمحہ نت نئی سوچیں اور خیالات کون بھر رہا ہے۔ ان کی آنکھوں میں چمکنے والے نور کی تجلیات کہاں سے آ رہی ہیں۔ ان کے پیٹوں میں بھوک اور نفس کشی کے احساسات کہاں سے جنم لے رہے ہیں۔ ان کے جسموں کو کون حرکت دے رہا ہے۔ کون حرارت عطا کر رہا ہے، کون انہیں بیمار کر رہا ہے اور کون ان کو شفاء دے رہا۔ وہ ہر بات، میں میری، مرضی اور میری رضا چاہیں گے۔ میرے فیصلوں پر کبھی نہیں پچھتائیں گے۔ تب بھی نہیں جب میں ان سے کچھ چھینوں گا......اور تب بھی نہیں جب میں ان کو ختم کردوں گا۔ وہ بہت خاص ہوں گے......وہ میری محبت میں دشمنوں کو بھی اپنا بنائیں گے۔ میری چاہت میں دشمنوں کو بھی معاف کر دیں گے۔ ان کے لئے صرف میں اہم ہوں گا اور میں ان کو تب ملوں گا جب وہ

اپنی انا، تکبر کو ختم کر کے میرے آگے عجز و انکساری سے سر جھکائیں گے۔ میرے فرمانبردار ہوں گے اور اس سے ان کے اندر روحانی بصیرت پیدا ہو گی۔'' جواب دیا گیا۔

''کیا روحانی بصیرت بھی آپ کی محبت سے پیدا ہو گی؟ پوچھا گیا۔

''ہاں روحانی بصیرت کا سرچشمہ میرا عشق ہو گا، جو میرے عرفان سے جنم لے گا، جب انسان کو اپنے اندر اور باہر ہر جانب میں ہی نظر آؤں گا تو اس کے اندر عرفان اور وجدان کے دروازے کھلیں گے۔ اس کی روح ہر وقت مضطرب، بے قرار اور بے چین رہے گی۔ میرا ذکر، میری یاد اور میری تمنا اس کو بہت بے چین رکھے گی۔ اس کی متلاشی نگاہیں میری جستجو میں ہر جانب اٹھیں گی۔ میرے قرب کے لئے وہ اس قدر بے قرار ہو گا کہ اپنا سب کچھ چھوڑ کر جنگلوں، پہاڑوں اور ویرانوں میں نکل جائے گا۔ وہ کبھی مجھے میرے بنائے ہوئے نظاروں میں تلاش کرے گا...... تو...... کبھی اپنی روح کی پرواز میں...... میرے دیدار کی تمنا اس کے اندر ایک ایسی آگ بھڑکائے گی جو کسی پل ٹھنڈی نہیں ہو گی۔'' بڑی سرکار نے جواب دیا۔

''عشق کیا ہو گا...... جو انسان کو اس قدر مضطرب رکھے گا؟'' سوال کیا گیا۔

''جو ایک بار دیکھا...... اسے دوبارہ دیکھنے کی آرزو 'عشق' ہے۔ جب ایک بار میری حقیقت کا تھوڑا سا عرفان کسی روح کو ہو گا تو وہ اس قدر مضطرب ہو جائے گی کہ اسے دنیا کی کوئی شے سکون نہیں دے گی۔ وہ میرے ہجر میں روئے گا اور تڑپے گا اور میرے وصال کی تمنا دل میں لئے مارا مارا پھرے گا...... عشق کی حقیقت کیا ہے؟ تم اس کا شعور کبھی نہیں کر سکو گے، کیونکہ میں نے عشق کی نعمت سے صرف انسان کو نوازا ہے، ہم کو نہیں اور انسان جب سرکشی میں میری اطاعت کرے گا، مایوسی میں...... مجھ پر ایمان لائے گا...... اور جب وہ مجھے ظاہر میں پوشیدہ اور پوشیدہ میں ظاہر پائے گا۔ میں اس کی ظاہری آنکھ کے اندر روحانی آنکھ کا محور ہوں گا۔ وہ دنیا کو دیکھے گا، مگر اسے ہر طرف میں نظر آؤں گا...... وہ مجھ سے دور اور میں اس سے دور نہیں ہوں گا...... میں اس کے دل کی دھڑکنوں میں...... اس کی آنکھ کی بصیرت میں، دماغ کے شعور میں اور روح کے وجدان میں ہوں گا۔ عشق سوز ہے، ساز ہے، خاموشی ہے، آواز ہے، سکون ہے، اضطراب ہے، ہجر ہے، وصال ہے، میرے قرب اور دیدار کی تمنا اور انتہائے شوق کا نام عشق ہے۔ عشق شدت محبت سے جنم لینے والے فراق اور وصل کی انتہائی کیفیت کا نام ہے، جو انسان کو کسی بھی پل سکون نہیں لینے دے گا۔ یہ محبت، چاہت، جستجو اور شوقِ تمنا کے سفر کا نام ہے۔ عشق تڑپ کا نام ہے، معراج ہے، وصل کی تمنا ہے، محبت نقطہ ہے اور عشق دائرہ ہے، محبت عرفان ہے اور عشق وجدان...... محبت کا حاصل عشق ہے اور عشق کا حاصل کسی کو معلوم نہیں ہو گا، کیونکہ عاشق...... عشق تو ضرور کرے گا، مگر کیا پائے گا اور کیا کھوئے گا اور کیا کچھ کھو کر پائے گا...... اسے خود بھی معلوم نہیں ہو گا۔'' بڑی سرکار نے بتایا۔

''کیا دنیا کے سارے انسان آپ سے عشق کریں گے؟'' لیڈر نے حیرت سے پوچھا، جس کے اندر، بہت اضطراب پھیل رہا تھا۔

''نہیں بہت سے اپنے ہم جنسوں کے ساتھ عشق کرے گا...... مگر وہ عشق ان میں مزید اضطراب پیدا کرے گا...... کیونکہ عشق میں ٹھہراؤ نہیں...... عشق ہر وقت محوِ پرواز ہو گا، جب انسان اس کو پا لے گا، جس سے وہ عشق کرتا ہو گا تو وہ جذبہ دم توڑ کر بے معنی ہو جائے گا۔ اس کو پا کر بھی اسے سکون نہیں آئے گا۔ وہ کسی اور شے کا متلاشی ہو گا...... لیکن میرے عشق کی کوئی منزل نہیں...... ہر انسان کا سفر بھی مختلف ہو گا اور منزل بھی...... اس

سفر میں وہ ایسی ایسی منازل اور مدارج طے کرے گا کہ خود بھی حیران رہ جائے گا...... میں اس کے اندر ہوں گا۔ اس کے بہت قریب، مگر پھر بھی وہ میرے قرب کی تمنا میں اپنے آپ کو فنا کرے گا۔'' بڑی سرکار نے بتایا، روشنی یوں چمکی جیسے مسکرا رہی ہو۔

''یہ...... یہ...... کیسے ممکن ہے۔ آپ پاس ہوں اور پھر بھی آپ کی تلاش میں وہ سرگرداں رہے۔'' لیڈر نے بوکھلا کر کہا۔

''یہی عشق ہوگا...... میں اس کے سامنے اور وہ میرے سامنے ہوگا...... پھر بھی مجھ تک پہنچنے کی تڑپ اس کو بے قرار رکھے گی...... میرے ہجر اور فراق میں وہ مضطرب رہے گا۔'' بتایا گیا۔

''کیا آپ نے انسان کو اپنے عشق کے لئے پیدا کیا ہے؟'' لیڈر نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......'' جواب دیا گیا۔

''کیوں......؟ لیڈر نے چونک کر پوچھا۔

''میری ذات کا عرفان اور میرے عشق کا شعور تم کبھی بھی نہیں کر سکتے تھے۔ تم میری عبادت تو کرتے ہو مگر مجھے عبادت سے زیادہ انسان سے اپنی بندگی، محبت، چاہت اور عشق مقصود ہے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ کون مجھے دیوانگی کی حد تک چاہے گا۔ کس کی زندگی کا حاصل صرف میں ہوں گا۔ کون مجھ سے سچی محبت کرے گا، کون میری جستجو کرے گا اور میرے فراق میں تڑپے گا...... کون میرے لئے اپنا سب کچھ قربان کرے گا...... کس کی تمنا اور حاصل صرف میں ہوں گا؟'' محبت سے بتایا گیا۔

''کیا مٹی کے اس پتلے کے ذریعے آپ اپنی ذات کا عرفان چاہتے ہیں۔ کیا گارے سے بنے ہوئے اس انسان کی اتنی حیثیت ہوگی کہ وہ آپ کی ذات کا شعور کر سکے؟'' لیڈر نے مایوس کن لہجے میں پوچھا۔

''ہاں......'' جواب دیا گیا۔

''میں نہیں مانتا......؟ لیڈر نے نخوت سے کہا۔

''کس کو......؟'' حیرت سے پوچھا گیا۔

''انسان کو...... اور اس کے عشق کو'' لیڈر نے جواب دیا۔

سفید روشنی یوں چمکی جیسے خفگی کا اظہار کر رہی ہو۔ ہر جانب خاموشی چھا گئی۔ تمام حاضرین لیڈر کی گفتگو سے مضطرب ہو گئے تھے۔ ایک نے ہمت کی اور آگے بڑھ کر سوال کیا۔ ''کیا انسان کی آنکھیں صرف روحانی بصیرت کے لئے پیدا کی جائیں گی؟''

''نہیں...... جب اس کے احساسات مجروح ہوں گے اور جب اس کے جذبات کو ٹھیس لگے گی...... جب اس کی روح دکھ درد کے شدید احساس سے مضطرب ہوگی اور وہ اپنے آپ کو بہت بے بس پائے گا...... تب اس کی آنکھوں سے مخصوص قسم کا پانی جاری ہوگا...... جو اس کے دل کے غبار کو کم کرے گا۔'' سنجیدگی سے بتایا گیا۔

''کیسا پانی......؟'' حیرت سے سوال کیا گیا۔

''وہ پانی...... 'آنسو ہوں گے۔ آنسو مجروح جذبات کے اظہار کا ذریعہ ہوں گے۔ اگر انسان کو آنسو نہیں ملیں گے تو اس کا دل دکھ، درد کی شدت سے پھٹ جائے گا۔ اس کے اندر کے جذبات اور خیالات کا اظہار آنسوؤں اور خوشی کا اظہار ہنسی اور قہقہوں سے ہوگا۔ مایوسی کا اظہار خاموشی اور سرد آہوں سے ہوگا۔ آنسو جذبات کی سرشاری کا اظہار کریں گے۔ کبھی کبھار بہت خوشی سے بھی آنسو بہہ نکلیں گے، مگر زیادہ تر دکھ، درد اور کرب کے تاثرات کا اظہار ان سے ہوگا۔'' بتایا گیا۔

''کیا آنسو انسان کو بے بس اور کمزور ثابت کریں گے؟'' حیرت سے پوچھا گیا۔

''ہاں...... کسی حد تک...... مگر...... جن کو اپنے جذبات پر قابو ہوگا اور جو مجھ پر کامل یقین رکھیں گے ان کے دل اور اعصاب مضبوط ہوں گے۔ وہ دوسرے کمزور انسانوں کی طرح آنسو نہیں بہائیں گے۔'' جواب دیا گیا۔

''اب تمہاری میری اس شاہکار کے بارے میں کیا رائے ہے؟ بڑی سرکار نے ان سے پوچھا۔

ہر طرف گہری خاموشی چھا گئی...... انہوں نے سر جھکا لئے، جیسے انسان کے بارے میں بہت کچھ جاننے کے باوجود بھی وہ اسے شاہکار ماننے کو تیار نہ ہوں...... مگر برملا اس کے بارے میں کچھ کہنے کی ہمت اور جرات نہ کر رہے ہوں۔

''سرکار آپ نے انسان کے دل میں محبت، پیار، ہمدردی، نفرت، حسد، کینہ اور لالچ...... دماغ میں عقل، سوچ، ذہانت، تکبر اور جنون۔ پیٹ میں بھوک، شہوت، بدکاری اور نفس کشی وخواہشات۔ آنکھوں میں نور، بصارت، جہالت اور روحانی بصیرت رکھے ہیں یہ کیسا شاہکار ہے جسے آپ نے سب کچھ ہی دے ڈالا ہے کہ وہ جو چاہے کرے، چاہے تو محبت کرے، پیار پھیلائے، چاہے تو نفرت کرے، چاہے تو عقل اور ذہانت سے محلات تعمیر کرے، چاہے تو دنیا کو تباہ و برباد کرنے کے منصوبے بنائے اور سازشیں کرے، چاہے تو اپنا بھی سب کچھ ہڑپ کر لے اور حلال وحرام کا فرق مٹائے بغیر دوسروں کا بھی حق غصب کر لے اور چاہے تو نفس کشی بھی کرے۔ چاہے تو آپ کے نور سے دنیا کو خوبصورت مناظر دکھائے اور چاہے تو اپنی آنکھوں پر جہالت کے پردے ڈال لے۔ کیا آپ نے اسے اپنی مرضی، ارادے اور اختیارات میں مکمل خودمختاری دے دی ہے؟'' مؤدبانہ انداز میں سول کیا گیا۔

''مجھے معلوم تھا...... تم یہ سوال ضرور پوچھو گے...... ہاں۔ میں نے اپنے اس شاہکار کو سب کچھ دے ڈالا ہے۔'' پرامید لہجے میں بتایا گیا۔

سفید روشنی تیزی سے چمکی جیسے کوئی مسکرا کر کسی کو دیکھ رہا ہو۔ حاضرین محفل میں اضطراب سا پھیلنے لگا۔

''مگر...... سب کچھ دے کر بھی...... میں نے...... اسے...... کچھ نہیں دیا'' قدرے توقف کے بعد بارعب آواز بلند ہوئی۔

''کیا مطلب......؟'' وہ چونکے۔

''انسان محبت تو ضرور کرے گا...... مگر محبت کو پانا اور کھونا اس کے بس میں نہیں ہوگا۔

وہ اپنی عقل، ذہانت اور سوچ سے بہت کچھ حاصل کرنے کی جدوجہد کرے گا...... وہ برسوں کوشش کرے گا مگر جب میں چاہوں گا تب وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگا۔ اگر میں نہیں چاہوں گا تو وہ کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ چاہے دنیا بھر کے وسائل اپنی کامیابی کے لئے استعمال کرے۔

وہ اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے بہت کچھ کرے گا...... مگر اپنی بھوک پر قابو نہیں پا سکے گا، جب تک میں اس کو نفس کشی پر آمادہ نہیں کروں گا......اس کے اندر ہوس، حرص وطمع اور خواہشات کی طلب بڑھتی ہی چلی جائے گی۔ وہ ان پر کبھی بھی قابو نہیں پا سکے گا۔ جب تک کہ میں نہ چاہوں اور اس کی خواہشات کو پورا کرنا میرے اختیار میں ہوگا اور اس کے اندر شہوت کا جانور اسے درندگی اور وحشت پر ابھارے گا، مگر اس کے اس جذبے کو جب تک میں تکمیل نہیں ڈالوں گا، تب تک وہ مضطرب اور بے قرار رہے گا۔ وہ اپنی آنکھوں سے بہت نظارے دیکھے گا، مگر اس کے اندر خود شناسی، روحانی بصیرت اور وجدان کے دروازے صرف میں کھولوں گا...... دنیا کی کوئی طاقت اس پر قادر نہیں ہوگی کہ انسان سے کچھ چھین لے یا اسے کچھ عطا کر دے۔ انسان کے سارے کاموں، اس کی سوچوں، ارادوں اور منصوبوں کی ڈوریاں میں نے اس کی قسمت سے باندھ رکھی ہیں۔ وہ بہت کچھ کرنا چاہے گا، مگر اپنی قسمت کے ہاتھوں مجبور ہوگا۔ وہ بہت جدوجہد کرے گا...... مگر اس کی قسمت اس کو منہ کے بل گرائے گی وہ بڑے بڑے منصوبے بنائے گا مگر قسمت اسے مات دے گی۔ وہ اٹھ اٹھ کر اور آگے بڑھ بڑھ کر جدوجہد کرے گا۔ کوئی کامیابی اور فتح حاصل کرنے کے لئے اپنے سارے وسائل استعمال کرے گا، مگر جب تک اس کی قسمت ساتھ نہ دے گی تو وہ کچھ بھی نہیں کر سکے گا اور اس کی تقدیر اٹل ہوگی...... جسے میں لکھوں گا۔'' فاتحانہ انداز میں بتایا گیا۔

''جب انسان کی تقدیر آپ نے لکھی ہے تو پھر انسان کس لئے جدوجہد کرے گا۔ اسے جو کچھ آپ عطا کریں گے...... اسے وہی ملے گا...... جو نہیں چاہیں گے...... وہ نہیں ملے گا...... پھر وہ کیا پانے کی کوشش کرے گا اور کیونکر......؟ انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

''انسان کو جو کچھ ملنا ہے یا نہیں ملنا ہے وہ میرا فیصلہ ہے اور یہ اس کی تقدیر ہوگی...... کس طرح اور کن راستوں پر چل کر اسے وہ پانا ہے یہ اس کی جدوجہد ہوگی...... انسان کا سفر تو اس راستے پر چلنا ہے جس کے اردگرد میں نے اس کے لئے بہت کچھ چھپا رکھا ہے۔ اب یہ اس کی قسمت ہوگی کہ اس کو چلنے کے لئے جو راستہ ملے گا...... وہ ہموار ہوگا یا کنکروں سے بھرپور، جن سے ٹکرا کر وہ بار بار ٹھوکریں کھائے گا...... گرے گا یا سنبھلے گا...... یہ اس کا نصیب اور قسمت ہوگی۔'' بتایا گیا۔

''یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے آپ کا شاہکار بہت بے بس اور مجبور ہوگا؟'' حیرت سے سوال کیا گیا۔

''نہیں...... تم اس کی سرشت کو نہیں جانتے۔ اگر میں ایسا نہ کرتا...... اور اسے کچھ عطا کرنا یا نا کام کرنا...... میں اپنے ہاتھ میں نہ رکھتا تو انسان کے اندر موجود انانیت، تکبر، خود پسندی، خود غرضی، بربریت، لالچ، وحشت اور ضلالت وظلمت کی کوئی حد نہ ہوگی۔ وہ اپنے ہم جنسوں کے لئے ایسی ایسی آزمائشیں اور مصیبتیں کھڑی کرے گا کہ دوسرے انسانوں کے لئے سانس لینی مشکل ہو جائے گی۔ وہ دوسروں کے لئے نہ ٹلنے والا خطرہ بن جائے گا۔ اس لئے اس خطرے کے شر سے دوسروں کو محفوظ رکھنے کے لئے میں ظالموں کو ایک مخصوص وقت اور عمر کے بعد موت دوں گا اور موت کے ساتھ اس کا ظلم، اس کی کامیابیاں وکامرانیاں، منصوبے اور سازشیں ختم ہو جائیں گی اور سب کچھ بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔'' قطعیت سے جواب دیا گیا۔

''اگر اتنا سب کچھ عطا کرنے کے بعد انسان کو موت ہی دینی ہے تو پھر اسے زندگی کیوں دے رہے ہیں؟'' حیرت سے پوچھا گیا۔

''میں انسان کو آزمائش میں ڈالنا چاہتا ہوں۔'' جواب دیا گیا۔

''کیسی آزمائش......؟'' انتہائی حیرت سے پوچھا گیا۔

''زندگی کی آزمائش۔محبت، دولت، اقتدار اور خود شناسی کی آزمائش، جو زندگی کے اس کٹھن امتحان اور آزمائش میں سے کامیاب ہو کر گزریں گے، انہیں حیات جاودانی عطا کروں گا......ان پر اپنی نعمتیں نچھاور کروں گا......انہیں وہ کچھ عطا کروں گا، جن کے بارے میں انسان نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا'' بڑی سرکار نے محبت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

''سرکار......کیا آپ صرف انسان کو آزمائش کے لئے بنا رہے ہیں۔کیا اس کی زندگی کا کوئی اور مقصد نہیں ہوگا؟'' انہوں نے تجسس سے پوچھا۔

''میں اس کو جستجو کے لئے بنا رہا ہوں۔'' جواب دیا گیا۔

''کیسی جستجو......؟'' حیرت سے پوچھا گیا۔

ایک راز کو پانے کے لیے۔

''کیسا راز......؟''

''یہ ایک اسرار ہے جو صرف میرے اور انسان کے درمیان ہوگا......''

''کیا انسان، اس اسرار کو پالے گا......'' انتہائی حیرت سے پوچھا گیا۔

''سب نہیں......مگر بہت کم......''

''سب کیوں نہیں......؟''

''اگر سب جان گئے تو میں اسرار نہیں رہوں گا......اور کھل کر سب کے سامنے آجاؤں گا......اور میں ان کی محبت کی شدت اور اس پیانے کو جاننا چاہتا ہوں، جو وہ مجھ سے ان دیکھے کریں گے......میری جستجو میں اور مجھے پانے کی جدوجہد میں وہ انتہائی کٹھن مراحل اور آزمائشوں سے گزریں گے......کچھ تو مجھے جانتے......پہچاننے اور ماننے سے ہی انکار کر دیں گے۔کچھ مانیں گے مگر پہچانیں گے نہیں......اور کچھ جانیں گے بھی اور مانیں گے بھی......تم ہی بتاؤ......ایک انسان جو کسی کی محبت پانے کے لئے جستجو کرتا ہے۔کیا وہ اس کے برابر ہو سکتا ہے، جو کسی کی محبت کو سرے سے ہی نہیں مانتا......یا......پھر اس کی طرح جو کسی کی محبت کو چھیننے کی کوشش کرتا ہے......'' قدرے سنجیدگی سے سوال کیا گیا۔سب خاموش ہو گئے۔ان کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔

''کیا تم میری حقیقت جانتے ہو؟'' سوال کیا گیا۔

''جواباً وہ خاموش ہو گئے۔''

کیا تم مجھے جانتے ہو؟

وہ خاموش رہے۔

کیا مجھے مانتے ہو......؟

''ہاں......مثبت انداز میں قطعیت سے جواب دیا گیا''۔ سفید روشنی تیزی سے چمکی جیسے مسکرا رہی ہو۔

''اور جو، مجھے مان کر...... جانے اور پہچانے گا...... کیا وہ تمہاری طرح ہو سکتا ہے؟''

سب چونک گئے اور ایک دم بوکھلا کر سفید روشنی کی طرف دیکھنے لگے، مگر اس کی تاب نہ لا کر انہوں نے سر خاموشی سے جھکا لئے۔

''تمہاری مجھ تک ویسی رسائی کبھی ممکن نہیں ہوگی...... جیسی انسان کو ہوگی''۔

''انہوں نے پھر چونک کر سفید روشنی کو دیکھنا چاہا، مگر بڑی سرکار کے اس انکشاف پر وہ دکھی ہو گئے۔ بڑی سرکار اور ان کے درمیان اب کوئی تیسرا آ رہا تھا۔ ان کی محبت اور عبادت میں کوئی اور بھی شریک ہونے جا رہا تھا اور شراکت داری کے اس احساس نے ان کے اندر اضطراب پیدا کر دیا تھا۔ ان پر افسردگی چھا رہی تھی۔

بڑی سرکار نے ان کی طرف دیکھا...... ہر طرف گہری خاموشی سی چھا گئی۔

''وہ...... جو میری محبت...... میں اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہو جائے...... کیا...... وہ اس جیسا ہو سکتا ہے، جس کی محبت میں کوئی آزمائش ہی نہ آئے...... جو صرف محبت کرے...... مگر...... کوئی نذرانہ پیش نہ کرے''بڑی سرکار نے کہا تو انہوں نے پھر چونک کر سفید روشنی کو دیکھا۔

''کیسا نذرانہ......؟''قدرے توقف کے بعد انہوں نے پوچھا۔

''تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ میں انسان کو کیسے کیسے آزماؤں گا...... اس کو ایسی ایسی اذیت میں ڈالوں گا کہ وہ موت طلب کرے گا مگر میں اس وقت اسے موت بھی نہیں دوں گا...... وہ تکلیفوں سے فرار چاہے گا...... اور میں اس کے لئے سارے راستے بند کر دوں گا۔ وہ سکون کے چند لمحے مانگے گا تو میں ہر لمحے کو اتنا تکلیف دہ بنا دوں گا کہ ان کا دم گھٹنے لگے گا...... وہ میرے سامنے روئیں گے...... گڑگڑائیں گے...... آہیں بھریں گے...... شکوے کریں گے اور جھگڑا کریں گے، مگر میں ان کو آزماتا رہوں گا''۔ جواب دیا گیا۔

''کیوں......؟''حیرت سے پوچھا گیا۔

''ان کا صبر...... دیکھنے کے لئے...... کہ وہ کس حد تک برداشت کر سکتے ہیں''۔

''کیا صرف صبر دیکھنے کے لئے آپ اس کو اتنی اذیت میں ڈالیں گے......؟''انتہائی حیرت سے پوچھا گیا۔

''نہیں...... مجھ پر انسان کا ایمان اور یقین بھی دیکھنے کے لئے......''سنجیدگی سے جواب دیا گیا۔

''ہمیں انسان پر افسوس ہو رہا ہے......؟''وہ بولے۔

''کیسا افسوس......؟''بڑی سرکار نے حیرت سے پوچھا۔

''آپ کا شاہکار انسان دنیا میں کتنی اذیت بھری اور بے بسی کی زندگی بسر کرے گا...... لیڈر نے قدرے طنزیہ انداز میں جواب دیا۔

''کیا مطلب...... تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''پوچھا گیا۔

''انسان، جسے آپ بہت محبت سے بنائیں گے۔ اس کو دنیا اور اس کی نعمتیں عطا کریں گے...... اس کو بے شمار صلاحیتوں سے بھی نوازیں

گے......مگر وہ اتنا بے بس ہوگا کہ اپنی مرضی اور خواہش سے اپنی محبت کو پا بھی نہیں سکے گا۔ اتنی محنت کے باوجود بھی کامیابیاں حاصل کرنا اس کے لئے ممکن نہیں ہوگا۔ وہ جو چاہے گا......اسے نہیں ملے گا......اور پھر آپ اسے اذیتوں اور تکلیفوں سے بھری زندگی دیں گے......وہ اپنی مرضی سے نہ مر سکے گا اور نہ ہی فرار حاصل کر سکے گا......کیا آپ کا یہ شاہکار ادھورا انسان نہیں ہوگا؟ جسے آپ سب کچھ دے کر بھی کچھ نہیں دے رہے......ہمیں تو اس پر افسوس ہو رہا ہے......اور بہت دکھ بھی۔'' وہ تاسف سے بولے۔

''انسان بھی ساری زندگی اس پر افسوس کرتا رہے گا۔ مجھ سے شکوے کرے گا کہ میں نے اس کے ساتھ زیادتی کی......ظلم کیا......اس کی تقدیر لکھی جو اس نے کرنا ہے، سب اس کی قسمت میں پہلے دن سے لکھ دیا گیا ہے......تم انسان کو نہیں جانتے۔ میں اس کی فطرت، اس کے ضمیر، اس کی سرشت اور اس کے اندر کے رازوں اور ان سوچوں سے بھی واقف ہوں جو اس کے اندر جنم لیں گی......میں بہت سی باتیں اس کی تقدیر میں لکھوں گا۔ مگر اس کی تقدیر، سوچ، فیصلے اور عمل کے درمیان کچھ ایسے خلا ہوں گے جن کو انسان نے اپنے ارادے، مرضی اور فیصلوں پر کرنا ہوگا۔ جب ان نازک لمحوں میں انسان کی سرشت میں پنہاں پاکیزگی، عصمت، دانشمندی، خیر اور میری محبت کا عنصر غالب آئے گا۔ تب اس کی پہچان ہوگی......جب وہ اپنی محبت سے انکار اور میری محبت کا اقرار کرے گا، جب وہ صبر میں میری رضا طلب کرے گا......تب میں اسے منتخب کروں گا کہ وہ میری کتنی چاہت اور محبت کا حقدار ہے......پھر میں اسے وہی کچھ عطا کروں گا، جس کی وہ مجھ سے توقع کرے گا......مگر جن کی فطرت میں ٹیڑھا پن، کہیں نہ کہیں برائی چھپی ہوگی۔ وہ زندگی کے ان خلا کو ان برائیوں سے پر کرنے کی کوشش کرے گا......اور جو ان کی اذیتوں، پریشانیوں اور دکھوں کو محسوس کر کے ان کی تکالیف کو کم کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ میں ان کو بھی سزا دوں گا اور ان کو بھی تکالیف میں ڈالوں گا۔ انسان کی ساری زندگی یہی سلسلہ جاری رہے گا۔'' جواب دیا گیا۔

''ہم تو الجھ کر رہ گئے ہیں......آپ کی حکمتوں، مصلحتوں، مخفی رازوں تک ہماری رسائی ممکن نہیں۔ آپ کا شاہکار کیا کرے گا اور دنیا میں کیسی زندگی بسر کرے گا......اتنی تکالیف اور اذیتوں کے باوجود کیسے خوش رہے گا۔ ہمیں تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا......مگر ہمیں اس شاہکار کے بارے میں خدشات، وسوسے اور اندیشے ہیں۔'' کسی نے کہا۔

''کیسے اندیشے......؟'' بڑی سرکار نے پوچھا۔

''یوں لگ رہا ہے کہ آپ کا شاہکار......انسان بہت مضطرب اور مایوس ہوگا۔ اپنی قسمت کے ہاتھوں مات کھا کر وہ کیسے خوش رہے گا...... اور آپ جن مخصوص لوگوں کی بات کر رہے ہیں، جن کی رسائی آپ تک ہوگی وہ مجھے ناممکن نظر آتا ہے۔ کیونکہ اس قدر مضطرب انسان آپ تک رسائی پا ہی نہیں سکے گا۔'' لیڈر نے قدرے نخوت سے کہا۔

''کیوں......؟'' بڑی سرکار نے پوچھا۔

''کون سا ایسا انسان ہوگا، جس میں آپ کی محبت، آپ کا عشق، آپ کی جستجو، روحانی بصیرت اور اس کی روح میں وجدان اور عرفان غالب آئے گا......اتنا سب کچھ ہونا ایک انسان میں ناممکن ہوگا۔'' وہ قدرے حیرت سے بولا۔

''کیا تمہیں مجھ پر یقین نہیں؟''سوال کیا گیا۔

''مجھے انسان پر اعتبار نہیں۔''لیڈر نے جواب دیا۔

''کیوں......؟''

''مٹی کا کمزور انسان...... جسے خود بھی اپنے اندر کی خبر نہیں ہوگی...... جس میں کبھی شر غالب......اور کبھی خیر......جس کی فطرت میں محبت سے زیادہ فتنہ وفساد، حرص وہوس اور فساد زیادہ ہوگا...... جسے اپنی ذات سے آگہی نہیں ہوگی...... آپ تک کیسے پہنچ پائے گا......سب ناممکن ہوگا'' لیڈر نے پتلے کی جانب نفرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرا بخشا ہوا شعور، میرا عطا کیا ہوا علم اور عرفان اسے مجھ تک لے آئے گا۔''جواب دیا گیا۔

''آپ تک......؟''اس نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......مجھ تک......''

''آپ......اسے اتنا بڑا درجہ عطا کریں گے......؟''لیڈر نے چونک کر پوچھا۔

''ہاں......''پر مطمئن لہجے میں جواب دیا گیا۔

''میری چھپی ہوئی ذات کو وہ دنیا پر آشکارا کرے گا، جب میری ہستی کا عرفان اسے ملے گا، تو وہ دنیا کو اس کے بارے میں بتائے گا۔'' جواب دیا گیا۔

''کیا اتنا بڑا کام یہ ناتواں، کمزور اور حقیر انسان کر سکے گا؟''لیڈر کے اندر نفرت کی آگ بھڑکنے لگی اور اس نے اپنے غم وغصے کو چھپاتے ہوئے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

''ہاں......''مثبت انداز میں جواب دیا گیا۔

''میں نہیں مانتا......''لیڈر خفگی سے بولا۔

''کس کو......مجھے یا......انسان کو؟''

''انسان کو......آپ کا شاہکار......کبھی نہیں......کبھی بھی نہیں......''لیڈر نے قدرے غصے سے کہا۔

''تمہارے اس سوال کا جواب......مٹی کا یہ پتلا خود دے گا......کہ وہ میرا شاہکار کہلانے کا اہل ہے یا نہیں۔''جواب دیا گیا۔

''کیا اس کی اتنی حیثیت، مقام اور مرتبہ ہوگا کہ یہ خود اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کر سکے گا۔''لیڈر نے چونک کر پوچھا۔

''ہاں......اور یہ تم خود دیکھو گے۔''بڑی سرکار نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے......میں انتظار کروں گا......کہ یہ کب اور کیسے اپنے آپ کو آپ کا شاہکار ثابت کرتا ہے۔''وہ قدرے نخوت سے بولا اور شاہی دربار چھوڑ کر چلا گیا۔

تمام نوری مخلوق مضطرب ہوگئی اور اندر ہی اندر پریشان...... ان کا لیڈر جو بڑی سرکار کا منظور نظر تھا۔ اس مٹی کے پتلے کی وجہ سے بڑی سرکار کا شاہی دربار چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ ان کے لئے یہ انتہائی حیرت اور پریشانی کی بات تھی۔ وہ بہت بے قرار اور بے چین ہونے لگے، ہر طرف گہرا سکوت چھا گیا۔

''کیا تم بھی اسے میرا شاہکار نہیں مانتے؟'' بڑی سرکار نے بارعب انداز میں پوچھا۔

سب نے خاموشی سے سر جھکا لئے...... کسی کی کوئی آواز بلند نہ ہوئی۔

''میں تمہارے اندر کے اضطراب کو جانتا ہوں، تم بھی اس وقت تک اسے میرا شاہکار نہیں مانو گے...... جب تک یہ خود اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت نہیں کرے گا......'' بڑی سرکار نے پرُامید لہجے میں کہا۔

سفید روشنی مٹی کے پتلے پر اس انداز سے چمکی کہ اس سے ست رنگی شعاعیں نکلنے لگیں۔ وہ سب حیران ہو گئے...... وہ گھبرا گئے اور بوکھلا گئے۔

سفید روشنی یوں چمکی جیسے ان کی بوکھلاہٹ پر مسکرا رہی ہو۔

سفید روشنی پھر پتلے پر اس انداز سے چمکی کہ اس کے مٹی کے وجود کو اپنے حصار میں لے لیا۔ وہ ابرق کی مانند سفید، چمکتا ہوا نظر آنے لگا۔ وہ حیران رہ گئے اور دم سادھے ایک دوسرے کی جانب حیرت سے دیکھنے لگے۔ سفید روشنی پھر چمکی جیسے مسکرا رہی ہو اور اس کی نورانیت ہر جانب پھیلنے لگی۔

من و سلویٰ (معاشرتی رومانی ناول)

من و سلویٰ آپ کی پسندیدہ مصنفہ **عمیرہ احمد** کی ایک نہایت عمدہ تحریر ہے جو انہوں نے حرام، حلال رزق کے حصول جیسے اہم موضوع پر تحریر کی ہے۔ ہمارے معاشرے میں دو طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں ایک وہ جو اپنی روزی کمانے کے لئے رزق حلال کا راستہ چنتے ہیں اور دوسرے وہ جو کامیاب ہونے کے لئے شارٹ کٹ کی تلاش میں رہتے ہیں اور حرام ذرائع سے دولت اکٹھی کرنے میں کوئی عار نہیں سمجھتے۔ اس ناول میں مصنفہ نے جائز اور ناجائز کا فرق بہت خوبصورتی سے بیان کرتے ہوئے بتایا ہے کہ حلال کی کمائی ہمیں برائی پر جانے سے روکتی رہتی ہے اور حرام کا ایک لقمہ بھی اگر ہمارے خون میں شامل ہو جائے تو وہ کس طرح ہمیں بربادی کے کنارے لے جاتا ہے۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

حصہ دوئم

(۱)

سائنسی لحاظ سے دل انسانی جسم میں سب سے اہم اور خاص عضو سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ اگر دل کام کرنا چھوڑ دے تو انسان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ سب سے اہم اور نازک اعضاء کو خدا نے بہت حفاظت کے ساتھ سینے میں پسلیوں کے پنجر کے نیچے رکھا ہے، تاکہ کسی چوٹ یا رگڑ وغیرہ سے محفوظ رہے۔ دل کے گرد ایک باریک لیئر ہوتی ہے جسے Pericardium Layer کہتے ہیں، جس میں ایک Fluid ہوتا ہے جو دل کو دھڑکتے ہوئے مزید کسی رگڑ یا شاک سے بچاتا ہے۔

دل کا کام تمام جسم کو آکسیجنیٹڈ خون بہم پہنچانا اور تمام جسم سے گندا خون لیکر اسے پھیپھڑوں تک پہنچانا ہے تاکہ وہ وہاں صاف ہو جائے۔ دل کے چار خانے ہوتے ہیں دو اوپر والے آریکل اور دو نیچے وینٹریکل، ان کے درمیان والوز ہوتے ہیں، جو دل کے پھیلنے اور سکڑنے پر کھلتے اور بند ہوتے رہتے ہیں۔ دل کے نظام میں دل، شریانیں وریدیں اور کپلریز حصہ لیتے ہیں دل سے خون بڑی شریانوں کے ذریعے جسم کے مختلف حصوں تک پہنچتا ہے وہاں سے یہ تقسیم در تقسیم ہوتے ہوئے کپلریز کے ذریعے جسم کے ہر حصے تک پہنچتا ہے اور جسم کو آکسیجن اور خوراک مہیا کرتا ہے۔

دل ایک سیکنڈ میں 72 مرتبہ دھڑکتا ہے۔ دل کو خدا نے بہت ہی مضبوط پٹھوں یعنی Cardiac Muscles سے بنایا ہوا ہے۔

دل تمام جسم میں گردش کرنے کے بعد وریدوں کے ذریعے دل کے دائیں حصے تک پہنچایا جاتا ہے، جہاں سے یہ پھر صاف ہونے کے لئے پھیپھڑوں تک بھیج دیا جاتا ہے اس طرح Blood Circulation کا نظام چلتا رہتا ہے اور آخری سانسوں تک جاری رہتا ہے۔

دل میں بہت سے باطنی جذبات جنم لیتے ہیں مگر محبت سب سے اہم ہے جو دل کو بہت مضطرب اور بے قرار رکھتی ہے...... اور نت نئے جذبوں سے آشنا کرتی ہے...... کوئی بھی انسان...... نہ تو اس کی شدت کو جان پاتا ہے اور نہ ہی اس کی گہرائی کو...... محبت کا فلسفہ اور راز کیا ہے......؟ یہ محبت کیا ہے...... اور دل کا اس سے کتنا گہرا تعلق ہے؟ جس سے گوشت کا یہ لوتھڑا نا آشنا رہتا ہے۔

☆

زل کے دونوں ہاتھ Clay سے بھرے ہوئے تھے۔ وہ بہت انہماک محبت اور چاہت سے اسے گوندھ رہی تھی۔ اس کے خوبصورت سفید مرمریں ہاتھوں کی لمبی مخروطی انگلیاں کمال مہارت سے Clay میں کسی برقی مشین کی مانند تیزی سے حرکت کر رہی تھیں اور اس کے لمبے، سیاہ ریشمی بالوں کی لمبی اور ڈھیلی چٹیا میں سے بالوں کی لٹیں باہر نکل کر اس کے خوبصورت ٹکیا نما گول، سفید اور سرخ چہرے کے گرد ادھر ادھر منتشر ہو رہی تھیں اور ان لٹوں سے باریک بال اس کے بار بار سر ہلانے سے اس کے چہرے پر ادھر سے ادھر اڑتے پھر رہے تھے۔ ان کی چھیڑ خانیوں سے تنگ آ کر وہ قدرے جھنجلائے ہوئے انداز میں اپنے بالوں کو مٹی سے بھرے ہاتھوں سے کانوں کے پیچھے کرتی جس سے مٹی اس کے بالوں اور چہرے پر لگ گئی تھی۔ مگر وہ اپنے کام میں اس قدر محو تھی کہ اسے گرد و پیش کی کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ اس کی سیاہ، گہری خمدار بھنوؤں کے نیچے جھیل جیسی گہری آنکھوں

میں اک جستجو اور لگن تھی...... اس کے گال سردیوں کی نرم نرم دھوپ کی تمازت سے تمتما رہے تھے اور اس کی گلابی رنگت سرخ ہو رہی تھی۔ وہ بہت انہماک سے کوریڈور سے ملحقہ اوپن گراؤنڈ کے عین وسط میں زمین پر بیٹھی Sculpture کے لئے Clay تیار کر رہی تھی۔

شہیر کلاس روم کی کھڑکی میں سے مسلسل اسے دیکھ رہا تھا۔ ''وہ کتنی خوبصورت ہے...... شاید اسے اپنے حسن کی طاقت کا خود بھی اندازہ نہیں...... وہ حسن و خوبصورتی کا مکمل شاہکار ہے...... اس کے نقوش Egyptian کرداروں کی مانند تھے۔ ہیروں کی مانند چمکتی آنکھیں اور سفید چکنی جلد...... اس جیسا حسن اس نے اس سے قبل کہیں نہیں دیکھا تھا۔

اس نے ایک ماہ قبل اس کالج میں ایڈمیشن لیا تھا، کئی لڑکے ہر وقت اس کے ارد گرد منڈلاتے نظر آتے تھے۔ مگر وہ کسی کو لفٹ نہ کراتی تھی۔ شہیر اس کے قریب تو نہیں جاتا تھا مگر اس کی نظریں ہر وقت اس کے تعاقب میں رہتیں، وہ کیا کرتی ہے کس سے ملتی ہے...... کس سے اس کی دوستی زیادہ ہو رہی ہے...... اسے سب خبر ہوتی...... اور جب کبھی دونوں کا آمنا سامنا ہوتا تو شہیر نظریں جھکا لیتا شاید اس کے حسن کو برداشت کرنے کی اس میں تاب نہ تھی۔ اس کا دل اسے دیکھتے ہی بلیوں اچھلنے لگتا...... اس کو دیکھ کر اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگتیں اور جسم میں اک برقی رو سی دوڑ جاتی...... سارے جسم میں اک عجیب سی کپکپاہٹ پیدا ہوتی۔ وہ گھبرا کر جھرجھری لیتا اور جلدی سے وہاں سے چلا جاتا۔

''اس کو دیکھتے ہی اس کو کیا ہو جاتا ہے'' کیا میرے اندر کوئی کمپلیکس ہے...... یا پھر مجھ میں خود اعتمادی کی کمی ہو رہی ہے۔ میں اسے دیکھ کر کیوں مضطرب اور بے قرار ہو جاتا ہے...... اتنا بے بس کہ اس کی جانب نظریں اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا......

لیکن...... مجھے تو کسی بھی قسم کا کوئی کمپلیکس نہیں......

میں ایک امیر، دولت مند اور سیاسی اثر و رسوخ رکھنے والے خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ میری ممی منسٹر ہیں اور ڈیڈی بزنس مین...... اور مجھ جیسا خوبصورت، سمارٹ، ویل آف دراز قد لڑکا پورے کالج میں نہیں...... مجھے...... کسی بھی قسم کا کوئی کمپلیکس نہیں...... اور...... لڑکیاں تو مجھ سے خود دوستی کرنا چاہتی ہیں...... اور...... بہت سی لڑکیوں سے میری اچھی ہیلو ہائے بھی ہے...... بے اعتمادی کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا...... تو پھر...... زل کی پرسنالٹی میں کیا خاص بات ہے...... کہ میں اسے دیکھ کر بے قرار ہو جاتا ہوں...... اور نظر بھر کر اسے دیکھ نہیں پاتا......'' وہ اکثر راتوں کو مضطرب ہو کر سوچتا...... زل نے جب سے کالج جوائن کیا تھا شہیر کی راتوں کی نیند غائب ہو گئی تھی۔ ہر طرف نئی سٹوڈنٹ ''زل درانی'' کی آمد کا چرچا تھا۔ ہر جانب اس کے حسن کی باتیں ہوتی تھیں...... کوئی اس کی جھیل سی گہری، بڑی اور نیم مدہوش انداز میں کھلنے اور بند ہونے والی آنکھوں کی تعریف کرتا۔ کسی کو اس کے لمبے سیاہ ریشمی بالوں کی ڈھیلی چٹیا بہت بھاتی، کوئی اس کے دراز قد، اور جاذب نظر و متناسب جسم کو سراہتا...... اور...... اساتذہ اس کی سٹڈیز میں لگن اور اس کے ٹیلنٹ کی بے حد تعریف کرتے...... وہ منی ایچر پینٹنگ میں کمال مہارت رکھتی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ Sculpture Making میں اس کا جواب نہیں تھا۔ وہ کمال خوبصورتی سے Clay اور پلاسٹر آف پیرس کے مجسمے بناتی۔ قدرت بہت کم لوگوں کو ایسا متناسب حسن عطا کرتی ہے۔ وہ ''آئی اور چھا گئی'' کے مصداق وہ سب پر غالب آ گئی تھی۔ لڑکیاں اس کے حسن اور خوبصورتی کو رشک اور حسد کی نگاہ سے دیکھتی تھیں اور لڑکے اس کے ٹیلنٹ اور ہاتھوں میں فنکارانہ مہارت کو بھرپور انداز میں سراہتے نظر آتے تھے۔

کئی روز کی محنت شاقہ کے بعد زل کا بنایا ہوا Human bust تیار تھا اور اب ٹیبل پر رکھ کر انتہائی فنکارانہ مہارت کے ساتھ وہ Knife سے اس کے چہرے کے نقوش اور خدوخال نمایاں کر رہی تھی۔ وہ ایک مرد کا مجسمہ تھا۔ کلاس کے کئی لڑکے اور لڑکیاں زل کے اردگرد کھڑے تھے۔ ان میں شہیر بھی شامل تھا۔

''زل تم نے تو بہت خوبصورتی سے اس کے فیچرز نمایاں کیے ہیں۔ کیا تم نے یہ آرٹ کہیں سے سیکھا...... '' اس کی کلاس فیلو روشنی نے پوچھا۔

''نہیں...... تو...... ہماری فیملی میں کسی کا آرٹ سے بھی کوئی تعلق نہیں رہا...... بلکہ مجھے تو سب لوگ بہت تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ لیکن میں کیسے اسے چھوڑ دوں۔ اللہ نے مجھے خود اس کی سینس اور ٹیلنٹ دیا ہے...... '' زل نے مسکرا کر نائف سے آنکھ کی Shape بناتے ہوئے کہا۔

''تمہیں اپنا ٹیلنٹ ضائع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں...... یقین مانو اس سے پہلے بھی کسی نے اتنا خوبصورت Sculpture نہیں بنایا۔ یوں محسوس ہوتا ہے۔ ابھی اس میں روح ڈالی جائے تو یہ ایک خوبصورت آدمی بن کر کھڑا ہو جائے گا...... '' مریم نے مسکراتے ہوئے تعریف کی۔

''یار...... ہم تو صرف قدرت کی بنائی ہوئی چیزوں کی نقل کر سکتے ہیں...... اصل شاہکار تو وہی بناتا ہے...... جانتی ہو...... اس کی Clay کو Shape دیتے ہوئے میں کیا سوچ رہی تھی۔'' زل نے روشنی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا......؟ روشنی نے حیرت سے پوچھا۔

''Sculpture بناتے ہوئے ہر چیز کی مقدار اور تناسب کا کتنا خیال رکھنا پڑتا ہے یہاں تک کہ Clay نہ زیادہ سخت ہو نہ زیادہ نرم...... بہت Carefully اور توجہ سے یہ کام کرنا پڑتا ہے۔ اب دیکھو...... میرے نائف کا اینگل تھوڑا سا بھی ادھر ادھر ہو جائے تو آنکھ کی shape ہی بدل جائے گی۔ یقین مانو میں تو اللہ کے ماسٹر مائنڈ کی قائل ہو گئی ہوں...... جس نے ہر انسان کو اس کے ملک اور ریجن کے مطابق شکل و صورت، رنگت، جسم اور قد کاٹھ دیے ہیں...... پھر ایک بھی انسان دوسرے سے نہیں ملتا...... اٹس اے گریٹ ونڈر......'' زل نے نائف کو ٹیبل پر رکھتے ہوئے روشنی سے کہا۔

''ہاں...... یہ تو ہے......'' روشنی نے جواب دیا۔

''اب ہمارے ملک کے کچھ حصوں میں قدرت نے ایسے ایسے شاہکار تخلیق کیے ہیں...... کہ...... کبھی ہم ان کو دیکھتے ہیں اور کبھی اپنے آپ کو......'' ارسلان نے شوخ انداز میں کہا جو کہ شکل و صورت میں کلاس کا سب سے عام سٹوڈنٹ تھا۔ اس کی سانولی رنگت چپٹی ناک چھوٹی چھوٹی آنکھیں چوڑا ماتھا اور سر پر انتہائی باریک اور بہت کم بال اس پر نظر کی موٹے شیشوں والی عینک، دبلا پتلا لمبا وجود، اسے دیکھ کر لڑکیوں کے چہروں پر کبھی خوشگوار تاثرات نمایاں نہیں ہوتے تھے۔ البتہ وہ بہت خوبصورت، معنی خیز اور دلچسپ گفتگو کرتا تھا۔ لڑکے لڑکیاں یہاں تک کہ اساتذہ بھی اس کی کمپنی انجوائے کرتے تھے۔ وہ اکثر شوخ و شریر انداز میں باتوں کی پھلجھڑیاں چھوڑتا تھا اور پھر دبی دبی مسکراہٹ سے ہر ایک کو شریرانہ انداز میں دیکھ کر انجوائے کرتا۔

''ایسی بھی بات نہیں...... اللہ نے ہر ایک کو بہت محبت سے بنایا ہے۔'' زل نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''جناب...... یہ آپ اپنے بارے میں تو کہہ سکتی ہیں...... ہمارے بارے میں نہیں...... کیونکہ میں اکثر آئینے میں اپنا یہ چہرہ دیکھ کر سوچتا

ہوں...... اللہ نے بھی گلے سے ہی اتارا ہے۔'' وہ قہقہہ لگا کر بولا تو سب ہنسنے لگے۔ شہیر بہت ریزروڈ قسم کا نوجوان تھا۔ وہ سب کی باتوں کو انجوائے کرتا مگر نہ تو کسی پر کومنٹس دیتا، نہ تنقید کرتا، نہ کسی بحث میں حصہ لیتا۔ وہ زیادہ تر سب سے الگ تھلگ رہتا۔ لیکن زل کی وجہ سے وہ پہلی بار اپنے کلاس فیلوز کے ساتھ گروپ کی شکل میں کھڑے ہو کر باتیں انجوائے بھی کر رہا تھا اور زل کو قریب سے دیکھ بھی رہا تھا۔

''آپ اپنے آپ کو اتنا Under estimate مت کریں۔ آپ جیسا دنیا میں دوسرا اور کوئی بھی نہیں...... آپ کو اللہ نے کتنی انفرادیت دی ہے۔ آپ نے کبھی اس کے بارے میں سوچا ہے؟ آپ اپنے بارے میں پازیٹو ہو کر سوچا کریں''۔ زل نے مسکراتے ہوئے Sculpture کے آئی بروکو Shape دیتے ہوئے رُک کر ارسلان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اگر ہم جیسا کوئی دوسرا ہوتا...... تو...... وہ ایسا احتجاج برپا کرتا کہ آپ دیکھتی رہ جاتیں۔'' ارسلان نے شریرانہ انداز میں کہا۔

''کیسا احتجاج......؟'' روشنی نے چونک کر حیرت سے پوچھا۔

احتجاج کیا...... وہ تو حشر برپا کر دیتا...... کہ اس کو تو بنایا تھا...... مجھے کیوں اس جیسا بنایا ہے......؟ ارسلان نے معنی خیز انداز میں اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو سب نے پھر بھرپور قہقہہ لگایا۔

''یار لگتا ہے...... تمہیں اللہ سے بڑے ہی شکوے ہیں؟'' پاس کھڑے اسامہ نے مسکرا کر ارسلان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں...... بالکل بھی نہیں...... میں تو اپنے آپ میں اللہ کے رنگ دیکھ کر خوش ہوتا ہوں...... اور جب لڑکیاں مجھے دیکھ کر میرا مذاق اڑاتی ہیں تو پھر میں اللہ سے کہتا ہوں...... یقیناً آپ بھی ان کے مذاق کو انجوائے کر رہے ہوں گے ٹھیک ہے بھئی سب خوش ہوں......'' ارسلان نے ہنستے ہوئے کہا۔

''یو آر بریو......'' شہیر آہستہ آواز میں بولا۔

''شکر ہے...... یار...... تم بھی کچھ بولے...... ورنہ کئی عرصے تک ہم سمجھتے تھے۔ مسٹر شہیر احمد گونگے ہیں۔'' ارسلان نے ہنستے ہوئے کہا تو شہیر زیرِلب مسکرانے لگا۔

''ویسے تمہیں دیکھ کر مجھے ہمیشہ رشک آتا ہے...... تم پر قسمت بہت مہربان ہے...... تم ہماری کلاس میں اس وقت سب سے زیادہ ہینڈسم، سمارٹ لڑکے ہو۔ اور ممی تمہاری منسٹر...... ڈیڈی بزنس مین...... اسٹرونگ فیملی بیک گراؤنڈ...... یو آر...... رئیلی ویری لکی......'' ارسلان نے مسکراتے ہوئے کھلے دل سے اس کی تعریف کی تو سب ارسلان کے ''توجہ دلاؤ نوٹس'' کی مانند شہیر کی طرف بغور دیکھنے لگے۔

واقعی وہ بے حد خوبصورت تھا۔ دراز قد، گندمی رنگت، خوبصورت نقوش و خدوخال اور قدرے براؤن گھنگریالے بال، گہری مونچھیں...... وہ پہلی نظر میں ہی ویل گرومڈ پرسنالٹی لگتا...... اس کے مینرز اور بات کرنے کے انداز میں ایک مخصوص سٹائل تھا۔ وہ نہ کبھی کسی کے ساتھ زیادہ فرینک ہوا تھا اور نہ ہی کسی کو زیادہ بڑھانے کا موقع دیتا تھا۔ لڑکیوں سے اس کی اچھی ہیلو ہائے بھی تھی مگر کوئی بھی اس حد تک نہ بھائی تھی کہ وہ کسی کے بارے میں سنجیدگی سے سوچتا۔

مگر زل کی بات اور تھی...... زل کو جب سے دیکھا تھا وہ اس کے حواسوں پر چھائی تھی...... زل جب پہلے دن کلاس میں داخل ہوئی تو شہیر

نے ہڑ بڑا کر اسے یوں دیکھا تھا جیسے اس کے ذہن میں سمائی اور دل میں بسی کوئی خیالی تصویر، حقیقت میں انسانی روپ دھار کر اس کے سامنے آ کھڑی ہو......اور وہ انتہائی حیرت سے اپنی آنکھیں مل مل کر اسے دیکھ رہا ہو......

''ہائے......'' زل نے مسکرا کر اسے کہا تو وہ یوں چونکا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔

''ہائے......'' وہ آہستہ آواز میں بولا اور وہاں سے چلا گیا......زل اسے دیکھتی رہ گئی۔

پینتیس کے قریب سٹوڈنٹس کی کلاس میں بیس لڑکیاں اور پندرہ لڑکے تھے۔ رفتہ رفتہ سب میں بہت دوستی ہونے لگی......مگر......زل اور شہیر میں زیادہ فرینکنس نہ ہو پائی۔ وہ جب بھی ملتے......تو......''ہیلو......ہائے یا ہاؤ آر یو'' کے مخصوص جملوں کے علاوہ کبھی بھی زیادہ بات نہ کر پاتے۔ زل کو دیکھ کر شہیر کی آنکھیں یکدم چمکتیں......اور وہ اسے اس انداز سے دیکھتا جیسے زل کے لئے بے شمار ان کہے جذبے اور بہت سی محبت اس کی آنکھوں میں سمٹ آتی ہو۔ اس محبت اور ان جذبوں میں کتنی گہرائی تھی...... یہ صرف وہی جانتا تھا۔ زل کو کبھی بھی ان کی گہرائی اور شدت کا اندازہ نہ ہو پایا تھا۔

☆

پروفیسر رضا ربانی بہت تنقیدی انداز میں تمام سٹوڈنٹس کے بنائے ہوئے Sculptures کے بارے میں ڈسکشن کر رہے تھے۔ وہ باری باری سب کے Sculptures دیکھنے کے بعد کلاس روم کے عین وسط میں کھڑے ہو گئے، سب سٹوڈنٹس انکی طرف پر اشتیاق نظروں سے دیکھنے لگے۔

''سوائے ایک ماڈل کے......سب ماڈلز کے Facial expressions میں وہ گہرائی نہیں جو ہونی چاہئے۔'' پروفیسر ربانی نے کہا۔

''اور......سر......وہ ماڈل یقیناً مس زل کا ہوگا۔'' ارسلان جلدی سے بولا۔

''نہیں......وہ ماڈل شہیر کا ہے۔'' پروفیسر صاحب نے پرستائش نگاہوں سے شہیر کی طرف دیکھ کر کہا تو سب حیران رہ گئے......شہیر کو بھی اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

You know "Best art of the world is unconscious art"

یہ مشہور جملہ تو سب نے سنا ہوگا......اور یہ حقیقت بھی ہے...... جب کوئی آرٹسٹ کسی شے کو تخلیق کر رہا ہوتا ہے تو اس وقت وہ ہر قسم کی سوچ سے بے خبر ہو کر صرف اور صرف تخلیق کے پروسیس میں سے گزر رہا ہوتا ہے۔

اور اس وقت وہ سب کچھ بھلا کر جتنی گہرائی، جتنی لگن اور توجہ سے اس میں انوالو ہوگا......وہ اس کی تخلیق کا مقام متعین کرے گی......اور وہ لگن، وہ گہرائی اس کی تخلیق کے کسی نہ کسی پہلو سے ضرور ظاہر ہوگی......میوزک ہے تو اس کی دُھن اور سوز کی گہرائی سے آپ خود بخود جان جائیں گے......کہ اس کا مستقبل کیا ہوگا......اسی طرح آرٹ کی ہر برانچ میں آپ اس Rule کو اپلائی کر سکتے ہیں۔ شہیر کے ماڈل میں Facial Expressions بہت اسٹرونگ ہیں۔ ماڈل کے آئی بروز کی شیپ اور آنکھوں میں Eye Balls کی ٹھہری مومنٹ کا اینگل ہی اس کے

اندرونی تاثرات کی گہرائی کا بتاتا ہے۔سب اپنے ماڈلز کی آئی بالز دیکھیں بہت سپاٹ لگ رہی ہیں اور چہرے پر مختلف شکنیں ،لائنیں چہرے کے تاثرات کو اسٹرونگ میز میں واضح کرتی ہیں......اور اس میں بہت حد تک آرٹسٹ کی پرسنالٹی اور اس کے اندرونی تاثرات کی جھلک بھی نمایاں ہوتی ہے۔

ان ماڈلز کے ساتھ ان کے آرٹسٹ نہ بھی کھڑے ہوں تو ہم ان ماڈلز سے ان کے آرٹسٹوں کی پرسنالٹی جج کر سکتے ہیں۔زل کا ماڈل بہت ایکسیلنٹ ہے،مگر ظاہری طور پر......فیچرز بہت اچھے انداز میں carved out ہوئے ہیں مگر تاثرات میں کمی کا احساس نمایاں ہوتا ہے......شاید اس لئے کہ Male Model کو بناتے ہوئے زل کے ذہن میں ماڈل کی سائیکی تک رسائی نہیں ہوئی......زل کا ماڈل ایک خوبصورت مگر سپاٹ چہرہ لئے ہوئے لگتا ہے اور شہیر کے ماڈل کے فیچرز نارمل ہیں،مگر تاثرات گہرے ہیں اور یہ ایک سنجیدہ مزاج ماڈل بھرپور تاثرات لئے ہوئے نظر آتا ہے۔

یہ بات ہر آرٹسٹ کی آبزرویشن اور فیس ریڈنگ کی صلاحیت کو ظاہر کرتی ہے اور چہرے کے تاثرات دینے کے لئے اسٹرونگ فیس ریڈنگ بہت ضروری ہے......اور فیس ریڈنگ کے لئے اسٹرونگ آبزرویشن......اور آبزرویشن کے لئے ادراک (Preception) بہت اسٹرونگ ہونی چاہئے......اور ادراک کو مضبوط کرنے کے لئے کسی کی سائیکی اور سائیکی کو جاننے کے لئے اس کے دل تک رسائی ہونا بہت ضروری ہے۔'' پروفیسر ربانی نے کہا۔

''سر......یہ تو بہت Campliicated chain ہے۔'' اس کا مطلب ہے ایورج IQ رکھنے والا شخص اچھا آرٹسٹ نہیں بن سکتا۔'' عمر مصطفیٰ نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں......ایسی بھی بات نہیں......بہت ایورج آرٹسٹس بھی Excell کر رہے ہیں......لیکن آرٹ کی دوسری فیلڈز میں مگر Sculpture Making اور پورٹریٹس بنانے میں یہ پوائنٹس بہت اہم ہیں......'' پروفیسر ربانی نے بتایا۔

''سر......کیا......قدرت بھی انسانوں کو بناتے ہوئے ان باتوں کو مدنظر رکھتی ہے۔'' ارسلان نے اچانک سوال کیا تو سب چونک کر اسے دیکھنے لگے۔

'' پروفیسر ربانی نے اس کی طرف بغور دیکھا اور خاموش ہو گئے ،قدرے توقف کے بعد اسے دیکھتے ہوئے بولے۔

''ہاں......ان کے جینز میں کسی حد تک یہ بات پوشیدہ ہوتی ہے کہ یہ کس قسم کا انسان ہوگا......سنجیدہ،مزاحیہ،شکی یا جیسا بھی ہو......جیسے جیسے بچے کی گروتھ ہوتی جاتی ہے۔اس کا مزاج واضح ہونا شروع ہو جاتا ہے۔آپ اس کی حرکات دیکھ کر بتا سکتے ہیں کہ یہ مستقبل میں کیسا انسان ہوگا، کچھ بچے بچپن میں بہت خاموش اور جوان ہو کر بہت Jolly جبکہ کچھ بچپن میں بہت خوش مزاج ہوتے ہیں اور جوان ہو کر بہت سنجیدہ ہو جاتے ہیں۔

قدرت بہت ماہرانہ انداز میں ایک چیز کا لنک دوسرے سے جوڑتی ہے اور دونوں کے ملاپ سے پیدا ہونے والی چیز کی باطنی خصوصیات کا سراپا اسرار انداز میں اس شے کے اندر رکھتی ہے۔دل کس بات سے اچانک خوش ہوتا ہے اور کس بات پر ناراض ہو جاتا ہے۔اس کی کوئی توجیہہ نہیں۔اچانک رونما ہونے والی صورتحال میں ایک انسان کا ردعمل کیا ہوگا......یہ شاید کوئی انسان خود بھی یقینی طور پر نہیں جانتا۔اس لئے انسان کے اندر کے احساسات اور جذبات کو چہرے کے تاثرات بہتر طور پر بیان کرتے ہیں اور خاص طور پر آنکھیں غم وخوشی کی بہتر عکاس ہوتی ہیں۔شہیر کے ماڈل میں

آئی بالز کی موومنٹ کا مت ٹھہرا اینگل خوبصورت ہے۔''

سر رضا ربانی نے پھر شہیر کی تعریف کی تو وہ سر جھکا کر مسکرانے لگا۔سب سٹوڈنٹس نے پرستائش انداز میں شہیر کی طرف دیکھا۔

''اوکے...... سٹوڈنٹس...... آپ سب نے بہت اچھا کام کیا...... ویل ڈن اینڈ کیپ اٹ اپ۔ اور یہ ذہن میں رکھیں پریکٹس ہمیشہ Skill کو چار چاند لگاتی ہے...... گڈ لک''۔ پروفیسر ربانی کہہ کر کلاس روم سے باہر چلے گئے اور سب سٹوڈنٹس شہیر کے ماڈل کے ارد گرد اکٹھے ہو کر اسے بغور دیکھنے لگے اور اب انہیں اپنے ماڈلز اور شہیر کے ماڈل میں فرق واضح طور پر نظر آنے لگا ورنہ اس سے قبل سب زل کے ماڈل کی بھرپور تعریف کر رہے تھے۔ زل شہیر کے ٹیلنٹ کی معترف ہوگئی اور اس کی بھرپور انداز میں تعریف کرنے لگی اور وہ اس کے منہ سے تعریف سن کر مسرور ہونے لگا۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے زل کے ایک ایک لفظ پر وہ ہوا میں اڑ رہا ہو...... اس کے اندر ایک عجیب سی سرشاری پیدا ہونے لگی اور وہ محبت پاش نگاہوں سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔

☆

شہیر کا کمرہ کم کباڑ خانہ زیادہ بنا ہوا تھا۔ ہر طرف اس کی بنائی ہوئی پینٹنگز، مجسمے، Bust، ایزل اور کلرز بکھرے ہوئے تھے۔ وہ اس کا روم کم، اس کا سٹوڈیو زیادہ لگ رہا تھا۔ مسز فاخر نے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جھانکا تو وہ دنگ رہ گئیں۔ شہیر بیڈ پر لیٹا چھت کو گھور رہا تھا، مگر اس کے چہرے پر خوشی اور لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ مسز فاخر اسے بغور دیکھتی رہیں اور پھر دروازہ کھول کر اندر آ گئیں۔ شہیر بے خبر اپنی سوچوں میں گم چھت کو گھورتا رہا۔

''شہیر...... یہ تم نے کمرے کی کیا حالت بنا رکھی ہے...... اور تم کن سوچوں میں گم ہو؟'' مسز فاخر کے چہرے پر خفگی کے تاثرات نمایاں ہونے لگے اور وہ قدرے درشت لہجے میں بولیں۔

''اوہ...... آئی ایم سوری...... ممی......'' شہیر گھبرا کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔

''جب میں نے تمہاری ایکٹویٹیز کے لئے سپیشلی آرٹ سٹوڈیو بنوایا ہے تو پھر تم بیڈ روم کو کیوں استعمال کرتے ہو...... کیا یہ کسی منسٹر کے بیٹے کا بیڈ روم لگ رہا ہے...... ویری ہوپ لیس'' مسز فاخر غصے سے بولیں۔

''ممی...... آئی ایم سوری...... لیکن میں یہاں زیادہ Comfortable محسوس کرتا ہوں۔'' وہ آہستہ آواز میں بولا۔

''دیکھو بیٹا...... زندگی میں آگے بڑھنے کے لئے چیزوں کو ان کی مناسب جگہ پر اور وقت کو ٹائم ٹیبل کے مطابق استعمال کرنا بہت ضروری ہے۔ جس زندگی میں ڈسپلن نہیں ہوتا...... وہ ہیومن نہیں اینمل لائف ہوتی ہے...... انسان اور حیوان کی زندگی میں یہی فرق ہے۔'' مسز فاخر نے اسے اپنے انداز سے سمجھانے کی کوشش کی۔

''مگر...... ممی...... انسان تو خود ہی بہت Unpredictable ہے وہ اگلے لمحے میں کیا کرے گا...... اور کیسے React کرے گا۔ یہ تو وہ خود بھی نہیں جانتا۔'' شہیر نے آہستہ آواز میں کہا تو مسز فاخر نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

''بیٹا...... ہر انسان جانتا ہے کہ اسے کسی وقت بھی موت آ سکتی ہے۔ شاید اگلے لمحے ہی...... مگر وہ یہ سوچ کر نہ تو کوئی زندگی گزارنا چھوڑتا

ہے...... نہ اس کی پلاننگ کرنا اور نہ ہی اس کی انجوائے منٹس...... اس لئے بیٹا...... تمہاری اس بات میں کوئی Logic نہیں...... جب تک زندگی ہے...... اس کو اس کے تمام لوازمات کے ساتھ گزارنا پڑتا ہے۔ میں عذرا کو بھیج رہی ہوں، وہ آکر کمرے کی صفائی کر دیتی ہے اور دوبارہ یہاں مجھے گندگی نظر نہ آئے...... اپنے میٹر کو اپنے سٹوڈیو تک محدود رکھو۔'' مسز فاخر کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئیں اور شہیر نے گہری سانس لی۔

ممی شروع سے Dominating تھیں...... گھر میں بڑی بیٹی اور سسرال میں بڑی بہو ہونے کے ناطے ہر کسی پر ان کا رعب تھا اور ویسے بھی قدرت نے ان کی پرسنالٹی میں رعب کا عنصر کچھ زیادہ ہی نمایاں رکھا تھا، اس لئے ہر کوئی ملنے والا بھی ان کی بارعب شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ مسز فاخر نے زندگی میں بہت جدوجہد کی تھی۔ ایک عام پارٹی ورکر سے وہ ایک منسٹر بنی تھیں اور انہوں نے زندگی کے بہت نشیب وفراز دیکھے تھے اس لئے وہ لائف میں بہت پریکٹیکل ہو کر سوچتی تھیں۔ شہیر کی آرٹ میں دلچسپی انہیں ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ ان کے نزدیک لڑکوں کو کسی پریکٹیکل فیلڈ میں نام پیدا کرنا چاہیے۔ اس کے برعکس ان کا بڑا بیٹا سمیر ان کی توقعات کے عین مطابق تھا، وہ انگلینڈ میں ایم بی اے کر رہا تھا اور اسٹڈیز میں بہت اچھا تھا۔ مسز فاخر سمیر کی ایکٹویٹیز کو بھی پسند کرتی تھیں۔ وہ گالف، سنوکر اور بیڈمنٹن کا بہت اچھا پلیئر تھا۔ ہارس رائیڈنگ، ہائیکنگ، سوئمنگ کرتا تھا، اس کے علاوہ پارٹیز اور لائف میں تھرل کا قائل تھا۔ جبکہ شہیر کو آرٹ اور کلاسیکل میوزک سے بہت لگاؤ تھا۔ وہ بہت کم گو اور تنہائی پسند تھا۔ سمیر Extrovert تھا اور شہیر Introvert قسم کا انسان تھا۔ سمیر Loud تھا۔ اپنے غم وغصے اور محبت کے اظہار میں بے حد پوزیسو اور Show off کا قائل تھا جبکہ شہیر اپنے جذبات کو دوسروں سے چھپا کر دل تک محدود رکھنے کا عادی تھا۔ سمیر جب بھی انگلینڈ سے گھر میں آتا تو گھر میں ہر طرف شور وہنگامہ برپا ہو جاتا جبکہ شہیر کے ہونے یا نہ ہونے سے کسی کو کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ شہیر کی زیادہ دوستی ڈیڈی کے ساتھ تھی اور ڈیڈی زیادہ تر گھر سے باہر ہی رہتے۔ جب شہیر فارغ ہوتا تو ڈیڈی مصروف ہوتے اور اگر وہ مصروف ہوتا تو ڈیڈی فارغ...... اس لئے دونوں بہت کم ایک دوسرے سے کھل کر بات کر پاتے...... شہیر کی ممی سے بہت کم انڈرسٹینڈنگ تھی۔ ممی اسے ہمیشہ پریکٹیکل اور ڈسپلنڈ ہونے کا درس دیتیں۔ ایک تو ان کی سیاسی زندگی کی وجہ سے ان کے پاس وقت کم ہوتا اور اگر کبھی وقت ملتا تو وہ اسے اخلاقی سبق دیتی رہتیں، وہ کبھی اس کے اندر جھانک کر نہ دیکھتیں۔

شہیر کو ہمیشہ اپنے گھر، اپنے دل اور اپنے اندر محبت کی کمی کا شدید احساس ہوتا، اس کے پاس دنیا کی ہر نعمت تھی بلکہ ہر شے کی فراوانی تھی مگر اس کا دل ہر وقت اداس رہتا، اسے کوئی چیز، کوئی نعمت اور آسائش مطمئن نہ کر پاتیں۔ اس کا دل ہر وقت مضطرب اور بے چین رہتا...... اس نے آرٹ کا شعبہ بھی اس لئے منتخب کیا کیونکہ وہ اسے اپنے اندر کے جذبات کا بہتر عکاس لگا۔ اسی لیے وہ اپنے اندر اٹھنے والے شوریدہ سر جذبوں، ہیجانی خیالات اور گھمبیر احساسات کو اپنے آرٹ اور فن کے ذریعے بہترین انداز میں ان کا اظہار کرتا ہے اور ممی کو یہ وقت کا زیاں لگتا تھا۔

☆

زل اور شہیر کی ہر روز کسی نہ کسی موضوع پر کافی ڈسکشن ہوتی۔ وہ کبھی آرٹ کے مختلف پہلوؤں کو زیر بحث لاتے، کبھی نیچر اور کبھی انسانی نفسیات پر خوب ڈسکشن کرتے۔ شہیر بھی زل کی کمپنی بہت انجوائے کرتا، اسے محسوس ہوتا جیسے زل اور وہ ذہنی طور پر ایک دوسرے کے بہت قریب ہوں۔ اسے اندر ہی اندر طمانیت کا گہرا احساس مسرور رکھتا کہ جیسی لڑکی وہ اپنے تخیل میں سمائے بیٹھا تھا، اسے ویسی ہی لڑکی زل کی صورت میں مل گئی تھی۔

''شہیر تمہارا چہرہ بہت منفرد چہرہ ہے......'' زل شہیر کا پورٹریٹ بناتے ہوئے۔ بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر بولی۔

''کیا ہے اس میں......؟'' شہیر اس کے سامنے اسٹول پر ماڈل بنا بیٹھا تھا۔ زل کے جملے پر اس نے چونک کر پوچھا۔

''چہرے پر سنجیدگی اور آنکھوں میں کچھ...... آئی ڈونٹ نو...... کچھ بہت ڈفرنٹ ہے۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتا...... کیسے Explain کروں......'' زل قدرے جھنجلا کر بولی۔

''کیا مطلب......؟'' شہیر نے حیرت سے پوچھا۔

''مجھے کبھی کبھی تمہیں دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے...... جیسے تم وہ نہیں ہو...... جو...... تم نظر آتے ہو...... تم بہت مسٹیریس لگتے ہو...... تمہاری آنکھیں...... اور ان میں چھائی اداسی...... تمہاری پرسنالٹی کا ساتھ نہیں دیتی......'' زل نے اس کی آنکھوں میں بہت گہرائی سے جھانکتے ہوئے کہا۔

''اچھا...... اس سے پہلے تو مجھے کسی نے ایسا نہیں کہا۔'' شہیر ٹالنے کے انداز میں بولا۔

''شاید تمہیں پہلے کسی نے اس نظر سے دیکھا ہی نہیں ہو......'' زل اپنی ہی لے میں بولی۔

''کس نظر سے......؟'' شہیر نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

تو وہ ایک دم ٹھٹکی اور چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

''آئی مین...... ایک آرٹسٹ کی نظر سے'' اس نے جلدی سے بات بدلی۔

''ہاں...... ممکن ہے...... مگر...... ہر آرٹسٹ بھی تو اس نظر سے نہیں دیکھتا جس نظر سے تم دیکھ رہی ہو۔'' نادانستہ جملہ شہیر کے منہ سے نکلا۔

''کیا مطلب......؟'' زل نے چونک کر پوچھا۔

''میرا مطلب ہے...... کین آبزرویشن سے......'' شہیر گڑبڑا کر بولا۔

زل خاموشی سے اس کا پورٹریٹ بنانے میں مصروف ہو گئی اور شہیر مسلسل اسے دیکھتا رہا۔

''بھئی...... یہ پراجیکٹ کب تک چلے گا...... کوئی ہم غریب، غرباء کو بھی پوچھ لیا کرے۔'' ارسلان اچانک گراؤنڈ کے قریب ٹیرس پر کھڑے ہوتے ہوئے بولا تو شہیر نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا۔

''سربانی کا حکم ہے...... اب ہم کیا کر سکتے ہیں؟'' زل نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔

''سربانی بالکل بھی خدا ترس نہیں...... کبھی چیریٹی کے طور پر ہی ہم غریب، غرباء کو بھی کسی ایسے پراجیکٹ میں شامل کر لیا کریں...... مگر انہیں بھی ہم پر رحم نہیں آتا...... اور میں ڈرتے ہوئے ان سے بات نہیں کرتا...... کہیں نہ کہہ دیں ''میاں...... یہ...... منہ دھو کر رکھو......'' حالانکہ ہر روز رگڑ رگڑ کر یہ منہ دھوتا ہوں...... پھر بھی دھونے والا ہی لگتا ہے۔'' ارسلان نے ہنستے ہوئے کہا تو زل نے بھرپور قہقہہ لگایا۔ وہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہی تھی، آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے اور شہیر بھی ان کی باتیں سن کر مسکرانے لگا۔

''یار تم لوگوں کا کتنا کام رہ گیا ہے...... مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے...... میں تو کیفے ٹیریا جا رہا ہوں۔'' ارسلان منہ بنا کر بول

''آج کا کام تو بس تھوڑا سا رہ گیا ہے..... تم چائے کا آرڈر دو ہم آتے ہیں......'' زل نے کہا تو ارسلان مسکراتا ہوا چلا گیا۔

''ارسلان جیسے زندہ دل اور ہنستے مسکراتے لوگ زندگی میں فلیور (Flavour) کا کام کرتے ہیں اور اسے خوشگوار بناتے ہیں۔'' زل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں..... "He's very optimistic" زل تم میرا پورٹریٹ بنانے میں کتنا ٹائم لگا رہی ہو۔'' شہیر نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''اس لئے..... کہ..... یو..... آر ویری ڈیپ..... اور ڈیپ لوگوں کے Expressions بہت Carefully بنانا پڑتے ہیں۔'' زل نے کہا اور اپنا سامان سمیٹنے لگی۔

''آئی ڈونٹ تھنک سو......'' شہیر نے گھمبیر مسکراہٹ سے کہا۔

''اچھا..... تو..... تم میرا پورٹریٹ بنانے میں کتنا ٹائم لو گے؟'' زل نے شہیر کے ہمراہ چلتے ہوئے پوچھا۔

''صرف دو دن.....'' شہیر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''ریئلی..... اٹس امیزنگ......'' زل نے حیرت سے پوچھا۔

''اس لئے کہ تمہارے Expressions کو سمجھنا میرے لئے مشکل نہیں۔'' شہیر نے کہا۔

''کیا..... کسی کے دل تک پہنچنا تمہارے لئے آسان ہے؟'' زل نے حیرت سے معنی خیز انداز میں پوچھا تو شہیر اس کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔

''کسی اور کے بارے میں دعویٰ تو نہیں کرتا مگر تمہارے بارے میں کسی حد کہہ سکتا ہوں...... ''ہاں'' ......'' شہیر نے بھی معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا تو زل خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگی اور دونوں مسکراتے ہوئے کیفے ٹیریا کی طرف چلے گئے۔

☆

زل بہت سنجیدہ موڈ میں اسٹول پر بیٹھی تھی جب شہیر اس کا پورٹریٹ بنا رہا تھا۔ وہ ایک ٹک اس کی جانب دیکھتا اور پھر کام میں مصروف ہو جاتا۔ زل نجانے کس سوچ میں ڈوبی تھی کہ اس کی آنکھوں میں نمی سی تیرنے لگی۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی اپنے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے انگلیوں کے ناخنوں کو بجا رہی تھی۔ شہیر نے اس کی نم آنکھوں کی جانب دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ مگر اس کا پرسنل معاملہ سمجھتے ہوئے اس نے پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ البتہ وہ بار بار اس کی جانب دیکھتا رہا۔ بارہا پوچھنے کی کوشش کرتا مگر پھر خاموش رہ جاتا۔

''زل..... پلیز اپنا چہرہ سیدھا رکھو۔'' شہیر نے کہا تو اس نے ہڑبڑا کر اس کی جانب دیکھا جیسے کسی خیالی دنیا سے حقیقی دنیا کی طرف لوٹی ہو..... اور..... اسے اپنے آنکھوں میں اترنے والی نمی کا احساس بھی اچانک ہوا ہو..... اس نے اپنی نم آنکھوں کو اپنی انگلیوں کی پوروں سے صاف کیا اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ شہیر کو محسوس ہوا جیسے وہ اس لمحے اندر سے بہت دکھی ہو رہی ہو مگر وہ پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

''شہیر..... پلیز..... آج کا کام وائنڈ اپ کر دو..... میری طبیعت ٹھیک نہیں..... میں بریک چاہتی ہوں۔'' زل آہ بھر کر اٹھی اور شکست

خوردہ لہجے میں اسے کہا۔

''ٹھیک ہے...... باقی کا کام کل کرلیں گے......'' شہیر نے کہا۔

''تھینک یو......'' زنل کہہ کر وہاں سے چلی گئی اور شہیر اس کے بارے میں سوچتا رہ گیا۔

''ضرور...... کوئی بہت بڑی پرابلم ہوگی...... جو...... زنل یوں پریشان ہے، ورنہ وہ تو بہت Lively لڑکی ہے۔'' شہیر نے افسردگی سے سوچا اور ایزل اٹھا کر کلاس روم میں چلا گیا۔

پروفیسر مسز عطیہ رحمٰن کی کلاس اٹینڈ کرنے کے بعد وہ کیفے ٹیریا کی طرف گیا۔ کیفے ٹیریا کے ایک کونے میں زنل اور ارسلان بیٹھے تھے۔ زنل رو رہی تھی اور ارسلان اسے چپ کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ آج دونوں نے مسز عطیہ کی کلاس بنک (Bunk) کی تھی۔ شہیر ان کے پاس گیا تو زنل نے جلدی سے اپنے آنسو صاف کیے اور اپنا بیگ اٹھا کر وہاں سے جانے لگی۔

''کہاں جا رہی ہو...... پلیز بیٹھی رہو......'' ارسلان نے کہا۔

''اگر میں انٹرفیئر کر رہا ہوں تو میں دوسری ٹیبل پر بیٹھ جاتا ہوں۔'' شہیر نے شائستگی سے کہا۔

''نہیں...... یار ایسی کوئی بات نہیں۔'' ارسلان نے کہا تو زنل خاموشی سے بیٹھ گئی۔ اس کی خوبصورت جھیل سی آنکھوں میں گلابی ڈورے نمایاں ہو رہے تھے اور آنکھیں متورم ہونے کی وجہ سے مزید بڑی اور خوبصورت لگ رہی تھیں۔ اس کی خوبصورت ستواں ناک رونے کی وجہ سے سرخ ہو رہی تھی۔ شہیر نے اس کی طرف گہری نگاہوں سے دیکھا اور خاموش ہو گیا۔

''یار...... شہیر...... تم ہی بتاؤ...... زندگی میں ہر پرابلم کا کوئی نہ کوئی حل ہوتا ہے نا......'' ارسلان نے گویا اپنے کسی دعوے کی تصدیق کے لئے شہیر سے رائے طلب کی۔

''نہیں...... بہت سی پرابلمز کا کوئی حل نہیں ہوتا۔'' شہیر نے اپنی رائے دی۔

''لو...... یک نہ شد دو شد...... میں زنل کو قائل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ ہر پرابلم کا کوئی نہ کوئی حل ہوتا ہے اور تم کہہ رہے ہو...... نہیں......'' ''تم دونوں ایک جیسا کیوں سوچتے ہو...... سوائے میری شکل کے بدلنے کے...... باقی ہر پرابلم کا حل موجود ہے۔'' ارسلان نے شوخ لہجے میں کہا تو زنل نم آنکھوں کے ساتھ ہنس پڑی، شہیر بھی مسکرا دیا۔

''ویسے مذاق کے علاوہ...... بات یہ ہے...... کہ جب انسان اپنے آپ کو کسی بند گلی میں پاتا ہے اور اسے کسی پرابلم کا کوئی حل نظر نہیں آتا...... تو اچانک کہیں نہ کہیں اللہ ضرور کوئی نہ کوئی اس کے لیے راستہ بنا دیتا ہے کہ وہ پرابلم solve ہو جاتی ہے۔ یہ میرا عقیدہ اور ایمان ہے اور میں اپنے عقیدے میں بہت Firm ہوں۔'' ارسلان نے کہا۔

''اپنی اپنی سوچ کی بات ہے اور ہر ایک کا کچھ نہ کچھ عقیدہ تو ضرور ہوتا ہے۔'' شہیر نے جواب دیا۔

''تم عقیدے کو سوچ سے علیحدہ کیوں سمجھتے ہو......؟ اچھا تم ہی بتاؤ...... تم عقیدہ کس کو کہتے ہو؟'' ارسلان نے پوچھا۔

''کسی بھی بات کو سچ جانتے ہوئے اس کو تمام تر سچائیوں کے ساتھ ماننا...... دل سے اور دماغ سے۔'' شہیر نے جواب دیا۔

''اور زل...... تم بتاؤ۔'' ارسلان نے پوچھا۔

''ڈونٹ آسک می (مجھ سے مت پوچھو)'' وہ افسردگی سے بولی۔

''زل کو آج رہنے دیتے ہیں۔ آج اس کا عقیدہ آنسوؤں کے جزیرے میں ڈوبا ہوا ہے...... پھر کسی روز اس سے پوچھیں گے۔

''شہیر تم نے ٹھیک کہا مگر تم نے سوچ کو عقیدے سے علیحدہ کیوں کیا...... ہر عقیدے کی بنیاد سوچ ہی ہے...... اپنی اس سوچ کو سچ ماننا اور دل ودماغ کو اس پر گواہ بنا کر اس کی حفاظت کرنا۔ یہی سچا عقیدہ ہے اور میرا عقیدہ یہ ہے کہ خدا ضرور کبھی نہ کبھی بند گلی میں بھی راستہ پیدا کر دیتا ہے۔'' ارسلان نے کہا۔

''شاید ایسا ہی ہوتا ہو......'' شہیر نے جواب دیا۔

''یعنی کہ تم اس بات سے متفق نہیں ہو۔'' ارسلان نے پوچھا۔

''انسان زندگی کے بارے میں ویسا ہی رویہ اپناتا ہے، جیسے زندگی اسے ٹریٹ کرتی ہے۔'' شہیر نے کہا۔

''تو کیا...... تم بھی کسی بند گلی میں ہو...... جس میں کوئی راستہ نہیں......'' ارسلان نے حیرت سے پوچھا۔

''معلوم نہیں......'' شہیر نے آہ بھر کر جواب دیا تو زل نے چونک کر دونوں کو دیکھا۔

''کیا...... تمہیں اس میں کسی نئے راستے کی کوئی امید نہیں۔'' ارسلان نے پوچھا۔

''میں اس کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں؟'' شہیر نے سنجیدگی سے کہا۔

''یہی سوچ...... بالکل یہی سوچ تمہارے عقیدے کی کمزوری اور پختگی کو ظاہر کرتی ہے...... تم اس میں Firm نہیں ہو۔'' ارسلان نے ٹیبل پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''یار اب چائے کا آرڈر دو...... یا...... پھر عقیدہ پختہ کروا کے...... آرڈر دو گے۔'' شہیر نے کہا تو ارسلان نے چائے کا آرڈر دیا۔

زل مکمل طور پر خاموش تھی۔ چائے پیتے ہوئے بھی اس نے کسی قسم کی کوئی بات نہ کی۔

''اب میں چلتی ہوں...... ڈرائیور میرا انتظار کر رہا ہوگا۔'' زل بیگ اٹھاتے ہوئے بولی۔

''اوکے...... گڈ لک...... اینڈ پلیز بی پازیٹو'' ارسلان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اوکے......'' وہ مایوسی سے ہونٹ سکوڑتے ہوئے بولی۔

''مس زل...... ایسے مایوس لہجے میں اچھی چیزیں اور کام بھی ہوتے ہوتے رہ جاتے ہیں...... پازیٹو...... مینز (Means)...... پازیٹو...... اینڈ ہنڈرڈ پرسنٹ پازیٹو'' ارسلان نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ مسکرا دی اور خوشی کی ایک لہر اس کے چہرے پر دوڑ گئی۔ اس کے چہرے کے تاثرات ایک دم بدل گئے۔ اس کی آنکھوں میں بھی امید کے دیئے جگمگانے لگے اور وہ وہاں سے چلی گئی۔

''دس از ہوپ ان لائف......'' ارسلان نے کہا تو شہیر بھی مسکرا دیا۔

''شہیر...... جانتے ہو...... جب امید زندگی سے ختم ہو جاتی ہے تو کیا ہوتا ہے......؟'' ارسلان نے انتہائی سنجیدگی سے پوچھا۔

''کیا ہوتا ہے......؟'' شہیر نے حیرت سے پوچھا۔

''پھر انسان...... انسان نہیں رہتا...... وہ پھر سے مٹی کا مجسمہ بن جاتا ہے...... بے رنگ، ساکن اور ساکت وجود جو ذرا سی ٹھوکر سے گر کر ریزہ ریزہ ہو جائے...... اور خدا نے مٹی کے مجسمے کو زندگی کی حرارت دی...... اس میں حرکت پیدا کی...... اسے متحرک کیا...... اسے چلتا پھرتا وجود بنایا...... تاکہ وہ ہر قدم پُر امید ہو کر اٹھائے جانتے ہو انسان ستر ہزار پرت کا مجموعہ ہے اور ہر پرت میں اک گہرا راز چھپا ہے...... اور ہر راز میں اک ''امید'' چھپی ہے......'' ارسلان نے چائے کا آخری گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔

''یار...... تمہاری انسانوں کے بارے میں بہت زیادہ ریسرچ ہے۔'' شہیر نے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔

''اوں...... ہوں...... ایک پرسنٹ بھی مکمل نہیں...... بس تھوڑی سی ہے...... جانتے ہو جب انسان کی پرسنالٹی میں کوئی نیگٹو پہلو ہوتا ہے تو وہ اس کی تسکین کیسے کرتا ہے......؟'' ارسلان نے پوچھا۔

''کیسے......؟'' شہیر نے حیرت سے پوچھا۔

''یا تو وہ ناامید، ہو کر ڈپریشن کا شکار ہو جاتا ہے...... یا پھر پرامید، ہو کر پازیٹو سوچنا شروع کر دیتا ہے۔ میں نے جب لائف میں بہت ڈپریشن آبزرو کیا...... تو...... پھر میں نے پازیٹو ہو کر سوچنا شروع کیا...... اور پھر ہر بند گلی میں ایک راستہ بننا شروع ہو گیا۔'' ارسلان نے مسکراتے ہوئے کہا اور دونوں کیفے ٹیریا سے باہر آ گئے۔

شہیر نے ایک دو بار زل کا نام اس کے سامنے لیا تاکہ ارسلان اسے زل کے بارے میں کچھ بتائے مگر ارسلان ہر بار بات کا رخ بدل دیتا۔

☆

زل کیوں رو رہی تھی......؟ اس کی آنکھوں میں کیسی اداسی چھائی ہوئی تھی۔ اس کا فیملی بیک گراؤنڈ بھی بہت اچھا ہے۔ وہ اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ چار بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی اور سارے بھائی اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ پھر زل کو کیا پریشانی ہو سکتی ہے۔ شہیر رات بھر اس کے بارے میں سوچتا رہا۔

''مجھے زل سے کچھ پوچھنا چاہئے تھا...... اس کی پرابلمز شیئر کرنا چاہئیں تھیں، مگر میں خود کیسے اس کے ذاتی معاملات میں مداخلت کرتا......'' شہیر نے خود ہی اپنی سوچ کی تردید کی۔

زل اس کے سامنے بیٹھی تھی اور وہ اس کے پورٹریٹ کو فائنل ٹچ دے رہا تھا۔ آج وہ پہلے کی طرح غیر مطمئن نہ تھی بلکہ اس کی آنکھوں اور چہرے پر طمانیت کا گہرا احساس نمایاں تھا۔ شہیر نے پورٹریٹ مکمل کر کے اسے دکھایا تو وہ دیکھ کر چونک گئی۔

''یہ...... یہ...... کیا؟ تم نے میری آنکھوں میں اتنی اداسی کیسے بھر دی؟'' زل نے حیرت سے پوچھا۔

''کل تم اتنی ہی اداس تھیں۔'' شہیر نے بتایا تو وہ چونکی اور اسے دیکھ کر ایک دم خاموش ہوگئی۔

''مگر...... کل کی فیلنگز ہمیشہ کے لیے تو نہیں تھیں...... اور پورٹریٹ تو مستقبل میں بھی دیکھا جاتا ہے۔'' زل نے قدرے شکایتی لہجے میں کہا۔

''زل...... تخلیقی لمحے بہت اہم ہوتے ہیں...... جب کوئی تخلیق کار کوئی شے بنا رہا ہوتا ہے...... تو اسے بنانے سے پہلے کی سوچ...... اور...... اس وقت کی سوچ...... جب وہ چیز بن رہی ہوتی ہے...... تخلیق کار کے ذہن میں اس چیز کا ایک خاکہ بناتی ہے اور وہ اس وقت فیصلہ کرتا ہے کہ اسے کیسی چیز بنانی ہے...... تمہارا پورٹریٹ جب میں نے شروع کیا تو میرے ذہن میں تمہارے تاثرات کے بارے میں بالکل مختلف سوچ تھی مگر کل صبح سے تم بہت اداس تھی اور تمہاری آنکھوں میں ٹھہری نمی تمہارے چہرے کے تاثرات کو بہت افسردہ بنا رہی تھی...... پھر میں کیسے مسکراتے چہرے کے ساتھ اداس آنکھیں بناتا......'' شہیر نے کہا۔

''لیکن...... تم کل یہ باتیں مجھے Explain بھی کرسکتے تھے۔ کہ تم کس نظر سے مجھے دیکھ رہے تھے...... میں تو اپنے آپ سے بھی بے خبر تھی۔'' زل نے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے اپنا پراجیکٹ مکمل کرنا تھا۔'' شہیر نے وضاحت کی۔

''اور...... یہ پورٹریٹ دیکھنے کے بعد پروفیسر ربانی جب آنکھوں میں اس نمی کی وجہ پوچھیں گے...... تو...... میں کیا جواب دوں گی...... کیا تم میری پرابلمز اور میرے اندر کی پریشانی کو دوسروں کے سامنے ایکسپوز کرکے مجھے بے عزت کرنا چاہتے ہو؟'' زل خفگی سے بولی۔

''آئی ایم سوری...... میرے ذہن میں ایسی کوئی بات نہیں تھی...... اگر تم اس بات کو مائنڈ کرتی ہو تو میں یہ پورٹریٹ تمہارے سامنے پھاڑتا ہوں۔'' اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے پورٹریٹ کو پرزے پرزے کردیا۔ زل حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئی...... اسے یقین نہیں آرہا تھا...... کہ یہ کیسا عجیب شخص ہے...... جو ہر لمحے کے ساتھ بدل جاتا ہے...... وہ خفگی سے اسے دیکھتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

☆

مسٹر اور مسز فاخر حسین بہت دنوں بعد گھر میں ڈنر کررہے تھے۔ شہیر بھی ان کے ساتھ موجود تھا۔ آج مسز فاخر نے بہت عرصے بعد اسپیشل ڈنر تیار کروایا تھا اور ان کا موڈ بھی قدرے خوشگوار تھا، البتہ شہیر کچھ اپ سیٹ نظر آرہا تھا۔ اس کے چہرے پر اداسی کی گہری چھاپ تھی۔

''تہمینہ...... آج خیریت تو ہے...... یہ ڈنر کس خوشی میں ہے؟'' فاخر حسین نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''کوئی خاص وجہ نہیں...... بس آج میں کچھ فارغ تھی سوچا...... مل کر ڈنر کرتے ہیں۔'' مسز فاخر نے بتایا۔

''زہے نصیب...... آج منسٹر صاحبہ کو ہمارے بارے میں بھی سوچنے کا وقت مل گیا۔'' فاخر حسین نے مسکراتے ہوئے مگر قدرے شکایتی لہجے میں کہا۔

''فاخر...... کیا آپ وہ وقت بھول گئے...... جب میں گھر میں کھانا بنا کر آپ کے انتظار میں ساری ساری رات بیٹھی رہتی تھی اور آپ اپنی بزنس میٹنگز میں بزی رہتے تھے۔ تہمینہ نے بھی موقع دیکھ کر قدرے درشت لہجے میں کہا۔

''ہاں......وقت وقت کی بات ہے......کبھی آپ کو انتظار کرنا پڑتا تھا اور اب ہم باپ بیٹے کو کرنا پڑتا ہے۔'' فاخر حسین نے کہا تو تہمینہ ایک دم غصے سے مشتعل ہو کر وہاں سے اٹھ گئیں۔

''ارے بھئی......آپ کہاں جا رہی ہیں......میں تو مذاق کر رہا تھا......'' فاخر حسین نے قدرے گھبرا کر کہا۔

''رہنے دیجئے آپ......میں سب جانتی ہوں......آپ کو ساری زندگی مجھ سے شکوے ہی رہے ہیں......اور اپنی ذات پر ذرا سی تنقید بھی آپ برداشت نہیں کر پاتے۔'' تہمینہ غصے سے کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

"She is very unpredictable" فاخر حسین نے تاسف سے کہا اور کھانا چھوڑ کر بڑبڑانے لگے۔

''مجھے آج تک اس کی سمجھ نہیں آئی......فوراً لمحوں میں بدل جاتی ہے......اچھی خاصی بات کر رہی ہو گی تو فوراً کسی نہ کسی بات کو مائنڈ کر کے موڈ آف کر لیتی ہے......اس کے ساتھ تو مذاق بھی کھل کر نہیں کیا جا سکتا......اب دیکھنا کئی روز تک موڈ آف رہے گا......اور خواہ مخواہ ٹینشن پھیلائے گی۔'' فاخر حسین یوں بول رہے تھے جیسے انہیں اپنے کیے پر بہت پچھتاوا ہو رہا ہو۔

''ڈیڈی......کیا......مما شروع سے ہی ایسی ہیں؟'' شہیر نے کھانا چھوڑتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں......اس کی ماں یعنی کہ میری پھوپھی بالکل ویسی ہی تھیں......یہ جینز کا اثر ہے......پھوپھو کی اچھی باتیں تو تہمینہ نے Inherit نہ کیں......اس ایک بات کو Inherit کر لیا......میں اس کی......اس عادت سے تنگ آ گیا ہوں......ساری زندگی اس بری عادت کی نذر ہو کر بہت بدمزہ گزری ہے۔'' فاخر حسین نے کہا تو شہیر کو اپنی پورٹریٹ پھاڑنے کی حرکت یاد آ گئی......اسے خود بھی اندازہ نہ تھا کہ وہ کیا کرے گا......اور اس نے کیا کر دیا......

''کیا وہ بھی ممی کی طرح ہے؟''

کیا ہر شخص کے جینز میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ اس کی پرسنالٹی پر اس حد تک اثر انداز ہوتے ہیں۔

وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

☆

''یار شہیر کیا تم نے زل کا پورٹریٹ مکمل کر لیا ہے؟'' ارسلان نے اچانک شہیر سے پوچھا جبکہ زل ایزل پر رکھی ایک پینٹنگ مکمل کرنے میں مصروف تھی۔ اس نے چونک کر دونوں کو دیکھا۔

''نہیں......'' شہیر نے زل کی طرف مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''کیوں......اتنے روز تو ہو گئے ہیں......یار......مجھے تو دال میں کچھ کالا لگ رہا ہے۔'' ارسلان نے ہنستے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب......؟'' شہیر نے انتہائی سنجیدگی سے پوچھا اور زل کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا......زل کو اس کے دیکھنے کا انداز قدرے برا لگا اور وہ پینٹنگ کو وہیں ادھورا چھوڑ کر کلاس روم سے باہر نکل گئی۔

یہ زل کو کیا ہوا ہے کیا تم لوگوں میں کھٹ پھٹ ہوئی ہے ارسلان نے حیرت سے پوچھا۔

''غالباً...... تم سب کچھ جانتے ہو...... پھر بھی کچھ نہ جاننے کا پوز کر رہے ہو۔'' شہیر نے اچانک درشت لہجے میں کہا۔

''شہیر...... یہ تم کو کیا ہو گیا ہے۔ اور...... تم کیسی باتیں رہے ہو...... آر...... یو...... او کے......؟'' ارسلان نے اسے ریلیکس کرنے کے انداز میں اپنے اٹھے ہاتھوں کو آہستہ آہستہ اوپر سے نیچے کرتے ہوئے کہا۔

''میں سب جانتا ہوں، زل تم سے ہر بات شیئر کرتی ہے۔'' شہیر نے خفگی سے کہا۔

''کیا زل نے تمہیں کچھ ایسا کہا ہے؟'' ارسلان نے حیرت سے پوچھا۔

''اسے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں...... میں سب کچھ جانتا ہوں......'' شہیر کے لہجے میں عجیب سی تلخی اور شکایت تھی۔

''سوری...... اگر تم نے میری کسی بات کو مائنڈ کیا......؟

ارسلان نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ شہیر کے دل میں ارسلان کے لئے نفرت سی پیدا ہونے لگی۔ ورنہ اس سے قبل دونوں میں اچھی دوستی تھی۔ نجانے کیا ہو رہا تھا کہ شہیر کا دل اس سے متنفر ہونے لگا تھا اور اسے اس بات کی خود بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی...... کیا وہ ''زل'' کی وجہ سے اس سے نفرت کرنے لگا تھا...... یا...... پھر اس اچانک پیدا ہونے والی نفرت کی کوئی اور وجہ تھی۔ وہ خود ہی جھنجھلانے لگا۔

''شہیر...... کیا تم لوگوں کا پراجیکٹ مکمل ہو گیا ہے۔'' اچانک پروفیسر ربانی نے کلاس میں کھڑے شہیر سے پوچھا۔

''نو...... سر......'' شہیر نے آہستہ لہجے میں کہا۔

''زل نے تو اپنا پورٹریٹ Submit کروا دیا ہے...... میں آپ کا پراجیکٹ بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔'' پروفیسر ربانی نے کہا۔

''آئی ایم سوری...... سر......'' وہ آہستہ آواز میں بولا۔

''کیا کوئی پرابلم ہے...... یا...... پھر...... کوئی اور ریزن......؟''

''نو...... سر...... نو ریز؟'' وہ جلدی سے بولا۔

''تو پھر...... آپ کب مجھے اپنا ریزن پورٹریٹ دیں گے۔'' سر رضا ربانی نے پوچھا۔

''اگلے ہفتے تک...... میں پوری کوشش کروں گا۔'' شہیر نے کہا۔

''نیکسٹ ویک......؟ اٹ از ٹو لیٹ۔'' پروفیسر رضا ربانی نے حیرت سے کہا۔

''سر...... کچھ ایسی مصروفیات ہیں......'' اس نے بہانہ بنایا۔

''شہیر...... یہ ذہن میں رکھیں...... یہ آپ کی ایکٹوٹیز یا پاس ٹائم نہیں۔ اٹ از پارٹ آف یور سٹڈیز، انڈرسٹینڈ۔'' پروفیسر رضا نے قدرے خفگی سے کہا تو شہیر نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔ پروفیسر رضا کلاس سے باہر نکل گئے۔

وہ کیسی الجھن کا شکار ہو گیا تھا...... اسے خود بھی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا...... حالات کیسے الجھتے چلے جا رہے تھے...... اس کی ایک حرکت اسے کن

مشکلات سے دوچار کر رہی تھی۔نجانے کیوں وہ اچانک ہائپر ہو گیا تھا اور اس نے زل کا پورٹریٹ پھاڑ دیا تھا......اور اب وہ دوبارہ کیسے زل سے کہے۔

''اور......وہ کیسے پھر اپنا ٹائم Spare کرے گی اور اگر وہ انکار کر دیتی ہے تو سر رضا کو وہ کیا کہے گا......اور اگر وہ پورٹریٹ مکمل نہیں کر پاتا تو سر رضا کے سامنے شرمندہ ہو گا۔وہ عجیب مخمصے کا شکار ہو رہا تھا۔

یہ میں کیا کر رہا ہوں......؟

مجھے کیا ہو رہا ہے......؟

میں کیوں ہائپر ہونے لگا ہوں......؟

میرے دل میں وسوسے کیوں پیدا ہونے لگے ہیں......اور میں ارسلان سے کیوں متنفر ہونے لگا ہوں......میرے دل میں اس کے لئے ''نفرت'' کیوں پیدا ہونے لگی ہے......ان گنت سوالات......وسوسے اور اندیشے،اس کے دل میں پیدا ہونے لگے......

''ایکسکیوزمی مس زل......مجھے آپ سے ایک فیور چاہئے......''شہیر نے گیٹ سے داخل ہوتی ہوئی زل کو روک کر پوچھا۔

''اگر......آپ مجھے پورٹریٹ کے بارے میں کچھ کہنا چاہتے ہیں......تو......سوری......میرے پاس اتنا وقت نہیں......مجھے اور اسائمنٹس بھی مکمل کرنی ہیں......''زل نے دوٹوک لہجے میں کہا اور وہاں سے چلی گئی۔شہیر کو بہت خفت سی محسوس ہونے لگی۔اسے کبھی بھی زندگی میں ایسی صورتحال کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا اور زل بھی کبھی اتنی Rude نہیں تھی۔یقیناً اسے ارسلان نے میرے خلاف بھڑکایا ہوگا۔اس نے سوچا اور اس کے دل میں ارسلان کے خلاف مزید نفرت پیدا ہونے لگی۔

سارا دن وہ کلاس میں اپ سیٹ رہا زل سے ایک دوبار آمنا سامنا ہوا......تو......کبھی وہ روشنی سے باتوں میں مصروف ہوتی......کبھی اسامہ سے......اور زیادہ تر وقت وہ ارسلان کے ساتھ کبھی کیفے ٹیریا میں چائے پیتی ہوئی پائی گئی......کبھی ارسلان کے ساتھ پینٹنگ بناتے ہوئے ہنستی مسکراتی باتیں کرتی ہوئی......وہ شہیر کی آنکھوں میں کھٹکتی......

ارسلان بھی شہیر سے متنفر رہنے لگا تھا......وہ ہیلو ہائے کے علاوہ اس سے کوئی اور بات نہ کرتا۔شہیر جب کیفے ٹیریا میں داخل ہوتا تو ارسلان اسے دیکھتے ہی فوراً وہاں سے اٹھ کر چلا جاتا۔اگر گروپ ڈسکشن ہو رہی ہوتی اور شہیر کچھ ڈسکس کر رہا ہوتا تو ارسلان فوراً وہاں سے ہٹ کر ادھر ادھر مصروف ہو جاتا۔

روشنی،عمر مصطفیٰ،اسامہ سمیت تمام سٹوڈنٹس زل،شہیر اور ارسلان کے درمیان تناؤ کو محسوس کر رہے تھے۔

''زل......کیا تمہارا اور ارسلان کا شہیر سے کوئی جھگڑا ہوا ہے؟''روشنی نے سینڈوچ کھاتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں......تو......؟کس نے کہا؟''زل نے بات بدلنے کی کوشش کی۔

''معلوم تو کچھ......ایسا ہی ہو رہا ہے......''روشنی نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''اپنی اپنی Assumptions ہیں۔ورنہ ایسی کوئی بات نہیں......اس کے ساتھ ایک اسائنمنٹ تھی وہ مکمل ہو گئی......اب میں بھی بزی

ہوں……اور……وہ بھی……'' زل نے جواب دیا۔

''کیاتم شہیر کو ناپسند کرتی ہو؟'' اچانک روشنی نے پوچھا۔

''کیا مطلب……؟'' زل نے چونک کر پوچھا۔

''کچھ Rumours سننے میں آرہی ہیں……'' روشنی نے منہ بنا کر آہستہ آہستہ پوچھا۔

''روشنی……تم کیا پوچھنا چاہ رہی ہو……کھل کر بات کرو۔'' زل نے دوٹوک لہجے میں پوچھا۔

''کیاتم جانتی ہو……کہ……شہیر تم سے محبت کرتا ہے؟'' روشنی نے آنکھیں گھما کر پوچھا۔

''ک……کک……کیا……محبت……؟ اور مجھ سے……؟ آر یو آن یور سینسز؟ زل کے لئے یہ انکشاف انتہائی چونکا دینے والا تھا۔ غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا تھا اور ہونٹ کپکپانے لگے تھے۔

''پلیز……تم یوں ہائپر مت ہو……'' روشنی نے اس کا غصہ دیکھتے ہوئے کہا۔

''روشنی……یہ باتیں کون پھیلا رہا ہے……؟ کیا شہیر نے ایسا کچھ کہا ہے؟ زل نے حیرت سے پوچھا۔

''چھوڑو……جس نے بھی کہا ہے……مگر اس میں کچھ حقیقت بھی ہے۔'' روشنی نے جواب دیا۔

''کیسی حقیقت……؟ زل نے پھر چونک کر پوچھا۔

''یہی کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے۔'' روشنی نے مسکرا کر جواب دیا۔

''پھر……وہی بات……میں تمہیں بتا رہی ہوں کہ ایسی کوئی بات نہیں……بس۔ اب میرا دماغ خراب مت کرو۔ میں جا رہی ہوں۔''

زل غصے سے اٹھ کر وہاں سے چلی گئی اور روشنی حیرت سے اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہ گئی۔

☆

''آئی ایم سوری سر……میں آپ کو پورٹریٹ نہیں دے پاؤں گا……وہ……ان فیکٹ……'' شہیر کو سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا بہانہ بنائے؟

''جو بھی وجہ ہے……صاف صاف بتاؤ۔'' پروفیسر ربانی نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''سر……زل کا پورٹریٹ ٹھیک نہیں بنا تھا اور وہ میں نے غصے میں پھاڑ دیا……اور اب وہ دوبارہ بنوانے پر رضامند نہیں……'' شہیر نے واضح انداز میں بتایا۔

''اور یہ کس نے ڈیسائیڈ کیا……کہ……وہ ٹھیک نہیں بنا تھا؟'' پروفیسر ربانی نے اچانک پوچھا تو وہ چونک گیا۔

''زل نے……'' اس نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

''ٹھیک ہے……آپ ارسلان کا پورٹریٹ بنالیں۔'' پروفیسر ربانی نے کہا تو وہ چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔

''اب کیا ہوا……؟'' پروفیسر ربانی نے حیرت سے پوچھا۔

''وہ......سر......ہی از نان سیریس......خاموشی سے نہیں بیٹھا اور......''وہ بہانے بنانے لگا۔

''ٹھیک ہے......آپ اس اسائنمنٹ کو ہی چھوڑ دیں۔ شہیر مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے آپ کچھ اپ سیٹ ہیں۔'' پروفیسر ربانی نے اس کی جانب بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نو......سر......آئی......ایم......''وہ بولا۔

''مے......آئی......کم ان سر......'' اچانک زل پروفیسر ربانی کے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے بولی۔ شہیر کو ان کے سامنے بیٹھا دیکھ کر چونکی۔

''یس......آیئے زل......میں آپ کا ہی انتظار کر رہا تھا......'' پروفیسر ربانی نے کہا تو شہیر نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ زل کمرے میں داخل ہوئی اور شہیر کو قدرے نظر انداز کرتے ہوئے دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔

پروفیسر ربانی نے اپنے ٹیبل کی دراز میں سے اس کا بنایا ہوا شہیر کا پورٹریٹ نکالا تو دونوں چونکے۔

''زل......آپ نے پورٹریٹ تو اچھا بنایا ہے مگر ان کی ناک کی ٹپ اور Base میں فاصلہ زیادہ کر دیا ہے، اس معمولی سے فرق سے ان کے فیچرز میں نمایاں چینج محسوس ہو رہا ہے......یہ ادھر دیکھیں......'' پروفیسر ربانی نے پورٹریٹ شہیر کے چہرے کے ساتھ رکھ کر بتایا تو زل نے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے بغور دیکھا......

''اور ان کی آنکھوں کو دیکھیں......'' پروفیسر ربانی کے کہنے پر اس نے شہیر کی آنکھوں کی طرف بغور دیکھا۔ اس نے بھی زل کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی Eye lids اور Eye lashes کو تھوڑا سا Shape دیں۔

''زل......دیکھنے میں تو یہ بہت معمولی فرق ہیں، مگر تھوڑے سے ڈفرنس سے شکل و صورت بدل جاتی ہے۔ ٹھیک ہے......ہم خدا کی طرح نہ تو پرفیکٹ ہو سکتے ہیں......اور نہ ہی اتنے ماہر......جو ہر شے کو انتہائی متناسب انداز میں بناتا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے......ہم آرٹ کے لوگ تو immitators ہیں......جو اس کی بنائی ہوئی چیزوں کی کاپی کرتے ہیں......ارسطو نے بھی تو یہی کہا ہے نا......اور ایک آرٹسٹ کا بھی یہ کام ہے کہ وہ کم از کم کاپی تو ٹھیک بنائے......بناتے وقت ہر شے کے اینگل کا خاص خیال رکھے......'' پروفیسر ربانی نے کہا۔

''رائٹ سر......میں اس کو ٹھیک کرتی ہوں۔'' زل نے پورٹریٹ اٹھایا اور باہر نکل گئی۔

تھوڑی دیر بعد شہیر بھی ان کے روم سے باہر نکلا......زل کوریڈور میں کھڑی تھی......اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح شہیر کو کہے کہ پورٹریٹ ٹھیک کرنے میں اس کی مدد کرے......اسے کچھ ٹائم دے۔ روشنی کی باتیں سن کر اسے ویسے ہی شہیر پر بہت غصہ تھا......دوسرا......اسے اپنا رویہ بھی یاد تھا۔ جب شہیر نے اسے پورٹریٹ بنانے کے لئے کہا تھا۔ وہ شش و پنج کا شکار تھی اور ہونٹ چبا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سوال تھا۔

''پورٹریٹ ٹھیک کرنے کے لئے آپ کو میری ضرورت ہے......'' شہیر نے اس کے قریب آ کر پوچھا۔

''یس آف کورس......'' اس نے چہرہ دوسری جانب کرتے ہوئے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے......آپ اسے آج ہی ٹھیک کر لیں......کل میں بزی ہوں گا......مجھے مسز عطیہ کی اسائنمنٹ پر کام کرنا ہے۔'' شہیر نے

انتہائی نرم لہجے میں کہا تو وہ چونک کر اس کی جانب دیکھنے لگی۔ وہ اس سے کچھ اور توقع کر رہی تھی اور وہ اس کی توقعات کے برعکس ری ایکٹ کر رہا تھا۔

''اوکے...... '' وہ اس کے ساتھ چل پڑی اور کلاس روم کے کوریڈور میں سے ہوتی ہوئی ٹیرس پر آ گئی...... شہیر اس کے سامنے اسٹول پر بیٹھ گیا۔ وہ مکمل خاموش تھا اور ادھر ادھر دیکھ رہا تھا جبکہ زِل ایزل پر لگے بورڈ پر پورٹریٹ فکس کرنے میں مصروف تھی۔

اس نے پورٹریٹ کی طرف دیکھا اور پھر شہیر کی آنکھوں کی طرف انتہائی غور سے...... تاکہ...... Eye lids اور Eye lashes کی Shape ٹھیک کر سکے۔ شہیر بھی اس کی طرف بغور دیکھنے لگا۔ آج اس کی آنکھوں میں کچھ عجیب سی بات تھی کہ وہ قدرے گھبرا گئی اور جلدی سے منہ موڑ کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اپنی کلرز پیلٹ ٹھیک کرنے لگی۔

''کتنا مشکل ہوتا ہے...... اپنی مرضی اور خواہش کے برعکس کوئی کام کرنا...... '' اس نے دل میں سوچا وہ اس شخص کو دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی...... مگر اس کو اپنے قریب بٹھانے پر مجبور تھی۔

اس نے اپنے آپ کو سمجھایا اور پھر شہیر کی آنکھوں کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ اس کی طرف یوں دیکھ رہا تھا جیسے کوئی بہت چاہت اور محبت سے کسی کو دیکھتا ہے...... شہیر خاموش تھا مگر اس کی آنکھیں بول رہی تھیں...... اس کی زبان چپ تھی مگر آنکھیں محبت کی پیار بھری باتیں کر رہی تھیں۔

''کیا تم جانتی ہو...... کہ...... شہیر تم سے محبت کرتا ہے۔'' روشنی کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے......

''شہیر کو آج کیا ہو گیا ہے...... یا...... پھر میں کس illusion کا شکار ہو رہی ہوں۔'' اس نے اپنے دل میں پیدا ہونے والے وسوسوں کو جھٹکا اور شہیر کی طرف دیکھے بغیر پورٹریٹ میں بنی اس کی آنکھوں کی طرف دیکھنے لگی۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ آنکھیں بھی اس کی طرف یونہی دیکھ رہی ہوں جیسے وہ حقیقت میں اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ جھنجلانے لگی۔ اس کی آنکھوں سے اس کی جھنجلاہٹ ظاہر ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا۔

''شہیر کیوں مجھے ایسی نظروں سے دیکھ رہا ہے...... کہ...... میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے سحر میں گرفتار ہو رہی ہوں...... ایسا کچھ بھی نہیں...... یہ سب میرا وہم ہے۔'' اس نے اپنے خیال کو خود ہی رد کرنے کی کوشش کی۔

''مگر اس میں کچھ حقیقت بھی ہے......'' روشنی کے الفاظ پھر اس کے کانوں میں گونجے......

وہ اپنے آپ سے الجھنے لگی...... اس کا برش اس کے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ کلرز کو یونہی بے خیالی میں مکس کر رہی تھی اور مسلسل مکس کرتی جا رہی تھی۔

''زِل...... آر...... یو...... اوکے......؟'' شہیر کافی دیر سے اسے یوں کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

''زِل اچانک چونکی...... اور...... بوکھلا کر اس کی طرف دیکھنے لگی...... شہیر اٹھ کر اس کے قریب آ گیا...... اس کی قربت سے اسے وحشت سی ہونے لگی۔

''آپ ٹھیک تو ہیں......'' شہیر نے محبت بھرے لہجے میں پوچھا، زِل ہونٹ چبانے لگی......

''آپ ادھر بیٹھیں......اور یہ کلرز پیلٹ مجھے دیں۔ مجھے اپنی Eyelids اور Eye lashes کی Shape بہت اچھی طرح معلوم ہے۔ میں ٹھیک کر دیتا ہوں۔'' شہیر نے اس کے ہاتھ سے برش اور کلرز پیلٹ لی اور پورٹریٹ کو ٹھیک کرنے لگا۔ زل عجیب الجھن کا شکار ہو رہی تھی۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا......کیا کرے......وہ اس صورتحال سے پہلی بار دوچار ہو رہی تھی۔ وہ بہت بولڈ اور کونفیڈنٹ تھی......نجانے اسے کیا ہو رہا تھا......؟ وہ کیوں اتنی نروس ہو رہی تھی......؟

وہ اپنی سوچ میں گم تھی اور مسلسل شہیر کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ شہیر اپنے کام میں بہت مگن تھا۔ مگر اس کا ذہن کہیں اور تھا......اور......دل ان گنت سوالات کر رہا تھا۔

''میں جانتا ہوں......تمہیں کیا ہو رہا ہے؟'' اس نے کن اکھیوں سے اس کی جانب دیکھ کر دل میں سوچا۔

''ایسا زندگی میں پہلی بار ہو رہا ہے......'' زل نے ہونٹ چباتے ہوئے سوچا۔

''میں نے تو تمہیں کچھ بھی نہیں کہا......صرف......محبت بھری نظروں سے دیکھا ہے۔'' شہیر نے زیر لب مسکراتے ہوئے سوچا۔

''اس کی آنکھوں میں آج کیا ہے......؟'' زل نے پہلو بدلتے ہوئے سوچا۔

''میں نہیں جانتا تھا......محبت میں اتنی طاقت بھی ہو سکتی ہے۔'' شہیر نے کلرز پیلٹ کلرز لیتے ہوئے سوچا۔

''کیا واقعی......وہ مجھ سے محبت کرنے لگا ہے......کیا اس کی آنکھیں مجھے یہی پیغام دے رہی ہیں۔'' زل نے اپنی نگاہیں اپنے پاؤں کے نیچے زمین پر مرکوز کرتے ہوئے سوچا۔

''ہاں......میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں......خدا کرے میری آنکھیں تم تک میرے دل کا پیغام پہنچا دیں اور کاش تم میرے اس پیغام کو سمجھ سکو......'' شہیر نے سوچا۔

''میں کیوں الجھ رہی ہوں......اور......مجھے یہ کیا ہو رہا ہے؟'' وہ بدحواس ہو کر اٹھی......شہیر نے ایک ٹک اس کی جانب دیکھا اور کلرز پیلٹ سائیڈ پر رکھتے ہوئے اس کی جانب آیا۔

''زل......اب دیکھئے اور بتایئے کہ میں نے کس حد تک پورٹریٹ کو ٹھیک کیا ہے۔'' شہیر نے زل کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا تو وہ خاموشی سے ایزل کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی اور پورٹریٹ کی طرف دیکھنے لگی۔ واقعی اس نے پورٹریٹ کو بالکل ٹھیک کر دیا تھا۔ شہیر ایزل کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔

''اب غور سے دیکھیں اور بتایئے مجھ میں اور پورٹریٹ میں کتنا فرق ہے؟ شہیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

زل نے دونوں کو بغور دیکھا اور دیکھتی ہی رہ گئی......انیس......بیس کا فرق بھی باقی نہیں رہا تھا۔

''مجھے تو بالکل ٹھیک لگ رہا ہے......'' زل نے آہستہ سے جواب دیا۔

''کیا پورٹریٹ میں میری آنکھیں وہی کہہ رہی ہیں......جو وہ حقیقت میں کہنا چاہ رہی ہیں۔'' شہیر نے معنی خیز انداز میں کہا تو زل نے چونک کر پھر اس کی جانب دیکھا۔

''آئی ایم ایکسٹریملی سوری...... اس روز میں نجانے کیوں ہائپر ہو گیا تھا...... اور میں اپنے آپ کو بہت گلٹی فیل کرتا رہا ہوں...... آئی ہوپ...... یو انڈرسٹینڈ می'' اس نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔

زل نے ایک ٹک اس کی جانب دیکھا اور خاموش ہو گئی۔

''پلیز...... زل...... میری فیلنگز کو سمجھنے کی کوشش کریں...... اس روز کے بعد میں نے اپنی غلطی کو شدت سے محسوس کیا ہے...... آئی ایم رئیلی......؟''

''تھینک یو...... اب میں چلتی ہوں۔'' زل اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی اور شہیر خاموشی سے اس کی جانب دیکھنے لگا اور گہری سانس لی۔ زل ایزل اور پورٹریٹ اٹھا کر وہاں سے چلی گئی اور وہ وہیں کھڑا رہ گیا۔ اس لمحے اس کا دل کرچی کرچی ہو رہا تھا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا...... کیا کرے......؟ اور اس کی بات کو کیا سمجھے؟ اس نے تو پوری سچائی کے ساتھ اسے اپنے دل کی بات بتانے کی کوشش کی تھی اور اس کا غیر متوقع ردعمل اس کے لئے حیران کن تھا۔ وہ تو سوچتا تھا کہ جب وہ اسے اپنے دل کی بات بتا کر ایکسکیوز کرے گا۔ تو وہ مسکرا کر اس کی جانب دیکھے گی...... وہ سب کچھ بھلا دے گی...... مگر اس کا ''تھینک یو'' کہنے کا روکھا انداز...... سپاٹ آنکھیں...... اس کے دل میں نشتر کی چبھو رہے تھے...... اس کا دل بوجھل ہونے لگا اور اس کی سانس رکنے لگی...... آنکھیں نمی سے بھرنے لگیں...... وہ کہیں دور جانا چاہتا تھا...... بہت دور...... کسی ویرانے میں...... جہاں وہ اور اس کی سوچوں کے علاوہ کوئی اور نہ ہو...... وہ لانگ ڈرائیو پر نکل گیا۔ زل مسلسل اس کے ذہن میں تھی اور اس کا کہا ہوا جملہ اس کے ذہن میں جونک کی طرح چپٹ گیا تھا۔ اس نے کیوں ایسے کہا......؟ اس نے میری پوری بات بھی نہیں سنی...... اور...... وہاں سے چلی گئی...... کیا...... وہ میرے لئے وہ کچھ محسوس نہیں کر رہی جو میں اس کے لیے کر رہا ہوں...... میں اسے بتانے والا تھا...... کہ میں اس سے بہت محبت کرتا ہوں اور شاید اس کو اس بات کا اندازہ بھی ہو گیا تھا...... پھر جانتے بوجھتے ہوئے بھی اس نے مجھے نظر انداز کر دیا۔ اس کا مطلب ہے اس نے......'' وہ جھنجھلانے لگا اور ڈرائیونگ کرتے ہوئے سر کے ایک ہاتھ سے بال نوچنے لگا۔ وہ اس لمحے اتنا ہائپر ہو رہا تھا کہ اسے سامنے آتا ہوا ٹرک دکھائی ہی نہ دیا اور بمشکل اس سے ٹکراتے ہوئے بچا۔ اس کی گاڑی بریک کی زوردار آواز کے ساتھ رکی۔ ٹرک بہت آگے نکل گیا تھا۔ سڑک پر اکا دکا گاڑیاں تھیں۔ وہ گاڑی روک کر سوچنے لگا۔

مجھے کیا ہو رہا ہے......؟ اور

میں کیوں اتنا جذباتی ہو رہا ہوں......؟

زل کا یہ ''ری ایکشن'' نیچرل تھا...... اس روز کے بعد کئی ایسے مواقع آئے جب زل کی فیلنگز ہرٹ ہوئیں تھیں۔ وہ مجھ سے ناراض تھی...... اور اس کو ہونا بھی چاہئے تھا۔ اس روز غلطی میری ہی تھی...... ''میں نے اس کی فیلنگز سمجھنے کی بجائے پورٹریٹ پھاڑ دیا...... وہ خود ہی زل کو بری الذمہ ٹھہرانے لگا...... زل اس کے ساتھ کچھ اور برا بھی کر سکتی ہے۔'' وہ ایسا کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتا تھا وہ بہت مشکل سے اپنے آپ کو سمجھا کر گھر واپس آ گیا۔

☆

''سمیر گھر واپس آ رہا ہے......'' ممی نے رات کو اسے خبر سنائی۔

''کیوں......؟'' شہیر نے اچانک پوچھا۔

''اس کی سٹڈیز مکمل ہو گئی ہے......'' ممی نے خوش ہو کر بتایا۔

''آئی......سی......'' اس نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

''کیا بات ہے...... تمہیں اس کے آنے کا سن کر خوشی نہیں ہوئی۔''

ممی نے اس کے چہرے کی طرف بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا خوشی دکھانے کی چیز ہوتی ہے؟'' شہیر نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''ہاں...... انسان کے Expressions سے پتہ چل جاتا ہے...... کہ وہ خوش ہے...... یا...... ناخوش......'' ممی نے کہا۔

''ایک عام سی بات ہے Expressions وقتی ہوتے ہیں کبھی بھی اسٹرونگ نہیں ہوتے۔'' شہیر نے جواب دیا۔

''سمیر پورے سال کے بعد گھر واپس آ رہا ہے...... اور تمہیں اس کے آنے کی کوئی خوشی نہیں ہو رہی...... کیا تمہیں اس سے محبت نہیں؟'' ممی نے حیرت سے پوچھا۔

''ممی...... آپ کی اور میری فیلنگز میں اس لیے فرق ہے...... کہ ہم دونوں کا Relationship اس سے مختلف ہے۔ آپ ماں ہو کر سوچ رہی ہیں...... آپ کی فیلنگز اس کے لئے بہت اسٹرونگ ہیں...... جو میرے لیے کبھی بھی اتنی اسٹرونگ نہیں رہی ہیں...... اور سمیر...... میرا بھائی ہے...... لیکن وہ میرا فرینڈ کبھی بھی نہیں رہا...... جبکہ وہ سب کا فرینڈ ہے۔'' شہیر نے آہ بھر کر انتہائی سنجیدگی سے جواب دیا۔

''شہیر...... یہ تم کیسی باتیں سوچتے ہو...... میں تو تمہاری باتیں سن کر حیران ہو رہی ہوں...... تم نے یہ سب کچھ کیسے سوچ لیا......؟'' ممی نے حیرت سے پوچھا۔

''ممی......سوچ...... سوچ ہوتی ہے...... اسے دماغ میں آنے کے لئے کسی منسٹری کی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی۔'' وہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا اور تہمینہ حیرت سے اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہ گئیں......

یہ کس بات کا ری ایکشن ہے......؟

وہ کیوں ایسے بی ہیو کر رہا ہے......؟

مسز تہمینہ پریشان ہو کر سوچنے لگیں۔

☆

ارسلان اور زِل کیفے ٹیریا سے باہر اوپن ایئر میں ایک بنچ پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

''کل شہیر تمہارا پورٹریٹ بنا رہا تھا...... میں نے کوریڈور سے گزرتے ہوئے دیکھا تھا...... تم کچھ اپ سیٹ لگ رہی تھی......'' ارسلان نے قدرے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

''ن...... نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں...... میں نے اس کا پورٹریٹ بنایا تھا...... سر ربانی نے اس میں کچھ Flaws بتائے تھے...... وہ مجھ سے ٹھیک نہیں ہو پا رہے تھے...... تو...... شہیر نے خود ہی ٹھیک کر لئے۔'' زل نے صاف گوئی سے بتایا۔

''آئی...... سی...... زل...... تمہیں شہیر کیسا لگتا ہے؟'' ارسلان نے اچانک پوچھا تو وہ بوکھلا گئی۔

''ک...... کیا...... مطلب......؟'' وہ ایک دم گھبرا کر بولی...... اور...... اس کی نظروں کے سامنے روشنی کا چہرہ گھوم گیا...... وہ توقع کر رہی تھی کہ شاید ارسلان بھی اس سے وہی باتیں کرنے لگا ہے......

''میرا مطلب ہے...... کچھ Unpredictable سا انسان ہے۔ کچھ الجھا سا گہرے پانیوں کی طرح خاموش...... اگلے لمحے کیسے ری ایکٹ کرے گا...... یہ شاید وہ خود بھی نہیں جانتا......'' ارسلان نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... لیکن میرا خیال ہے...... ہر انسان کسی نہ کسی حد تک Unpredictable ہی ہوتا ہے۔'' زل نے جواب دیا۔

''نہیں...... سب نہیں...... کچھ...... اور ان میں سے بھی کم یا زیادہ...... ارسلان نے کہا۔

''تم شہیر کے بارے میں کیوں کونشس ہو رہے ہو؟ زل نے پوچھا۔

''اس روز اس نے جس طرح میرے ساتھ بی ہیو کیا...... میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا...... اور...... جانتی ہو...... اس کا رویہ بہت توہین آمیز تھا...... شاید میری شکل وصورت یا پھر میرے فیملی بیک گراؤنڈ کی وجہ سے ایسا تھا...... مگر اس کا لب ولہجہ بہت تکلیف دہ تھا......'' ارسلان نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

''کیوں...... تمہارے فیملی بیک گراؤنڈ کو کیا ہوا ہے؟ اور میرا نہیں خیال کہ ایسی کوئی بات اس کے ذہن میں ہو سکتی ہے...... مجھ سے بھی تو...... اس نے......'' زل نے اچانک جملہ ادھورا چھوڑا اور خاموش ہو گئی۔

''کیا...... تم سے بھی......؟'' ارسلان نے حیرت سے پوچھا۔

''کچھ...... نہیں...... بس یونہی ہائپر ہو گیا تھا......'' زل نے کہا۔

''ریئلی......'' ارسلان نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

''تم اپنے ذہن کو ایسی منفی باتوں سے دور رکھو تو بہتر ہے......؟ زل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیوں......'' میں بھی تو انسان ہوں...... اور...... میرے ذہن میں بھی ایسی منفی باتیں آ سکتی ہیں۔'' ارسلان نے ذو معنی انداز میں پوچھا۔

''ہاں...... تم بھی انسان ہو...... اور...... ضرور ایسا سوچ بھی سکتے ہو...... مگر اپنی سوچ کو پازیٹو رکھو تو بہتر ہے۔'' زل نے رائے دی۔

''کیا سوچ کو پازیٹو رکھنا انسان کے اپنے بس میں ہے؟'' ارسلان نے پوچھا۔

''یس...... آف کورس...... کسی حد تک......''

اور یاد ہے...... اس روز...... تم نے مجھے اس ٹاپک پر کتنا بڑا لیکچر دیا تھا...... جب میں بہت اپ سیٹ تھی...... کیا یاد آیا......؟'' زل نے پوچھا۔

''ہاں......اچھی طرح یاد ہے......کیا بنا اس مسئلے کا......'' ارسلان نے یاد کرتے ہوئے پوچھا۔

''ایز اٹ از......نو پراگریس......ارسلان۔ اگر اس روز تم مجھے Console نہ کرتے......تو......آئی ڈونٹ نو......میں کچھ کر لیتی۔'' زل نے قدرے جذباتی انداز میں کہا۔

''کیا کر لیتی......؟ نہر میں کود جاتی یا کالج کی بلڈنگ کی چھت پر سے چھلانگ لگا دیتی......یا......پھر بہت ساری سلیپنگ پلز کھا کر مرنے کی ناکام کوشش کرتی۔ ویسے زل تم نے پھر بھی زندہ بچ جانا تھا......اور پھر خوامخواہ میں ساری زندگی شرمندہ ہوتے رہنا تھا......'' ارسلان نے ہنستے ہوئے کہا۔

''نہیں......میں نے تو ایسا کچھ بھی نہیں سوچا تھا......میں تو کچھ اور کرنے کا پلان کر رہی تھی......'' زل نے سنجیدگی سے کہا۔

''یعنی......کہ......اس سے بھی بڑھ کر کوئی خطرناک کام......؟'' ارسلان نے مسکراہٹ چھپاتے ہوئے کہا۔

زل نے اس کو کچھ کہنے کے لئے جیسے ہی منہ کھولا۔ تو سامنے سے آتے شہیر کو دیکھ کر ایک دم خاموش ہو گئی۔

''ہیلو......آپ لوگ......یہاں ہیں اور میں آپ دونوں کو نجانے کہاں کہاں تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔'' شہیر نے اس قدر بے تکلفانہ انداز سے کہا کہ دونوں چونک گئے......دونوں نے حیرت سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور پھر شہیر کی طرف استفہامیہ نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

''بھئی......اس قدر حیران ہونے کی کیا بات ہے؟ چلیں اٹھیں سب لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں......'' شہیر نے جلدی جلدی دائیں ہاتھ سے چٹکیاں بجاتے ہوئے کہا۔

''کون لوگ......؟ زل نے حیرت سے پوچھا۔

''بھئی......ہمارا گروپ......روشنی......اسامہ......عمر مصطفیٰ......مریم......فوزیہ......نینا اور میں'' شہیر نے جلدی جلدی نام گنوائے۔

''مگر......سب لوگ کہاں جا رہے ہیں......اور یہ اچانک پروگرام کس نے بنایا ہے......؟'' ارسلان نے حیرت سے پوچھا۔

''آخر......یہ سب کیا ہے؟'' زل نے بھی جھنجھلا کر پوچھا۔

''سب کچھ سمجھ میں آ جائے گا......بس......آپ لوگ میرے ساتھ چلیں۔'' شہیر جلدی جلدی بولا۔

اور دونوں اس کے اصرار پر اٹھ کر اس کے ساتھ چلنے لگے۔ لیکن......شہیر......کچھ تو بتاؤ......تم نے یہ اچانک پروگرام کیوں بنایا ہے؟'' ارسلان نے قدرے نرم لہجے میں پوچھا۔

''آئی......ہیو......اے......بگ سرپرائز فار یو'' شہیر نے کہہ کر زل کی طرف ذومعنی نگاہوں سے دیکھا اور مسکرانے لگا۔

(۲)

انسانی سوچ، فہم وادراک، شعور، ذہانت اور عقل کا سرچشمہ دماغ، ہر دور میں خود انسان کے لئے ایسا سوال بنا رہا ہے جس کا جواب تلاش کرنے میں صدیاں گزر گئیں مگر قدرت کی اس کرشمہ سازی کا حتمی اور کلی جواب دینے سے قاصر رہا ہے۔

قدیم مصری لوگ انسانی دماغ کے وجود کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے اور اکثر ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دیتے تھے۔ ان کے خیال کے مطابق ذہن اور روح دل وجگر میں رہتی تھی جب وہ حنوط شدہ لاشیں (ممیاں) بناتے تھے تو ان کے نتھنوں سے دماغ نکال کر پھینک دیتے تھے اور بقیہ اعضا کو بہت احتیاط سے مرتبانوں میں محفوظ کر کے انہیں ان حنوط شدہ لاشوں کے مقبروں میں دفنا دیتے تھے۔

یونانیوں نے بھی قدیم مصریوں کے خیالات کی تائید کی۔ 5bc میں فلاسفر Alcmaeon نے تجویز کیا کہ دل نہیں بلکہ دماغ احساسات کا منبع ہے۔

450bc ء میں افلاطون نے کہا کہ دماغ ہی وہ عضو ہے جو ذہانت کے لئے مخصوص ہے اور اس کی spherical shape مکمل ذہانت کا گھر ہے۔

ارسطو نے کہا دماغ نہیں بلکہ دل ذہانت اور محسوسات کا گھر ہے۔

قدیم مصری بھی ایک لمبے عرصے تک اس خیال کی تائید کرتے رہے۔ Hetrpphilus نے کہا کہ دماغ ہی ایسا عضو ہے جو سوچنے کے لئے مخصوص ہے اور cerebellum cereberum کو بیان کیا اور یہ بھی دریافت کیا کہ nerves ہی وہ channels ہیں جو جسم میں رابطے کا ذریعہ ہیں۔

لیونارڈو ڈاونسی (Leonardo da vincy) نے پہلی بار دماغ کی پہلی اور بالکل ٹھیک ڈرائنگ بنائی۔

فرانسیسی فلاسفر Rene Descartes نے ایک کتاب لکھی جس کا نام Dehominit ہے جو اس کے مرنے کے بارہ سال بعد شائع ہوئی جس میں انسانی دماغ اور ذہن کے تاثرات کے بارے میں آئیڈیاز دیئے گئے۔

آسٹریلین ڈاکٹر Franz Gall نے دماغ کے ابھاروں اور رویے کے درمیان تعلق کو بیان کرنے کی کوشش کی۔

انگریز ڈاکٹر Jmaes Parkinson نے پہلی دفعہ دماغ کی بیماری جو بوڑھے لوگوں میں پائی جاتی ہے اور ان کی حرکات پر اثر انداز ہوتی ہے اسے دریافت کیا۔ اس کا نام Parkinson Disease ہے۔ ایک امریکن ریل روڈ ورکر Phineas Gage ایک دھماکے کے بعد زندہ رہا جبکہ لوہے کا ایک راڈ اس کے دماغ کے اگلے حصے میں گھس گیا تھا۔ اس کے رویے میں تبدیلی رونما ہوئی جس نے سائنسدانوں کو اشارہ دیا

کہ دماغ کا اگلا حصہ جسے cerebrum کہا جاتا ہے پرسنالٹی کو کنٹرول کرتا ہے۔

Pierepaul Broca (پیری پال بروکا) نے دماغ کے دائیں حصے کی شناخت کی جو بول چال کو کنٹرول کرتا ہے۔

آسٹریلین ڈاکٹر Karl Wernicke نے دماغ کا وہ حصہ دریافت کیا جو بائیں جانب ہوتا ہے اور جو بولنے کے لئے مخصوص ہے اور بول چال میں واضح الفاظ کے انتخاب میں مدد دیتا ہے۔

آسٹریلین ڈاکٹر سگمنڈ فرائیڈ نے Interpretition of Dreams شائع کرائی جس کا بنیادی خیال نفسیاتی تجزیہ (Psycho Analysis) تھا۔ 1928ء میں E.E.G (Electro (enciphalo gram) کے ذریعے دماغ کی لہروں کو ریکارڈ کیا۔

موجودہ دور میں سائنس نے دریافت کیا ہے کہ انسانی دماغ کا وزن 1.3 کلوگرام ہوتا ہے اور اس کا 90% حصہ پانی پر مشتمل ہے اور یہ سرخی مائل پنک کلر کا ہوتا ہے اور مکھن جیسا نرم ہے۔ یہ جسم کی 20% طاقت خرچ کرتا ہے۔ چاہے انسان سو رہا ہو یا جاگ رہا ہو cerebro spinal fluid دماغ کی حفاظت کرتا ہے۔

دماغ تین اہم حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

1- Fore brain

2- Mid brain

3- Hind brain

fore brain کو بھی تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

1- Thalamus

2- Limbic system

3- Cerebrum

sensory information پہلے تھیلمس کو جاتی ہیں وہاں سے Limbic system اور پھر cerebrum میں جاتی ہیں۔

Limbic system ایک arch کی صورت میں تھیلمس اور cerebrum کے درمیان پایا جاتا ہے یہ انسان کے رویے جیسے غصہ، ڈر، خوف، سکون، بھوک، پیاس، خوشی اور جنسی ردعمل پر شامل ہے۔ یہ یادداشت بنانے میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔

Lymbic system تین حصوں پر مشتمل ہے۔

Hypothalamus یہ ہارمونز پیدا کرتا ہے۔

Amygdala اس کے اندر نیورانز (برین سیلز) خوشی و غمی کے جذبات پیدا کرتے ہیں۔

Hippocampus لمبی یادداشت پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے جو Learning (سیکھنے) کے عمل میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

Cerebrum یہ دماغ کا سب سے بڑا حصہ ہے اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا جن کو رائٹ اینڈ لفٹ Cerebral Hemisphere

Right Cerebral Hemisphere

بائیں حصے کو کنٹرول کرتا ہے اور یہ تعمیری کاموں، تخیل، آرٹ اور میوزک کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

Left cerebral hemisphere دائیں حصے کو کنٹرول کرتا ہے۔ یہ زبان کو بولنے اور لکھنے میں مدد دیتا ہے۔ نیز سائنسی حساب کتاب اور تمام ٹیکنیکل کاموں کو سیکھنے میں مدد دیتا ہے۔ یہ دونوں حصے ایک دوسرے کے ساتھ مربوط (communicate) ہوتے ہیں۔

left hemisphere عام طور پر دائیں حصے پر غالب ہوتا ہے اسی لئے لوگ زیادہ تر دائیں ہاتھ سے لکھتے ہیں۔

cerebrum کے گرد 2 ملی میٹر موٹی layer ہوتی ہے اسے cerebral cortex یا grey matter کہتے ہیں۔ یہ بہت سلوٹوں (wrinkels) والی ہوتی ہے۔ یہ انسان میں ذہانت اور سوچ بچار کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔ یادداشت کا بھی اس سے گہرا تعلق ہے۔ یادداشت cerebral cortex کے مختلف حصوں میں (محفوظ) store ہو جاتی ہے۔

یہ نیورانز (برین سیلز) کے درمیان پیٹرن آف کونیکشنز کے طور پر محفوظ ہوتی ہے۔ ہر روز کے واقعات کو یاد کرنا جیسے چھٹی پر جانا، فلم دیکھنا، لمبی یادداشت اس کے ساتھ مخصوص ہے روزمرہ کے واقعات جن کو دماغ یاد رکھنا چاہتا ہے ان کو limbic system میں رکھتا ہے۔ limbic system باقاعدگی سے ان واقعات کو cortex میں بھیجتا ہے جہاں long term storage میں محفوظ ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے واقعات رات کو خوابوں کی صورت میں replay ہوتے ہیں۔

cerebrum پڑھنے، سننے، میوزک سے لطف اندوز ہونے، کسی مشکل کا حل سوچنے، درد کے احساسات اور پینٹنگ تخلیق کرتے ہوئے language سیکھنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

Mid Brain

یہ دماغ کا درمیانی حصہ ہے جو قوت سماعت سے متعلقہ حصے کو کنٹرول کرتا ہے۔ یہ آنکھوں کے reflexes منعکسی حرکات کو بھی کنٹرول کرتا ہے۔ یہ raticular formation (شبیہ بننے کے عمل کو بناتی ہے) یہ forebrain اور hind brain کو بھی connect کرتا ہے۔

Hind brain

یہ دماغ کا پچھلا حصہ ہے۔ اس میں pons، medulla اور cerebellum شامل ہے medulla بہت سے خود بخود ہونے والے کام مثلاً دل کی دھڑکن سانس لینے کا عمل، بلڈ پریشر اور خوراک نگلنے کے افعال سرانجام دیتا ہے۔ بہت سے نیورانز جو pons میں ہوتے ہیں اور medulla کے اوپر موجود ہوتے ہیں جو سونے اور جاگنے کے درمیانی حالت میں اثر انداز ہوتے ہیں یہ سانس لینے کی شرح ورفتار کو کنٹرول کرتا ہے۔

cerebellum یہ brain stem سے اوپر موجود ہوتا ہے اور اسے چھوٹا دماغ کہتے ہیں۔ اس کی ساخت گوبھی کی طرح ہوتا ہے اس کا کام انسان کے جسمانی توازن کو برقرار رکھنا ہے۔ جسمانی حرکات میں ہم آہنگی پیدا کرنا دوڑتے اور بھاگتے وقت توازن برقرار رکھنا ہوتا ہے۔ یہ سیکھنے behaviour for memory storage میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اگر اس کو remove کر دیا جائے تو پھر بھی دماغ کام کرتا ہے مگر اس کی ہم آہنگی ڈسٹرب ہو جاتی ہے۔

cerebellum کا وقت کے ادراک سے گہرا تعلق ہے اس کا تعلق باطنی وجود یا جسم لطیف (روح) سے آنے والی اطلاعات اور حسی تحریکات emotions sensory سے ہے یہ جسم لطیف سے آنے والی اطلاعات کو لطیف طریقے سے interpret کرتا ہے جن لوگوں کی aesthetic متحرک ہوتی ہے ان میں cerebellum کا سائز چھوٹا ہوتا ہے یا اس کی ناقص کارکردگی کی صورت میں توجہ ایک نقطے پر مرکوز کرنے میں وقت پیش آتی ہے چوٹ کی صورت میں سیکھنے کی صلاحیت کم ہو جاتی ہے۔ ایسے لوگ لفظی غلطیاں کرتے ہیں دو ہم آواز لفظوں میں فرق نہیں کر پاتے جیسے habit اور rabbit میں۔

دماغ میں چار قسم کی برقی رو مشاہدہ کی گئی ہیں بیٹا ویوز (Beta waves) الفا ویوز (Alpha waves) اور تھیٹا ویوز (Theta waves) گاما برین ویوز (Gama brain waves)

گاما ویوز نیند کی انتہائی گہری حالت میں پیدا ہوتی ہیں ان کی فریکوئنسی بڑھنے سے الفا، بیٹا اور تھیٹا میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ تھیٹا ویوز brain stem میں پیدا ہوتی ہیں۔

gama waves انتہائی لاشعوری کیفیت کی نمائندگی کرتا ہے اسے مشترک حواس یا کائناتی نگاہ کا autism جنون بھی کہتے ہیں۔

جب کسی شخص کا ذہن رویوں، ذہانت، احساسات، ردعمل طور طریقوں اور دوسری بہت سی باتوں سے متاثر ہوتا ہے تو اس کا لاشعور متحرک ہو جاتا ہے۔ ذہن کی یہ تمام صلاحیتیں ہر فرد میں مختلف ہوتی ہیں جو ہر ایک کی مختلف شخصیت (پرسنالٹی) بناتی ہیں۔

شخصیت کا دوسرا پہلو ذہانت ہے جو بہت سی چیزوں کا مجموعہ ہے جس میں کسی چیز کو یاد کرنے کی صلاحیت تخلیقی قوت، سیکھنے کی قابلیت، منصوبہ بندی، مہارت ٹھیک الفاظ کا استعمال اور کسی مسئلے کو حل کرنے کی صلاحیت شامل ہے۔ سائنسدانوں کا خیال ہے کہ ذہانت کے 120 مختلف پہلو ہیں۔

محسوسات کے بغیر دنیا بہت بے رنگ دکھائی دیتی ہے۔ خواس خمسہ اردگرد کی دنیا میں ہونے والی تبدیلیوں کو محسوس کرتے ہوئے انہیں دماغ میں بھیجتے ہیں اور اس طرح انسان مستقل طور پر گردوپیش میں ہونے والی تبدیلیوں سے آگاہ ہوتا رہتا ہے۔ کئی ملین (sensors) حسیات ایک جیسی مقدار میں جلد کے اندر مختلف انداز سے پھیلی ہوتی ہیں۔

سب سے زیادہ حسیاتی صلاحیت ہونٹوں، انگلیوں کی پوروں اور زبان میں موجود ہوتی ہیں۔

انسان کا شعوری ذہن گردوپیش کی ہر بات کی خبر رکھتا ہے لیکن یہ معلوم کرنے کے لئے کہ وہ سوتے وقت کیا کر رہا ہوتا ہے۔

E.E.G کے ذریعے سوتے ہوئے انسانی دماغ کی لہروں کا مشاہدہ کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا ہے کہ سویا ہوا شخص پہلے گہری نیند میں

گیا پھر ہلکی نیند میں گیا۔ پھر ہلکی نیند میں جسے rem کہتے ہیں جب وہ بیدار ہونے کے قریب تھا پھر وہ گہری نیند میں چلا گیا۔ ساری رات یہ عمل repeat ہوتا رہا اور rem sleep کے ساتھ یہ دورانیہ طویل ہوتا گیا۔

rem sleep میں ہی انسان خواب دیکھتا ہے سویا ہوا شخص جو مکمل طور پر بے ہوش نہیں ہوتا کیونکہ وہ کسی بھی اونچی آواز سے آسانی سے بیدار کیا جاسکتا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ

"sleep is a period of alter consiousness"

اور اس کے راستے میں Hypnoris (تحلیل نفسی) حائل ہے۔ ایک ہی جملے کے بار بار دہرانے سے انسان ٹرانس میں چلا جاتا ہے۔ جس میں اس کے ذہن کو بآسانی ہدایات دی جاسکتی ہیں۔ اس عمل کے ذریعے لوگوں کے دماغی خوف کی کیفیات اور مختلف بیماریوں کی وجوہات جان کر علاج کیا جاسکتا ہے۔ انسانی دماغ کی پیچیدگیوں کو سمجھنا انتہائی مشکل کام ہے اور خاص طور اس کی باطنی خصوصیت عقل اور اس کی نیرنگیوں کو...... کسی بھی انسان کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔ عقل ایک راز ہے اور جس کا سرچشمہ صرف خدا ہے۔

☆

ڈاکٹر رابرٹ، علی موسیٰ کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے اپنے ویل فرنشیڈ ہال نما کلینک میں داخل ہوئے۔ ڈاکٹر رابرٹ کے چہرے پر حیرانگی و پریشانی کے تاثرات نمایاں تھے۔

''اٹس ریئلی ویری امیزنگ سچوئشن...... بٹ ایوری پرابلم ہیز سیلوشن (یہ بہت حیران کن صورت ہے مگر ہر مسئلے کا حل ہوتا ہے) ڈاکٹر رابرٹ نے پرامید لہجے میں کہا۔

''اسی لئے میں آپ کے پاس آیا ہوں...... وہ میرا اچھا دوست ہے...... اور میں اسے کھونا نہیں چاہتا'' علی موسیٰ نے قدرے سنجیدگی اور تاسف سے جواب دیا۔

''وہ کہاں ہے......؟'' ڈاکٹر رابرٹ نے پوچھا۔

''نیچے...... گاڑی میں......'' علی موسیٰ نے جواب دیا۔

''اکیلا......؟'' ڈاکٹر رابرٹ نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

''نہیں...... میرے ایک اور دوست کے ساتھ......'' علی موسیٰ نے کہا۔

'' آپ ان کو میرے پاس لے آئیے...... میں انتظار کرتا ہوں'' ڈاکٹر رابرٹ نے کہا اور علی موسیٰ کلینک سے باہر نکل گیا اور ڈاکٹر رابرٹ اس کیس کے بارے میں سوچنے لگے۔

علی موسیٰ کو گئے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی مگر وہ ابھی تک نہیں لوٹے تھے۔ ڈاکٹر رابرٹ نے حیرت سے دیوار پر لگے کلاک کو دیکھا اور اٹھ کر کلینک کی بہت بڑی شیشے کی کھڑکی میں سے نیچے پارکنگ میں دیکھنے لگے۔ انہیں نہ تو علی موسیٰ نظر آیا اور نہ ہی کوئی اور علی موسیٰ کہاں گیا......؟ اس کی

خاطر میں نے آج اپنی ساری اپائنٹمنٹس کینسل کی ہیں......اور......'' ڈاکٹر رابرٹ نے قدرے تشویش سے سوچا اور اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور قدرے مایوسی سے سوچتے ہوئے اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئے۔ کہنی اپنے ٹیبل پر ٹکائے اور سر کو ہاتھ سے تھامے وہ گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

اچانک دروازہ کھلا اور علی موسیٰ ایک ویل ڈریسڈ آدمی کے ساتھ اندر داخل ہوا آدمی چہرے سے پڑھا لکھا، مہذب اور سلجھا ہوا شخص دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی عمر پچپن سال تھی اور آنکھوں پر سنہری فریم کی عینک لگا رکھی تھی۔ اس کی رنگت سانولی، نقوش، بھدے اور چہرے پر قدرے کرختگی تھی۔ آنکھوں میں عجیب سا اسرار تھا۔ سر کے بال قدرے گھنے تھے مگر ان میں سفیدی خصوصی طور پر نمایاں تھی۔ بلیک کلر کے تھری پیس سوٹ کے ساتھ سفید شرٹ اور میرون ٹائی میں وہ قدرے مہذب لگ رہا تھا۔

ڈاکٹر رابرٹ نے علی موسیٰ اور پھر اس شخص کی جانب استفہامیہ انداز میں دیکھا۔ علی موسیٰ کے چہرے پر تھکن اور پریشانی کے تاثرات نمایاں تھے اور آنکھوں میں بے چینی اور بے زاری تھی۔ ڈاکٹر رابرٹ نے ان تاثرات سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے ان سے کسی قسم کا سوال نہ کیا اور اس شخص کی جانب دیکھتے ہوئے قدرے پرتپاک انداز میں کھڑے ہو کر اس کا خیر مقدم کیا۔

''ویلکم......ڈاکٹر دانش......'' ڈاکٹر رابرٹ نے اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے اور اس کی جانب بڑھ کر اپنا ہاتھ مصافحے کے لئے بڑھاتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر دانش نے مسکرا کر ڈاکٹر رابرٹ سے ہاتھ ملایا۔

''آیئے تشریف رکھیے......'' ڈاکٹر رابرٹ نے کلینک کی ایک جانب انتہائی آرام دہ صوفے کی جانب اشارہ کیا، تینوں مختلف اطراف میں رکھے صوفوں پر بیٹھ گئے۔

''آپ لوگ کیا لیں گے......چائے یا کافی......؟'' ڈاکٹر رابرٹ نے دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کافی......'' علی موسیٰ نے ڈاکٹر دانش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''او کے......'' ڈاکٹر رابرٹ نے اپنی ٹیبل پر رکھے انٹر کام پر کافی کا آرڈر دیا اور ان کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔

''ڈاکٹر دانش......میں آپ کی achievements کے بارے میں سن کر بہت خوش ہوا ہوں......یو......آر......اے جینئس ریئلی گاڈ گفٹڈ......'' ڈاکٹر رابرٹ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کونسی achievements......؟'' ڈاکٹر دانش نے حیرت سے پوچھا تو ڈاکٹر رابرٹ نے علی موسیٰ کی طرف گہری نگاہوں سے دیکھا اور گہری سانس لی اور تینوں خاموش ہو گئے۔ ڈاکٹر رابرٹ کی نظریں مسلسل ڈاکٹر دانش کے چہرے پر تھیں اور وہ پر تجسس انداز میں ڈاکٹر دانش کے چہرے کا جائزہ لے رہے تھے جبکہ ڈاکٹر دانش ٹیبل پر پڑے کرسٹل باؤل میں رنگ برنگی beads (موتی) گننے میں مصروف تھے۔ شیف ٹرالی میں کافی لایا اور سب کے سامنے کافی کے کپ رکھے اور باہر چلا گیا۔

باہر موسم خاصا سرد ہو رہا تھا۔ کمرہ قدرے پرسکون اور گرم تھا۔ گرم بھاپ اڑاتی ہوئی کافی کی خوشبو دماغ کو مسرور کرنے لگی۔ علی موسیٰ نے

ڈاکٹر دانش کے کہنے پر کافی کا کپ پکڑا اور اسے آہستہ آہستہ پینے لگے۔ ڈاکٹر دانش کافی کی طرف بغور دیکھنے لگے اور شوگر پیک کپ میں ڈال کر ایک چمچ سے ہلاتے ہوئے اس کی جانب بغور دیکھنے لگے اور آہستہ آہستہ سپ لینے لگے اچانک باہر سڑک پر پولیس وین کے سائرن کی تیز آواز سن کر تینوں چونکے اور سب نے سڑک کی طرف کھلنے والی کھڑکی کی جانب دیکھا۔ ڈاکٹر دانش کا ہاتھ کپکپایا اور انہیں زور سے جھٹکا لگا تو ہاتھ کی جنبش سے کرسٹل باؤل فرش پر گر گیا جو سفید چمکتی ہوئی ٹائلز سے بنا تھا۔

''اوہ......'' ڈاکٹر دانش نے قدرے تاسف سے کہا اور فرش پر بکھرے اور پھسلتے موتیوں کو دیکھنے لگے جو سفید ٹائلوں پر تیزی سے ادھر ادھر پھیلتے چلے جا رہے تھے اور ٹائلز کی ہمواری اور پھسلن کی وجہ سے کہیں ٹھہر ہی نہیں رہے تھے۔

''کوئی بات نہیں......آپ انہیں چھوڑیں'' ڈاکٹر رابرٹ نے کہا۔

''نہیں......'' اور وہ پنجوں کے بل فرش پر بیٹھ کر رنگ برنگی موتیوں کو اکٹھے کرنے لگے۔ ڈاکٹر رابرٹ اور علی موسیٰ حیرت سے انہیں دیکھنے لگے۔

''ڈاکٹر دانش......پلیز ڈونٹ ڈواٹ......آپ......آپ ایک جینئس سائنٹسٹ (سائنسدان) ہیں اور یوں'' ڈاکٹر رابرٹ نے قدرے گھبرا کر کہا۔

''نو......آئی......ایم ناٹ'' اور کبھی گھٹنوں کے بل اور کبھی پنجوں کے بل رینگ رینگ کر موتی اکٹھے کرتے اور انہیں ہاتھ میں پکڑی باؤل میں ڈالتے رہے۔

''علی موسیٰ......ان دانوں کو کاؤنٹ (گنتی) کریں......'' ان کو پچاس ہونا چاہیے......میرا خیال ہے یہ پینتالیس ہیں، پانچ ادھر ہی کہیں ہوں گے'' ڈاکٹر دانش نے باؤل علی موسیٰ کو پکڑایا اور خود صوفے کے پاس قدرے لیٹ کر اس کے نیچے لمبا ہاتھ مار کر دانے ڈھونڈنے لگے۔

علی موسیٰ نے مایوسی سے ڈاکٹر رابرٹ کی جانب دیکھا اور ہاتھ میں رکھے موتیوں کو آنکھوں ہی آنکھوں میں بغور دیکھتے ہوئے کاؤنٹ کرنے لگے۔ وہ واقعی ہی پینتالیس تھے۔ ڈاکٹر دانش کبھی صوفے کے نیچے بقیہ دانوں کو تلاش کر رہے تھے کبھی ٹیبل کے نیچے......پنجوں اور گھٹنوں کے بل چلتے ہوئے ان کی ٹائی مسلسل فرش سے ٹکرا رہی تھی اور وہ کسی پالتو جانور کی مانند ادھر ادھر موتیوں کو تلاش کر رہے تھے۔ بہت مشکل سے وہ پانچ موتیوں کو اکٹھا کر کے لائے اور انتہائی خوشی سے علی موسیٰ کے سامنے ٹیبل پر رکھے باؤل میں دانے ڈالے اور انتہائی خوشی سے اپنے ہاتھوں سے تالیاں بجانے لگے۔

''یہ ٹارگٹ بھی پورا ہو گیا'' وہ بچوں کی طرح بھرپور قہقہہ لگا کر بولے اور کافی کا کپ ہاتھ میں پکڑا۔

''اوہ......یہ تو ٹھنڈی ہو گئی ہے'' ڈاکٹر دانش نے منہ بنا کر کہا۔

''کوئی بات نہیں......میں اور منگواتا ہوں......گرم کافی'' ڈاکٹر رابرٹ نے کہا۔

''اوہ......نو......آئی ڈونٹ لائک کافی......میں نے کبھی کافی نہیں پی'' ڈاکٹر دانش نے بے زاری سے کہا تو علی موسیٰ نے چونک کر ان کی جانب دیکھا جو کافی کے مگ کو کبھی ختم نہیں ہونے دیتے تھے۔

ڈاکٹر دانش کی اس ایکٹیوٹی کے دوران علی موسیٰ اور ڈاکٹر رابرٹ نے بھی کافی نہیں پی تھی اور تینوں کے کپ ویسے ہی ان کے سامنے پڑے تھے۔علی موسیٰ اور ڈاکٹر رابرٹ کے چہروں پر گہری سنجیدگی چھائی تھی۔یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ڈاکٹر دانش کی حالت پر انہیں شدید دکھ ہو رہا ہو۔دونوں خاموش تھے اور ڈاکٹر دانش ان کی طرف کنکھیوں سے دیکھتے اور شرما کر یوں دیکھتے جیسے کوئی شرارتی بچہ اپنے سے کسی بڑی عمر کے شخص کو دیکھ کر شرماتا ہوا ہنس رہا ہو۔

''ڈاکٹر دانش......آپ......؟''ڈاکٹر رابرٹ نے اپنے موڈ کو قدرے تبدیل کرتے ہوئے ڈاکٹر دانش کو مخاطب کرنا چاہا۔

''میں......میں ڈاکٹر دانش نہیں ہوں......میں تو......میں تو......''وہ ہاتھ کی انگلی اپنی دائیں کنپٹی پر رکھ کر سوچنے لگے۔

''میں کیا ہوں......؟''وہ بڑبڑائے۔

''ہاں......یاد آیا......میں تو 'ہمپٹی' ہوں''وہ ایک دم خوشی سے ہنستے ہوئے بولے اور بے ہنگم قہقہے لگانے لگے۔

''ہمپٹی......کون ہمپٹی......؟''ڈاکٹر رابرٹ نے حیرت سے پوچھا۔

آپ مجھے نہیں جانتے......ہمپٹی کو نہیں جانتے......سرکس میں سب مجھے ہمپٹی ہی کہتے ہیں۔میں سرکس میں جوکر ہوں clown...... رنگ ماسٹر ڈمپٹی......مجھے بہت پیار کرتا ہے۔جب میں سرکس میں شو کرتا ہوں لوگ بہت تالیاں بجاتے ہیں......ایسے......اور ڈاکٹر دانش زور زور سے تالیاں بجاتے ہوئے ادھر اُدھر گھومنے لگے۔ان کے چہرے پر انتہائی خوشی کے تاثرات تھے۔انہیں بالکل بھی ہوش نہیں تھا کہ ان کے بال کتنے بے ترتیب ہو گئے تھے اور ان کی ٹائی بالکل پیچھے جا چکی تھی۔دو گھنٹے پہلے کلینک میں آنے والا شخص قدرے مہذب لگ رہا تھا اور اب بالکل اس سے مختلف......واقعی جوکر اور پاگل دکھائی دے رہا تھا۔

میں سرکس میں جب clown cap ریڈ اور وہائٹ کوٹ پہن کر آتا ہوں تو بچے خوشی سے چلانے لگتے ہیں۔میری طرف گفٹس پھینکتے ہیں اور ہر طرف ہمپٹی......ہمپٹی کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔میں ایک swing سے دوسرے swing تک ہوا میں یوں move کرتا ہوں اور اس نے اپنے دونوں پاؤں سے جوتے اتارے......ہاتھ اٹھا کر ایک صوفے سے دوسرے صوفے پر جمپ لگانے لگا اور اس لمحے وہ بہت خوش تھا۔عجیب انداز میں قہقہے لگا رہا تھا۔بے تحاشا ہنس رہا تھا ڈاکٹر رابرٹ اور علی موسیٰ اس کی جانب حیرت سے دیکھتے چلے جا رہے تھے مگر بہت خاموش تھے۔وہ پورے کلینک کو سرکس کا رنگ سمجھ کر چھلانگیں لگا رہا تھا۔کبھی فرش پر قلابازیاں کھانے لگتا،کبھی ڈانس کرنے لگتا اپنے منہ سے موسیقی کی مختلف دھنیں نکالتا۔خوش ہو کر سیٹیاں بجاتا اور وہ ایسا کرتے ہوئے خوب لطف اٹھا رہا تھا۔پندرہ منٹ تک وہ یونہی مختلف کرتب دکھاتا رہا اور پھر بے دم ہو کر صوفے پر بیٹھ گیا۔اس کے چہرے پر تھکاوٹ کے آثار نمایاں ہونے لگے۔وہ اپنے ہاتھ سے سر کو دبانے لگا یوں جیسے اسے سر میں درد محسوس ہو رہا ہو۔

ڈاکٹر رابرٹ اور علی موسیٰ بغور اس کے چہرے کی جانب دیکھتے رہے۔ڈاکٹر دانش نے آنکھیں بند کیں اور صوفے کی پشت کے ساتھ سر ٹکا دیا۔

علی موسیٰ نے حیرت اور تشویش سے ڈاکٹر رابرٹ کی جانب دیکھا۔علی موسیٰ کی آنکھوں میں ان گنت سوالات تھے۔وہ بہت کچھ پوچھنا چاہ رہا تھا اور جیسے ہی کچھ پوچھنے کے لئے لب کھولے تو ڈاکٹر دانش آنکھیں کھول کر ڈاکٹر رابرٹ اور علی موسیٰ کی جانب دیکھنے لگے۔

''آئی ایم سوری......شاید میں سو رہا تھا'' ڈاکٹر دانش نے گلا کھنکارتے ہوئے کہا اور اپنے ہاتھ سے اپنے بالوں کو ٹھیک کیا، کھڑے ہو کر ٹائی اور اپنے ڈریس کو درست کیا اور اپنے آپ کو نارمل کرتے ہوئے ان کے سامنے بیٹھ گیا۔شاید میرے سونے کی وجہ سے آپ لوگوں نے بھی کافی نہیں پی۔کیا گرم کافی کا ایک کپ مل سکتا ہے؟'' ڈاکٹر دانش نے ڈاکٹر رابرٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''Sure......'' ڈاکٹر رابرٹ مسکرا کر اپنی سیٹ سے اٹھتے ہوئے بولے اور انٹر کام پر دوبارہ کافی کا آرڈر دیا۔

تھوڑی دیر بعد شیف گرم کافی لے آیا اور تینوں فریش کافی پینے لگے۔تینوں خاموش تھے۔ڈاکٹر رابرٹ منتظر نگاہوں سے ڈاکٹر دانش کی جانب دیکھ رہا تھا۔یہ جاننے کے لئے کہ وہ اب کس ٹرانس میں تھا۔

''ڈاکٹر دانش......آئی ایم پراؤڈ آف یور اچیومنٹس (کامیابیوں)'' ڈاکٹر رابرٹ نے قدرے توقف کے بعد ڈاکٹر دانش کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں......کامیابیوں کا ایک وقت ہوتا ہے......اور اس کے بعد......'' ڈاکٹر دانش نے قدرے منطقی انداز میں کہہ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

ڈاکٹر رابرٹ نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

''اور......اس کے......بعد......کیا ہوتا ہے؟'' ڈاکٹر رابرٹ نے حیرت سے پوچھا۔

''اس کے بعد......دنیا خالی ہو جاتی ہے......اس کے پاس انسان کو دینے کے لئے کچھ نہیں رہتا......ہر طرف nothingness چھا جاتی ہے'' ڈاکٹر دانش نے آہ بھر کر انتہائی سنجیدگی سے جواب دیا۔

''ڈاکٹر دانش......آپ سے ملنے کی مجھے شدید خواہش تھی......اور مجھے یقین نہیں آ رہا......کہ آپ جیسا عظیم سائنسدان آج میرے سامنے......میرے کلینک میں ہوگا'' ڈاکٹر رابرٹ نے اس کے موڈ کو بدلنے کے لئے مسکرا کر کہا۔

''آپ کون ہیں......؟'' ڈاکٹر دانش نے حیرت سے پوچھا۔

''میں......میں......ڈاکٹر رابرٹ ہوں'' ڈاکٹر رابرٹ نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''یہ میرے بہت قریبی دوست ہیں......آج میں ان سے ملنے آیا تو آپ کے بارے میں بتایا تو یہ چونک گئے اور آپ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی'' علی موسیٰ نے جلدی سے جواب دیا۔

''آئی......سی......نائس ٹو میٹ یو ڈاکٹر رابرٹ'' ڈاکٹر دانش نے کھڑے ہو کر ڈاکٹر رابرٹ سے ہاتھ ملایا۔

''تھینک یو......'' دونوں مسکرانے لگے۔

''ڈاکٹر دانش......آپ نے نیورالوجی کی فیلڈ میں بہت شہرت حاصل کی ہے۔میں نے وہ پیپرز پڑھے ہیں میں آپ کی ریسرچ اور ذہانت سے بہت متاثر ہوا ہوں بلکہ بہت متاثر ہوا ہوں۔اتنی عقل، ذہانت اور علم سے خدا بہت کم لوگوں کو نوازتا ہے۔آپ دنیا کے خوش قسمت ترین انسانوں میں سے ایک ہیں جن کو خدا نے اتنی بڑی کامیابیوں سے نوازا ہے'' آپ کو کامیابیوں کا یہ سفر کیسا لگا؟'' ڈاکٹر رابرٹ نے بھرپور انداز میں ڈاکٹر دانش کی تعریف کرتے ہوئے سوال کیا۔

''ڈاکٹر......آپ کے سر کے بال کہاں گئے؟'' ڈاکٹر دانش نے ڈاکٹر رابرٹ کے گنجے سر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''ک......ک......کیا؟'' ڈاکٹر رابرٹ نے قدرے کھسیا کر پوچھا۔ان کے چہرے پر شرمندگی کے تاثرات نمایاں ہونے لگے۔

''ڈاکٹر رابرٹ آپ شرمندہ مت ہوں......آپ نے جو سوال پوچھا ہے......اس کا یہ جواب ہے، آپ کے بال بہت جلدی اڑ گئے...... میری کامیابیوں کی طرح......کسی چیز کو پانے میں بہت اسٹرگل (جدوجہد) کرنی پڑتی ہے اور کھونے میں چند سال......شاید چند ماہ......یا پھر چند دن'' ڈاکٹر دانش نے انتہائی سنجیدگی سے منطقی انداز میں جواب دیا تو ڈاکٹر رابرٹ اور علیٰ موسیٰ نے گہری سانسیں لے کر قدرے تعریفی انداز میں ڈاکٹر دانش کی جانب دیکھا۔

''ڈاکٹر دانش......آپ واقعی ہی بہت جینئس ہیں'' ڈاکٹر رابرٹ نے کہا۔

''ہاں......پیرنٹس نے اسی لئے میرا نام 'دانش' رکھا تھا'' ڈاکٹر دانش نے قدرے خوشگوار موڈ میں مسکراتے ہوئے کہا۔آپ کے پیرنٹس (والدین) کہاں ہیں؟ ڈاکٹر رابرٹ نے پوچھا۔

''کھو گئے......'' ڈاکٹر دانش نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''کہاں......؟'' ڈاکٹر رابرٹ نے چونک کر پوچھا۔

''معلوم نہیں'' ڈاکٹر دانش نے مایوسی سے جواب دیا۔

''یہ کیسے ممکن ہے......کہ......آپ کو......ان کی کوئی خبر نہ ہو'' ڈاکٹر رابرٹ نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

ڈاکٹر دانش نے ڈاکٹر رابرٹ کی جانب غور سے دیکھا اور اس کی آنکھوں میں بے یقینی دیکھ کر اپنے کوٹ کی جیب میں سے پارکر کا قیمتی اور نفیس پن نکال کر اسے فرش پر رکھا اور اپنے پاؤں کی ٹھوکر سے اسے لڑھکا دیا۔ پن تیزی سے لڑھکتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ڈاکٹر رابرٹ اور علیٰ موسیٰ حیرت سے ڈاکٹر دانش کی طرف دیکھنے لگے۔

''وہ بھی اس پن کی طرح کہیں کھو گئے ہیں......اس دنیا میں موجود ہیں......مگر اس پن کی طرح کہاں کھو گئے ہیں، معلوم نہیں'' ڈاکٹر دانش نے جواب دیا۔

''کیا آپ نے ان کو تلاش نہیں کیا؟'' ڈاکٹر رابرٹ نے پوچھا۔

''ڈاکٹر......کیا باہر کوئی ایکسیڈنٹ ہوا ہے......پولیس وین کے ہوٹرز کی آواز سنائی دے رہی ہے'' ڈاکٹر دانش نے ڈاکٹر رابرٹ کی توجہ ہٹانے کی خاطر سڑک پر شور مچاتی ہارن بجاتی پولیس وین کے بارے میں کہا۔

''شاید......'' ڈاکٹر رابرٹ نے جواب دیا۔

''علیٰ موسیٰ......آئی ایم ٹائرڈ......اپنے فلیٹ میں واپس جانا چاہتا ہوں......کیا تم میرے ساتھ نہیں چلو گے؟'' ڈاکٹر دانش نے علیٰ موسیٰ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں......میں آپ کے ساتھ ہی چلتا ہوں......لیکن......''علی موسیٰ کچھ کہتے ہوئے رکا۔

''ٹھیک ہے......میں گاڑی میں جا کر بیٹھتا ہوں......تم آجانا''

''تھینک یو......ڈاکٹر رابرٹ......یو......آر......اے نائس مین'' ڈاکٹر دانش اس سے مصافحہ کر کے بنا کچھ کہے سنے باہر نکل گیا۔

''ڈاکٹر رابرٹ......یہ......سب کیا ہے......؟ ڈاکٹر دانش تو بالکل ابنارملز کی طرح بی ہیو کر رہے تھے۔کیا وہ واقعی پاگل ہو رہے ہیں؟'' علی موسیٰ نے حیرت سے پوچھا۔

''آپ......ڈاکٹر دانش کو کب سے جانتے ہیں؟'' ڈاکٹر رابرٹ نے علی موسیٰ کے سوال کا جواب دیئے بغیر کہا۔

''گزشتہ چند ماہ سے......ہم دونوں نے ایک اپارٹمنٹ شیئر کیا ہے......میرا تعلق جورڈن (اردن) سے ہے اور یہاں جاب کے سلسلے میں آیا ہوں......ڈاکٹر دانش اس اپارٹمنٹ کے مالک ہیں جہاں میں رہ رہا ہوں۔ڈاکٹر دانش ازریئلی سِک Sick......وہ بہت بے بسی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ان کی لائف میں کوئی ہوپ نہیں وہ اکثر مرنے کی باتیں کرتے ہیں۔میں ایک کمپنی میں بطور آرکیٹیکٹ جاب کرتا ہوں، رات کو واپس آتا ہوں تو ڈاکٹر دانش کی باتیں سن کر مجھے بہت دکھ ہوتا ہے۔انسانیت کے ناتے میں انہیں آپ کے پاس لایا ہوں۔آپ ایک اچھے سائیکاٹرسٹ ہیں۔آپ کا بہت نام ہے، مجھے کئی روز سے محسوس ہونے لگا تھا کہ ڈاکٹر دانش کو کسی اچھے سائیکاٹرسٹ کی ضرورت ہے......پلیز آپ ان کی مدد کریں'' علی موسیٰ نے افسردگی سے کہا۔

''ینگ مین......گاڈ نے انسان کو دوسرے انسان کی صورت میں بہت بڑی نعمت اور تحفے سے نوازا ہے۔جب کوئی انسان بغیر کسی لالچ......اور غرض کے دوسرے انسان کے لئے دکھ، درد اور محبت محسوس کرتا ہے......اور اس کی تکلیف کم کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس سے بڑھ کر اس انسان کے لئے اور کیا تحفہ ہوگا......ڈونٹ وری......میں ان کی پرابلمز حل کرنے کی پوری کوشش کروں گا......'' ڈاکٹر رابرٹ نے علی موسیٰ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''تھینک یو ڈاکٹر......'' علی موسیٰ نے مسکرا کر جواب دیا۔

''پلیز......مجھے ڈاکٹر دانش کے بارے میں تمام معلومات فراہم کرنے کی کوشش کریں، آئی مین......ان کے فیملی بیک گراونڈ اور ان کے پرابلمز اینڈ کومپلیکسز کے بارے میں......ان فیکٹ یہ انسان کے اندر کے کومپلیکسز اور دماغ کے اندر کونفلیکٹ (کشمکش) ہوتی ہے جو نفسیاتی بیماریوں کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں۔باتوں باتوں میں ڈاکٹر دانش کے اندر موجود کونفلیکٹ ایریاز کو ٹچ کرنے کی کوشش کریں'' ڈاکٹر رابرٹ نے علی موسیٰ کو کہا۔ تو وہ توجہ سے ان کی باتیں اور ہدایات سننے لگا۔

''گڈ لک......میں ڈاکٹر دانش کے ساتھ ایک اور میٹنگ کرنا چاہوں گا لیکن اس دوران آپ ان کی ساری حرکات کو نوٹ کر کے مجھے انفارم کریں'' ڈاکٹر رابرٹ نے اسے رخصت کرتے ہوئے کہا تو علی موسیٰ ان کا شکریہ ادا کرتا ہوا باہر نکل آیا۔

☆

''اماں......کیا آپ نے عاصم کو کھانا کھلایا ہے؟''فریحہ نے شام کو گھر داخل ہوتے ہوئے ادھیڑ عمر ملازمہ سے پہلا سوال کیا۔

''ہاں......بہت مشکل سے......''ملازمہ نے بیزاری سے جواب دیا۔

''کیوں......؟''فریحہ نے حیرت سے پوچھا۔

''بی بی......اب وہ جوان ہو رہا ہے......بہت تنگ کرنے لگا ہے......میرے قابو میں نہیں آتا۔آپ اس کے لئے کوئی اور ملازمہ تلاش کریں......میری بوڑھی ہڈیوں میں اب اسے سنبھالنے کی طاقت نہیں......آپ میرا حساب چکتا کریں......''اماں قدرے خفگی سے منہ بنا کر بولی۔

''اماں......آج آپ کو کیا ہو گیا ہے......آپ نے پہلے تو کبھی ایسی بات نہیں کہی''فریحہ نے اماں کی طرف بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''بی بی......وہ پہلے اتنا تنگ بھی تو نہیں کرتا تھا،کھانا کھلانے بیٹھو تو اتنے زور سے ہاتھ پاؤں مارتا ہے کہ قابو میں نہیں آتا......آج تو اس نے سارا سالن بھی میرے اوپر گرا دیا اور پانی بھی......بڑی مشکل سے اسے سلایا ہے''اماں قدرے تلخی سے بولی۔

''اماں......میں سب سمجھتی ہوں اور آپ کی بہت شکر گزار بھی ہوں۔اگر آپ نہیں ہوتیں تو شاید میں اتنی بے فکر ہو کر نوکری پر بھی نہ جا سکتی،اماں......آپ نے میرا بہت ساتھ دیا ہے اتنے مشکل وقت میں......جب میرے اپنے میرا ساتھ چھوڑ گئے ہیں۔آپ میرے لئے آسرا بنی رہی ہیں......میں جانتی ہوں عاصم اب بہت تنگ کرنے لگا ہے مگر آپ ہی بتایئے میں کیا کروں۔کیا میں اسے کہیں پھینک سکتی ہوں......کہیں چھوڑ سکتی ہوں''فریحہ کی آنکھیں برسنے لگیں تو اماں کا دل پسیجنے لگا۔

''بی بی......میرا یہ مطبل (مطلب) نہیں تھا۔میں تمہیں دکھی تو نہیں کرنا چاہتی......مگر......میں بھی کیا کروں......بی بی......اب وہ بچہ نہیں رہا،بڑا ہو رہا ہے اس کے لئے کسی مرد کو نوکر رکھو......میں بڑھیا کہاں تک اسے سنبھالوں،کبھی کبھار تو میرے اوپر ہی گر جاتا ہے......سارے کا سارا......مولا کے رنگ ہیں......سارا جسم ٹھیک ٹھاک ہے......بس دماغ میں ہی کوئی کسر رہ گئی ہے اور بیچارہ سب کا محتاج ہو گیا ہے''اماں نے تاسف سے کہا تو فریحہ نے گہری سانس لی اور اماں کی طرف بغور دیکھنے لگی۔

''اماں......اگر آپ کو کسی ملازم لڑکے کا بندوبست کر دوں پھر تو آپ ہمیں چھوڑ کر نہیں جائیں گی نا''فریحہ نے پرامید لہجے میں کہا۔

''ہاں......پھر......میں رک جاؤں گی......بی بی......مجھے تجھ سے پیار بھی تو بڑا ہے......جب میں یہاں آئی تھی......بابا پانچ سال کا تھا اور اب وہ سولہ برس کا ہو گیا ہے......''اماں نے کہا۔

''ہاں......اماں......وقت تو گزر گیا ہے مگر اس کی سب تلخیاں مجھے یاد ہیں......شاید وقت سے وابستہ اچھی بری یادیں گزرے وقت کو کبھی بھولنے نہیں دیتیں''فریحہ نے افسردگی سے کہا۔

''بی بی......تیرا بڑا حوصلہ ہے......اپنی ساری جوانی......اس معذور بچے کے ساتھ گزار دی......''اماں نے ہمدردی سے کہا۔

''اس کی ماں......جو......ہوں''فریحہ نے نم آنکھوں سے جواب دیا۔

''باپ کی بھی تو کوئی ذمہ داری ہوتی ہے نا......اس نے تو کبھی اس کی خبر ہی نہیں لی''اماں نے کہا۔

''اماں...... وہ اسے اپنی اولاد سمجھے تو پھر ہے نا...... جو شخص یہ ماننے سے ہی انکار کر دے کہ اس جیسے عقلمند اور قابل شخص کے ہاں کبھی ایسا بچہ پیدا نہیں ہو سکتا جو ذہنی طور پر معذور ہو...... تو وہ کیسی ذمہ داریاں سمجھے گا...... اور انہیں کیسے نبھائے گا'' فریحہ نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''بی بی...... یہ تو خدا کی خدائی میں حصہ ڈالنے والی بات ہے، کوئی اللہ کا بندہ ایسی بات نہیں کر سکتا'' اماں نے حیرت سے کہا۔

''اماں...... جب اللہ انسان کو اس کی اوقات سے زیادہ نعمتوں سے نوازتا ہے تو وہ اپنے آپ کو ہی خدا سمجھنے لگتا ہے اور دوسرے انسان اسے زمین پر رینگنے والے کیڑے مکوڑے نظر آنے لگتے ہیں...... وہ بھی ایسا ہی انسان تھا...... اسے اپنے سوا کوئی اور نظر ہی نہیں آتا تھا...... ہر کوئی اس سے کمتر تھا...... ہر ایک اس کے سامنے صفر تھا'' فریحہ مایوسی سے خلا میں گھورتے ہوئے بولی۔

''بی بی...... ایسے بندے کے ساتھ گزارا کرنا بڑا ہی مشکل ہو جاتا ہے...... تو نے کیوں ایسے مرد سے شادی کی؟'' اماں نے پوچھا۔

''اماں...... قسمت سے ہارے انسان کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا...... وہ کیا تھا......؟ مجھے شادی کے بعد پتہ چلا...... پھر...... میرے پاس کوئی راستہ نہ رہا'' فریحہ کی آنکھیں پھر نم ہونے لگیں۔

''بی بی...... کھانا لاؤں؟'' اماں نے پوچھا۔

''نہیں...... ابھی بھوک نہیں...... چائے کا ایک کپ لے آیئے'' فریحہ نے کہا تو اماں اٹھ کر کچن میں چلی گئی اور فریحہ اٹھ کر عاصم کے کمرے میں گئی۔'' وہ گہری نیند سو رہا تھا۔

فریحہ اس کے پاس بیٹھ گئی اور اس کی جانب بغور دیکھنے لگی۔ وہ انتہائی صحت مند اور جوان لگ رہا تھا۔ چہرے پر معصومیت تھی۔ مونچھیں رفتہ رفتہ گھنی ہونے لگی تھیں۔ سر کے بال بھی گھنے سیاہ تھے مگر فریحہ ہمیشہ انہیں بہت چھوٹا کروا دیتی تھی کیونکہ وہ غصے میں اپنے سر کے بالوں کو بہت بری طرح نوچتا تھا اور اکثر بالوں کی لٹیں اس کے ہاتھ میں آجاتی تھیں انہیں دیکھ کر فریحہ دکھی ہو جاتی تھی مگر عاصم کو اس تکلیف کا ذرا بھی احساس نہیں ہوتا تھا۔ وہ سویا ہوا بالکل ٹھیک لگ رہا تھا۔ اس کے سارے اعضا ٹھیک تھے سوائے دماغ کے...... ڈاکٹروں کو اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی تھی اور وہ کسی حتمی نتیجے تک نہیں پہنچ پائے تھے...... مگر وہ خود اس کی وجہ جانتی تھی...... وہ نم آنکھوں سے عاصم کی جانب دیکھتی رہی اور اس کے جوان، صحت مند مگر بے کار جسم کو دیکھ کر خون کے آنسو پیتی رہی۔

''بی بی...... چائے پی لو...... میں نے باہر میز پر رکھی ہے'' اماں نے کمرے میں اس کے پیچھے آکر کہا تو فریحہ اپنی آنکھوں کو صاف کرتی ہوئی لاؤنج میں چلی گئی۔ فریحہ کے چہرے پر انتہائی دکھ اور افسردگی کے تاثرات تھے۔ وہ خاموشی سے چائے پی رہی تھی اور کسی گہری سوچ میں گم تھی۔

''بی بی...... تم نے اپنے شوہر سے طلاق بھی نہیں لی...... پھر اسے کیوں نہیں کہتی کہ وہ بچے کی ذمہ داری اٹھائے...... سارا دن ماری ماری پھرتی ہو...... نوکری کرتی ہو...... بچے کو سنبھالتی ہو...... اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو اس بچے کو کون سنبھالے گا...... کیا تم نے کبھی اس بارے میں سوچا ہے؟'' اماں نے اس کے قریب کارپٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''اماں...... ہر وقت یہی تو سوچتی رہتی ہوں...... اور اسی لئے تو اس سے طلاق نہیں لی...... کہ...... شاید اسے کبھی خیال آجائے اور وہ اسے

اپنی اولاد سمجھ لے'' فریحہ نے آہ بھر کر کہا۔

''تم دونوں میں جھگڑا کس بات پر ہے..... وہ کہتا کیا ہے.....؟ عجیب سر پھرا شخص ہے.....'' اماں قدرے خفگی سے بولی۔

''اماں..... ہم دونوں میں بہت اختلافات تھے..... مگر آپ ان باتوں کو نہیں سمجھ سکیں گی'' فریحہ نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''کیوں.....؟ وہ دنیا کا انوکھا انسان تھا..... جس کی باتیں میں سمجھ نہیں سکوں گی'' اماں غصے سے بولی۔

''ہاں..... وہ اپنے آپ کو دنیا کا سب سے انوکھا اور منفرد انسان سمجھتا تھا..... بہت قابل اور ذہین شخص تھا..... مگر.....'' فریحہ کچھ کہتے ہوئے رکی۔

''وہ بہت مشکل انسان تھا..... میری ہر بات سے الٹا مطلب نکالتا تھا۔ سیدھی بات کو بھی توڑ مروڑ کر یوں بیان کرتا تھا کہ میں پریشان ہو جاتی تھی..... وہ مجھے ذہنی طور پر بہت پریشان کرتا تھا..... مجھے ہر بات میں نیچا دکھانے کی کوشش کرتا تھا..... میں نے اس کے ساتھ شادی کے تین سال انتہائی اذیت میں گزارے تھے'' فریحہ آہ بھر کر بولی اور اس کی آنکھوں کی نمی میں اضافہ ہونے لگا۔

''وہ ایسا کیوں کرتا تھا.....؟'' اماں نے حیرت سے پوچھا۔

''وہ کومپلیکسڈ انسان تھا'' فریحہ نے بے خیالی میں جواب دیا۔

''کیسا انسان تھا.....؟'' اماں نے حیرت سے پوچھا۔

''اسے اپنی عقل اور ذہانت پر بڑا مان تھا۔ وہ اپنے جیسا کسی کو نہیں سمجھتا تھا۔ میں اس کے سامنے بہت کم عقل اور بے وقوف تھی۔ وہ نہ تو میری کسی غلطی کو معاف کرتا تھا اور نہ ہی میری کسی بات کو اس میں سے میخ نکالے بغیر جانے دیتا تھا..... اگر میں خاموش رہتی تھی تو اس سے بھی چڑتا تھا۔ بات کرتی تھی تو کٹہرے میں کھڑی ہو جاتی تھی۔ بحث کرتی تھی تو آپے سے باہر ہو جاتا تھا۔ ناراض ہوتی تھی تو طنز شروع کر دیتا تھا..... اف میں بتا نہیں سکتی..... اماں..... کہ وہ کیسا انسان تھا..... اسی لئے تو عاصم ایسا پیدا ہوا تھا..... ڈاکٹر کہتے تھے کہ میں شدید ذہنی دباؤ میں رہتی تھی اور اس کا اثر عاصم پر ہو گیا..... اور جانتی ہو..... اماں..... وہ مجھے کیا طعنے دیتا تھا.....؟'' وہ زخمی مسکراہٹ سے بولی۔

''کیا.....؟'' اماں نے حیرت سے پوچھا۔

''کہتا تھا..... کہ میں کند ذہن، کم عقل اور بے وقوف ہوں، اس لئے ایسا بچہ پیدا کیا..... اس نے کبھی اس بات کو مانا ہی نہیں کہ اس نے مجھے کبھی کسی دباؤ میں رکھا یا ذہنی اذیت دی..... اس کے نزدیک تو میں دنیا کی خوش قسمت ترین عورت تھی..... کہ..... میں اس کی بیوی تھی اور مجھے ہر وقت اس کا شکر گزار ہونا چاہیے تھا کہ اس نے مجھے اپنی بیوی بنانے کے قابل سمجھا تھا'' فریحہ نے آہ بھر کر کہا۔

''بی بی..... مجھے تو واقعی اس کی باتیں سمجھ میں نہیں آ رہیں تھیں..... عجیب احمق انسان تھا'' اماں نے ناک چڑھا کر غصے سے کہا۔

''احمق نہیں..... علقمند..... دانشمند..... اور بے مثال'' وہ آہستہ آہستہ بڑبڑائی۔

اچانک کسی شے کے فرش پر گرنے کی آواز سنائی دی۔ دونوں نے چونک کر عاصم کے کمرے کی جانب دیکھا اور بھاگتی ہوئی عاصم کے

کمرے میں گئیں۔ عاصم فرش پر گرا پڑا تھا۔ شاید اس نے سوتے ہوئے کروٹ لی اور فرش پر گر گیا تھا۔ فریحہ اور اماں اس کی جانب لپکیں، وہ بری طرح رو رہا تھا۔ فریحہ نے اس کے بے جان جسم کو اٹھانے کی کوشش کی مگر وہ اتنا بھاری ہو رہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ ہی گر گئی۔ اماں اس کی مدد کو لپکی اور دونوں نے بہت مشکل سے اسے اٹھا کر بیڈ پر لٹایا۔ وہ بری طرح چلا رہا تھا۔ شاید اسے کہیں چوٹ لگی تھی مگر وہ بتا نہیں سکتا تھا۔ صرف بے ہنگم انداز میں رو رہا تھا۔ اس کی بھیگی آنکھوں میں فریحہ کے لئے غصہ اور نفرت تھی۔ وہ اپنے غصے کا اظہار اپنے ہاتھوں کو عجیب انداز میں ہلا ہلا کر کر رہا تھا اور روتے ہوئے عجیب وغریب آوازیں نکال رہا تھا۔

''بیٹا...... چپ کرو...... مما ہے نا...... آپ کے پاس'' فریحہ نے محبت سے اس کی پیشانی چومتے ہوئے کہا مگر وہ اسے اپنے ہاتھ سے پرے دھکیل رہا تھا جیسے وہ اس سے سخت ناراض ہو اور اس کی وجہ سے گرا ہو۔

''بیٹا...... آپ مجھ سے کیوں ناراض ہو رہے ہو......؟'' فریحہ نے محبت سے پوچھا اور وہ شاں شاں کی آوازیں نکالنے لگا۔

''عاصم بیٹا...... میں آپ کے کمرے میں آئی تھی مگر آپ سو رہے تھے۔ اس لئے واپس چلی گئی'' فریحہ اس کی آوازوں کا مطلب سمجھتے ہوئے بولی۔

اس نے اپنی بھیگی آنکھوں سے فریحہ کی جانب دیکھا اور غوں غوں کی آوازیں نکالنے لگا اور اسے زبان دکھانے لگا۔

''اماں...... اسے بھوک لگی ہے، آپ دودھ میں کارن فلیکس ڈال کر لے آیئے'' فریحہ نے کہا تو اماں باہر جانے لگی۔ عاصم نے پھر شاں شاں کی آوازیں نکالنی شروع کر دیں اور غصے سے ہاتھ بیڈ پر مارنے لگا۔

''کارن فلیکس نہیں...... تو...... پھر اور کیا کھاؤ گے......؟'' فریحہ نے مسکرا کر پوچھا۔

وہ مسلسل نفی میں سر ہلا رہا تھا۔

''بریڈ اور دودھ......؟'' فریحہ نے پوچھا۔

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے شاں شاں کرنے لگا۔

''چکن سینڈوچز'' فریحہ نے مسکرا کر پوچھا۔

تو اس کی آنکھیں خوشی سے چمکیں۔ فریحہ مسکرانے لگی۔

''اماں...... میں اس کے لئے سینڈوچز لائی ہوں...... فریج میں پڑے ہیں، وہ لے آیئے'' فریحہ نے کہا تو وہ خوشی سے دونوں ہاتھوں کو ہلانے لگا اور فریحہ نے نم آنکھوں سے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا۔ اماں چھوٹی ٹرے میں سینڈوچز اور دودھ کا کپ لے کر آ گئی۔ فریحہ نے ایپرن عاصم کی گردن کے گرد باندھا اور اس کے سر کو اپنی گود میں رکھ کر سینڈوچ کا تھوڑا تھوڑا حصہ اچھی طرح چمچ سے mash کر کے اس کے منہ میں ڈالنے لگی اور اس کے ساتھ چمچ سے دودھ اس کے حلق میں انڈیلنے لگی۔ وہ نہ تو خود کھا سکتا تھا اور نہ ہی چبا سکتا تھا۔ وہ بے جان وجود کی مانند بیڈ پر لیٹا رہتا تھا۔ وہ بات کو سمجھتا تھا مگر خود کچھ نہیں کر سکتا تھا اور فریحہ کو اس کا ہر کام کرنا پڑتا تھا۔ وہ زبان رکھتے ہوئے نہ بول سکتا تھا۔ مضبوط دانتوں کے باوجود چبا نہیں سکتا

تھا۔صحت مند توانا ہاتھوں سے نوالہ اپنے منہ میں نہیں ڈال سکتا تھا۔ چلتے ہوئے وہ اکثر گر پڑتا تھا۔فریحہ اور اماں بہت مشکل سے اسے پکڑ کر چلاتی تھیں ۔فریحہ کے لئے اس کا وجود ایک بہت بڑی آزمائش تھا۔اس کا علاج دنیا کے کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں تھا۔ماہر اور نامور ڈاکٹر اسے دیکھ کر بے بسی اور مایوسی کا اظہار کرتے۔وہ اس کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ عاصم کا دماغ ٹھیک ہونے کے باوجود بھی ٹھیک نہیں تھا۔اس کا ایک حصہ damage ہو گیا تھا۔وہ چیزوں کو دیکھ سکتا تھا۔ باتوں کو سن سکتا تھا۔ پیغامات کو receive کر سکتا تھا۔ چیزوں کو محسوس کر سکتا تھا مگر دماغ respond نہیں کر سکتا تھا اور اس نے اس کے پورے وجود کو ناکارہ بنا دیا تھا۔فریحہ نے اس کے علاج کے لئے کہاں کہاں رابطہ نہیں کیا تھا۔ بیرون ملک نامور نیورو سرجنز کو عاصم کی رپورٹس بھیجی تھیں ان سے رابطے کر کے اس کے ہر ممکن علاج کی کوششیں کیں تھیں مگر اس کی ہر کوشش ناکام ثابت ہوئی تھی۔اس کی زندگی کا مقصد صرف عاصم کے وجود کو زندہ رکھنا تھا اور سولہ سالوں سے وہ اسی جدوجہد میں مصروف تھی۔اس نے سول انجینئرنگ کر رکھی تھی اور اپنے شعبے میں اس نے بہت نام کمایا تھا۔شہر کے مرکز میں اس کا ویل فرنیشڈ آفس تھا اور اپنے شعبے سے وابستہ چند ماہرین کے ساتھ مل کر کام کرتی تھی۔وہ سب ایک ٹیم کے طور پر کام کرتے تھے۔پورے ملک میں ان کے کام کی بہت شہرت تھی۔فریحہ اپنی کمپنی کی ڈائریکٹر تھی۔وہ صبح سے شام تک آفس میں مصروف رہتی۔گھر آتی تو عاصم کی ذمہ داریاں نبھاتی۔اس کی زندگی کے دو ہی مقاصد تھے کام اور عاصم۔کام کرنا اس کی زندگی کا مشن تھا اور عاصم کو پالنا اپنے وجود کی تسکین کا ذریعہ تھا۔وہ سولہ سالوں سے جس چکی میں پس رہی تھی۔اس نے اس کے اعصاب کو شل کر دیا تھا۔اپنے لئے اس کے پاس سوچنے کے لیے نہ تو وقت تھا اور نہ ہی فرصت۔ہر نئے دن کے ساتھ عاصم اس کی پریشانیوں اور ذہنی اذیت میں اضافہ کر رہا تھا۔ دوسری جانب آفس میں اس کی مصروفیات بڑھ رہی تھیں۔وہ جس روز آفس سے لیٹ گھر آتی تو عاصم اس سے خفا ہو جاتا اور کسی نہ کسی طریقے سے اپنی خفگی کا اظہار انتہائی شدید انداز میں کرتا جسے دیکھ کر فریحہ پریشان ہو جاتی۔وہ اسے کچھ سمجھا نہیں سکتی تھی کیونکہ وہ اس کی باتوں کو سمجھ ہی نہیں سکتا تھا۔وہ تو بس اسکے لمس کو محسوس کر سکتا تھا۔اس کو چھونے، دیکھنے اور محسوس کرنے سے عاصم کو دلی طور پر سکون ملتا۔اس کے اندر کوئی جذبہ تسکین پاتا تو وہ خوش ہو کر مطمئن ہو جاتا۔وہ چاہتا کہ فریحہ اس کے پاس بیٹھی رہے۔اس کا سر اپنی گود میں لئے اسے سہلاتی رہے اسے آہستہ آہستہ کھلاتی رہے اور وہ اسے دیکھ کر خوش ہوتا رہے مگر فریحہ کے لئے اس کے ساتھ یوں مصروف ہونا بہت مشکل تھا۔وہ تھکی ہاری آفس سے واپس آتی تو اسے بس عاصم کی فکر ہوتی۔ کبھی چائے پیتی اور کبھی چائے پیئے بغیر ہی اسے کھلانے میں مصروف ہو جاتی۔اس کو کچھ نہ کچھ کھلا کر پھر وہ خود کھاتی اور اس قدر تھک جاتی کہ وہیں بیٹھے بیٹھے سو جاتی۔

قدرت نے اس کو اس قدر سخت آزمائش میں ڈالا تھا کہ اس کے پاس کوئی راہ فرار نہ تھی۔

اماں اس سے باتیں کر رہی تھی اور وہ صوفے کی پشت کے ساتھ سر ٹکائے گہری نیند سو رہی تھی۔اماں نے اس کی جانب دیکھ کر آہ بھری اور کلاک کی جانب دیکھا۔نو بج رہے تھے اور وہ گہری نیند سو رہی تھی۔اماں کو اس پر ترس آنے لگا۔اماں نے فریحہ کو آہستہ سے بلایا۔

”بی بی......اندر کمرے میں جا کر سو جاؤ......“ اماں نے کہا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ گئی اور نیند میں چلتی ہوئی اپنے بیڈروم میں جا کر سو گئی۔

☆

ڈاکٹر رمیض نے کامیاب نیورو سرجن کی حیثیت سے بہت نام کمایا تھا۔قدرت اس پر بہت مہربان تھی ۔ وہ ایسی قسمت لے کر پیدا ہوا تھا کہ مٹی میں بھی ہاتھ ڈالتا تو وہ سونا بن جاتی جس راستے پر قدم رکھتا وہی راستہ اس کو خوش آمدید کہتا۔جس دروازے پر دستک دیتا وہی دروازہ اس پر مزید کامیابیوں کے در وا کرتا چلا جاتا۔وہ بلا کا ذہین اور لائق نوجوان تھا۔انتہائی خوش قسمت اور خوش نصیب تھا۔قدرت کروڑوں انسانوں میں سے کسی ایک کو ایسی ذہانت، فطانت اور بلند نصیب سے نوازتی ہے۔اس کو جو کچھ بھی مل رہا تھا اس میں اس کی جدوجہد کم اور قدرت کی نظر کرم زیادہ تھی۔ اس کی ماں میٹرک پاس سادہ سی عورت تھی جبکہ باپ ایک سرکاری دفتر میں کلرک تھا۔رمیض کو ڈاکٹری کی تعلیم دلانا ان کی حیثیت سے باہر تھا مگر رمیض کو سکول کالج بورڈ اور یونیورسٹی میں ہمیشہ اول آنے پر حکومت کی جانب سے وظیفہ ملتا رہا جس سے اس کی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام ہوتا رہا اسے بہت کم مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔حکومت کی جانب سے اسے نیورو سرجری میں سپیشلائزیشن کے لئے امریکہ بھیجا گیا اور جب وہ امریکہ سے واپس لوٹا تو ملک کے تمام بڑے ہسپتال اسے اپنے ہاں ملازمت دینے کے لیے رابطہ کرنے لگے مگر اس نے حکومت کے ایک خیراتی ہسپتال میں جاب کرنے کو ترجیح دی کیونکہ وہ اپنے آپ کو ملک اور حکومت کا قرض دار سمجھتا تھا۔عوام کی خدمت کے نام پر غریبوں کا خون چوسنے والے تمام ڈاکٹر اسے احمق اور بے وقوف کہتے تھے اور کسی نہ کسی طرح اس کی شہرت کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے مگر وہ ہر رکاوٹ اور حسد سے بے نیاز اپنا مشن جاری رکھے ہوئے تھا۔نیورو سرجری کے علاوہ اس کی زیادہ دلچسپی برین اسٹڈی میں ریسرچ تھی۔اس کے لئے برین بہت حیران کن معمہ تھا۔ظاہری طور پر ایک جیسی ساخت سے جنم لینے والی مختلف سوچیں ومختلف آئی کیو لیولز۔ایک ہی خاندان اور ماحول میں پروان چڑھنے والے لوگوں کی سوچیں اور ذہنی بیماریاں، وہ بہت سی چیزوں کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔اسے ہاسپٹل میں ہی ایک بنگلہ ملا تھا جس میں وہ اپنے بوڑھے ماں باپ کے ساتھ رہتا تھا۔بنگلے کا ایک پورشن اس نے اپنی ریسرچ کے لئے مخصوص کر رکھا تھا جس میں وہ اپنے فارغ اوقات میں برین پر ریسرچ کرتا۔کمپیوٹر پر جدید تحقیق کے مطابق انفارمیشن لیتا اور اپنی بنائی ہوئی لیب میں مختلف انسانی دماغوں کو محفوظ کر کے ان پر ریسرچ میں مصروف رہتا۔اس سلسلے میں وہ ملک کے ٹاپ کلاس نیورو سرجنز اور ریسرچرز کے ساتھ ڈسکشنز کرتا رہتا۔

''ڈاکٹر رمیض...... برین اسٹڈی بہت وسیع موضوع ہے۔بہت سے سائنسدانوں اور ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ ایک انسان اپنی پوری زندگی میں صرف 5 سے 10 فیصد تک اپنا دماغ استعمال کرتا ہے۔باقی 90% استعمال کیے بغیر ہی وہ اس دنیا سے چلا جاتا ہے۔دراصل انسان خود بھی مائنڈ پوٹینشل کے بارے میں واقف نہیں...... وہ اپنے ذہن کو صرف روزمرہ کے کام کاج، سونے جاگنے، تھوڑا بہت سوچنے سمجھنے اور لکھنے پڑھنے میں استعمال کرتا ہے اور بس......! ذہن سے کس حد تک اور کتنی تیزی سے کام لیا جا سکتا ہے شاید انسان کو اس کا شعور خود بھی نہیں اب ٹیلی پیتھی ہپناٹزم اور مختلف مائنڈ ریڈنگ ایکٹویٹیز پر جیسے جیسے ریسرچ ہو رہی ہے۔انسان خود بھی حیران ہو رہا ہے اور اسے خود بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ واقعی برین کے بارے میں اس کی ریسرچ نہ ہونے کے برابر ہے۔آپ کی ریسرچ کا فوکس کیا ہے؟'' ملک کے ٹاپ کلاس نیورو سرجن ڈاکٹر محسن زیدی نے ڈاکٹر رمیض کی جانب بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''سر...... مجھے خود بھی معلوم نہیں کہ میں کیا ایکسپلور کرنا چاہتا ہوں اور مجھے کس بات پر فوکس کرنا چاہیے۔میری ریسرچ کا موضوع کیا

ہے؟ مجھے فی الحال کچھ معلوم نہیں صرف اتنا معلوم ہے کہ میرے پاس یہ ایک ٹاپک ہے جس کے بارے میں مجھے کچھ ریسرچ کرنی ہے...... میرے شعبے کے بہت سے لوگ مجھے بیوقوف کہتے ہیں کیونکہ وہ چیزوں کو ایزاٹ از اپنانے کے خواہشمند ہوتے ہیں لیکن میں کچھ تجربات کرنا چاہتا ہوں...... سر قدرت نے ہمارے لئے زمین بنائی ہے کہ ہم اس پر چل پھر سکیں سفر کر سکیں مگر انسان کی جستجو نے جب اسے اندر سے مضطرب کیا تو اس نے منزل کو سوچے بغیر اس کھودنا شروع کر دیا۔ جوں جوں انسان زمین کی گہرائی تک جاتا رہا۔ قیمتی خزانے اس کے ہاتھ آتے رہے اور جستجو کا یہ سفر ابھی تک مکمل نہیں ہوا۔ انسان بھی تو ایسا ہی ہے اس کے اندر ایک شے کی دریافت ایک دوسرے راز کی نشاندہی کرتی ہے۔ مجھے ابھی اپنی منزل کا پتہ نہیں لیکن میں کچھ ایسا کرنا چاہتا ہوں جس سے انسانیت کو صحیح معنوں میں فائدہ ہو۔ میں نے اس سلسلے میں کچھ ریسرچ کی ہے۔ یہ اس کی فائل ہے۔ آپ سینئر ہیں اور میں بہت جونیئر آپ کی رہنمائی چاہتا ہوں" ڈاکٹر رمیض نے فائل ڈاکٹر زیدی کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا تو وہ نظر کی عینک لگا کر فائل کے ایک ایک صفحے کو بغور دیکھنے لگے۔ دونوں مکمل خاموش تھے۔ ڈاکٹر رمیض ان کے چہرے پر نمودار ہونے والے تاثرات سے بہت سے اندازے لگانے میں مصروف تھا اور ڈاکٹر زیدی فائل کے صفحات میں کہیں گم ہو گئے تھے۔

"ماشاء اللہ...... آپ نے بہت ریسرچ کی ہے...... اور آپ کسی نہ کسی روز اپنی منزل بھی پا لیں گے، آپ کی ریسرچ سے ابھی مجھے بھی اندازہ نہیں ہو پا رہا کہ آپ کس سمت جا رہے ہیں کیونکہ بہت سے کاموں کا فیصلہ خود وقت اور قدرت کرتی ہے۔ انسان کو بہت بعد میں اس کا اندازہ ہو پاتا ہے...... آپ کی ریسرچ کے بارے میں پڑھ کر مجھے ڈاکٹر دانش بہت یاد آ رہے ہیں۔ ہی واز اے سپر جینئس مین (وہ بہت زیادہ ذہین آدمی تھے) نیورو سائنٹسٹ...... انہوں نے بھی بہت منفرد انداز میں برین پر ریسرچ کرنے کی کوشش کی...... مگر......" ڈاکٹر زیدی آہ بھر کر خاموش ہو گئے۔

"مگر کیا......؟" ڈاکٹر رمیض نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ ملک چھوڑ کر چلے گئے...... پھر واپس نہیں لوٹے" ڈاکٹر محسن زیدی نے جواب دیا۔

"کیوں......؟" ڈاکٹر رمیض نے حیرت سے پوچھا۔

"ایک آپریشن کے دوران ایک مریض کی ڈیتھ ہو گئی۔ اس کے لواحقین نے ان پر قتل کا الزام لگا دیا۔ ڈاکٹر صاحب قدرے arrogant (مغرور) قسم کے انسان تھے جیسا کہ زیادہ تر کامیاب انسانوں کے بارے میں ایسا ہی سمجھا جاتا ہے۔ ان کا اپنی فیلڈ میں بہت نام اور عزت تھی جس سے دوسرے ڈاکٹرز بہت خائف تھے اور ان سے حسد و رقابت بھی رکھتے تھے۔ انہوں نے اس واقعے کو بہت ہوا دی اور یہ مشہور کر دیا کہ ڈاکٹر صاحب اس مریض کا آپریشن نہیں بلکہ اس پر کوئی ریسرچ کر رہے تھے اور اس عمل کے دوران مریض کی موت واقع ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب پر مقدمہ چلا انہیں عمر قید کی سزا سنائی گئی مگر کچھ فلاحی تنظیموں اور حکومت کی مداخلت سے ان کا جرم معاف کر دیا گیا مگر ڈاکٹر صاحب بہت دل برداشتہ ہو گئے اور ملک چھوڑ کر چلے گئے" ڈاکٹر محسن زیدی نے مایوس کن لہجے میں بتایا۔

"ویری سیڈ...... اب وہ کہاں ہیں؟" ڈاکٹر رمیض نے پوچھا۔

"شاید انگلینڈ میں...... مگر سنا ہے اب وہ کچھ نہیں کرتے بہت تنہائی اور مایوسی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ فیملی سے دوستوں سے اور اس ملک

سے مکمل طور پر تمام تعلقات توڑ چکے ہیں۔ مجھے اکثر بہت افسوس ہوتا ہے۔ وہ بہت لائق اور ذہین انسان تھے۔ انہوں نے بہت محنت اور جدوجہد سے اپنے شعبے میں نام کمایا تھا مگر رقابت، حسد اور دشمنی کی وجہ سے ان کا کیریئر ختم ہو گیا یا پھر قسمت کے ہاتھوں انہیں شکست ہوئی...... معلوم نہیں کیا ہوا......؟ مگر ایک قابل شخص جو ملک کا بہت بڑا سرمایہ تھا۔ وہ ضائع ہو گیا......'' ڈاکٹر زیدی نے تاسف کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے بھی یہ جان کر بہت افسوس ہوا ہے'' ڈاکٹر رمیض نے تاسف کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''ڈاکٹر دانش جیسے لوگ صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں مگر لوگ ان کی قدر نہیں کرتے...... اور جب وہ دنیا سے چلے جاتے ہیں تو پھر ان کی یاد میں دن مناتے ہیں ان پر مقالات اور کتابیں لکھی جاتی ہیں...... ڈاکٹر رمیض...... کیا آپ جانتے ہیں کہ انسان کا المیہ کیا ہے؟'' ڈاکٹر زیدی نے گہری سانس لیتے ہوئے پوچھا۔

''نو...... سر......'' ڈاکٹر رمیض نے جواب دیا۔

''انسان کا اپنے آپ کو کھو دینا'' ڈاکٹر زیدی نے آہ بھر کر کہا۔

''کیا مطلب......'' ڈاکٹر رمیض نے چونک کر پوچھا۔

''بہت کچھ پانے کی جدوجہد میں جب انسان اپنے آپ سے غافل ہو جاتا ہے...... اور اپنی ذات کو بھول جاتا ہے تو اس سے اپنا آپ...... اسکی اپنی ذات...... اس کا وجود بہت دور چلا جاتا ہے پھر اس کا کھوکھلا وجود بہت دیر تک اس کا ساتھ نہیں دے پاتا...... ڈاکٹر دانش کے ساتھ بھی شاید کچھ ایسا ہی المیہ تھا'' ڈاکٹر زیدی نے فائل بند کر کے رمیض کی جانب بڑھائی۔

''کیا ڈاکٹر دانش کو کسی نے ملک میں واپس لانے کی کوشش نہیں کی؟'' ڈاکٹر رمیض نے پوچھا۔

''شروع میں کچھ لوگوں نے اس کے بارے میں آواز بلند کی تھی مگر کسی نے توجہ نہ دی اور لوگ اپنی اپنی زندگیوں میں مگن ہو گئے'' ڈاکٹر زیدی نے بتایا۔

''ملک کا اتنا قیمتی سرمایہ یوں ضائع ہو گیا اور کسی کو احساس ہی نہیں ہوا'' ڈاکٹر رمیض نے کہا۔

''ڈاکٹر رمیض یہ سب صرف 'نظریہ ضرورت' کے تابع ہے...... جب تک آپ لوگوں کی ضروریات پوری کرتے رہیں گے...... دنیا آپ کی قدر بھی کرے گی اور آپ کو یاد بھی کرے گی...... جب آپ کسی کی ضرورت پوری نہیں کر سکتے...... لوگ آپ کو پاؤں تلے روند کر چلے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر دانش بہت لائق اور ذہین ڈاکٹر تھے مگر...... شاید وہ کسی کی ضرورت نہ بن سکے...... اس لئے لوگ ان کو بھول گئے'' ڈاکٹر زیدی نے کہا۔

''ڈاکٹر صاحب میں ان سے رابطہ کرنا چاہتا ہوں۔ ان کو ملک میں واپس لانے کی کوشش کروں گا...... کیا آپ میرا ساتھ دیں گے؟ ڈاکٹر رمیض نے عزم کا اظہار کرتے ہوئے کہا تو ڈاکٹر زیدی نے چونک کر ڈاکٹر رمیض کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں پرعزم چمک اور ارادے کی پختگی تھی۔

''یس آف کورس...... آئی ایم ود یو...... اور مجھے یقین ہے جب آپ دونوں مل کر کوئی جوائنٹ ریسرچ کریں گے تو دنیا کو ایک نئی فائدے مند چیز ملے گی'' ڈاکٹر زیدی نے مسکراتے ہوئے کہا تو رمیض نے بھی مسکرا کر ان کی جانب دیکھا۔

''میرے پاس ان کے کچھ پرانے کونیٹک نمبرز ہیں۔ میں ان پر رابطہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ انگلینڈ میں میرے بہت سے دوست ہیں ان سے بھی کونٹیکٹ کرتا ہوں'' ڈاکٹر زیدی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''تھینک یو سر...... میں آپ سے ان ٹچ رہوں گا، اب ہمارا مشن ڈاکٹر دانش کو ملک میں واپس لانا ہے'' ڈاکٹر رمیض نے مسکراتے ہوئے کہا تو ڈاکٹر زیدی بھی مسکرا دیئے۔

''ڈاکٹر رمیض...... آج مجھے آپ کی آنکھوں میں عزم دیکھ کر بہت خوشی ہوئی ہے جو اس بات کا اشارہ کرتی ہے کہ ٹیلنٹڈ لوگ جب اپنے جیسے لائق لوگوں کی قدر کرتے ہیں اور ان کی عزت کرتے ہیں تو انسانیت کے کھوئے ہوئے وقار کو بہت حوصلہ اور ہمت ملتی ہے۔ بیسٹ آف لک'' ڈاکٹر زیدی نے اس کی تعریف کرتے ہوئے اسے رخصت کیا اور وہ بھی نئے عزم سے واپس لوٹا۔ اس کا ذہن مسلسل ڈاکٹر دانش کے بارے میں سوچ رہا تھا اور اس دن کے بارے میں جب وہ ڈاکٹر دانش کو ملک میں واپس لے کر آئیں گے۔

☆

علی موسیٰ ڈاکٹر رابرٹ بروکس کے کلینک میں ان کے سامنے بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر رابرٹ ڈاکٹر دانش سے کوئی بھی سیشن کرنے سے پہلے ان کی کیس ہسٹری کے بارے میں تفصیلاً جاننا چاہتے تھے اور ان کی زندگی کے بارے میں تفصیلاً علی موسیٰ بتا سکتے تھے جو گزشتہ کئی روز سے ڈاکٹر رابرٹ کے پلان اور ہدایات کے مطابق ڈاکٹر دانش کی تمام حرکات وسکنات اور باتوں کو نوٹ کر رہے تھے اور ان کو اپنی ڈائری میں لکھتے جاتے تھے۔

''ڈاکٹر رابرٹ...... ہی از ویری مسٹریس مین (وہ بہت پراسرار آدمی ہے) ان جیسا منفرد، عجیب اور حیران کن انسان میں نے اب سے پہلے کبھی نہیں دیکھا...... پہلے میں نے ان کی حرکات کو اور ان کی باتوں کا یوں نوٹس نہیں لیا تھا جیسا کہ اب لیا ہے...... پہلے وہ مجھے کچھ ذہنی طور پر اپ سیٹ لگتے تھے اور اب کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا ہیں؟ ذہنی بیمار...... ابنارمل...... پاگل یا پھر...... کوئی اور مخلوق......؟ مجھے تو کبھی کبھی ان سے خوف بھی آنے لگتا ہے اور ان پر شک بھی ہونے لگتا ہے...... کہ وہ کوئی جن ہیں یا بھوت'' علی موسیٰ نے قدرے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

''آپ نے کیا آبزرو کیا ہے؟'' ڈاکٹر رابرٹ نے پوچھا۔

''ڈاکٹر رابرٹ کبھی وہ سرکس میں ہنسانے والے جوکر بن جاتے ہیں۔ کبھی سرکس میں ویلنگ کرنے والے ایڈونچر بن جاتے ہیں کبھی بیمار مریض...... کبھی ڈاکٹر...... کبھی ایک دم ہنسنا شروع کر دیتے ہیں۔ بچوں کی طرح تالیاں بجاتے ہیں، قہقہے لگاتے ہیں اور کبھی انتہائی سنجیدہ ہو جاتے ہیں، کبھی بہت دکھی اور پریشان ہو کر رونا شروع کر دیتے ہیں۔ کبھی احمقوں کی طرح باتیں کرنے لگتے ہیں تو کبھی انتہائی سمجھدار و مجھے تو ان کی بالکل بھی سمجھ نہیں آ رہی...... اور حیرت کی بات یہ ہے کہ جب وہ جوکر بنتے ہیں تو اپنی اصل شخصیت یعنی ڈاکٹر دانش کو بالکل ہی بھول جاتے ہیں۔ وہ اس وقت مکمل طور پر جوکر ہوتے ہیں اور جب ڈاکٹر دانش کے روپ میں باتیں کرتے ہیں تو ان کو وہ جوکر یاد بھی نہیں ہوتا لیکن جب وہ دوبارہ جوکر بنتے ہیں تو پھر وہی باتیں، ویسے ہی انداز میں دہرانے لگتے ہیں جیسے وہ اپنا ٹوٹا ہوا رابطہ پھر سے جوڑ کر سلسلہ آگے بڑھا رہے ہوں۔ مجھے تو کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے وہ ڈاکٹر دانش نہیں بلکہ کوئی سپر نیچرل مخلوق ہوں......'' علی موسیٰ پریشانی سے بولے۔

''آپ پریشان مت ہوں، دراصل وہ multiple personality میں تبدیل ہو چکے ہیں سائیکاٹرسٹ اسے dissassociation اور اسے تین کیٹگریز سے define کرتے ہیں Eve white, Eve black and jane انسان کی مختلف حرکات اور شخصیات کو ان تین کیٹگریز میں سمو دیا ہے مثلاً صاف ستھرا، پرسکون اور خوش اخلاق شخص، ایو وہائٹ، کیٹگری میں آتا ہے۔ اچھل کود کرنے والا بے ہنگم بے اختیار ہنسنے والا اور خواہ مخواہ مشتعل ہونے والا 'ایو بلیک' میں اور سنجیدہ، سمجھدار، قابل، خوشگوار ہنسی ہنسنے والا 'جین' کیٹگری میں آتا ہے۔
جب ایسا شخص کسی دوسری اور بالکل مختلف پرسنالٹی کا روپ دھارتا ہے تو وہ اپنی اصل شخصیت کو بھول جاتا ہے پانچ سے دس منٹ یا اس سے زیادہ وقت کے لئے وہ اس پرسنالٹی میں آتا ہے۔ پھر اس سے دوسری تیسری یا اپنی اصل پرسنالٹی میں چلا جاتا ہے۔ ایک شخص ایک ہی وقت میں دو تین یا اس سے کئی زیادہ پرسنالٹیز adopt کر لیتا ہے اور ہر ایک سے بے نیاز رہتا ہے۔ اسے نہیں معلوم ہوتا کہ وہ چند گھنٹے یا چند منٹ پہلے کیا کر رہا تھا۔ وہ اپنے فرضی نام یا شخصیت سے بالکل مختلف کردار ادا کرتا ہے۔ ڈاکٹر رابرٹ نے اسے بتایا اور علی موسیٰ انتہائی حیرانگی سے ان کی باتیں سننے لگے۔

''یہ سب کیوں ہوتا ہے...... ؟ کیا یہ کوئی بیماری ہے؟'' علی موسیٰ نے حیرت سے پوچھا۔

''Escapism یعنی (فرار) جب کسی کی زندگی میں بہت سی تلخیاں، الجھنیں، پریشانیاں اور ڈپریشن بڑھ جاتا ہے اور اس کا دماغ مختلف سوچوں سے تھک جاتا ہے تو اس کا لاشعور ایکٹو (متحرک ہو جاتا ہے جیسا کہ آپ بھی جانتے ہیں کہ لاشعور کا تعلق خوابوں، فینٹسی اور نا معلوم دنیا سے زیادہ ہے۔ ایسا انسان باہر کی تلخ اور شعوری دنیا سے فرار پانا چاہتا ہے اور ان سے بھاگ کر وہ اپنی لاشعوری دنیا میں کہیں گم ہونا چاہتا ہے وہ دنیا اسے خوش آمدید کہتی ہے وہاں اسے کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں ہوتا۔ وہ ہر طرح سے آزاد ہوتا ہے وہ جو چاہے کرے، کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ اس دنیا میں وہ 'ہیرو' ہے اور وہ 'ہیرو' کبھی ٹارزن ہے کبھی جن بھوت، پری سپرمین یا کوئی ایسا کردار جو اسے پسند ہوتا ہے اس کردار کی خوبیاں اسے متاثر کرتی ہیں اور اس کے لاشعور میں کہیں محفوظ ہوتی ہیں جب ایسا انسان روپ دھارتا ہے تو وہ وہی خوبیاں اپنانے کی کوشش کرتا ہے جو اسے اچھی لگتی ہیں۔ یوں ایک پرسنالٹی سے دوسری میں جاتے ہوئے اسے زیادہ وقت نہیں لگتا'' ڈاکٹر رابرٹ نے علی موسیٰ کو تفصیلاً بتایا۔

''ڈاکٹر دانش کس سے فرار چاہتے ہیں؟'' علی موسیٰ نے حیرت سے پوچھا۔

''یہی راز جاننے پر ان کا علاج ممکن ہو سکے گا اور اس کے لئے ان کے ماضی یعنی ان کی لائف ہسٹری کو جاننا بہت ضروری ہے۔ میں نے فون پر آپ کو direct کیا تھا کہ آپ زیادہ سے زیادہ ان کے بچپن، ان کے ماضی اور ان کے والدین کی باتیں کریں تاکہ ہم ڈاکٹر صاحب کے بارے میں ملنے والی معلومات سے ان حقائق تک پہنچ سکیں جن کی وجہ سے ان کی پرسنالٹی split ہو گئی ہے'' ڈاکٹر رابرٹ نے سنجیدگی سے کہا۔

''ڈاکٹر صاحب میں نے بہت کوشش کی کہ باتوں باتوں میں ان کے ماضی میں جھانک سکوں مگر ڈاکٹر دانش بہت ہوشیاری سے اس موضوع کو چھوئے بغیر دوسرے موضوع کی طرف نکل جاتے ہیں تب بھی نہیں جب وہ اصل میں ڈاکٹر دانش کے روپ میں ہوتے ہیں مجھے اکثر یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ جیسے وہ اس موضوع کو نا پسند کرتے ہیں کہ ان سے اس کے بارے میں ڈسکشن بھی کی جائے'' علی موسیٰ نے بتایا۔

''ڈاکٹر دانش نہ تو عام انسان ہیں اور نہ ہی عام مریض...... وہ بہت ذہانت رکھنے والے خاص انسان ہیں بہت کم لوگوں کو قدرت ایسی

ذہانت سے نوازتی ہے۔ یہ ان کا المیہ ہے کہ ان کی شخصیت بکھر گئی ہے اور اس کے پیچھے ضرور کوئی اہم وجہ ہوگی۔ آپ کو بہت ہوشیاری اور ٹیکنیکل انداز میں اس وجہ کو جاننے کی جدوجہد کرنی ہے" ڈاکٹر رابرٹ نے کہا تو علی موسیٰ انتہائی توجہ سے ان کی ہدایات کو نوٹ کرنے لگے۔

"میں پوری کوشش کروں گا کہ ان کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کر سکوں...... اور جیسے ہی مجھے کوئی انفارمیشن ملتی ہے میں آپ کو انفارم کروں گا" علی موسیٰ نے کہا۔

"اگلے ہفتے میرے ساتھ ان کا سیشن ہے اور میں چاہتا ہوں اس سے پہلے کچھ نہ کچھ معلومات میرے پاس ہوں۔ اس طرح تشخیص اور ٹریٹمنٹ میں آسانی ہو جائے گی" ڈاکٹر رابرٹ نے کہا تو علی موسیٰ خاموش ہو گئے۔

ڈاکٹر دانش اپنے اپارٹمنٹ میں موجود نہیں تھے۔ دروازوں کو بھی لاک نہیں لگا تھا اور وہ خود بھی کہیں نہیں تھے۔ علی موسیٰ گھبرا گئے اور اپارٹمنٹ کا ایک ایک کونہ چیک کیا مگر وہ کہیں موجود نہیں تھے۔ علی موسیٰ گھبرا کر ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ ان کا موبائل نمبر ڈائل کیا تو وہ بھی ٹیبل پر پڑا تھا۔

"وہ کہاں جا سکتے ہیں؟" علی موسیٰ نے انتہائی پریشانی سے سوچا اور گھبرا کر ڈاکٹر رابرٹ کو فون کیا۔ وہ بھی پریشان ہو گئے۔

"پلیز...... آپ انہیں جلد تلاش کریں ایسے مریض اکثر ہائپر ہو کر مرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں" ڈاکٹر رابرٹ نے کہا تو علی موسیٰ کے چہرے پر پسینہ آنے لگا۔

"اوہ...... نو......" علی موسیٰ بڑبڑائے اور فون بند کر دیا۔

"کہاں تلاش کروں......؟" علی موسیٰ نے سوچتے ہوئے اپنے آپ سے سوال کیا اور یہ ایسا سوال تھا جس کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

انہوں نے ساتھ والے اپارٹمنٹ کے دروازے پر دستک دی مگر وہاں سے بھی کوئی تسلی بخش جواب نہ ملا۔ واپس اپارٹمنٹ میں آ کر انہوں نے ڈاکٹر دانش کی وارڈ روب اور سامان چیک کیا۔ سب کچھ وہاں موجود تھا۔ وہ پریشان ہو کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگے۔ شام ہو رہی تھی۔ ہر طرف ملگجا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ موسم بھی سرد ہو رہا تھا اور ڈاکٹر دانش کا لانگ کوٹ بھی صوفے پر پڑا تھا۔ اگر وہ مزید بیمار ہو گئے تو......؟" علی موسیٰ نے پریشانی سے سوچا اور بے خیالی میں نیچے سڑک پر دیکھا۔ پانچ منزلہ بلڈنگ کے آخری فلور پر وہ رہتے تھے۔ اتنی اونچائی سے نیچے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر سڑک پر بہت لوگ دائرے کی صورت میں کھڑے تھے اور ان کے درمیان کون تھا وہ انہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ علی موسیٰ کو شک سا ہوا اور انہوں نے اپنی دوربین سے نیچے دیکھا، دائرے کے اندر ڈاکٹر دانش کھڑے تھے اور ان کے اردگرد بچے اور لوگ خوشی سے تالیاں بجا رہے تھے۔ علی موسیٰ نے سکون کا سانس لیا اور بھاگتے ہوئے نیچے گئے۔ ڈاکٹر دانش بڑے ماہرانہ انداز میں الٹی سیدھی قلابازیاں مارنے میں مصروف تھے اور خاموش زبان سے ایسی اوٹ پٹانگ حرکتیں کر رہے تھے کہ ان کے گرد کھڑے بچوں کا ہنس ہنس کر برا حال ہو رہا تھا۔ علی موسیٰ بھاگتے ہوئے دائرے کے اندر گئے۔ ڈاکٹر دانش نے علی موسیٰ کی طرف دیکھا اور یوں نظر انداز کر دیا جیسے انہیں جانتے ہی نہ ہوں۔

"پلیز...... آپ لوگ یہاں سے جائیے...... یہ بیمار ہیں" علی موسیٰ نے بچوں اور لوگوں سے قدرے چلاتے ہوئے کہا۔ بچے اور لوگ حیرت سے ڈاکٹر دانش اور علی موسیٰ کی جانب دیکھنے لگے۔ علی موسیٰ کے بار بار کہنے پر وہ لوگ وہاں سے چلے گئے۔ ڈاکٹر دانش بچوں کو پکڑ پکڑ کر روکنے

لگے مگر علی موسیٰ انہیں جانے کے لئے کہتے رہے۔ سب کے جانے کے بعد ڈاکٹر دانش سڑک کی ایک جانب گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اونچی آواز میں رونا شروع ہو گئے۔

''پلیز ڈاکٹر دانش...... بی ہیو یور سیلف ...... موسم کتنا خراب ہو رہا ہے اور اندھیرا بھی ہو رہا ہے۔ آپ بیمار ہو جائیں گے پلیز گھر چلیں'' علی موسیٰ نے گھبرا کر ان کا بازو کھینچتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... سردی...... مجھے بہت سردی لگ رہی ہے......'' ڈاکٹر دانش اپنے بازوؤں کو سمیٹتے ہوئے بولے اور علی موسیٰ انہیں اپارٹمنٹ میں لے کر گئے اور انہیں بیڈ پر لٹا کر کمبل اوڑھا دیا۔

''میں آپ کے لئے کافی لاتا ہوں'' علی موسیٰ نے کہا اور کچن میں چلے گئے۔

تھوڑی دیر بعد وہ کافی کے دو مگ لیے ڈاکٹر دانش کے پاس آ گئے۔ باہر برفباری ہونے لگی تھی مگر ان کا کمرہ کافی گرم ہو رہا تھا کیونکہ علی موسیٰ نے ڈاکٹر دانش کے پاس رکھے ہیٹر کو قدرے تیز کر دیا تھا۔

ڈاکٹر دانش آپ کیوں باہر گئے......؟ کیا آپ بھول گئے تھے کہ کل رات آپ کو سردی سے بخار بھی ہو رہا تھا اور پھر بھی؟ علی موسیٰ نے حیرت سے مگر قدرے ملائمت سے پوچھا۔

''میں تو کہیں نہیں گیا۔ دو دنوں سے اس کمرے میں بند ہوں۔ آپ جس سے مرضی پوچھ لیں اور میں بھلا اس سردی میں کیوں باہر جاؤں گا...... میں پاگل نہیں ہوں'' ڈاکٹر دانش نے علی موسیٰ کی جانب دیکھتے ہوئے قدرے طنزیہ لہجے میں کہا اور علی موسیٰ حیرت سے ان کی جانب دیکھنے لگے۔

(۳)

قدرت نے انسان کو چلانے اسے توانائی بہم پہنانے کیلئے ایک نہایت اہم اور پیچیدہ نظام، نظامِ انہضام بنایا ہے۔ یہ نظام منہ سے شروع ہوکر خوراک کی نالی معدہ، چھوٹی آنت، بڑی آنت اور آخر میں ریکٹم پر ختم ہوتا ہے۔ یہ نظام منہ سے شروع ہوتا ہے جس میں سب سے پہلے آنکھیں خوراک کو دیکھتی ہیں اور دماغ تک پیغام پہنچاتی ہیں کہ یہ چیز معدہ تک آرہی ہے اور معدہ اس کے لئے تیار ہوجائے۔ دماغ فوری طور پر احکام بھیجتا ہے اور معدہ میں انیزائمز آنا شروع ہوجاتے ہیں۔ منہ کے اوپر خدا نے ناک شاید اسی مقصد کیلئے رکھی ہے تاکہ انسان باسی اور خراب چیزوں کو کھا کر کسی بیماری میں مبتلا نہ ہوجائے۔ منہ میں خوراک کو زبان پر رکھتے ہی اس کا ذائقہ محسوس ہوتا ہے اور دماغ تک یہ پیغام پہنچایا جاتا ہے کہ کھانے والی چیز میٹھی، کھٹی، نمکین یا کسیلی ہے۔ خوراک کو منہ میں دانتوں کی مدد سے چبا کر باریک اور چھوٹے پیسز کی صورت میں تبدیل کردیا جاتا ہے منہ میں موجود سلائیو (Saliva) خوراک میں شامل ہوکر اسے چھوٹے چھوٹے گولوں کی شکل میں حلق سے پھر خوراک کی نالی ایسوفیگس تک پہنچاتا ہے۔ ایسوفیگس سے خوراک معدہ میں پہنچ جاتی ہے۔ معدہ ایک تھیلی نما عضو ہے اس میں بہت زیادہ پھیلنے کی صلاحیت ہوتی ہے اس کی دیواریں لچکدار ہوتی ہیں۔ ان سے انزائمز خارج ہوتے رہتے ہیں جو خوراک کو ہضم کرنے میں مدد کرتے ہیں۔ یہاں خوراک semi liquid شکل میں بن جاتی ہے۔ معدہ سے آہستہ آہستہ خوراک چھوٹی آنت میں منتقل ہوجاتی ہے وہاں اس میں مزید رطوبتیں شامل ہوتی ہیں۔ جیسے پتے کی سیکریشن بائل لبلبے کی پینکریاٹک جوس جو چربی اور دوسرے مادوں کو ہضم کرکے مزید چھوٹے اجزا میں تقسیم کردیتا ہے۔ انتڑیوں کی دیواروں سے ہضم شدہ خوراک خون کے ذریعے جگر تک پہنچ جاتی ہے اور پھر پورے جسم میں دل کے ذریعے پورے جسم میں گردش کرتی ہے جو خوراک ہضم نہیں ہوتی وہ pieces کی شکل میں بڑی آنت میں منتقل کردی جاتی ہے جہاں سے یہ مزید ہضم ہونے کے بعد فضلے کی صورت میں جسم سے باہر دھکیل دی جاتی ہے۔

اس طرح کھانے کا یہ سلسلہ تاحیات جاری وساری رہتا ہے اور جسم کو انرجی ملتی رہتی ہے۔ قدرت کا یہ نظام اسی طرح بہت پیچیدہ اور نہ سمجھ آنے والا ہے جس طرح مختلف اقسام کی بھوک اور ان سے جنم لینے والی طمع، ہوس اور لالچ......

☆

وہ صبح کی بھوکی پیاسی، دردر بھیک مانگتی، تھکی ہاری اپنی جھگی کی طرف جارہی تھی۔ اس نے ایک تھیلا کندھے پر اٹھا رکھا تھا۔ اس میں بھیک کے نام پر اکٹھی کی گئی چیزیں، بچی کچھی روٹیوں کے ٹکڑے پلاسٹک کی خالی بوتلیں اور پھٹے پرانے کپڑوں کے چیتھڑے، ٹوٹے پھوٹے برتن اکٹھے کر رکھے تھے...... اسے بھیک مانگنے سے نفرت تھی مگر بھیک مانگنا اس کی مجبوری تھی...... جس دن وہ بھیک مانگنے نہ جاتی...... سارا دن اس کو کھانے کو کچھ نہ ملتا اور پیٹ تھا کہ بن کھائے اسے سکون نہ لینے دیتا...... اماں کے کوسنے اس کے کانوں میں گونجتے۔

''اری.....تو.....کسی نواب کی بیٹی نہیں.....جو تجھے کام کیے بغیر روٹی کھانے کو مل جائے گی..... یہاں کمانے کو کوئی نہیں اور کھانے کو سارا خاندان.....چل اٹھ.....حرام خور.....تیرے یہ نخرے.....ہم نہیں اٹھا سکتے.....'' اماں اس کی چٹیا پکڑ کر اسے جھگی سے باہر دھکا دیتی.....اور اس کا تھیلا جھگی سے باہر پھینکتی۔

''خالی ہاتھ مت آنا.....بھیک نہ ملے تو باہر سے کھا.....مر.....آنا.....یہاں آکر تجھے کچھ نہیں ملے گا.....'' اماں غصے سے بولتی۔اماں بھی سچ ہی کہتی تھی.....لولا لنگڑا بڈھا باپ.....سات بچے.....اماں اور.....وہ.....کھانے کو اتنے پیٹ.....اور کمانے کو.....وہ.....ابا.....اور دو بھائی.....دن بھر میں جتنی بھیک ملتی.....اس سے صرف دو وقت کی روکھی سوکھی روٹی ہی نصیب ہوتی۔

''پتا نہیں ربا.....تو نے ہمارے لیکھ کس ٹٹی قلم سے لکھے ہیں..... یہ بھی کوئی زندگی ہے.....میں لعنت بھیجتی ہوں ایسی زندگی پر.....ہم تو کتے بلیوں سے بھی بری زندگی گزار رہے ہیں۔انہیں تو پھر بھی پیٹ بھر کر کھانا نصیب ہوتا ہے.....ہمیں ساری زندگی پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہیں ہوا.....'' رانی نے کھلے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے گہری سانس لی اور دکھی دل سے سوچا۔

شام کے ملگجے سائے پھیل رہے تھے وہ تیز تیز قدم اٹھاتی اپنی جھگی کی طرف جارہی تھی۔

''اری لیلیٰ.....کاہے کو اتنی جلدی میں ہے.....دو گھڑی ہمارے پاس بھی بیٹھ جا.....'' شامو ہیجڑے نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

''اری تھوکتی ہوں.....میں تجھ پر.....میرے لئے تو ہی رہ گیا ہے.....جو تیرے پاس بیٹھ کر میں اپنا منہ کالا کروں.....مردود ہیجڑا'' رانی نے غصے سے شامو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیوں.....میرے پاس بیٹھتے ہوئے تجھے کیا تکلیف ہے.....قد کاٹھ میں تجھ سے لمبا ہوں.....خوبصورت ہوں.....جوان ہوں.....کماتا ہوں.....بس.....ذرا.....'' شامو نے مسکرا کر اسے چڑانے کے لئے کہا۔

''چل جا.....دفعہ ہو.....میرے منہ نہ لگ.....بڑا آیا.....اچھی طرح جانتی ہوں تجھے.....ناچ.....گا کر.....حرام کی کمائی کھاتا ہے اور رعب جماتا ہے جیسے افسر لگا ہے'' رانی نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

''اری.....تو.....کہے.....تو.....میں تیرے لئے کہیں افسر لگ جاؤں.....'' شامو نے آنکھ دباتے ہوئے کہا۔

''چھوڑ میرا راستہ.....اور مجھ سے فضول باتیں مت کر۔تو محنت کر کے روٹی کھائے تو پھر تجھے پتہ چلے کہ محنت کی کمائی کیا ہوتی ہے۔'' رانی نے غصے سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اے.....رانی.....مجھے تجھ سے بڑی محبت ہوگئی ہے.....سچ تو بڑی اچھی لگے ہے مجھے'' شامو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بکواس بند کر.....محبت کرنے کے لئے تو ہی رہ گیا ہے.....سارے مرد مر گئے ہیں.....جو میں تجھ سے محبت کروں گی'' رانی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''اری.....نکھٹو.....حرام خور.....شرابیوں.....جوئے بازوں سے تو اچھا ہی ہوں۔حلال کی کماتا ہوں.....تجھے رانی بنا کر رکھوں گا.....''

شامو نے مسکراتے ہوئے کہا تو رانی کا پارہ ہائی ہو گیا۔

''ہٹ...... میرے راستے سے...... ورنہ اتارتی ہوں جوتی......'' وہ نیچے جھک کر اپنی ٹوٹی ہوئی چپل اتارنے لگی...... تو...... شامو ہنسنے لگا۔

''چل...... جا...... عیش کر...... سن...... میں...... یہ تیرے لئے لایا تھا'' شامو نے اپنی جیب میں سے ایک چاکلیٹ نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔

''مجھے نہیں چاہیے...... تیری حرام کی کمائی کا'' رانی غصے سے بولی۔

''بھیک کی کمائی...... تو...... بڑی حلال کی ہوتی ہے نا......'' شامو نے ہنستے ہوئے کہا اور رانی منہ بسورتے ہوئے آگے بڑھ گئی...... شامو اسے دیکھ کر ہنستا رہا۔

☆

شامو...... فقیروں کی جھگیوں سے کچھ فاصلے پر کچی بستی میں ایک خستہ حال مکان کرایے پر لے کر رہتا تھا۔ اس کے ساتھ دو اور ہیجڑے نرگس اور فردوس رہتے تھے اور ایک سولہ سترہ سالہ لڑکا جمی تھا جسے ہیجڑا بننے کا شوق تھا اور اس کی حرکتوں کی وجہ سے اس کے گھر والوں نے اسے گھر سے نکال دیا تھا۔ وہ ان لوگوں کے پاس آ کر رہتا تھا۔ ڈھولک بہت اچھی بجاتا تھا اور اس کی آواز بھی بہت اچھی تھی۔ شامو، فردوس اور نرگس کے ساتھ جمی نے مل کر بڑا زبردست گروپ بنا رکھا تھا۔ شامو نے اپنا حلیہ رانی کی خاطر مردوں جیسا بنا لیا تھا۔ نجانے کیوں وہ رانی کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا...... اور رانی اس کی باتوں اور حرکتوں سے چڑتی تھی۔ اسے گالیاں دیتی تھی، اس سے نفرت کرتی تھی مگر وہ اس کی باتوں پر مسکراتا رہتا تھا۔

''اے شامو...... یہ چاکلیٹ تو بڑا مزے کا لایا تھا...... ہمارے لئے، ہم سب نے کھا لیا...... آج ایک اور لے آنا'' نرگس نے صبح اٹھتے ہی شامو سے کہا تو وہ غصے سے اسے دیکھنے لگا۔

''مرے...... تو یہ تیرے لئے تھوڑا تھا...... کاہے کو کھایا'' شامو غصے سے جھگڑا کرتے ہوئے بولا۔

''اس پر نام تھوڑا ہی لکھا تھا...... کہ تو کس کے لئے لایا ہے...... ہم نے سمجھا میرے، فردوس اور جمی کے لئے لایا ہے'' نرگس ہنستے ہوئے بولی۔

''تو...... نے میری پینٹ کو کیوں ہاتھ لگایا...... خبردار آئندہ میری چیزوں کی تلاشی لی...... تجھ پر چوری کا پرچہ کرا دوں گا'' شامو دھمکی کے انداز میں بولا۔

''اے...... ہائے...... بتا تو سہی...... کس کے لئے آج کل بڑا بانکا بن بن پھر رہا ہے اور جیب میں چاکلیٹ بھی رکھتا ہے'' نرگس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ہے...... کوئی...... پر...... وہ تو نہیں'' شامو غصے سے بولا۔

''اچھا...... غصہ تھوک، سن...... آج رات بڑی زبردست پارٹی کے ہاں جانا ہے...... پانچ ہزار ایڈوانس لے لیا ہے...... بڑے امیر لوگ ہیں...... تیرے ٹھمکے کے شوقین...... بس...... ایسا ناچنا کہ واہ واہ ہو جائے'' نرگس نے اسے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

''نرگس...... میں نے فیصلہ کرلیا ہے ناچ...... گانا چھوڑ کر کوئی کام شروع کروں گا'' شامو نے سنجیدگی سے کہا۔

''ارے پاگل ہو رہا ہے...... ہیجڑوں کو کام کون دیتا ہے...... کمبخت اس پاپی پیٹ کی بھوک مٹانے کیلئے کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں تجھے شاید معلوم نہیں...... اور...... یہ دنیا کسی کو خواہ مخواہ روٹی بھی نہیں دیتی...... ارے ہمیں تو کوئی بھیک بھی نہیں دیتا...... خوش قسمت ہیں...... وہ...... جن کو بھیک مل جاتی ہے'' نرگس کی آنکھیں نم ہونے لگیں اور وہ سسکنا شروع ہوگئی۔ شامو کی آنکھوں کے سامنے رانی کا چہرہ گھومنے لگا......

''اٹھ...... عقل کر...... اور تیاری پکڑ'' نرگس نے اسے محبت سے سمجھایا۔

''نہیں...... آج تم لوگ جاؤ...... میری طبیعت ٹھیک نہیں'' شامو نے کہا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

''اس کی عقل تو گھاس چرنے گئی ہے...... باؤلا ہو گیا ہے کمبخت'' نرگس بولنا شروع ہوگئی...... فردوس اور جمی کمرے میں سے باہر صحن میں آگئے۔

''کیا ہوا...... نرگس...... کاہے کو واویلا کر رہی ہے؟'' فردوس نے پوچھا۔

''شامو...... کا دماغ خراب ہو گیا ہے...... کہتا ہے ناچ گانا نہیں کروں گا...... محنت کروں گا......'' نرگس نے بتایا۔

''آپا...... تو...... کر لینے دے اسے شوق پورا...... ہر ہیجڑے کے دل میں محنت کرنے کی جو آگ بھڑکتی ہے نا...... خود ہی ٹھنڈی پڑ جاتی ہے...... جب کھانے کو کچھ نہیں ملتا'' فردوس نے کہا۔

''دفعہ کر...... اسے جانے دے...... تو...... کاہے کو جی میلا کرتی ہے...... لوگوں نے تو تماشا ہی دیکھنا ہے...... ہمارا دیکھ لیں...... ہم ہیں نا......'' فردوس نے نم آنکھوں سے نرگس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو نرگس نے حیرت اور افسردگی سے اس کی جانب دیکھا اور خاموش ہوگئی۔

☆

رانی نے تھیلا الٹایا تو اس میں سے دو سوکھی روٹیاں، نان کے چند ٹکڑے اور دو تین گلے سڑے سیب نکلے جو اس نے غلہ منڈی سے گزرتے ہوئے چوری چوری اپنے تھیلے میں ڈالے تھے...... اس کا چھوٹا بھائی بجو بھیک میں چند روپے لایا تھا اور کہیں سے چرائی ہوئی روٹیاں...... مٹھو بھی کہیں سے نیاز کے چاول لفافے میں بھر کر لایا تھا اور ان چاولوں کو دیکھ کر سب کے منہ میں پانی آرہا تھا۔

''ارے واہ...... مٹھو...... تو نے بڑا اچھا کام کیا ہے...... بڑے دنوں سے دیگ کے چاول کھانے کو جی چاہ رہا تھا......'' ملکے نے جھگی کے فرش پر اپنے آپ کو گھسیٹ کر چٹائی کے قریب لاتے ہوئے کہا اور للچائی نظروں سے چاولوں کی طرف دیکھنے لگا۔ چاولوں کی خوشبو ساری جھگی میں پھیل گئی...... اماں کی طبیعت بڑی خراب ہو رہی تھی۔ اس کے ہاں آٹھویں بچے کی پیدائش متوقع تھی وہ جھگی کے ایک کونے میں فرش پر میلا کچیلا گدا بچھا کر لیٹی کراہ رہی تھی۔

''میری حالت خراب ہو رہی ہے'' اماں نے رانی کو پاس بلا کر کہا۔

رانی کو ہر سال ایسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس نے جلدی سے بچوں کو کھانا کھلایا اور ساتھ والی جھگی سے نوری کو بلا کر لے آئی۔ باہر موسم بہت خراب ہو رہا تھا۔ رانی بچوں اور ابے کے ساتھ جھگیوں سے باہر اندھیرے میں ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئی۔ موسم زیادہ ٹھنڈا ہو رہا تھا۔

بچوں نے خوشی خوشی آگ جلائی اور آگ تاپتے ہوئے کھیلنے لگے۔ رانی مسلسل خاموش تھی اور گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

''کیا ہم صرف جھگیوں میں رہنے کے لئے پیدا ہوتے ہیں اور یہیں مر جاتے ہیں...... مولا...... تو نے ہم کو کاہے کو پیدا کیا...... سڑکوں اور گلیوں سے بھیک اکٹھی کرنے کے لئے......'' ایک دم بارش شروع ہوگئی...... بچے سردی سے ٹھٹھرنے لگے......

''رانی...... ان کو نوری کی جھگی میں لے جا...... باہر بہت ٹھنڈ ہو رہی ہے'' ابے نے رانی سے کہا تو وہ انہیں نوری کی جھگی میں لے گئی۔ نوری کے شوہر جگو کی نظروں سے رانی کو بہت ڈر لگتا تھا۔

''کمبخت...... کیسے دیکھتا ہے...... اس کے دیدے بھی نہیں پھٹتے'' رانی نے دل میں سوچا۔

''پتا نہیں...... اماں کو بھی کیا سوجھتی ہے...... بچوں کا ڈھیر اکٹھا کرتی ہے کوڑے پر چھوڑنے کے لئے...... پہلے ہی کھانے کو کچھ نہیں...... اوپر سے اور بچے اکٹھے کرتی جا رہی ہے'' رانی نے غصے سے سوچا۔

''پانچ بیٹے...... اور تین بیٹیاں...... کیا کم اولاد ہے...... جواب اور چاہیے تھی...... اماں کو بچے کونسے سنبھالنے پڑتے ہیں۔ میں، گڈی اور شبو ہی سنبھالتی ہیں...... جیسے بچے پالنے کا ٹھیکہ ہم نے لیا ہوا ہے...... اب کی بار تو خود ہی سنبھالے گی...... میں نے تو صاف نہ کر دینی ہے...... خود ہی پیدا کرتی ہے تو خود ہی سنبھالے'' رانی نے غصے سے سوچتے ہوئے تہیہ کر لیا۔

نوری جھگی میں داخل ہوئی تو رانی نے حیرت اور سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

''رانی...... اب تو گھر جا...... تیری ماں اب ٹھیک ہے'' نوری بولی۔

''کیا ہوا ہے......؟'' رانی نے بے صبری سے پوچھا۔

''اس کو چائے پلا دینا......'' نوری نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

''نوری لڑکا ہوا ہے یا لڑکی؟'' رانی نے پھر پوچھا۔

''میں اب بہت تھک گئی ہوں...... جا کر خود ہی دیکھ لے'' نوری نے جلدی سے کہا...... تو رانی اس کی جھگی سے باہر نکل آئی۔ نوری کی جھگی سے اپنی جھگی تک کا فاصلہ اس نے بڑی مشکل سے طے کیا۔

اس کی عمر سولہ سال تھی۔ قدرے سانولی رنگت، خوبصورت نقوش، لمبے سیاہ بالوں اور دراز قد کے ساتھ وہ بڑی دلکش لگتی تھی۔ سارے بہن بھائیوں کے نقوش اچھے مگر رنگ سانولے تھے۔ وہ جلدی سے اپنی جھگی میں داخل ہوئی۔ اس کی ماں یوں بے سدھ پڑی تھی جیسے اس کو کوئی سانپ سونگھ گیا ہو، اس کے پہلو میں ایک چھوٹا سا خوبصورت، گوری چٹی رنگت والا صحت مند بچہ بلک رہا تھا۔ ماں اس کے رونے بلکنے سے بے بہرہ چھت کو گھورتی جا رہی تھی اور آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ بہہ کر اس کے سر کے نیچے گندے سے تکیے کو بھگو رہے تھے۔

''اماں...... کیا ہوا ہے...... اور...... تو...... کیوں رو رہی ہے؟'' رانی نے اس کی نم آنکھوں کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''رو رہی ہے...... اپنی کالی کرتوتوں کو...... نجانے کیا کچھ......'' ابا بیساکھیوں کی مدد سے جھگی کے اندر آیا اور غصے سے برکتے کی طرف

دیکھتے ہوئے بولا، اس کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں اور چہرے پر انتہائی غصے کے آثار نمایاں تھے۔

برکتے نے بے بسی اور رحم طلب نظروں سے اس کی طرف یوں دیکھا جیسے سارا قصور اسی کا ہو......اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کی آہوں اور سسکیوں سے جھگی کا بوسیدہ حال کپڑا بھی لہرانے لگا۔

''مگر ہوا کیا ہے......؟ ابا......تو......کیوں......اماں پر برس رہا ہے؟'' رانی نے حیرت سے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اری......اس کو کھ جلی نے ہیجڑا جنا ہے......کیا اس کو میں مبارکبادیں دوں......؟ کمبخت نے ناک کٹوا کر رکھ دی ہے......ساری بستی میں خبر پھیل گئی ہے......کہیں منہ دکھانے کا نہیں چھوڑا......اس سے بہتر تھا یہ کچھ بھی نہ جنتی......مجھے مرا ہوا بچہ قبول تھا مگر یہ نہیں......'' ابے نے غصے سے برکتے کو گھورتے ہوئے کہا۔ رانی نے حیرت سے اپنے دونوں ہاتھ منہ کے اوپر رکھ کر اپنی چیخ روکنے کی کوشش کی......اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا......کیا کہے......اس کی آنکھوں کے سامنے شامو کا چہرہ گھوم گیا۔

''تھوکتی ہوں میں تجھ پر......میرے لئے تو ہی رہ گیا ہے جو تیرے پاس بیٹھ کر منہ کالا کروں......ہیجڑا نا مراد''

رانی کو اپنے کہے ہوئے الفاظ یاد آنے لگے......اور اس کی آنکھوں میں حیرت اور تاسف کا رنگ نمایاں ہونے لگا۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگیں۔ وہ بچے کی طرف دیکھتی تو آنکھوں کے سامنے شامو کا چہرہ نظر آتا۔

''اٹھا......اسے......اور کہیں پھینک آ......مجھے نہیں چاہیے......یہ بیٹا......'' ابا غصے سے بولا۔

''حرام کا نہیں ہے......جو......پھینک آؤں'' اماں بمشکل اٹھ کر بولی اور رونے لگی......بچہ بلکتا چلا جا رہا تھا۔

''مولا جانے......کیا ہے......کیا نہیں......پر......یہ......یہاں نہیں رہے گا......'' ابا غصے سے بچے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''ملکیا......تو......اس کا باپ ہے......کاہے کو اتنا جالم (ظالم) بن رہا ہے......انسان ہے یہ بھی......مولا کی دین ہے'' برکتے نے اسے روتے ہوئے گود میں اٹھایا۔

''اری......کونسا انسان......ان جیسوں کو کون انسان سمجھتا ہے......کون ان کو گھروں میں رکھتا ہے، خبردار جو تو نے اسے اپنا دودھ پلایا......'' ملکے نے بچہ اس سے چھینتے ہوئے کہا۔

''رب کا خوف کر......ماں ہوں میں اس کی......مجھے دودھ تو پلانے دے......بیچارے کا اس میں کیا قصور......رب نے جو اس کے ساتھ کیا ہے......تو......تو......نہ کر......دیکھ کب سے بھوک سے تڑپ رہا ہے......معصوم بھوک سے ہی مر جائے گا'' برکتے نے رحم کی بھیک مانگتے ہوئے ملکے سے کہا۔

''مر جائے......تو زیادہ اچھا ہے......'' ملکا غصے سے بولا۔

بچے کے بلکنے کی آواز زور پکڑ رہی تھی......رانی تو حیرت کے مارے کچھ نہیں بول رہی تھی۔ وہ ماں باپ کو حیرت سے باتیں کرتے ہوئے سن رہی تھی مگر نظریں مسلسل بچے پر تھیں۔

''ملکے......اتنا جالم نہ بن......رب غصے ہو جائے ہے'' برکتے نے کہا۔

''ہوتا ہے......تو......ہو جائے......کا ہے کو......ہمیں ایسا بچہ دیا'' ملکا غصے سے بولنے لگا۔

''توبہ......توبہ......رب سے زورا زوری کر رہا ہے......میرے سے معصوم بچے کا رونا نہیں دیکھا جا رہا......'' اور برکتے روتے ہوئے اسے دودھ پلانے لگی۔

ملکے نے غصے سے بچہ اس کے ہاتھ سے چھیننے کی کوشش کی۔ برکتے نے اسے اپنی طرف کھینچنے کی......بچہ اور زیادہ اونچی آواز سے بلکنے لگا۔ رانی حیرت سے انہیں دیکھتی رہی۔ تجو اور مٹھو ماں باپ کو دیکھتے رہے۔ باقی کے بچے نوری کی جھگی میں بے خبر پڑے سوتے رہے۔ ملکے نے برکتے کو زور سے دھکا دیا......اور اسی کوشش میں بیساکھیاں اس کے بازوؤں کی گرفت سے ڈھیلی پڑ گئیں اور وہ دھڑام سے نیچے گر گیا۔

''کھڑا تجھ سے ہوا نہیں جا رہا......اور لگا ہے بچے کو چھیننے'' برکتے نے غصے سے کہا۔

ملکا پھر غصے سے اٹھا اور بچے کو چھین کر اپنی چادر کے نیچے چھپایا اور بیساکھیوں کے سہارے اپنے آپ کو گھسیٹتا ہوا باہر نکل گیا۔ باہر کڑا کے کی سردی پڑ رہی تھی۔ پو پھٹنے میں ابھی کچھ وقت تھا۔

بارش کے بعد موسم بہت سرد ہوا تھا۔ برکتے اونچی آواز سے رونے لگی اور رانی بے بسی سے ماں کو دلاسا دینے لگی......وہ بچوں میں سب سے بڑی تھی اور اس پر ہی تو ماں کو سنبھالنے کی ذمہ داری تھی۔ برکتے روتی پیٹتی اور سینہ کوبی کرتی جا رہی تھی۔

''ہائے......اس غریب کو جالم کہاں لے گیا......باہر تو بڑی سردی ہے......یا اللہ! میں کیا کروں......تو ہی بچے کی حفاظت کرنا......ملکے تو آگ کما رہا ہے......جالم کہیں کے......'' برکتے سینے پر زور زور سے ہاتھ مارتی جا رہی تھی اور روتی جا رہی تھی۔ رانی کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ وہ کیا کہتی کیسے دلاسا دیتی......وہ بس ماں کے ہاتھ پکڑ کر اسے سینہ کوبی سے روکنے کی کوشش کرتی۔

☆

نرگس، فردوس اور جمی رات کو محفل سے واپس آ رہے تھے۔ شاموان کے ساتھ نہیں گیا تھا۔ اس لئے اس کی کمی محسوس ہوتی رہی مگر پھر بھی انہوں نے بہت روپے اکٹھے کر لیے تھے۔ وہ نیند اور تھکاوٹ سے چُور باتیں کرتے جا رہے تھے۔ ساری رات انہوں نے گانے بجانے کی محفل کو گرم رکھا تھا۔ تماشائیوں نے بھی ان سے بھرپور لطف اٹھایا تھا۔ کیسے کیسے انہیں تنگ نہیں کیا تھا۔ مگر وہ تو ان کا دل لبھانے آئے تھے۔ انہیں خوش کرنے آئے تھے۔ ان کی بری حرکتوں پر ان کے دل کتنے کٹتے تھے اور وہ کیسے پسینے میں بھیگ جاتے تھے......دوسروں کو کیا خبر......! شاید قدرت نے ہی انہیں تماشا بنا رکھا تھا۔ دوسروں کو خوش کرنے کی بھاری ذمہ داری انہیں سونپ رکھی تھی اور وہ آنسو پی پی کر......اپنے دلوں کو لہولہان کرتے ہوئے یہ فریضہ خوش اسلوبی سے انجام دینے کی کوشش کرتے۔

رات بہت سرد تھی اور ختم بھی ہونے والی تھی۔ تینوں باتیں کرتے ہوئے سڑک پر سے گزر کر اپنی بستی کی طرف جا رہے تھے۔ اچانک کسی بچے کے رونے کی تیز آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔

''ارے جی...... فردوس...... یہ آواز سن رہی ہو'' نرگس نے ان کی آواز کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... کسی بچے کے رونے کی آواز ہے...... آواز اس طرف سے آ رہی ہے'' فردوس نے دائیں طرف اشارہ کیا۔

''ارے جی...... اپنی ٹارچ تو ادھر کر'' نرگس نے کہا تو جی نے اپنی ٹارچ ان کے آگے کی...... ذرا فاصلے پر کوڑے کرکٹ کا ڈھیر تھا...... وہاں ایک گندے سے کپڑے میں شیر خوار بچہ رو رہا تھا۔ بہت زیادہ سردی سے اس کا جسم اور چہرہ ٹھنڈا برف ہو رہا تھا مگر مسلسل رونے کی وجہ سے گلے کی رگیں پھول رہیں تھیں۔ فردوس نے آگے بڑھ کر بچے کو اٹھالیا۔

''کوئی حرامی لگتا ہے'' فردوس بڑبڑائی۔

''اے...... ہائے...... کیا بک رہی ہے...... دیکھ تو سہی...... رو رو کر اس کا کیا حال ہو رہا ہے'' نرگس نے اسے ٹوکا۔

فردوس نے جلدی سے اسے ساتھ لگایا اور اس کے گیلے کپڑے اتار کر اپنی جیکٹ میں لپیٹنا چاہا...... تو چونک گئی۔

''اری...... نرگس...... یہ تو تیرے میرے جیسا ہے...... نامراد اسے پھینک گئے...... مرے اس کی کلموئی ماں...... جو اس کو ایک دن بھی نہ رکھ سکی......'' فردوس گالیاں بکتے ہوئے بولی۔

''ہاں...... ایک دن کا ہی لگتا ہے...... چل...... جلدی سے گھر لے چل...... باہر ٹھنڈ بہت ہو رہی ہے'' نرگس نے کہا۔

فردوس نے اسے جلدی سے اپنے ساتھ لگایا اور گھر لے آئی۔ گھر پہنچی...... تو شامو گھر آ چکا تھا اور سو رہا تھا۔ ان کے ساتھ بچے کے رونے کی آواز سن کر ہڑبڑا کر اٹھ گیا......

''اری...... نرگس...... فردوس...... یہ کہاں سے اٹھالائی......؟'' شامو نے حیرت سے بچے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''یہ...... ہمارا ہی ہے'' فردوس مسکرا کر بولی۔

''ہمارا...... کہاں سے......؟ سچ بتاؤ...... کہاں سے اٹھالائی، صبح کو پولیس گھر آ گئی...... تو پھر بتانا...... کس کا ہے اور کہاں سے لائی......؟'' شامو نے خفگی سے کہا۔

''کاہے کو بگڑ رہا ہے...... اپنی بستی سے باہر کوڑے کے ڈھیر سے اٹھا کر لائی ہیں...... کسی نے وہاں پھینک دیا تھا...... ہے تو ہماری جنس...... اس لئے اٹھالائے'' فردوس نے کہا۔

''اللہ نے ہماری بھی جھولی بھر دی...... سچ ہمیں بھی تو کھیلنے اور دل بہلانے کو بچے چاہیے ہوتے ہیں...... ادھر ادھر سے وہ ایسے بچوں کو بھیج کر ہماری جھولیاں بھرتا ہے۔ واہ مولا! تیرے بھی عجیب ہی رنگ ہیں'' نرگس خوشی کے مارے پھولی نہ سما رہی تھی...... اور بچے کے وارے نیارے جا رہی تھی...... دوپٹے کے پلو سے دس دس کے نوٹ نکال کر بچے کے سر سے وارے اور فردوس کو پکڑانے لگی۔

''یہ بچے کے سر کا صدقہ ہے...... صبح خیرات کر دینا'' نرگس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''آپا...... اس کو بہت بھوک لگی ہے...... ہمارے گھر میں تو فیڈر بھی نہیں...... کیسے دودھ پلائیں'' فردوس نے نرگس سے کہا۔

''شامو......جا......کہیں سے فیڈر لے آ'' نرگس نے کہا۔

''میں نہیں جارہا فیڈر لینے جہاں سے بھی لینے جاؤں گا سب پوچھیں گے کس کے لئے......تو......میں کیا جواب دوں گا اور ویسے بھی لوگ پوچھتے کم مذاق زیادہ بناتے ہیں'' شامو نے منہ بسورتے ہوئے جواب دیا۔

''اے جمی......جا تو کہیں سے فیڈر لا......بچہ بڑا ہی بھوکا ہے۔ دیکھ تو سہی بھوک سے نڈھال ہو رہا ہے......ماں صدقے جائے......تجھ پر......چپ کر جا......میرے لال'' نرگس نے بچے کو اپنے کندھے کے ساتھ لگاتے ہوئے چپ کرانے کی کوشش کی۔

جمی اس کی بات سن کر باہر نکل گیا۔

''بیچارا......اس دنیا کا عذاب سہنے آ گیا ہے......پتہ نہیں مولا بھی اپنے کیا رنگ دکھانا چاہتا ہے......اپنی خوشی کے لئے ہم جیسوں کو ساری زندگی کے لئے سولی پر لٹکا دیتا ہے'' شامو نے نم آنکھوں سے کہا۔

''ارے چپ کر......خواہ مخواہ بدشگونی نہ کر......وہ مولا ہے......بہتر جانتا ہے اس نے کیا کرنا ہے......ہمارے گھر بچہ آیا ہے......ہمیں اس کی خوشی منانی ہے......'' نرگس نے شامو کو ڈانٹا اور نیند اور تھکاوٹ سے چور جمائیاں لینے لگی لیکن کسی نے بھی سونے کی خواہش ظاہر نہ کی تھی۔ بچے کو پا کر وہ اس قدر خوش تھیں کہ انہیں نیند بالکل ہی بھول چکی تھی۔

جمی کہیں سے چھوٹا سا فیڈر لے آیا اور بچے کو دودھ پلایا۔ گرم کپڑوں میں لپیٹ کر اسے سلا دیا۔

''اس کے آنے سے ہماری زندگیاں بھی رنگین ہو جائیں گی......میں آج ہی اس کے لئے رنگ برنگی کپڑے اور کھلونے لاؤں گی'' نرگس نے کہا۔

''اور آپا......دیکھو کتنے نصیب والا ہے......محفل سے جتنے پیسے آج ملے ہیں پہلے کبھی نہیں ملے......مولا نے اس کے آنے سے پہلے ہی ہماری جھولی بھر دی'' فردوس نے خوشی سے کہا۔

''اور میں جانتا ہوں......یہ کتنا بدنصیب ہے......اس کی حیثیت تو راکھ جتنی بھی نہیں'' شامو نے آہ بھر کر سوچا اور کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔

☆

رانی کا دل بہت بوجھل ہو رہا تھا......رات کو جو کچھ ہوا تھا اس نے اس کے دل و دماغ کو بہت پریشان کر رکھا تھا۔ کیسے تھوڑی ہی دیر میں کیا کچھ ہو جاتا ہے۔ رات کو بچہ پیدا ہوا اور صبح کو اس کا نام و نشان تک نہ تھا......ملکا نجانے اسے کہاں چھوڑ آیا تھا۔ برکتے پیٹتی رہی اور اس سے پوچھتی رہی کہ وہ اسے اس کا کچھ اتا پتا تو بتائے۔ اسے ڈر تھا کہ اس نے اسے مار ہی نہ دیا ہو......مگر وہ اسے کچھ بھی نہیں بتا رہا تھا۔

''ملکے......اسے کہاں چھوڑ کے آیا ہے؟'' برکتے نے بے بسی سے پوچھا۔

''اسے دفنا آیا ہوں......اب آئندہ اس کے بارے میں مت پوچھنا'' ملکے نے غصے سے جواب دیا۔

''ہائے......میں......مر گئی......زندہ کو دفنا آیا ہے......جالم......رب تجھے کبھی معاف نہیں کرے گا......ارے کوئی باپ بھی اتنا جالم ہو سکتا

ہے..... ''برکتے نے روتے ہوئے کہا۔

''میں اس کا باپ نہیں ہوں.....سنا تو نے.....خبر دار جو مجھے اس کا باپ کہا..... مجھے اپنی نامردی محسوس ہوتی ہے.....حرام خور نجانے کہاں کی بلا تھی..... جو میرے سر منڈھ رہی ہے' ملکے نے غصے سے چلاتے ہوئے کہا۔

تیری جبان میں کیڑے پڑیں جو ایسے اول فول بول رہا ہے، کمبخت تجھے نہیں پتہ..... کہ مولا جو چاہے پیدا کر سکتا ہے۔ برکتے نے روتے ہوئے کہا اور ملکا اسے گھورتا ہوا باہر نکل گیا۔ برکتے کی رو رو کر ہچکی بندھ گئی تھی۔ نوری کی جھگی سے سارے بچے واپس اپنی جھگی آئے تو ہر طرف افسردگی اور ماتم جیسی خاموشی تھی۔ رانی خاموش سے کونے میں بیٹھی تھی۔ اماں نے کچھ نہیں کھایا پیا تھا۔ رانی نے کالی سیاہ چائے کا ایک کپ بنا کر اسے دیا۔

''کیسے پیوں.....؟ پتہ نہیں اس نے بھی کچھ پیا ہے کہ نہیں' برکتے بے بسی سے بولی تو رانی خاموش ہوگئی۔ اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اس نے بچوں کو تھوڑا بہت ناشتہ کرایا اور خاموشی سے تھیلا اٹھا کر چلی گئی..... بستی سے باہر نکلتے ہی اس کی نظریں شامو کی متلاشی تھیں مگر وہ کہیں نظر نہ آیا۔ آج اس کا دل چاہ رہا تھا شامو نظر آئے اور وہ اس سے کچھ پوچھے..... کچھ..... کچھ..... ؟ مگر کیا.....؟ اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ سارا دن افسردگی سے وہ ادھر ادھر ماری ماری پھرتی رہی۔ شام کو وہ واپس آرہی تھی تو شامو اسے راستے میں نظر آگیا۔ آج رانی اسے دیکھ کر چلائی نہیں تھی۔ اسے گالیاں نہیں دیں تھیں۔ اس نے اسے کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی..... شامو بہت حیران ہو رہا تھا۔

''لیلیٰ..... کیا ہوا تجھے..... آج بڑی چپ ہے..... کسی حرامزادے نے تجھے چھیڑ تو نہیں دیا..... ایک بار اس کا نام بتا..... پھر دیکھ اس کے ٹوٹے کر آؤں گا'' شامو نے ہوا میں اپنا مکا لہراتے ہوئے کہا۔

رانی خاموشی سے اس کی طرف یوں دیکھتی رہی جیسے اس کی بات اس نے سنی ہی نہ ہو۔

''شامو..... تم.....لوگ.....'' رانی نے بہت آہستہ سرد لہجے میں کہا۔

''کیا.....ہم.....لوگ.....؟'' شامو نے حیرت سے پوچھا۔

''تم لوگ..... تم.....'' وہ ہونٹ چبانے لگی۔ اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ کیا کہے.....؟ کیا پوچھے.....؟ اس کی طرف بے بسی سے دیکھتی رہی اور آگے بڑھ گئی۔

''اے لیلیٰ..... آج تجھے کیا ہوا ہے..... بڑی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو..... لگتا ہے کوئی مسئلہ ہو گیا ہے'' شامو اس کے جانے کے بعد سوچ میں پڑ گیا۔

☆

نرگس، فردوس اور جمی نے بچے کی خوشی میں میٹھے چاول پکا کر بانٹے تھے، ناچ ناچ کر اور اسے گود میں اٹھا کر لوریاں دیں..... سارا محلہ اکٹھا ہوگیا۔ سب میں مٹھائی بانٹی گئی۔

''خیر سے بچہ ہوا کس کے ہاں ہے..... یہ تو بتاؤ؟'' ایک آدمی نے مٹھائی کھاتے ہوئے مذاقاً کہا۔

''مٹھائی کھانی ہے تو کھا...... ورنہ ادھر پکڑا...... فضول باتیں مت کر......'' نرگس نے اس کے ہاتھ سے مٹھائی چھینتے ہوئے کہا۔

''ارے میں تو...... یونہی کہہ رہا تھا۔ بچے کی ماں کو مبارکباد دینا چاہتا ہوں......'' اس آدمی نے جواب دیا۔

''میں ہوں اس کی ماں...... لے لی مبارکباد...... چل جا اب دفعہ ہو یہاں سے'' نرگس نے غصے سے اسے کہا تو وہ شرمندہ سا وہاں سے کھسک گیا۔

''اچھا بچے کا نام کیا رکھا ہے......؟'' ایک اور آدمی نے پوچھا۔

''تیرے نام پر نہیں رکھا...... ہماری مرضی جو دل چاہے کہہ کر بلائیں...... تجھے کیا تکلیف ہے......'' فردوس نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''سارے حرامزادے...... چسکے لینے آجاتے ہیں...... ہر وقت کا مذاق بھی کوئی اچھی بات ہے...... گھروں سے چاہے جوتیاں کھا کر آئیں باہر آکر اپنی مردانگی کا رعب جھاڑتے ہیں...... اونہہ...... آئے بڑے مرد'' نرگس نے غصے سے گالیاں بکتے ہوئے کہا اور گھر کا دروازہ بند کر لیا۔

''فردوس چل بازار چلیں...... بچے کے لئے کپڑے اور کھلونے لے کر آئیں؟'' نرگس نے کہا۔

''آپا بچے کو بھی لے کر چلیں......؟'' فردوس نے حیرت سے پوچھا۔

''اری نہیں...... اسے جمی کے پاس چھوڑ جاتے ہیں...... سن رے جمی گھر ہی رہیو...... اور سن اسے شامو کے حوالے کر کے کہیں نہ جانا۔ وہ اس سے بڑی خار رکھتا ہے کہیں اسے مار ہی نہ دے'' نرگس نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

''ہائے...... میں مر گئی...... آپا...... یہ کیا کہہ رہی ہے...... شامو اتنا سنگدل اور ظالم ہو گیا ہے...... کہ بچے کو مار دے گا...... اللہ کی مار...... اس کمبخت نے جب سے مردانہ کپڑے پہننے شروع کیے ہیں...... مردوں کی طرح ہی سوچنا شروع ہو گیا ہے...... اسے کیا معلوم...... ماں کا دل کتنا نازک ہوتا ہے......'' فردوس نے اپنے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے اس کے تیور ٹھیک نہیں لگ رہے...... جمی بچے کا خیال رکھنا...... صدقے جاؤں...... میری بلی...... میری گڈی...... میں ابھی آجاؤں گی...... رونا مت...... اور جمی ماموں کو تنگ بھی نہ کرنا'' نرگس نے بچے کو چومتے ہوئے کہا۔

''چل ری...... فردوس...... بازار میں بڑا ٹیم لگے گا......'' نرگس نے کہا اور دونوں پرس سنبھال کر بازار کی طرف چل پڑیں، جہاں بچوں کے کھلونے اور کپڑے دیکھ کر رکتیں...... وہیں دکاندار اور لوگ ان کا مذاق اڑانا شروع کر دیتے۔

''ارے بھائی...... ذرا یہ گڑیا تو دکھا......'' نرگس نے ایک خوبصورت سی گڑیا کی طرف اشارہ کیا۔

''اچھا...... پہلے ٹھمکا تو لگا......'' دکاندار نے ہنستے ہوئے کہا۔

''چل...... دفعہ ہو...... مر...... میں کہیں اور سے لے لیتی ہوں'' نرگس نے جواب دیا۔

''یہ فراک کتنا پیارا ہے...... کتنے کا ہے......؟'' فردوس نے ایک دکاندار سے پوچھا۔

دکاندار نے ان کی طرف کوئی توجہ نہ کی اور دوسرے گاہکوں کو کپڑے نکال نکال کر دکھاتا رہا۔

''ارے بھائی...... یہ فراک دکھا دو'' فردوس نے پھر کہا۔

دکاندار نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی۔

''ارے سنتا نہیں......کب سے کہہ رہی ہوں فراک دکھا......ہم کب سے ادھر کھڑی ہیں...... تجھے نظر نہیں آتا'' نرگس نے خفگی سے کہا۔

''چل ہٹ......ادھر سے......اپنا آپ تو دیکھو......پھر شاپنگ کرنا، منہ اٹھا کر چلی آتی ہو......بھلا فراک تمہارے کس کام کا؟'' دکاندار بدتمیزی سے بولا۔

''ہم اپنے......'' نرگس نے کچھ کہنا چاہا مگر فردوس نے اسے اشارے سے روک دیا۔

''چل ادھر سے......کہیں اور چلتے ہیں'' فردوس نے اسے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر لے گئی۔

''کاہے کو بچے کے بارے میں سب کو بتاتی ہے......پھر الٹی سیدھی سنے گی......آپا کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے......اللہ کی یہ زمین صرف مردوں اور عورتوں کے لئے ہی ہے......ہمارے لئے تو کوئی جگہ ہی نہیں......پتہ نہیں اس نے ہمیں انسانوں جیسی شکل وصورت کیوں دی......؟ جانور ہوتے تو کوئی طعنے تو نہ دیتا نا......بے زبان کسی سے کچھ نہ پوچھتے مگر یہاں سب کے درمیان پیدا کر کے اس نے ہم سب سے بڑی زیادتی کی ہے......ہمیں لوگوں کو بتانا پڑتا ہے کہ ہم ہیں......اور......ادھر کھڑے ہیں مگر کوئی قدم رکھنے کو اور جگہ دینے کو تیار نہیں ہوتا......'' فردوس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''ہاں......کبھی کبھی تو لگتا ہے......اللہ کی اس زمین پر کوئی ہمارا ہمدرد نہیں......کوئی ہمارے دکھوں کو نہیں سمجھتا......کچھ مولا نے ہمارے ساتھ زیادتی کی......اور......اس سے بڑھ کر اس کے بندے ہمارے ساتھ کرتے ہیں......'' نرگس نے نم آنکھوں سے جواب دیا۔

''اے چمپا......کلی......ریشم......ریما......لال اور سبز پری کدھر کو جا رہی ہو......؟ آج تو بڑے فیشن کر رکھے ہیں......یہ آنکھوں کے میزائل کدھر گرانے کے ارادے ہیں'' ایک جوان لڑکے نے پاس سے گزرتے ہوئے فردوس کو چٹکی کاٹ کر ہنستے ہوئے کہا۔

''اوئی میں مرگئی......اللہ کرے مرے تو......اور تیرے اگلے پچھلے بھی یہ میزائل میں تیری ماں کے گھر گراؤں گی......سارے سڑ کر راکھ ہو جائیں گے......'' فردوس نے اسے گالیاں بکتے ہوئے کہا اور لڑکا ہنستا ہوا آگے نکل گیا۔ آگے جا کر وہ مڑ مڑ کر دیکھنے لگا، اس کی شرارت پر بازار کے سارے مرد ہنسنے لگے اور کوئی ادھر سے فردوس کو چھیڑنے لگا......کوئی دوسری جانب سے......فردوس روہانسی ہو گئی۔

''آپا گھر چل......یہاں تو سارے تماش بین اکٹھے ہوئے ہیں......بیڑا غرق ان کا......'' فردوس نے کہا۔

''اری......بچے کے لئے کوئی خریداری تو کی ہی نہیں......ایسے ہی خالی ہاتھ کیسے چلے جائیں؟'' نرگس نے حیرت سے جواب دیا۔

''آپا......یہاں کوئی شاپنگ کرنے دے گا تو کرو گی نا......سب ہم سے مستی، شرارت اور مذاق کرتے ہیں......کوئی تجھے کچھ نہیں دے گا......'' فردوس نے کہا۔

''اے ہائے......فردوس......بچے کے پاس تو ڈھنگ کے کپڑے بھی نہیں......سویٹر بھی نہیں......چل ادھر آ......یہ دکاندار بوڑھا ہے......اس سے لے لیتے ہیں'' نرگس نے ایک چھوٹی سی دکان پر کھڑے بوڑھے آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور اس سے چند جوڑے کپڑوں کے خریدے اور گھر واپس آ گئیں۔

☆

''اے جمی...... کیا مصیبت ہے...... جب سے میں گھر آیا ہوں یہ ریں ریں کر رہا ہے...... دو پل بھی سکون سے لیٹنے نہیں دیا...... اچھا خاصا گھر میں سکون تھا، پتہ نہیں کہاں سے یہ مصیبت اٹھا لائے؟'' شامو نے غصے سے جمی کو کہا جو روتے ہوئے بچے کو کندھے سے لگائے چپ کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''کوڑے کے ڈھیر سے اٹھایا ہے اسے...... نہ اٹھاتے تو مر جاتا بیچارا'' جمی خالص زنانہ آواز نکالتے ہوئے بولا۔

''تو مر جاتا...... ہم کیا کرتے......؟'' شامو غصے سے بولا۔

''شامو...... یہ انسان کا بچہ تھا...... کتے بلی کا تو نہیں جو ہم اسے دیکھ کر وہیں پھینک آتے'' جمی نے کہا۔

''اور جن کا ہے ان کو پھینکتے ہوئے کوئی خیال نہیں آیا...... تو تم لوگوں نے کیوں اٹھایا؟'' شامو بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

''ہائے شامو...... کیسی باتیں کر رہا ہے...... تیرے سینے میں دل نہیں کیا......؟ جو تو ایسی باتیں کر رہا ہے......'' جمی نے بچے کو دوسرے کندھے کے ساتھ لگا کر پھر چپ کرانے کی کوشش کی...... تو...... شامو اس کی بات سن کر خاموش ہو گیا اور غصے سے باہر نکل گیا۔ فردوس اور نرگس گھر میں داخل ہوئیں۔ ان کے ہاتھ میں بچے کے لئے بہت سی چیزیں، کپڑے کھلونے اور پھل وغیرہ تھے۔ نرگس نے آتے ہی بچے کو پکڑا اور والہانہ انداز میں اسے چومنے لگی اور سینے کے ساتھ لگایا۔ بچہ خاموش ہو گیا۔

''ماں صدقے...... اپنی ماں سے اداس ہو گیا تھا...... دیکھ کیسے میرے پاس آتے ہی چپ ہو گیا ہے'' نرگس نے فرط جذبات سے لبریز نم آنکھوں کے ساتھ جمی اور فردوس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو وہ بھی مسکرانے لگیں۔

☆

برکتے کا رو رو کر برا حال ہو گیا تھا۔ نجانے اسے کیا ہوا تھا۔ اس کے معدے میں کوئی چیز ٹھہر ہی نہ رہی تھی۔ پانی پیتی تو وہ قے کر دیتی...... دودھ یا چائے کچھ بھی ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ دو تین دن سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا اور نہ ہی اسے بھوک لگ رہی تھی...... سوائے چھوٹے بچوں کے کسی نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ نجانے کیسی اداسی چھا گئی تھی...... کوئی کسی سے نہ بات کرتا...... نہ کچھ کہتا بس خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے اور نظریں پھیر لیتے...... رانی، باپ کی طرف دیکھتی تو وہ منہ پھیر دیتا...... بجو اور مٹھو نے تو آپس میں بات تک کرنا چھوڑ رکھی تھی...... برکتے خاموش سی چارپائی پر لیٹی آہیں بھرتی کروٹیں بدلتی رہتی...... ہائے ہائے کی آوازوں پر سب چونک کر اسے دیکھتے اور پھر خاموش ہو جاتے۔

''بجو...... جا تھوڑا سا دودھ ہی لے آ...... اماں کو چائے بنا دوں'' رانی نے بجو کو دس سکے اکٹھے کر کے اور ایک گلاس پکڑاتے ہوئے کہا، وہ خاموشی سے گلاس لے کر چلا گیا۔

بجو نے دودھ کا گلاس دکاندار کے آگے کیا۔

''اس میں دس روپے کا دودھ ڈال دے......'' بجو نے سکے پکڑاتے ہوئے کہا۔

''اب کس کے لئے...... اتنا سا دودھ لینا ہے......'' دکاندار نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''اماں کے لئے......'' بجو نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

''سنا ہے.....تیری ماں نے ہیجڑا جنا ہے'' دکاندار نے ہنستے ہوئے کہا۔

شامو بھی وہاں دودھ لینے کھڑا تھا اس نے مڑ کر بجو کی طرف حیرت سے دیکھا۔ بجو کو کچھ سمجھ میں نہ آیا کیا کہے۔ اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں......شامو نے اس کی طرف دیکھا۔ ''ہیجڑا گھر میں ہی ہے یا کوڑے کے ڈھیر پر پھینک آئے؟'' دکاندار نے ہنستے ہوئے بجو کو گلاس پکڑاتے ہوئے کہا......ساتھ بنچ پر بیٹھے کچھ لوگ بھی ہنسنے لگے۔

بجو نے خاموشی سے گلاس پکڑا اس کا چہرہ پسینے سے شرابور ہونے لگا۔

''لا......اس میں تھوڑا سا دودھ اور ڈال دوں......ہیجڑے کو بھی تو پلاتا ہوگا......'' دکاندار نے پھر ہنستے ہوئے کہا۔

بجو نے غصے سے اس کی طرف دیکھا اور گلاس زور سے دکاندار کے چہرے کی طرف پھینکا۔ دودھ اس کے چہرے پر گر گیا اور بجو وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔

''ٹھہر جا......تو......حرام خور......ایک ہمدردی کرو......اوپر سے یہ بدلہ ملے......'' دکاندار بڑبڑانے لگا۔

شامو دکاندار کی طرف دیکھنے لگا۔

''چاچا......تجھے کیسے پتہ چلا کہ ان کے ہاں ہیجڑا پیدا ہوا ہے'' شامو نے حیرت سے پوچھا۔

''لے تجھے تو جیسے پتہ ہی نہیں......تیرے ہی گھر میں تو ہے اور کس نے جنا ہے......جو فردوس اور نرگس لڈو بانٹتی پھر رہی ہیں۔ سب کو خبر ہے کہ ملکے نے بچہ کہاں پھینکا اور کس نے اٹھایا......اب......بستی ہے ہی کتنی......سب کو سب کی خبر ہے......مگر......میں اس کمبخت کو نہیں چھوڑوں گا۔ میرے سارے کپڑے خراب کر گیا ہے'' دکاندار نے کہا تو شامو خاموشی سے وہاں سے چلا گیا۔

☆

''بجو تو دودھ نہیں لایا......اور گلاس کہاں ہے؟'' رانی نے حیرت سے پوچھا۔ بجو کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا اور اس کی ناک کے نتھنے پھول رہے تھے۔

''نہیں لایا دودھ......اور آئندہ مجھے باہر سے کچھ لانے کو مت کہنا'' بجو غصے سے بولا۔

''کیا تو کسی سے لڑ کر آیا ہے؟'' رانی نے اسے پوچھا۔

''باہر ہر کوئی یہی پوچھتا ہے......تیری اماں نے ہیجڑا جنا ہے......کہاں ہے وہ......؟ بس میں نہیں جاؤں گا'' بجو نے روتے ہوئے جواب دیا۔

''ساری بستی میں تھو تھو ہو رہی ہے۔ سب آتے جاتے مزے لے لے کر باتیں کرتے ہیں......اب یہاں رہنا مشکل ہو گیا ہے......سامان باندھو اور کسی دوسرے شہر چلتے ہیں۔ ہم یہاں رہ کر بے عزتی برداشت نہیں کر سکتے'' ملکے نے اچانک اپنا فیصلہ سنایا تو سب نے چونک کر اسے دیکھا۔

''مگر......ابا......ہم کہاں جائیں گے......یہاں ہماری جھگی ہے'' رانی نے حیرت سے کہا۔

''جھگی ہے.....کوئی کوٹھی تو نہیں.....سامان اٹھائیں گے اور چل پڑیں گے.....مگر یہاں نہیں رہیں گے.....میں لوگوں کی باتیں نہیں سن سکتا.....بہت کالک لگ گئی منہ پر.....''ملکے نے غصے سے کہتے ہوئے برکتے کی طرف دیکھا جیسے سارا قصور اسی کا ہو۔

''ہاں.....ابا ٹھیک کہہ رہا ہے'' بجو اور مٹھو نے بھی کہا۔

''سامان باندھو اور تیاری کرو.....''ملکے نے کہا اور سگریٹ کے گہرے کش لگانے لگا۔رانی نے برستی آنکھوں کے ساتھ سامان اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔

☆

شامو راستے میں منتظر بیٹھا تھا کہ رانی ادھر سے گزرے گی اور وہ اس سے کچھ پوچھے گا.....اور اس کو کچھ بتائے گا مگر شام ڈھلنے کو آ رہی تھی.....رانی ادھر سے نہ گزری۔

''معلوم نہیں.....اسے کیا ہو گیا ہے.....رانی آج ادھر سے نہیں گزری.....وہ کبھی چھٹی تو نہیں کرتی.....پھر کہاں چلی گئی.....کہیں بیمار ہی نہ ہو گئی ہو؟ نجانے کیوں اسے رانی سے محبت ہو گئی تھی۔رانی اسے اچھی لگتی تھی.....کیوں اچھی لگتی تھی۔یہ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا نادانستہ اس کے قدم رانی کی جھگی کی طرف اٹھ گئے.....وہاں پہنچا تو جھگی کی جگہ خالی پڑی تھی۔اکا دکا کاغذوں کے ٹکڑے اور ٹوٹے برتن پڑے تھے۔شامو نے حیرانگی سے ادھر ادھر دیکھا۔

''یہ.....یہ.....لوگ کہاں چلے گئے؟'' شامو نے ایک دس بارہ سال لڑکے سے پوچھا۔

''چلے گئے.....''اس نے جواب دیا۔

''کہاں.....؟'' شامو نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

''پتہ نہیں.....'' بچے نے کندھے اچکا کر جواب دیا۔

شامو پریشان ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔نوری اپنی جھگی سے نکلی تو شامو اس کی طرف لپکا۔

''یہ.....یہ.....یہاں پر جھگی تھی.....'' وہ بمشکل بولا۔

''چلے گئے یہاں سے.....'' نوری نے بے زاری سے جواب دیا۔

''کسی دوسرے شہر.....پتہ نہیں.....کہاں ،مگر تو کیوں پوچھے ہے؟'' نوری نے معنی خیز نظروں سے شامو کو سر سے لے کر پاؤں تک گھورا اور اپنی جھگی کے اندر چلی گئی۔شامو کا دل بیٹھنے لگا۔رانی اچانک اسے چھوڑ کر کہیں چلی گئی۔اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔رانی کو کہاں ڈھونڈے؟ کس جگہ تلاش کرے اور رانی اسے کچھ بھی بتائے بغیر کہیں چلی گئی تھی.....کوئی اتا پتا نہیں بتایا تھا۔

''شامو.....تیری طرح تیری محبت بھی بڑی بے وقعت نکلی.....اس نے تیری ذرا سی بھی قدر نہ کی.....پتہ نہیں.....ہماری ساری سوچیں.....ہمارے خیالات.....ہمارے جذبات سب ایک ہی نظر سے کیوں دیکھے جاتے ہیں اور دیکھنے والی نظروں میں ہمارے لئے کبھی نرمی

نہیں ہوتی'' شامو کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگیں۔

وہ گھر لوٹا تو رات گہری ہو رہی تھی۔ بچہ سو رہا تھا...... فردوس اور نرگس کسی نئے جوڑے پر گوٹا کناری لگا رہی تھیں۔ جمی پاس بیٹھا ٹیپ پر ایک نیا گانا سن رہا تھا اور ساتھ ساتھ اس اسٹائل میں ڈھولک بجانے کی کوشش کر رہا تھا۔ شامو کی طرف سب نے گہری نظروں سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر تھکاوٹ کے آثار نمایاں تھے اور آنکھیں جیسے بہت رونے سے سوجی ہوئی تھیں۔

''کیا ہوا تجھے...... کیا کسی کا جنازہ پڑھ کر آیا ہے؟'' نرگس نے حیرت سے اس کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہمیں تو کسی کا جنازہ پڑھنے کی بھی اجازت نہیں......'' شامو آہ بھر کر بولا۔

''کیا ہوا...... کاہے کو یہ رونی شکل بنائی ہے؟'' فردوس نے اسے پوچھا۔

''کچھ نہیں ہوا'' اس نے بیزاری سے جواب دیا۔

''سن شامو...... بہت روز ہو گئے...... تجھے دیکھتے ہوئے...... نہ تو ہمارے ساتھ دھندے پر جاتا ہے اور نہ ہی کچھ کما کر لاتا ہے اس طرح مفت کی روٹیاں تو ہم تجھے کھلا نہیں سکتے...... سیدھی طرح ہمارے ساتھ کام پر چل......'' نرگس نے شامو کو دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

''اور اگر کام پر نہ جاؤں...... تو......؟ تو پھر کیا کرو گی؟'' شامو نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''تو پھر تمہیں...... یہ گھر چھوڑنا پڑے گا'' نرگس نے ٹھوس لہجے میں کہا تو شامو سمیت فردوس اور جمی بھی حیران رہ گئے اور نرگس کی طرف دیکھنے لگے۔

''آپا...... یہ تو کیا کہہ رہی ہے؟ پندرہ سالوں سے یہ ہمارے ساتھ رہ رہا ہے...... جب یہ دس برس کا تھا تب ہمارے پاس آیا تھا...... اس سے ہمیں بچوں جیسا پیار ہے'' فردوس نے کہا۔

''مگر اب یہ ساری عمر تو بچہ بن کر نہیں رہ سکتا...... بڑے اس کے ناز نخرے اٹھائے ہیں۔ ہمارے ساتھ بھی پیٹ لگے ہیں اور پیٹ تین وقت کا کھانا مانگتے ہیں...... اور کھانا پیسوں سے آتا ہے...... اور پیسے کام کرنے سے ملتے ہیں...... کام نہیں کرے گا تو پھر کیا کرے گا...... تو ہی پوچھ اس سے؟'' نرگس نے غصے سے شامو کو گھورتے ہوئے کہا۔

''تیرے پاس اب بچہ آ گیا ہے نا...... اسی لئے تو اب مجھے نکال رہی ہو'' شامو نے نرگس سے کہا۔

''جو مرضی سمجھ...... مگر...... تجھے یہاں رہنے کے لئے کام کرنا ہو گا ورنہ چھٹی کر'' نرگس نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔

''تیرے نزدیک میری کوئی قدر نہیں...... تیرا میرا رشتہ بس اتنا سا ہے...... کام کروں...... پیسے لاؤں تو پھر یہاں رہ سکتا ہوں...... ورنہ نہیں...... ارے تم ہیجڑے اسی لئے نامراد رہتے ہو...... کہ تم اپنے ہی لوگوں کے لئے وہ درد نہیں محسوس کرتے جو ماں باپ اپنی اولادوں کے لئے کرتے ہیں...... شاید اس میں تمہارا بھی قصور نہیں کہ تمہارے اپنے والدین بھی تو تمہارے لئے وہ درد محسوس نہیں کرتے جو اپنی دوسری اولاد کے لئے کرتے ہیں...... شاید ہم لوگوں کے رشتے دل اور خون کے نہیں پیٹ کے رشتے ہوتے ہیں...... ہم صرف اپنی اپنی بھوک مٹانے کے لئے ایک دوسرے کے

ساتھ جڑے ہیں...... جب تک ہم ایک دوسرے کے پیٹ کی بھوک مٹاتے رہتے ہیں...... ہم ایک دوسرے کے قریب ہیں ورنہ نہیں...... ٹھیک ہے...... میں یہ گھر چھوڑ کر جا رہا ہوں'' شامو نے نم آنکھوں سے نرگس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا...... اور دروازے کی طرف جانے لگا۔

''آپا اسے روک...... یہ...... یہ کہاں جا رہا ہے؟'' فردوس نے نرگس کے ہاتھوں کو پکڑتے ہوئے کہا۔

''اری جانے دے کمبخت کو...... نہ کام کا نہ کاج کا...... دشمن اناج کا...... دو دن بھوکا رہے گا تو دماغ ٹھکانے آ جائے گا...... آیا بڑا لاٹ صاحب کی اولاد...... کہتا ہے ناچ گانا نہیں کرے گا...... یہ نہیں کرے گا تو پھر اور کیا کرے گا...... ہیجڑوں کو کام کون دیتا ہے؟ رہنے دو...... اسے دو دن باہر...... دماغ ٹھکانے آ جائے گا......'' نرگس نے بے رخی سے کہا تو فردوس حیرت اور نم آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔

☆

شامو نے ساری رات بازار میں ایک ویران جگہ میں گزاری۔ سردی سے وہ ٹھٹھر رہا تھا سوائے اپنی جیکٹ اور پتلون کے اس کے پاس کوئی اور کپڑا نہ تھا۔ صبح بیدار ہوا تو بھوک سے بری طرح نڈھال ہو رہا تھا...... وہ بازار کی طرف چل پڑا۔ حلوائیوں کی دکانوں پر حلوہ پوری اور چھوٹے ہوٹلوں سے سالن اور پراٹھوں کی خوشبو نے اس کی بھوک اور بڑھا دی تھی۔ وہ للچائی نظروں اور بھوکے پیٹ کے ساتھ لوگوں کو کھاتے پیتے دیکھ رہا تھا اور اس کے منہ میں پانی آ رہا تھا۔ اس کا چائے پینے کو دل چاہ رہا تھا مگر اس کی جیب میں تو چند سکے بھی نہیں تھے کہ وہ چائے کا کپ پیتا......

''بھائی...... کھانے کو کچھ دے دو...... میں آج کے دن سارے برتن دھو دوں گا......'' شامو نے ایک ہوٹل والے سے درخواست کی۔

''چل ہٹ...... یہاں سے...... تجھ سے کام کروا کے یہاں میں نے مجرا لگانا ہے اور صبح سویرے مجھے کیا اپنی شکل دکھا دی ہے...... نجانے دن کیسا کٹے گا......'' ہوٹل والے نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

''کیوں...... میں کوئی منحوس ہوں؟'' شامو نے نم آنکھوں سے پوچھا۔

''منحوس نہیں...... مگر خوش نصیب بھی نہیں ہو...... خوش نصیب ہوتے تو یوں مانگتے پھرتے...... چل جا...... اب سویرے سویرے موڈ نہ خراب کر......'' ہوٹل والے نے اسے ڈانٹا تو وہ نائی کی ایک دکان کے باہر دبک کر بیٹھ گیا جہاں سورج کی گرم شعاعیں سب سے پہلے پڑ رہی تھیں۔

''شکر ہے دھوپ پر انسانوں کی قدرت نہیں ورنہ یہ دھوپ بھی نہ سینکنے دیتے'' شامو نے دکھ بھرے انداز میں سوچا اور نیلے آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔

''تجھے کیا کہوں......؟ تو بھی تو ہماری نہیں سنتا...... ہمیں دیکھ کر تجھے دکھ نہیں ہوتا تو اور کس کو ہوگا'' شامو نے سوچا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ وہ پیٹ کو ٹانگوں اور بازوؤں کے اندر دبا کر بیٹھا تھا تاکہ بھوک زیادہ نہ لگے۔ درمیانی عمر کے نائی نے دکان کھولی تو شامو جلدی سے وہاں سے اٹھ کر ذرا فاصلے پر بیٹھ گیا اور آنے جانے والوں کو یوں دیکھنے لگا جیسے اس کی نظریں تو ان کے چہروں پر ہوں مگر کہیں اور دیکھ رہی ہوں۔

نائی نے دکان کھولی تو لوگ اس کے پاس آنے جانے لگے۔ اس نے چند کرسیاں دھوپ میں رکھ دیں۔

ایک آدمی سر کی مالش کروانا چاہ رہا تھا۔ نائی کا مالشیا ابھی تک نہیں آیا تھا۔

''ابے......سن......تو سر کی مالش کر دے گا'' نائی نے شامو کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں......ہاں......کر دوں گا......'' شامو نے خوش ہو کر جواب دیا۔

''صاب باہر بیٹھ جاؤ......دھوپ میں مالش کرالو'' نائی نے اس آدمی سے کہا۔

''یہ......مالش کرے گا'' آدمی نے حیرت سے شامو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں......صاب......میں......میں بہت اچھی مالش کرتا ہوں......'' شامو نے جلدی سے کہا اور تیل پکڑ کر اس کے سر کی مالش کرنے لگا۔

''ابے......تیرے تو ہاتھوں میں جان ہی نہیں ہے......کیا زنانہ ہاتھ ہیں'' آدمی نے اس کے ہاتھوں پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔

''چھوڑ......کاہے کو......میرے ہاتھ پکڑ رکھے ہیں'' شامو ہاتھ چھڑاتے ہوئے بولا۔

''تجھے مردانہ ہاتھوں کی پکڑ بتا رہا ہوں'' آدمی نے بے ہودہ سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''جمالے......کوئی مرد بچہ بھیج......جس کے ہاتھوں میں جان ہو......نہ اس میں جان ہے نہ......اس کے ہاتھوں میں'' آدمی نے آواز لگاتے ہوئے کہا۔

''وہ......اصل......میں......بھوک کی وجہ سے میرے ہاتھ......ٹھیک طرح سے کام نہیں کر رہے'' شامو نے سنجیدگی سے کہا۔

''تو......کھانا کھا لینا تھا......کس نے کہا......بھوکا رہنے کو'' آدمی نے کہا۔

''کھانے کے لئے پیسے چاہئیں......اور میرے پاس پیسے نہیں ہیں'' شامو نے رنجیدہ لہجے میں کہا۔ اس آدمی نے ایک ٹک اس کی جانب دیکھا اور جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر اسے دیا۔

''جا......جا کر چائے پی لے، آدمی نے اپنی سخاوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''شکریہ......صاب......اللہ تجھے بہت دے'' مارے تشکر کے اس کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے......آنسو اس کی آنکھوں سے رواں ہو گئے۔

''جمالے......تو اسے کوئی کام کیوں نہیں دیتا......یار ان لوگوں کا بھی ہم پر حق بنتا ہے......اسے کٹنگ ہی سکھا دے......'' اس آدمی نے نائی سے کہا۔

''یہ لوگ ناچ گانے سے بہت کما لیتے ہیں......ان کو کام کی کیا ضرورت؟'' جمالے نے جواب دیا۔

''صاب جی......میں وہ کام نہیں کرنا چاہتا......'' شامو جلدی سے بولا۔

''جمالے......رکھ لے......بیچارے کو......کوئی ہنر اسے بھی سکھا دے'' اس آدمی نے کہا۔

''ٹھیک ہے......ضرورت تو مجھے بھی ہے......میری اپنی اولاد اس ہنر کو سیکھنا نہیں چاہتی......باپ......دادا کے پیشے کو وہ لوگ برا سمجھتے ہیں......انہیں شرم آتی ہے......ایک دو کاریگر میں نے رکھے تھے......مگر اب انہوں نے اپنے بیوٹی سیلون کھول لیے ہیں......ٹھیک ہے......اگر یہ کام

سیکھنا چاہتا ہے.....تو آجائے" جمالے نے کہا تو شامو کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔

"کیوں نہیں.....میں دل لگا کر کام کروں گا....." شامو نے خوشی سے کہا۔

"مگر حلیہ تجھے لڑکوں والا بنانا پڑے گا.....لڑکی بن کر یہاں کام نہیں چلے گا" جمالے نے کہا۔

"ٹھیک ہے.....ٹھیک ہے.....صاب جی بہت شکریہ آپ نے میری بڑی مدد کی.....اللہ آپ کو خوش رکھے" شامو نے فرط جذبات سے لبریز نم آنکھوں کے ساتھ اس آدمی سے کہا تو وہ مسکرا دیا۔

"جا.....جا کر چائے پی لے" اس آدمی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

شامو وہاں سے چلا گیا۔

"مولا کے رنگ ہیں نا.....انسان میں کسی ایک چیز کی کمی رکھ دے تو ساری دنیا کی دولت خرچ کر چھوڑے وہ کمی پوری نہیں ہوتی..... سارے قسمت کے کھیل ہیں.....وہ دینے پر آئے تو خزانوں کے منہ کھول دے.....نہ دینے پر آئے تو کون اسے کچھ کہہ سکتا ہے....." اس آدمی نے آہ بھرتے ہوئے کہا اور جمالے کو پیسے دے کر چلا گیا۔

☆

بھوک انسان کو کتنا ذلیل وخوار کرتی ہے کہ وہ ایسے کام کرنے پر بھی آمادہ ہو جاتا ہے جو وہ کبھی کرنا نہیں چاہتا.....پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے سو حربے آزماتا ہے.....ہر روز نئی ترکیبیں سوچتا ہے.....نئے منصوبے بناتا ہے۔ پیسہ اکٹھا کرنے کے ہزار جتن کرتا ہے اور اس پیسے کا سب سے پہلا مصرف اس کا پیٹ ہوتا ہے۔ نت نئے کھانے لذیذ کھانے.....چٹ پٹے اور مزیدار کھانے.....صبح کا آغاز کھانے سے شروع ہوتا ہے اور رات گئے تک کھانے کی ہی فکر لاحق رہتی ہے۔ شاید دن کی کوئی ایسی گھڑی ہو.....جب خالی پیٹ خاموش ہو کر بیٹھ جائے.....اسے تو ہر وقت..... ہر پل.....کچھ نہ کچھ کھانے کو چاہیے.....پیٹ بھرا بھی ہو تو آنکھوں میں ایسی بھوک رہتی ہے جو انسان کو سکون نہیں لینے دیتی.....بھوک مٹانے کی خواہش اور کھانے کی طلب.....انسان کو جتنا بے سکون رکھتی ہے شاید کوئی اور شے نہیں۔

صبح کا بھوکا رات کو بھوکا نہیں سو سکتا اور ایک دن کا بھوکا دوسرے دن بھوک برداشت نہیں کر سکتا اور دو دن کا بھوکا تیسرے دن ہر طریقے سے اپنی بھوک مٹانے کی کوشش کرتا ہے اور کئی دن کا بھوکا چوری، ڈکیتی، قتل اور ہر جرم پر آمادہ ہو جاتا ہے جسے وہ بھوکا ہونے سے پہلے برا سمجھتا تھا۔ زندگی کیسا گورکھ دھندا ہے جو انسان کو الجھائے رکھتی ہے۔ بڑے بڑے نظریات، آدرش، اخلاقیات سب جسم کی بنیادی ضرورتوں کے سامنے ناکام ہو جاتے ہیں.....بھوک ایسی نقاہت اور کمزوری لاتی ہے کہ سارے جسم کو مفلوج کر کے رکھ دیتی ہے۔ دماغ سوچنا چھوڑ دیتا ہے.....دل کی حرکت سست پڑنے لگتی ہیں اور جسم نڈھال ہو جاتا ہے.....اس لئے پیٹ کو بھرا رہنا چاہیے.....اور اس کو بھرنے کے لئے انسان حلال وحرام کی حدود بھی پار کرنے کی کوشش کرتا ہے.....اسے اس کا نفس ہر وہ کام کرنے پر آمادہ کرتا ہے جس سے اس کی بھوک ختم ہو جائے.....دن شروع ہوتے ہی کھانے پینے کی چیزوں سے بازار سجنے شروع ہو جاتے ہیں.....پھلوں کی دکانیں.....سبزیوں کے ٹھیلے.....گوشت کے انبار، قطار در قطار چھوٹے ہوٹلوں میں لٹکتے مرغے.....بڑے ہوٹلوں میں نت نئے پکوان.....انسان کی بھوک کسی طرح کم نہیں کر سکتے۔ نجانے قدرت نے بھوک میں کیا راز رکھا ہے کہ انسان

اس راز کو پانے کے لئے دن سے لے کر رات تک جستجو کرتا ہے مگر اس کو کوئی سراغ نہیں ملتا...... وہ بس کھاتا ہے...... پیتا ہے...... اور سو جاتا ہے...... یوں لگتا ہے انسان کی زندگی کا مقصد صرف کھانا پینا ہے...... جوں جوں زمانہ ترقی کرتا جارہا ہے...... سب سے زیادہ توجہ اور زور کھانے پر دیا جارہا ہے مگر اس کے باوجود اس بھوک میں کمی نہیں آرہی...... جو قدرت نے انسان کے اندر ڈال دی ہے اور جو مرتے دم تک ختم نہیں ہوتی۔

اس بھوک کے پیچھے کیا راز ہے......؟

انسان شاید اس کی تہہ تک نہیں پہنچ پایا...... یا پھر اس کو پانے کی جستجو نہیں کرتا...... روز بروز اس کی بھوک بڑھتی جارہی ہے اور وہ اپنی جسمانی بھوک، نفسانی بھوک اور شہوانی بھوک کو ہر طریقے سے مٹانے کے ذریعے تلاش کرتا ہے...... وہ کسی اور بھوک کی طرف توجہ ہی نہیں دیتا...... وہ اپنی ہر قسم کی بھوک مٹانے میں حیوان بھی بن جاتا ہے...... درندوں اور چوپایوں جیسا بھی...... مگر اس بھوک کے بارے میں نہیں سوچتا...... جو قدرت اس سے چاہتی ہے۔ شاید اس بھوک کا تعلق آدم اور حوا کا جنت میں اس شجر ممنوعہ کا پھل کھانے سے ہے جو شیطان کے بہکاوے میں آکر انہوں نے کھایا دیکھنے میں خوشنما اور پر لذت مگر جس کے نتیجے میں پچھتاوے ان کا مقدر ہوئے...... انسان نے کبھی نہیں سوچا کہ قدرت کی نافرمانی کے لئے آدم وحوا کوئی اور کام بھی کر سکتے تھے...... انہوں نے کھانے کے عمل کو کیوں چنا...... یا قدرت نے انہیں اس شے کے کھانے سے کیوں آزمایا......؟

شاید اس لئے کہ اس کھانے کا انسان کے ضمیر میں گندھی ہوئی اس بھوک سے گہرا تعلق تھا جو اسے ہر برے کام پر آمادہ کر سکتی ہے...... جس پر قابو پانے سے انسان 'اشرف المخلوقات' کے زمرے میں آتا ہے اور جس کو کھلا چھوڑنے سے...... اور...... اس پر قابو نہ پانے سے وہ حیوان سے بھی بدتر بن جاتا ہے......

قدرت انسان کو اپنی ہر بھوک پر قابو پاتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہے کیونکہ مال وزر کی بھوک پر قابو پانے سے انسان کے اندر سے لالچ ختم ہوتا ہے...... دل کی خواہشات پر قابو پانے سے اس میں فیاضی آتی ہے...... شہوت کی بھوک پر قابو پانے سے اس میں پارسائی آتی ہے اور پیٹ کی بھوک پر قابو پانے سے اس میں نفس کشی آتی ہے......

مگر کوئی بھی اپنی بھوک پر قابو نہیں پانا چاہتا......

سب اپنی اپنی بھوک مٹانے کی فکر میں ہیں......

ہر جائز و ناجائز طریقے سے......!

حلال و حرام کما کر......!

بس بھوک مٹانی ہے......!

اور اس کے بعد......!

بھوک پھر بڑھتی جاتی ہے......!

ہر روز...... ہر شام...... ہر صبح...... ہر رات......!

شامو نے ایک کھوکھے سے چائے کا کپ اور دو رس لے کر اپنی بھوک مٹائی...... چائے پیتے ہوئے وہ مسلسل سوچ رہا تھا...... اس شخص کے

بارے میں جس نے زندگی میں پہلی بار اس کی مدد کی تھی...... ورنہ وہ تو انسانیت سے بددل ہو کر اعتبار کھو بیٹھا تھا...... ابھی تک اسے جتنے بھی انسانوں سے واسطہ پڑا تھا...... سب نے اسے مذاق اور طنز کا نشانہ بنایا تھا...... کسی نے اس سے دو بول ہمدردی کے نہیں بولے تھے اس نے بھی نہیں...... جس سے وہ محبت کرتا تھا...... وہ تو شہر ہی چھوڑ کر چلی گئی تھی...... اس نے آہ بھری اور چائے ختم کر کے خالی کپ کھوکھے والے کو پکڑا یا۔ اس نے کپ پکڑ کر ایک کونے میں رکھ دیا...... جس کا مطلب شامو واضح طور پر سمجھ گیا...... وہ خاموشی سے جمالے کی دکان پر آ گیا۔

''کیا نام ہے تیرا...... سن...... کوئی شبنم...... لیلیٰ...... ریمانہ بتا نا...... کوئی ڈھنگ کا نام بتانا'' جمالا ادھیڑ عمر کا قدرے سخت مزاج مگر صاف گو بندہ تھا۔

''شامو......'' وہ آہستہ سے بولا۔

''شامو...... ٹھیک ہے چلے گا......'' جمالا بڑبڑایا۔

''سن کٹنگ میں بڑا پیسہ ہے...... اگر تو مجھ سے لیڈیز کٹنگ سیکھ لے...... نا...... تو پھر دیکھنا کیسے وارے نیارے ہو جائیں گے...... میرا خیال ہے کٹنگ تو...... تو...... سیکھ ہی لے گا...... اتنا تو تیرا دماغ ہو گا ہی...... دماغ تو تم لوگوں کا پورا ہی ہوتا ہے...... سُر تال کو تو بہت سمجھتے ہو'' جمالا مسکرا کر بولا تو شامو بھی ہنسنے لگا۔

''ہے تو...... تو...... خوبصورت...... ادھر...... آ...... پہلے میں تیری کٹنگ کر کے تیرا مردانہ حلیہ بناؤں...... پھر کام شروع کرنا'' جمالے نے قدرے نرمی سے اسے کہا اور اسے اپنے آگے بٹھا کر اس کی کٹنگ کرنے لگا۔ کٹنگ سے اس کا حلیہ قدرے بدل گیا۔

''شکر ہے اب تو کچھ لڑکا لگ رہا ہے......'' جمالے نے اسے بڑے سے آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا تو شامو بھی مسکرانے لگا۔

''تو...... رہتا کہاں ہے......؟'' جمالے نے اچانک پوچھا۔

''میں نے ان کو چھوڑ دیا ہے'' شامو نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

''کیوں......؟'' جمالے نے حیرت سے پوچھا۔

''میں ناچ گانا نہیں کرنا چاہتا تھا'' شامو نے جواب دیا۔

''اچھا...... تو...... پھر اب کہاں رہے گا......؟'' جمالے نے پوچھا۔

''معلوم نہیں......'' شامو نے افسردگی سے جواب دیا۔

''دکان کے پیچھے ایک کمرہ ہے...... تو بھی وہیں رہ لینا...... تیری تنخواہ میں سے کرایہ کاٹ لوں گا'' جمالے نے کہا تو شامو خوش ہو گیا۔

''چل جا...... اب نہا دھو کر آ...... اور پھر کام شروع کر'' جمالے نے کہا تو شامو خوشی خوشی حمام میں گھس گیا۔

☆

نئے شہر کے ویرانے میں آ کر انہوں نے اپنی جھگی لگائی تھی...... گندے نالے کے پاس کھلے میدان میں صرف ان کی ہی جھگی تھی...... جب تک فقیروں کی کوئی بستی نہیں ملتی...... انہوں نے وہیں رہنے کا سوچا تھا...... چھوٹے شہر سے بڑے شہر کی طرف آتے ہوئے نجانے کتنے وسوسے، کتنے

اندیشے اور کتنا خوف تھا...... مگر...... اب وہ شہر ان کے لئے تنگ پڑ گیا تھا۔ وہ کئی سالوں سے وہاں رہ رہے تھے...... مگر اچانک سب کچھ چھوڑنا پڑا...... اگر وہ پیدا نہ ہوتا...... تو...... وہ اپنا شہر نہ چھوڑتے۔ سب اس کو ہی قصوروار ٹھہرا رہے تھے۔ ملکا رانی، بجو، مٹھو...... اور برکتے بھی...... نجانے قدرت کی کیا مصلحت تھی...... کہ دو دن میں ان کا دانہ پانی اس شہر سے اٹھ گیا تھا...... وہ شہر بدر ہو گئے تھے...... یا پھر اس نے ان کو کر دیا تھا...... سب کو نئے شہر، نئی جگہ اور نئے لوگوں سے کچھ خوف سا محسوس ہوتا تھا...... نجانے اس شہر کا مزاج کیا ہے؟ وہاں ان کی اپنی بستی تھی...... بستی کے لوگ ایک دوسرے کو جانتے تھے...... پہچانتے تھے۔ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے۔ آپس میں ایک دوسرے کی خوشیوں کو محسوس کرتے تھے...... انہیں مناتے تھے مگر یہاں ان کی جھگی بالکل تنہا تھی...... نہ کوئی پرسان حال تھا...... اس بچے کی پیدائش کے بعد تو ان کے ہاں ایسی خاموشی اور سراسیمگی چھا گئی تھی کہ ایک دوسرے سے بات کرتے ہوئے بھی انہیں کوئی جھجک اور خوف محسوس ہوتا تھا...... ادھر...... ادھر کی باتیں کرتے...... مگر...... اس بچے کا ذکر نہ کرتے۔

برکتے کو بس ایک ہی فکر لگی رہتی تھی۔ نجانے وہ کہاں ہے؟ زندہ بھی ہے یا مر گیا ہے...... ملکا اسے کہاں چھوڑ آیا ہے اور وہ اسے کچھ بتاتا بھی تو نہیں تھا۔ بجو نے بتایا تھا کہ ابا اسے کوڑے کے ڈھیر پر چھوڑ آیا تھا مگر برکتے کا دل نہیں مانتا تھا۔ ملکا اس کا باپ تھا اور باپ اتنا ظالم کبھی نہیں ہو سکتا، اس لئے اس نے بجو کی بات پر یقین نہیں کیا تھا۔

''چلو...... اٹھو...... اور سب دھندے پر جاؤ...... یہاں سوئے پڑے رہنے سے کوئی روٹی تمہارے منہ میں ڈالنے نہیں آئے گا'' ملکے نے صبح سویرے اپنی بیساکھیوں سے بچوں کو اٹھانا شروع کیا تو وہ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ گئے۔

''مگر ابا...... اس شہر کا تو ہمیں کچھ پتا ہی نہیں...... کہاں جائیں...... نہ رستوں کی خبر...... نہ بازاروں کا پتا'' رانی نے پریشانی سے کہا۔

''سب پتہ چل جائے گا...... ایک بار گھر سے نکلو گی تو راستوں کی خوب خبر رکھنا...... جن راستوں پر چل کر جاؤ گی...... انہی پر واپس آ جانا...... جگہ کی نشانیاں دیکھتے جانا'' ملکے نے اونچی آواز میں کہا۔

رانی کا دل نہیں چاہ رہا تھا مگر ابے کے کہنے پر وہ چل پڑی...... تھیلا کندھے پر لٹکائے وہ انجانے راستوں پر چلتی رہی...... اسے کچھ خبر نہ تھی کہاں جانا تھا اور کس راستے سے واپس آنا تھا۔ اس کے ذہن میں تو صرف وہ بچہ تھا اور شاموتھے...... اور وہ رات تھی...... ایسی رات اس کی زندگی میں کبھی نہیں آئی تھی...... وہ کتنی خوفناک اور بھیانک رات تھی جس نے آناً فاناً ان کی زندگیوں کو بدل دیا تھا...... زندگی کیسے بدلتی ہے......؟ کیسے انسان کو اٹھا کر ادھر سے ادھر پھینکتی ہے...... یہ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا...... قدرت کا ایک فیصلہ...... اس کا ایک 'امر کن' انسانوں کو کیسے کیسے قدم اٹھانے پر مجبور کر سکتا ہے...... اس بات پر اس نے پہلے کبھی نہیں سوچا تھا۔

نجانے کیوں اس بار برکتے بہت مطمئن تھی کہ بیٹا ہی ہوگا...... اس کا دل کہتا تھا کہ بیٹا ہوگا اور اس نے بچے کے کپڑے بھی لڑکوں والے مانگ تانگ کر اکٹھے کیے تھے...... بیٹے اس کے پاس پہلے بھی تھے مگر اس بار اسے کوئی انجانی سی خوشی محسوس ہوتی تھی۔ وہ بہت پرامید تھی اور اس ہونے والے بچے کو اپنے لئے خوش قسمت سمجھتی تھی۔ اسکا خیال تھا کہ اس کے ہونے کے بعد ان کے حالات بالکل بدل جائیں گے...... وہ اس کے بارے

میں بہت پرامید ہو کر رانی اور نوری سے باتیں کرتی...... وہ حیرت سے پوچھتیں کہ وہ کیوں اتنی پرامید ہے...... تو وہ ہنس کر جواب دیتی......

''جس دن مجھے اس کے ہونے کی خبر ملی تھی...... اس روز ملکے نے اپنی بیساکھیاں خریدی تھیں...... اور وہ میرے سامنے بیساکھیوں کے سہارے کھڑا ہو کر چلا تھا ورنہ زمین پر اپنے آپ کو گھسیٹ گھسیٹ کر کھینچتے ہوئے اس کی ٹانگیں اور رانیں بالکل چھل گئی تھیں'' ...... برکتے اس روز سے بہت پرامید ہو گئی تھی کہ نیا آنے والا بچہ ان کے لئے امید اور خوشیوں کا پیغام لے کر آئے گا...... مگر...... کیا ہوا تھا......؟

اس نے ان کی زندگیوں کو واقعی بدل دیا تھا...... مگر...... بہت مختلف انداز میں...... اس نے انہیں شہر بدر کر دیا تھا...... ان سے ان کی خوشیوں اور امیدوں کو چھین لیا تھا...... اس نے برکتے کو آنسوؤں کا سیلاب دے دیا تھا اور ملکے کو غم وغصہ...... اس واقعے نے رانی کے ذہن کو اتنا بدل دیا تھا...... کہ اسے زندگی اور انسانوں کے بارے میں ایک عجیب سی بے یقینی دے دی تھی...... انسان کی زندگی میں کچھ بھی ہو سکتا ہے...... اور...... وہ کچھ...... جس کے بارے میں انسان کبھی سوچتا بھی نہیں...... انہوں نے کبھی بھول کر بھی نہیں سوچا تھا کہ ان کے ہاں ایسا بچہ جنم لے گا...... اور یہ بھی کبھی نہیں سوچا تھا...... کہ وہ راتوں رات کسی دوسرے شہر چلے جائیں گے...... سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر۔

''کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے...... سب کچھ ممکن ہے۔ میں آج بھیک مانگ رہی ہوں...... کل کو میں کسی افسر کی بیگم صاحبہ بن کر گاڑی میں گھوم سکتی ہوں'' اس نے ایک بڑی صاف ستھری سڑک پر نئی سیاہ چمکیلی کار میں ایک عورت کو بیٹھے دیکھ کر سوچا اور خود ہی ہنسنے لگی......

''رانی...... تو...... اپنا...... منہ دھو کر رکھ...... منہ دھونے کو صابن نصیب نہیں ہوتا...... اور بیٹھنے لگی ہے گاڑی میں'' اس نے اس خیال کے آنے پر ہی اپنے آپ کو لعنت ملامت کی...... اور ایک سگنل پر رکی اس گاڑی کی مالکہ سے بھیک مانگی...... جس نے قدرے نخوت سے اس کی طرف دیکھا اور بن کچھ کہے گاڑی آگے بڑھا دی......

''دیکھ لیا...... بیگم صاحبہ تو بات کرنا پسند نہیں کرتی اور تو اس کی طرح گاڑی میں بیٹھنے کے خواب دیکھ رہی ہے'' اس نے دل میں سوچا اور چلچلاتی دھوپ میں ادھر ادھر ماری ماری پھرتی رہی...... شام ہونے کو تھی اور اسے راستے کا کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔ اس نے جو نشانیاں رکھی تھیں وہ کئی جگہوں پر ایک سی نظر آئیں...... اتنے فاصلے پر فلاں درخت ہے اور اس کی شاخیں نیچے کو لٹک رہی ہیں...... ٹی وی پر چلنے والے مختلف اشتہارات کے سائن بورڈز...... جو کئی جگہوں پر جا کر ایک جیسے لگے تھے۔ وہ ٹپٹا گئی...... وہ شکل کہاں گئی جو میں نے صبح دیکھی تھی اور اس کی نشانی رکھی تھی۔

''مجھے لگتا ہے...... میں راستہ بھول گئی ہوں......'' اس خیال سے ہی اس کا دل ڈوبنے لگا اور چہرے پر ٹھنڈے پسینے آنے لگے...... نیا شہر...... نئے لوگ...... نئی جگہ...... کسی کو کیا بتائے...... کیا سمجھائے...... کیا کہے...... اس نے پریشان ہو کر سوچا اور مختلف گلیوں اور بازاروں سے ہوتی ہوئی ایسے محلے میں داخل ہو گئی جہاں ڈھولک کی تھاپ، گھنگھروؤں کی جھنکار اور لش پش کرتے جوان اور درمیانی عمر کے مردوں کا رش سا لگا تھا...... وہاں آنے جانے والے مردوں کے چہروں پر عجیب سی مسکراہٹ اور آنکھوں میں سرشاری سی تھی۔ خوشبوؤں میں رچے بسے ان کے لباس اور پوشاکیں...... کسی اور ہی بات کا پتہ دے رہی تھیں۔

''اے...... تو...... ادھر کیا کرنے آ گئی ہے...... اپنے کپڑے تو دیکھ...... تیرا یہاں کیا کام؟'' ایک عورت نما مرد نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا

جس کی وہاں پھولوں اور گجروں کی چھوٹی سی دکان تھی۔

''میں راستہ بھول گئی ہوں'' رانی نے بمشکل جواب دیا۔

''یہاں سے جانے کے بعد پھر بھول جانا کہ کہاں سے ہو کر گئی ہو......سنا تو نے......'' اس نے قدرے خفگی سے کہا۔

''کیوں......؟'' رانی نے نادانستہ پوچھا۔

''یہاں بڑے بڑے لوگ آتے ہیں......تجھ جیسے بھوکے ننگے نہیں'' مرد نے جواب دیا۔

''پھر بڑے لوگ یہاں فقیروں کو بھیک بھی زیادہ دیتے ہوں گے'' رانی نے تجسس سے پوچھا۔

''نہیں جی......وہ بھیک کسی کو نہیں دیتے......ہاں......روپیہ خوب لٹاتے ہیں'' مرد نے بتایا۔

''کس پر......؟'' رانی نے حیرت سے پوچھا۔

''خوبصورت پریوں پر......''

''کیا یہاں پریاں رہتی ہیں......؟'' رانی نے حیرت سے چونکتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں......انسان پریاں......''

''کیا......میں انہیں دیکھ سکتی ہوں؟'' رانی نے پوچھا۔

''چل ہٹ......تو......کون ہوتی ہے انہیں دیکھنے والی......ان کو دیکھنے کے پیسے لگتے ہیں اور تو مجھ سے کیوں ساری باتیں پوچھ رہی ہے......چل پیچھے ہٹ......ہٹ یہاں سے......نگار بیگم آ رہی ہے'' اس نے اسے راستے سے پیچھے ہٹایا......رانی دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ ایک خوبصورت فیشن ایبل جواں سال لڑکی کالی چادر میں لپٹی چھن چھن کرتی اس کے پاس سے گزری۔ اس کے گورے چٹے پاؤں پر مہندی سے نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ اس کے سفید خوبصورت ہاتھوں کی انگلیوں میں مختلف نگینوں اور سونے کی جڑاؤ انگوٹھیاں بہت بھلی لگ رہی تھیں۔

''واقعی یہ پری ہی ہے......'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

نگار بیگم کے ساتھ کئی لش پش کرتی لڑکیاں اور مرد تھے۔ وہ گلی میں سے ہوتی ہوئی سڑک کے کنارے ایک بڑی سی سفید کار میں بیٹھ کر چلی گئی۔

''یہ کون تھی......؟ کوئی پری لگتی ہے......؟'' رانی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......یہاں کی سب سے خوبصورت پری ہے......تم نہیں جانتی اس پر لوگ کس طرح نوٹ پھینکتے ہیں......فرش نوٹوں سے بھر جاتا ہے اور یہ اس پر چلتی ہے'' اس آدمی نے بتایا۔

''اتنے سارے نوٹ......اور یہ ان پر چلتی ہے'' رانی نے قدرے چیخ مار کر پوچھا۔

''ہاں......اور نہیں تو کیا......؟'' دکاندار نے ایک موتیے کا گجرا پروتے ہوئے کہا۔

''کیا یہ اصلی نوٹوں پر چلتی ہے؟'' رانی نے حیرت سے پوچھا۔

''اری...... تو کس دنیا میں رہتی ہے...... بالکل اصلی نوٹ ہوتے ہیں...... اور وہ بھی پانچ سو...... اور ہزار ہزار کے......'' دکاندار نے مزے لے لے کر بتایا۔

''واقعی...... ہمیں تو بھیک میں بھی کبھی سو روپیہ نہیں ملا...... یہ دیکھ...... سارے دن کی بھیک......'' اس نے اپنی جیب میں سے چند روپے اور چند سکے نکال کر اسے دکھائے...... دکاندار نے دیکھ کر تاسف کا اظہار کیا۔

''بس اپنے اپنے نصیب کی بات ہے...... یہاں پر کئی آتیں اور کئی جاتی ہیں مگر ہر ایک کی قسمت نگار بیگم جیسی نہیں اس پر تو دھن دولت یوں برس رہی ہے...... جیسے ساون کا مینہ سوکھی زمین پر برستا ہے...... اور اسے دیکھتے ہی دیکھتے جل تھل کر دیتا ہے۔ نگار بیگم مٹی میں بھی ہاتھ ڈالتی ہے تو وہ سونا بن جاتی ہے...... اور جس مرد کو بھی دیکھتی ہے...... وہی اس پر لٹو ہو جاتا ہے...... فلموں والے اس کے آگے پیچھے پھرتے ہیں مگر یہ کسی کو پکڑائی نہیں دیتی...... بڑے نخرے والی عورت ہے...... کسی سے خواہ مخواہ بات نہیں کرتی'' دکاندار نے کہا۔

''کیا تم سے کبھی اس نے بات کی......؟'' رانی نے پوچھا۔

''ہاں...... کبھی...... کبھار...... جب سپیشل گجرے بنوانے ہوں تو کوٹھے پر بلاتی ہے اور کہتی ہے...... اچھو...... بڑھیا گجرے بنانا...... آج بڑھیا مہمان آنے والے ہیں...... پھر میں بہت بڑھیا گجرے بنا کر دیتا ہوں......'' دکاندار نے اسے بتایا۔

''کیا تیرا نام اچھو ہے......؟'' رانی نے پوچھا۔

''ہاں...... اچھو پھول والا...... میرے پھولوں کے گجرے اور ہار بڑے مشہور ہیں......'' اچھو نے اپنی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

''نگار بیگم نے کس سے شادی کی ہے......؟ لگتا ہے امیر بندہ ہوگا...... جس کی بڑی سی گاڑی میں وہ ابھی بیٹھ کر گئی ہے'' رانی نے حیرت سے پوچھا۔

''شادی والے قصے کو نہ ہی چھیڑو تو بہتر ہے...... اور...... ایسی گاڑیاں تو ہر روز اسے لینے آتی ہیں...... مت پوچھو...... نگار بیگم کیا عورت ہے؟'' اچھو نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''کیسی عورت ہے......؟'' رانی نے پوچھا۔

''اٹھ...... اور...... گھر جا...... شام بہت ہو رہی ہے...... تیرا یہاں زیادہ دیر ٹھہرنا ٹھیک نہیں......'' اچھو نے کہا۔

''مگر...... میں...... تو راستہ بھول گئی ہوں......'' وہ پریشانی سے بولی۔

''جگہ بتا...... میں تجھے راستہ سمجھاتا ہوں'' اچھو نے کہا۔

''معلوم نہیں...... کیا بتاؤں...... بس...... ہماری جھگی کے پاس بڑا سا نالہ ہے......'' رانی نے بتایا تو اچھو سوچ میں پڑ گیا۔

''اس نالے سے پہلے ایک سکول بھی ہے نا......'' اچھو نے پوچھا۔

''ہاں...... ہاں...... وہی......'' رانی نے خوش ہو کر بتایا۔

''ادھر آ...... میں تجھے راستہ بتاتا ہوں......'' اچھو اسے گلی کی نکڑ پر لے گیا اور اسے راستہ سمجھانے لگا۔ رانی خوش ہو کر وہاں سے چلی گئی۔

سارا راستہ اس کے ذہن میں نگار بیگم اس کی بڑی سی گاڑی...... اور اس کے مہندی بھرے پاؤں تھے...... ''نگار بیگم پری ہے......؟ کیا عورت ہے؟ بڑے نصیب والی ہے...... ایسا نصیب کسی کسی کا ہوتا ہے...... وہ نوٹوں پر چلتی ہے، فرش ہزار اور پانچ سو کے نوٹوں سے بھرا ہوتا ہے تو وہ چلتی ہے'' رانی کا دماغ سوچ سوچ کر تھک گیا تھا۔

''وہ کیسے اتنے زیادہ نوٹوں پر چلتی ہوگی...... اس نے تو جب سے آنکھ کھولی تھی...... ایک ایک سکہ بھیک مانگ کر اپنے کشکول میں ڈالے تھے...... وہ تو ایسی بدقسمت تھی جسے نہ کبھی بھیک ڈھنگ کی ملی تھی...... نہ تن ڈھانپنے کے لئے اچھا کپڑا نصیب ہوا تھا اور نہ ہی پیٹ بھر کر روٹی...... کھانا کھا کر بھی بھوک اپنی جگہ باقی رہتی...... وہ بے بسی سے سوچتی چلی جارہی تھی...... اور اچھو کے بتائے ہوئے راستے سے ہوتی ہوئی بالآخر اپنی جھگی پہنچ گئی......

(۴)

انسانی جسم میں آنکھ انتہائی اہم اور پیچیدہ عضو ہے، جس کا تعلق بصیرت سے ہے۔ سامنے دیکھیں تو آنکھ کے اوپر سب سے نمایاں چیز Eye Brows ہیں جو آنکھ کو ایک خوبصورتی دیتے ہیں۔ اس کے بعد آنکھ کی پلکیں ہوتی ہیں جو خوبصورتی کے ساتھ آنکھ کی حفاظت کرتی ہیں، اور ڈسٹ (گرد) وغیرہ کو آنکھ میں جانے سے روکتی ہیں۔

پھر Eye lids پپوٹے ہوتے ہیں، آنکھ میں لیکریمل گلینڈز ہوتے ہیں جو میوکس اور واٹر چھوڑتے ہیں۔ آئی لڈاس کو صاف کرتے ہیں اور ڈسٹ پارٹیکلز کو بھی آنکھ سے صاف کر دیتے ہیں۔

آنکھ کے دو حصے بہت نمایاں ہوتے ہیں ایک سفید اور دوسرا براؤن حصہ۔ یہ حصہ آئرس کہلاتا ہے جو کہ Muscular Tissues سے بنا ہوتا ہے۔ اس کا کلرفل ہونا ایک تو آنکھ کو خوبصورتی دیتا ہے، دوسرا اس کا کام آ کاموڈیشن آف لائٹ ہے یعنی آنکھ میں مناسب روشنی داخل کرنا اس کے درمیان میں ایک Pore ہوتا ہے جسے آنکھ کی پتلی بھی کہتے ہیں۔ اس سوراخ کے راستے روشنی آنکھ میں داخل ہوتی ہے۔ تیز روشنی میں آنکھیں چندھیا جاتی ہیں اور Pupil کے سکڑنے سے کم روشنی اندر جاتی ہے، جبکہ اندھیرے میں وہ پھیل جاتی ہے اور ایک خاص مقدار روشنی کی اندر جاتی ہے۔

سکلیرا: اس کی وجہ سے آنکھ کی وائٹ کوٹ شیپ برقرار رہتی ہے۔

کورائیڈ: یہ ایک لیئر ہے اس میں بلڈ ویسلز ہوتی ہیں جو آنکھ کو خوراک مہیا کرتی ہیں۔

Cilliry Body: یہ آئرس کی کنٹریکشن کو کنٹرول کرتی ہیں اور آنکھ کے اندر آنکھ کا پانی مہیا کرتے ہیں۔ یہ پانی آنکھ کو نیوٹریشن مہیا کرتا ہے۔ لینز لائٹ کو ریٹینا پر فوکس کرتا ہے۔ یہ محدب عدسے کی ایک قسم ہے اور ویسا ہی کام سرانجام دیتا ہے۔

Vitrous انڈے کی سفیدی جیسا ہوتا ہے۔ آنکھ کی Shape برقرار رکھتا ہے۔ جیلی کی ساخت جیسا ہوتا ہے۔

Retina: میں لائٹ پاس ہو کر اس پر ایک الٹا امیج بناتی ہے۔ Visual Pathway ہے، اس پر بننے والے الٹے عکس کو لیکر آپٹک نرو کے ذریعے Oxipital Lobe میں لے جاتا ہے۔ اور وہاں آنکھ کا سیدھا امیج بنتا ہے۔ دماغ کے جس حصے میں امیج بنتا ہے جو اسے بنانے میں اہم کام کرتا ہے اسے Area 17 کہتے ہیں۔ اگر آپٹک نرو کسی طرح سے Damage ہو جائے تو وہ روشنی کو دماغ تک نہیں پہنچا سکتی اور آنکھ بظاہر ٹھیک ہونے کے باوجود دیکھ نہیں سکتی۔

ایک اندازے کے مطابق ایک چوتھائی دماغ کا حصہ ویژن بنانے کے عمل میں مدد کرتا ہے۔

کائنات میں ہر جانب بکھرے عجائبات، خوبصورت مناظر اور ہر سو پھیلی روشنیوں اور تجلیات کو آنکھ کی پتلی ...... میں ...... سمو کر۔ قدرت انسان کو ایسی بصارت عطا کرتی ہے ...... جس کے ذریعے کائنات کی ہر ہر شے کو دیکھتے ہوئے وہ اپنے اندر ایسی روحانی بصیرت تشکیل دیتا ہے ......

جس کا تعلق اس حقیقی اور ازلی نور سے جوڑتا ہے...... یہ نور؛ کہاں سے آتا ہے اور اس سے بصارت اور بصیرت کیسے پیدا ہوتی ہے۔ انسان ابھی تک اس راز سے ناآشنا ہے۔

☆

باہر شدید دھند اور سردی تھی۔ صبح سویرے اکا دکا لوگ سڑک پر دکھائی دے رہے تھے۔ شیرے نے ابھی چولہا جلایا ہی تھی کہ سائیں مٹھا، پاؤں میں ٹوٹی جوتی، سبز چوغا پہنے، گلے میں رنگ برنگی منکوں کی کئی مالا، ہاتھوں میں کئی رنگوں کے چھوٹے بڑے نگینوں کی انگوٹھیاں، کلائیوں میں چوڑیاں نما چھن چھن کرتے کنگن گرد سے اٹے بالوں کی لٹیں ادھر ادھر بکھیرے، گلے میں کشکول لٹکائے، ایک ہاتھ میں اک تارہ بجاتا ہوا شیرے کے کھوکھے میں داخل ہوا۔ شیرے نے حیرت سے سائیں کی طرف دیکھا۔

''سائیں جی...... آج بہت ٹھنڈ ہے...... آج تو بند جوتا پہن لیتے۔'' شیرے نے فکر مندی سے کہا اور چولہا جلانے کی کوشش کرنے لگا۔ کئی بار کی کوشش کے باوجود چولہا نہیں جل رہا تھا۔ سائیں مسکرایا اور اس کے قریب بیٹھ کر خاموشی سے اک تارہ بجانے لگا۔

''آج تو ٹھنڈ ہے آگ بھی نہیں جل رہی۔'' شیرا بڑبڑایا۔

''اوئے اندر سے انگیٹھی میں کوئلے ڈال کر لا...... وہی جلاؤں۔ سردی نے مت ماردی ہے۔'' شیرا بڑبڑایا اور ایک لڑکا انگیٹھی لے آیا۔ شیرا آگ جلانے لگا، دھوئیں سے اس کی آنکھیں سرخ ہونے لگیں اور ان سے پانی بہنے لگا۔ سائیں نے مسکرا کر اسے دیکھا اور کلام پڑھنے لگا۔

اکھیاں نوں میں پئی سمجھاواں	نہ رو ڈھایں، ڈھایں ہو
دل نوں صبر قرار نہ آوے	سمجھن دونویں ناہیں ہو
اندر بالن، اندرے دھواں	اندرے بھڑکن بھایں ہو
طالب ہاں دیدار دا باہو	اپنا آپ دکھائیں ہو

شیرے نے چونک کر سائیں کی طرف دیکھا تو وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔

''اللہ والوں کی باتیں اللہ ہی جانے''۔ شیرے نے لمبی سانس کھینچ کر کہا۔

ماسٹر باسط علی تیز تیز چلتے ہوئے کھوکھے تک آ گئے۔ اچانک سامنے سائیں کو دیکھ کر ٹھٹکے۔ تو سائیں نے بھی بھرپور نگاہوں سے ان کی جانب دیکھا اور وہ نظریں جھکا کر اندر چلے گئے۔ ''ہا۔ہا...... حق اللہ......'' سائیں نے نعرہ لگایا اور اپنا اک تارہ ایک جانب رکھ کر شیرے کی جانب دیکھنے لگا۔

''اچھا۔ بھائی...... چلتا ہوں......'' سائیں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''سائیں جی...... کہاں جا رہے ہو......؟ چائے تو پیتے جاؤ۔ چائے تیار ہے۔ آج بہت سردی ہے۔ دو گھونٹ پینے سے جسم گرم ہو جائے گا۔'' شیرے نے محبت سے کہا اور ایک کپ میں چائے ڈالنے لگا۔

''جسم گرم کر کے بھلا میں کیا کروں گا...... تھوڑی دیر گرم پھر مٹی ٹھنڈی ٹھار۔ بھلا مٹی بھی گرم ہوتی ہے...... جتنا مرضی آگ میں رکھو...... ڈھیری پھر ٹھنڈی کی ٹھنڈی ہوگی۔ سائیں نے کہا اور اپنا کشکول اور اک تارہ اٹھا کر نکل گیا۔ ٹوٹی جوتی میں سے آدھے پاؤں باہر آ رہے تھے۔ ایڑیاں سردی اور بہت چلنے کی وجہ سے پھٹ چکی تھیں اور پھٹی ہوئی جلد سے خون رس رس کر خشک ہو چکا تھا۔ اس نے سبز لمبے چوغے پر جا بجا پیوند لگا رکھے تھے، مگر کوئی سویٹر یا گرم کپڑا نہیں پہن رکھا تھا۔ لمبے کھچڑی بالوں کی لٹیں ادھر اُدھر بکھری تھیں مگر سر پر کچھ نہ تھا...... اسے دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ اسے واقعی ہی سردی نہیں لگتی تھی۔

سائیں نے باہر جاتے ہوئے پھر ماسٹر باسط علی کی جانب بغور دیکھا۔

نہ خدا مسیتے لبدا	نہ خدا وچ کعبے
نہ خدا قرآن، کتاباں	نہ خدا نمازے
نہ خدا میں تیرتھ ڈٹھا	ایویں پینڈے جاگے

ماسٹر باسط علی نے مضطرب ہو کر پہلو بدلا اور سائیں سے نظریں چرانے لگے۔ سائیں نے معنی خیز انداز میں بھرپور قہقہہ لگایا اور قہقہہ لگاتا ہوا کھوکھے سے باہر نکل گیا۔ سب حیرانگی سے اسے جاتے ہوئے دیکھنے لگے۔

''سائیں بھی کمال بندہ ہے...... آج تک میرے کھوکھے سے چائے کا گھونٹ نہیں پیا...... مگر ہر روز چکر ضرور لگائے گا...... بڑا ہی اللہ لوک ہے۔'' شیرے نے مسکرا کر اپنے آپ سے کہا۔

''اوئے جمالے...... الماری میں سے کپ پلیٹ لا...... ماسٹر صاحب کو چائے دینی ہے۔'' شیرے نے اونچی آواز سے کہا اور جمالا جلدی سے الماری میں سے ایک اسپیشل پھولوں والی کپ پلیٹ لے آیا اور اپنے کندھے پر رکھے کپڑے سے اس کو صاف کر کے شیرے کے آگے رکھا۔ شیرے نے اس میں اسپیشل بنائی ہوئی چائے ڈالی اور چھوٹے سے ٹرے میں کپ پلیٹ رکھ کر ماسٹر صاحب کو چائے بھیجی۔ ماسٹر صاحب نے مسکرا کر جمالے کی جانب دیکھا اور آہستہ آہستہ چائے پینے لگے۔

ماسٹر صاحب نے سفید موٹے سوٹ کے اوپر بلیک موٹی جیکٹ اور سر پر گرم ٹوپی پہن رکھی تھی، وہ انتہائی بارعب اور جاذب نظر شخصیت لگ رہے تھے۔ ان کی عمر پچاس سال سے زیادہ تھی مگر ان کی اچھی صحت اور سرخ و سفید رنگت نے ان کی اصل عمر کو کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ ماسٹر صاحب کون تھے اور کہاں سے آئے تھے......؟ کوئی نہیں جانتا تھا...... مگر عرصہ دراز سے اس چھوٹے سے پہاڑی علاقے میں مقیم تھے۔ گاؤں کے لوگ ان کی بے حد عزت کرتے تھے اور ان سے والہانہ عقیدت بھی رکھتے تھے۔ کھوکھے میں ماسٹر صاحب تنہا بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ کیونکہ ابھی دن کا آغاز ہوا تھا اور باہر سردی بھی بہت تھی۔ پھر رفتہ رفتہ لوگ آنا شروع ہو گئے۔

ماسٹر صاحب چائے پیتے ہوئے مسلسل اس دیوار کی جانب دیکھ رہے تھے جہاں ایک چھوٹے سے کیلنڈر پر ایک حدیث قدسی لکھی تھی:

''اے ابن آدم...... ایک تیری چاہت ہے اور ایک میری چاہت ہے، ہوگا تو وہی جو میری چاہت ہے، پس اگر تو نے سپرد کر دیا اپنے کو،

اس کے، جو میری چاہت ہے تو وہ بھی میں تجھے دے دوں گا جو تیری چاہت ہے۔ اگر تو نے مخالفت کی اس کی، جو میری چاہت ہے تو میں تھکا دوں گا اس میں جو تیری چاہت ہے اور پھر ہوگا تو وہی جو میری چاہت ہے۔''

ہر لفظ پڑھتے ہوئے ماسٹر صاحب کے دل میں آہیں بلند ہو رہی تھیں۔ ہر روز ان کا یہی معمول تھا۔ وہ ہمیشہ چائے اس مخصوص کرسی میز پر بیٹھ کر پیتے تھے، جہاں سے یہ حدیث واضح طور پر پڑھی جاسکتی تھی اور ہر بار پڑھتے ہوئے ان کے ذہن میں نجانے کیا کیا خیالات آتے تھے۔

''السلام علیکم۔'' ماسٹر صاحب۔'' گاؤں کے دو تین نوجوان کھوکھے میں داخل ہوئے اور چائے کا آرڈر دے کر اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ ایک نوجوان قدرے اونچی آواز میں ہر خبر پڑھ کر سنانے لگتا تو دوسرے اپنی اخبار چھوڑ کر اس کو سننے میں مصروف ہو جاتے۔

''یار...... یہ خبر سنو...... چار بچوں کی ماں اپنے آشنا کے ساتھ فرار......، اور......'' ایک نوجوان پڑھتے ہوئے ایک دم رک گیا۔

''اور...... کیا......؟ دوسرے دونوں نے انتہائی تجسس سے پوچھا۔

''اور......'' وہ آہستہ آہستہ اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔

اور...... یہ کہ...... موصوفہ کی پہلے شوہر سے بھی محبت کی شادی ہوئی تھی۔ اس نوجوان نے اخبار ایک جانب رکھتے ہوئے کہا ماسٹر صاحب بغور ان کی باتیں سن رہے تھے۔ ایک دم چائے کا کپ ان کے ہاتھ سے چھلکا اور انہوں نے کپ وہیں میز پر رکھ دیا۔

''یار...... یہ کیسی محبت ہے...... جو بار بار ہو جاتی ہے اور ہر بار اتنی طوفانی کہ پہلی محبت کی کوئی قدر نہیں رہتی...... ہوسکتا ہے کوئی تیسرا ملنے پر دوسرے کی محبت سے دل بھر جائے۔'' دوسرے نوجوان نے کہا۔

''یار...... محبت ہی ہے نا...... کرنے دو...... جتنی بار کوئی کرنا چاہے...... کرے...... دوسروں کو کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہئے۔ تیسرے نے ہنستے ہوئے کہا۔

ماسٹر صاحب نے چائے کے پیسے پلیٹ کے نیچے رکھے اور خاموشی سے کھوکھے میں سے باہر نکل آئے۔

ماسٹر باسط علی کا دم گھٹنے لگا۔ انہیں یوں محسوس ہونے لگا جیسے اچانک انہیں کسی تاریک کمرے میں بند کر دیا گیا ہو۔ جہاں نہ کوئی روشنی کی کرن پہنچ رہی ہو اور نہ سانس لینے کو ذرا سی ہوا ہو...... ماسٹر صاحب کھوکھے سے باہر نکل آئے۔ باہر موسم خاصا ٹھنڈا ہو رہا تھا مگر ماسٹر صاحب کا پورا بدن بری طرح جل رہا تھا۔ انہیں اس شدید سردی میں پسینہ آنے لگا تھا وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے سڑک پر چلے جا رہے تھے۔ اونچی نیچی...... غیر ہموار سڑک ایک ویران راستے کی جانب جانکلی۔ اس ویران راستے کی جانب بہت کم لوگ جاتے تھے مگر اس ویرانے کی طرف ماسٹر باسط علی کا مسکن تھا۔

سورج آہستہ آہستہ بادلوں کی اوٹ سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کوشش میں وہ جیسے ہی زمین کو اپنا جلوہ دکھاتا، زمین اس کی جھلک کا پرتپاک استقبال کرتی اور اس کے جلوے سے اس کا وجود دمکنے لگتا...... زمین جیسے ہی خوش ہوتی، سورج غائب ہو جاتا اور زمین پھر سرد آہیں بھر کر افسردہ ہونے لگتی اور اس پر ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگتیں۔ موسم بے حد خوبصورت ہو رہا تھا...... اردگرد خوبصورت چیڑ، صنوبر اور سنبل کے درخت اپنی خوبصورتیوں کے جلوے دکھا رہے تھے۔ زمین اور آسمان کا ہر منظر خوبصورت اور دلفریب تھا، مگر ماسٹر باسط علی کے دل میں ایسی آگ لگی تھی کہ انہیں کوئی

شے اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ ان کی آنکھوں کے گوشے تر ہو رہے تھے۔ حلق سوکھ رہا تھا، چہرہ پسینے سے تر تھا، دل اس قدر اداس اور پریشان تھا کہ بس شدت غم سے پھٹنے کو بے تاب تھا۔ وہ جلد از جلد اپنی کٹیا میں پہنچنا چاہتے تھے۔ ہر شے اور شخص سے بے خبر وہ اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھے۔

''تیرے نفس میں اتنا ملال کیوں ہے؟ اچانک پاس سے گزرنے والے فقیر سائیں مٹھا نے کہا تو ماسٹر باسط نے چونک کر اسے دیکھا تو سائیں مٹھا مسکراتا ہوا اور اسے گھورتا ہوا اس کے پاس سے گزر گیا۔ ماسٹر باسط علی کے دل میں پھر عجیب سی کیفیت پیدا ہونے لگی۔

سائیں مٹھا ہر بار اس کے دل کی چوری پکڑ لیتا تھا اور وہ نظروں ہی نظروں میں ماسٹر باسط علی سے اس کی ہمت اور جرأت بھی چھین لیتا تھا کہ وہ اس سے کوئی بات ہی پوچھ سکے۔ ماسٹر باسط علی کے دل میں اس لمحے واقعی بہت غم، دکھ اور ملال تھا۔ اور یہ صرف وہی جانتا تھا یا پھر اس کا خدا...... مگر سائیں مٹھا کیسے جان گیا۔ وہ بھی ایک نظر میں ماسٹر باسط علی کھڑا ہو کر اس راستے کی جانب دیکھنے لگا جس پر اب دور دور تک سائیں مٹھے کا کوئی پتا نہ تھا۔ گویا وہ بجلی کی سرعت سے اس کے پاس سے گزر گیا تھا۔

''سائیں...... ہر بار ہی...... میری ہر بات جان لیتا ہے...... اور مجھے بات کرنے کا موقع بھی نہیں دیتا۔ نجانے یہ شخص مجھ سے کیا چاہتا ہے اور ہر بار جب میں شدید اذیت میں ہوتا ہوں...... یہ اچانک میرے سامنے آجاتا ہے۔'' ماسٹر باسط علی چند لمحے پہلے والی قلبی اذیت بھلا کر سائیں مٹھے کے بارے میں سوچنے لگا۔

وہ اسی بیاسی سالہ مجذوب تھا۔ ہر وقت رنگ برنگی بڑے بڑے موتیوں والی مالا۔ اپنے گلے میں پہنے رکھتا تھا۔

سبز لمبے چوغے کے اوپر گرمی میں کبھی اکٹھے دو تین سویٹر پہن لیتا اور کبھی انتہائی شدید سردی میں صرف خالی چوغہ پہنتا...... اس کے ہاتھ میں کبھی کشکول ہوتا اور کبھی اکتارہ اس کے ہاتھوں کی ساری انگلیاں مختلف پتھروں کی انگوٹھیوں سے پر ہوتیں...... اس کے کھچڑی بالوں کی لٹیں مٹی سے اٹ کر اپنی اصلی رنگت ہی کھو بیٹھی تھیں۔ وہ شاذ و نادر ہی نہاتا تھا۔ پاؤں میں مختلف قسم کی چھن چھن کرتیں جھانجھریں پہنتا اور ہاتھ میں کڑے موٹے سے ڈنڈے کے ساتھ رنگ برنگی کترنیں بندھی ہوتیں، جنہیں لوگ زبردستی اس کے ڈنڈے کے ساتھ اپنی مرادیں پوری ہونے کے لئے باندھ دیتے۔

وہ لوگوں کو گالیاں بکتا، مگر لوگ زبردستی کترنیں باندھنے لگتے تو وہ ڈنڈا غصے میں ان کے آگے پھینک دیتا۔ لوگ خوش ہو جاتے۔

''کچھ نہیں ہوتا...... چاہے کپڑے کے تھان اس کے ساتھ باندھ دو......'' مگر لوگ اپنے اعتقاد میں بہت پختہ تھے۔ وہ کترنیں باندھ کر یوں مطمئن ہو جاتے جیسے اب ان کی مرادیں ہر صورت میں پوری ہو کر رہیں گی اور اکثر لوگ یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے کہ سائیں کے ڈنڈے کے ساتھ کترنیں باندھنے سے ان کی مرادیں پوری ہو گئیں...... سائیں بہت کم کسی سے بات کرتا تھا۔ بہت کم ہنستا تھا...... بہت کم روتا تھا۔ زیادہ تر خاموش رہتا تھا...... زیادہ تر صوفیانہ کلام پڑھتا رہتا تھا۔ لوگ اسے بلانے کی کوشش کرتے مگر وہ بہت کم جواب دیتا...... مگر ماسٹر باسط علی سے وہ خود بات کرتا تھا۔ ماسٹر باسط علی چونک کر اسے دیکھتا ہی رہ جاتا...... اور جب وہ سائیں سے بات کرنے کی کوشش کرتا تو سائیں منہ پھیر کر آگے نکل جاتا...... دونوں میں کئی سالوں سے یہ معمول جاری تھا۔

ماسٹر باسط علی نے لمبی آہ بھری اور اپنی کٹیا میں چلے گئے۔ جس میں ان کے علاوہ کبھی کوئی دوسرا نہیں رہتا تھا۔ ہر طرف گہری خاموشی تھی،

سورج بادلوں کو ہرا کر اب فاتحانہ انداز میں پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ اس کی روشنی اور حدت سے سارا ماحول گرم اور روشن ہو رہا تھا۔ ماسٹر باسط علی نے اپنی گرم ٹوپی اتاری اور ایک چارپائی پر لیٹ گیا جس پر صاف ستھرا بستر بچھا تھا۔

''چار بچوں کی ماں...... اپنے آشنا کے ساتھ فرار......'' ماسٹر باسط علی نے کروٹ بدلی، دل اک انجانے بوجھ تلے دبنے لگا۔ یہ کیسی محبت ہے...... ہر بار اتنی طوفانی...... کہ پہلی محبت پر غالب آ گئی...... محبت ہی ہے نا...... کرنے دو......'' ملے جلے جملے ماسٹر باسط علی کے دل میں ایک طوفان برپا کرنے لگے۔ وہ بھی چھوڑ کر چلی گئی...... سب کچھ...... مجھے...... اور میری محبت کو...... اس نے بھی سب کچھ بھلا دیا...... ان سب لوگوں کو...... ان تکلیفوں کو...... ان آزمائشوں اور اذیتوں کو...... جو میں نے اسے پانے کے لئے اور اس نے مجھے پانے کے لئے برداشت کی تھیں...... ماسٹر باسط علی چارپائی پر لیٹ گیا اور اس کے سامنے ماضی کا ایک ایک لمحہ ایک فلم کی مانند چلنے لگا۔ وہ سب باتیں...... وہ سب لمحے اور وہ سب یادیں جو دل کے اندر کسی گہرے راز کی مانند پوشیدہ تھے اب ان میں ان کا ذہن اور شعور شریک ہو رہا تھا۔ وہ نازی سے جنون کی حد تک محبت کرتا تھا۔ انتہائی شدید محبت، طوفانی محبت...... جس کی خاطر وہ سب کچھ برداشت کرنے کو تیار تھا۔ نازنین بھی اس سے بہت محبت کرتی تھی...... دونوں ایک ہی حویلی میں پل بڑھ کر جوان ہوئے تھے۔ باسط علی حویلی میں کام کرنے والے مزارعے قادر علی کا بیٹا تھا، چار بہنوں کا اکلوتا، خوبصورت، بجیل نوجوان اس کے ماں باپ زمیندار حشمت خان کی زمینوں پر کام کرتے تھے اور بہنیں حویلی کے اندر کل وقتی ملازمائیں تھیں۔ باسط علی کو پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا، اس لئے قادر علی نے اسے اپنے ایک دوست کے پاس شہر کے ایک مدرسے میں بھیج دیا، جہاں وہ لکھنے پڑھنے لگا۔ کئی کئی ماہ بعد گھر آتا تو ماں اور بہنیں اس کے لاڈ اٹھاتی نہ تھکتی تھیں، اسے کوئی قدم زمین پر نہ رکھنے دیتیں۔ ماں دیسی گھی کے پراٹھے۔ حلوے اور مختلف پکوان پکا پکا کر اسے کھلاتی اور باپ کی محبت کا اپنا انداز تھا وہ اپنے کاموں سے فارغ ہو کر اسے اپنے گھوڑے پر بیٹھا کر خوب سیر کرواتا، مختلف کھیل تماشے اور میلے دکھانے اسے لے جاتا۔ باسط علی آٹھ، دس دن کے لئے گاؤں آتا اور وہ آٹھ دس دن کیسے گزر جاتے اسے خبر ہی نہ ہوتی۔ واپس شہر جاتے ہوئے وہ خوب آنسوؤں سے روتا تو ماں، بہنوں کا دل بری طرح کٹتا...... اس کی ماں بلقیس کئی بار قادر علی سے کہتی کہ وہ اسے شہر نہ جانے دے وہ اس کی جدائی برداشت نہیں کر سکتی، مگر قادر علی کو اس کا مستقبل عزیز تھا۔ وہ ان پڑھ تھا مگر تعلیم کی اور علم والوں کی بہت قدر کرتا تھا۔

''اری...... بے وقوف...... تو نہیں جانتی کہ علم کتنی بڑی دولت ہے...... ہمارے پاس زمینیں، جائیدادیں تو ہیں نہیں جو ہماری اولاد کا شملہ اونچا کر سکے گی۔ آ۔ جا۔ کے تعلیم ہی اس کو عزت دے سکتی ہے۔ کیا تو نہیں چاہتی کہ اس کا شملہ اونچا ہو۔ وہ عزت دار بنے۔ لوگ اس کے آنے پر اٹھ کھڑے ہوں۔ یہاں رہ کر وہ ہماری طرح مٹی میں مٹی ہو جائے گا۔ بلقیس اب یہ تجھ پر ہے کہ اپنے بچے کو مٹی بنائے یا سونا۔ قادر علی سرگوشیوں میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتا تو وہ اس کی باتیں سن کر خاموش ہو جاتی۔ قادر علی جو بھی کہتا تھا۔ ٹھیک کہتا تھا۔ وہ پچھلی کئی پشتوں سے حویلی کے مزارعے چلے آ رہے تھے۔ نسل در نسل مزارعے...... انہوں نے بھی اپنا بچپن، جوانی اور بڑھاپا زمینداروں کی خدمت کرنے میں گزار دی تھی۔ صبح سویرے وہ کھیتوں میں چلے جاتے اور شام کو گھر لوٹتے۔ زمینوں پر کام کرتے کرتے ان کی زندگیاں اب ختم ہونے کے قریب تھیں مگر نہ ان کے گھر میں خوشحالی آئی تھی اور نہ ہی عزت وہ جو کچھ تھے اس سے ایک انچ بھی آگے نہ بڑھے تھے۔ باسط علی کی صورت میں انہیں ایک امید کی کرن نظر آئی تھی اور قادر علی

نے اس کرن کو اپنے لئے غنیمت جانتے ہوئے...... اسے آفتاب بنانے کی کوشش کی تھی۔ قادر علی کے دوست نے دوستی کا حق ادا کر دیا تھا اور باسط علی اسے اپنی اولاد کی طرح محبت کرتا تھا۔ بڑی توجہ سے اسے پڑھاتا تھا۔ اس کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی، باسط علی کی صورت میں اسے اولاد مل گئی تھی۔ باسط علی ہونہار تھا اور ماسٹر صدیق کی توجہ و محبت نے اس کے دل میں علم کا ذوق وشوق اور بڑھا دیا تھا۔ وہ ہر کلاس میں اول آتا تھا۔ جیسے ہی اس نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا اور کالج میں داخلہ لیا تو اس کا رنگ و روپ اور حلیہ ہی بدل گئے۔ ماسٹر صدیق نے اسے شہر کے بہترین کالج میں داخلہ دلوایا۔ اچھے کالج کے ماحول نے اس کی سوچ اور فکر کو بہت بدل دیا، وہ گاؤں آیا تو ہر گزرنے والا اسے مڑ مڑ کر دیکھتا۔ اونچا، لمبا، خوبصورت، وجیہہ نوجوان جو شکل سے ہی سلجھا ہوا اور تعلیم یافتہ لگتا تھا، انتہائی جاذب نظر شخصیت کا مالک بن رہا تھا۔ قادر علی اور اس کی بیوی اس کی بلائیں لیتے نہ تھکتے تھے۔ قادر علی کو اسے شہر بھیجنے کے فیصلے پر فخر محسوس ہوتا۔ اگر وہ گاؤں میں اس کے پاس رہتا تو اس کی طرح ایک مزارع ہی ہوتا۔

اب تو گاؤں کے ہر گھر میں اس کی چرچا ہونے لگی تھی۔ قادر علی کو محسوس ہونے لگا جیسے باسط علی کی وجہ سے اس کی عزت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے اور اس سوچ کے آتے ہی اس کا سر فخر سے بلند ہونے لگتا۔ فرطِ جذبات سے اس کی آنکھیں نم ہونے لگتیں اور وہ دل ہی دل میں بے حد خوش ہوتا۔

زمیندار حشمت خان کی تیسری بیٹی نازنین بھی شہر کے ایک کالج میں پڑھتی تھی۔ اتفاق سے دونوں چھٹیوں میں گھر آئے تو دونوں ایک دوسرے کی محبت کے اسیر ہو گئے۔ نازنین حسن و خوبصورتی کا مکمل پیکر تھی۔ اسے دیکھ کر کسی مصور کی خوبصورت پینٹنگ کا احساس ہوتا تھا۔ اس کی خوبصورت جھیل سی گہری آنکھیں۔ ستواں لمبی ناک، گہرے سیاہ ابرو۔ سفید گلابی رنگت، دراز قد اور سفید مرمریں جسم۔ اسے جو ایک بار دیکھتا، بار بار دیکھنے کی خواہش کرتا۔ اس جیسا حسن قدرت بہت کم کسی کو عطا کرتی ہے۔ وہ باسط علی کو اور باسط علی اسے دیکھ کر دل ہار گیا۔ ایک دوسرے کو دیکھے بغیر نہ دن کا آغاز ہوتا اور نہ رات کو الوداع کہا جاتا...... نجانے کیسے قدرت نے ان کے دلوں کو محبت کے انتہائی جذبات سے بھر دیا تھا کہ انہیں خبر ہی نہ ہوئی۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے اور مسکراہٹوں کے ذریعے ہی محبت بھرے پیغامات ایک دوسرے کو پہنچا دیتے۔ وہ محبت کے پر لگائے اونچی اڑانیں بھرنے میں مصروف تھے، نازنین کی محبت اس کے دل کی دھڑکنوں میں ایسے سمائی تھی گویا ہر دھڑکن صرف اس کے نام کی وجہ سے زندہ تھی اور باسط علی کا نام نازنین کے دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کرنے کے لئے کافی ہوتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے بہت عجیب محبت کرنے لگے تھے۔ بہت خاموش مگر بہت شدید...... وہ بہت کم ایک دوسرے سے بات چیت کرتے مگر تخیل میں ایک دوسرے کو باتوں سے ہی فرصت نہ ملتی۔ دونوں کی روحیں ایک دوسرے میں یوں مدغم ہو رہی تھیں جیسے وہ ایک دوسرے کے لئے ہی پیدا کی گئی ہوں۔ محبت کیسا عجیب جذبہ ہے، جو پل میں انسان کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیتا ہے۔ وہ شہر سے گاؤں آنے سے پہلے ایسے نہیں تھے، جب واپس شہر جانے لگے تو دونوں بہت بدل چکے تھے۔

''نازی...... تمہارے بغیر...... میں کیسے رہ پاؤں گا...... یوں لگتا ہے...... اب تو میری سانسیں بھی تمہارے قبضے میں ہیں۔'' باسط علی نے شہر جانے سے پہلے نازنین سے پہلی مرتبہ اپنے دل کی بات کہی۔

''اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے...... جیسے میرے جسم میں میری سانسیں ہی باقی نہیں......'' نازی نے جواب دیا۔

''کیوں......؟ باسط علی نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''سانس کے لئے آکسیجن، زندگی ہے۔ اور میری زندگی تو تم ہو...... تمہارے بغیر تو زندگی ادھوری لگتی ہے...... تم نظر نہیں آتے...... تو کچھ بھی اچھا نہیں لگتا...... تم نظر آتے ہو تو یوں لگتا ہے جیسے مجھے ساری خوشیاں مل گئی ہوں۔ باسط علی...... تم نے مجھے کیا کر دیا ہے؟ نازی نے نم آنکھوں کے ساتھ بے بسی سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے خود بھی معلوم نہیں...... کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔ شاید قدرت نے ہم دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کی بہت محبت ڈال دی ہے...... ورنہ ہم نے بچپن بھی تو اسی حویلی میں گزارا ہے...... اور ہم ایک دوسرے سے کتنا جھگڑتے بھی تھے۔ ایک دوسرے سے بات کرنا پسند نہیں کرتے تھے اور اب ایک دوسرے کو دیکھے بغیر سکون نہیں ملتا...... ایک دوسرے کے لئے اتنی محبت اور چاہت نجانے کہاں سے پیدا ہو گئی ہے؟ باسط علی نے حیرت سے کہا۔

''ہاں میں بھی اکثر اس کے بارے میں سوچتی ہوں...... باسط علی...... مجھے زندگی کا حاصل تمہارے سوا اور کوئی نظر نہیں آتا...... تم ہو...... تو...... میں ہوں...... اور تم نہیں...... تو میں بھی نہیں۔'' نازی نے آہ بھر کر اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''نازی...... تمہاری اتنی محبت سے مجھے ڈر لگتا ہے...... اگر ہماری محبت......؟ باسط علی نے اپنے دل میں چھپے خدشات کو ظاہر کرتے ہوئے کہا تو نازی نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

''باسط علی...... ہماری محبت ہمیں مل کر رہے گی...... کبھی بے یقینی کی باتیں نہ کرنا...... مجھے صرف اور صرف تم اور تمہاری محبت چاہئے...... اس کے علاوہ اور کچھ نہیں...... اور نہ ہی میں کسی اور کو قبول کروں گی...... تم بھی اپنے ذہن میں سے ہر سوچ کو نکال دو۔'' نازی نے پرعزم لہجے میں جواب دیا۔

''مگر...... میرے اور تمہارے درمیان...... جو اتنا لمبا فاصلہ ہے...... جس کو میری کئی پشتیں بھی عبور نہیں کر سکیں...... وہ میں کیسے طے کروں گا......'' باسط علی نے فکر مندی سے کہا۔

''اگر دلوں میں فاصلہ نہ ہو...... تو...... دنیا کے فاصلے کیا اہمیت رکھتے ہیں؟ نازی نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''دل کی باتوں...... اور...... دنیا کی باتوں میں بڑا فرق ہے۔ دنیا تو محبت کو ہی نہیں مانتی......'' باسط علی نے جواب دیا۔

''دنیا نہیں مانتی...... تو...... نہ مانے...... میں اور تم...... تو مانتے ہیں۔ ہمارے دل مانتے ہیں......'' نازی نے قدرے اکڑ کر کہا...... نازی بہت خودسر اور ضدی تھی۔ بچپن سے ہی اپنی بات منوانے کی عادی تھی۔ حشمت خان نے اپنی تینوں بیٹیوں کو اس قدر لاڈ پیار سے پالا تھا کہ وہ قدرے خودسر ہو گئی تھیں۔ مہ جبیں جو سب سے بڑی تھی، اس کی شادی ہو چکی تھی۔ افشین کی منگنی اپنے ماموں زاد سے بچپن میں ہی طے ہو گئی تھی، صرف نازنین کے امتحانات کی وجہ سے اس کی شادی میں تاخیر ہو رہی تھی۔ نازنین کو پڑھائی کا بہت شوق تھا اور وہ شہر کے کالج میں گریجویشن کر رہی تھی۔ وہ دونوں بہنوں سے زیادہ خوبصورت تھی۔ پورے گاؤں میں حسن و جمال میں اس کے برابر کا کوئی نہیں تھا۔ اس کے حسن و خوبصورتی کو کسی کی نظر نہ لگ

جائے، اس لئے حشمت خان نے اسے پردے کی خاص تاکید کر رکھی تھی...... مگر باسط علی کی نگاہوں سے وہ بچ نہ سکی۔ باسط علی بھی اونچا، لمبا، سجیلا نوجوان تھا۔ گاؤں کی بہت سی لڑکیاں اس پر مرتی تھیں...... مگر اس کا دل تو نازی پر مرمٹا تھا۔ اسے نازی جیسا کوئی اور دکھائی ہی نہیں دیتا تھا اور نازی کو باسط علی کے سوا کوئی اور نظر ہی نہیں آتا تھا۔ نازی دوسرے شہر چلی گئی اور باسط علی دوسرے۔ دونوں میں جدائی کیا پیدا ہوئی، دونوں مرنے کے قریب ہو گئے، نہ ایک دوسرے سے کوئی رابطہ ممکن تھا اور نہ ہی کوئی تعلق، نہ نازی کا دل پڑھائی میں لگتا تھا اور نہ ہی باسط علی کا۔ دونوں پڑھنے بیٹھتے تو مضطرب سوچوں کے ساتھ بس کتابوں کو گھورتے رہتے۔ باسط علی نے ایم ایس سی فزکس کے پیپر زدیئے اور جلدی جلدی گھر لوٹ آیا۔ نازی نے بھی انتہائی اداس دل کے ساتھ پیپر زدیئے اور گھر بھاگنے کی جلدی کی۔ نازی دوپہر کو حویلی پہنچی اور باسط علی شام کو۔ نازی نے جیسے ہی حویلی میں قدم رکھا تھا تب سے باسط علی کی بہن ثمینہ سے باتوں باتوں میں باسط علی کے بارے میں پوچھتی رہی اور جیسے ہی وہ گھر پہنچا تو اس کی جانب بے تاب نگاہوں سے یوں دیکھا جیسے برسوں سے کوئی پیاسی کسی صحرا میں ماری ماری پھرتی رہی ہو اور باسط علی کو دیکھتے ہی اس کی ساری پیاس بجھ گئی ہو......

باسط علی نے مسکرا کر اسے دیکھا اور نازی کو یوں لگا جیسے نازی کے دل کی ساری خوشیاں باسط علی کی مسکراہٹ میں چھپی ہوں اور باسط علی اسے دیکھ کر یوں مسرور ہوا جیسے کسی بیمار کو بہت دنوں بعد اچانک شفا مل گئی ہو۔ چند ماہ میں ان کی محبت، پہلے سے بالکل مختلف تاثرات لئے ہوئے تھی۔ پہلے محبت میں اضطراب اور انتظار تھا۔ اب محبت میں شدت اور بے باکی آتی جا رہی تھی۔ پہلے وہ سوچیں مضطرب رکھتی تھیں اور اب جذبات بے قرار رکھتے تھے۔ پہلے محبت کی دبی دبی چنگاریاں اندر ہی اندر سلگتی رہتی تھیں اور اب ہر جانب شعلے بن کر بھڑکتے رہتے تھے۔ پہلے محبت پوشیدہ راز تھی، اب سرعام اقرار تھی۔ ان کی محبت کی خوشبو آہستہ آہستہ پھیلنے لگی تھی اور بہت سے لوگ اس راز میں شریک ہونے لگے تھے۔

قادر علی کو جب معلوم ہوا تو اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس کی پچھلی نسلیں حشمت خان کے آباؤ اجداد کے ٹکڑوں پر پلتی آ رہی تھیں۔ باسط علی ذرہ خاک تھا اور ماہتاب کو پانے کی تمنا کر رہا تھا، جو سنتا تھا حیران ہوئے بغیر نہ رہتا تھا۔ باسط علی کی عقل کہاں چلی گئی ہے...... باسط علی کی اتنی جرأت کہ فرش پر رہ کر عرش پر بیٹھنے کے خواب دیکھنے لگا ہے۔ ہر ایک کو باسط علی انتہائی گنہگار نظر آنے لگا۔ اس کی ماں کو خبر ملی تو دل پکڑ کر بیٹھ گئی۔ زبان دانتوں تلے دبالی۔ اپنے بیٹے کی سلامتی کی دعائیں کرنے لگی۔ حشمت خان کو اگر خبر مل گئی تو وہ اسے زندہ نہیں چھوڑے گا اور اس کے ساتھ ساتھ شاید اس کے پورے خاندان کو بھی...... حشمت خان کے جاہ و جلال اور رعب و دبدبے سے سب واقف تھے، اس کے سامنے کسی کو بولنے کی جرأت نہ تھی۔ وہ بے انتہا نڈر اور بے باک تھا۔ لوگوں کو راتوں رات غائب کرانا اور صفحہ ہستی سے مٹانا اس کے لئے قطعی مشکل نہ تھا۔

''قادر علی...... میں اسی لئے کہتی تھی...... بیٹے کو مت پڑھا...... وہ اپنے آپ کو 'انسان' سمجھنے لگے گا...... ہم لوگ ڈھور ڈنگر ہی رہیں تو ہی اچھا ہے...... بنالیا تو نے اسے بڑا آدمی...... اب کیا کیا بھگتنا پڑے گا۔ یہ سوچ کر ہی میرا دل دہل جاتا ہے۔'' باسط علی کی ماں نے کہا تو قادر علی خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ اس کے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا۔ نجانے یہ سب کیسے ہو گیا تھا۔ اس نے تو باسط علی کے بارے میں ایسا کبھی نہیں سوچا تھا۔ نجانے انسان کی تقدیر میں کیا کچھ لکھا ہوتا ہے۔ اسے خبر ہی نہیں ہوتی۔ جب وہ ایک اٹل حقیقت بن کر سامنے آتی ہے تو انسان بوکھلا جاتا ہے۔ اسے کوئی راہ فرار نظر نہیں آتی۔ اس بوکھلاہٹ میں وہ کیا الٹے سیدھے قدم اٹھاتا ہے، اسے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ گل شہر میں نہیں کھلا تھا کہ وہ اس کی تعلیم

کو قصوروار ٹھہراتا۔ یہ تو آگ ان کے آنگن میں ہی بھڑکی تھی اور آنگن تو ان کی نظروں کے سامنے ہی تھا۔

حشمت خان اور اس کی بیوی حاکے کو بھی اس کی خبر ملی تھی۔ ان کے اندر آتش فشاں پھٹنے لگے۔ حشمت خان نے بیوی کو یہ بات راز میں رکھنے کو کہا اور چپکے چپکے نازی کا رشتہ اپنے ہی خاندان میں دور کے رشتے داروں میں کر دیا جو کبھی نہ تو ان کی حویلی آئے تھے اور نہ ہی یہ کبھی وہاں گئے تھے۔

شاہ زیب خان کے ساتھ شادی طے کر دی گئی۔ شاہ زیب خان والدین کا اکلوتا بیٹا تھا اور بہت زیادہ زمین و جائیداد کا مالک تھا۔ نازنین سے وہ دوگنی عمر کا تھا۔ انتہائی وجیہہ، خوبصورت اور بہت نیک دل انسان تھا۔ اس کی انسان دوستی اور لوگوں سے محبت و شفقت کی وجہ سے اپنے گاؤں اور اردگرد کے علاقے میں بہت عزت تھی۔ حشمت خان کو نازنین کے لئے اس سے بہتر کوئی رشتہ نظر نہ آیا۔ نازی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی اور حشمت خان نے افشین سے پہلے اس کی شادی طے کر دی۔ حشمت خان تو اس کی شادی فوراً کر دیتا مگر دونوں جانب فصلیں کٹائی کے لئے تیار کھڑی تھیں اس لئے انہیں تھوڑی سی تاخیر کرنی پڑی۔

نازی کو تھوڑا بہت اندازہ ہو چکا تھا کہ اس کے گھر والوں کو باسط علی سے اس کی محبت کی خبر مل چکی ہے، مگر کسی کا اس سے بات نہ کرنا انتہائی حیران کن تھا۔ اس کے دل میں وسوسے اور اندیشے سر اٹھانے لگے۔ وہ خود بھی بہت بے باک اور ضدی تھی۔ اپنے دل میں جنم لینے والے وسوسوں کو وہ خود ہی کچل دیتی..... میں باسط علی کے لئے سب کچھ کر سکتی ہوں..... اپنی جان بھی دے دوں گی، مگر باسط علی کو کبھی نہیں چھوڑوں گی۔'' وہ اپنے دل میں مصمم ارادہ کرتے ہوئے سوچتی۔

قادر علی نے باسط علی کو تنہائی میں بہت سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ وہ خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا مگر کچھ نہ بولا۔

''باسط علی..... کیا تو نے کچھ سنا ہے..... جو میں نے تجھ سے کہا ہے..... قادر علی اسے گم صم دیکھ کر بولا۔

باسط علی پھر خاموش رہا۔

''باسط علی..... تجھے کیا ہو گیا ہے..... تو ایسا..... تو..... ہرگز نہیں تھا۔ اور..... اب..... تو.....؟'' وہ اس کی جانب دیکھتے ہوئے آہ بھر کر بولا۔

''میں نے کیا..... کیا ہے؟'' باسط علی نے مؤدبانہ انداز میں پوچھا۔

''تو..... اپنی اوقات بھول رہا ہے..... اور..... اس کی سزا ہم سب بھگتیں گے'' قادر علی نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''ابا جی..... میں نے اس بات کو یاد رکھنے کی ہمیشہ کوشش کی ہے..... مگر.....'' اس نے نم آنکھوں کے ساتھ باپ کی جانب دیکھا۔

''مگر..... کیا.....؟ قادر علی نے حیرت سے پوچھا۔

''مگر..... کیسے بھول گیا..... مجھے سمجھ میں نہیں آیا.....'' باسط علی نے بھی بے بسی سے جواب دیا۔

''بیٹا..... اب بھی وقت ہے..... واپس لوٹ آ..... شہر چلا جا..... جب تک نازی کی شادی نہیں ہو جاتی۔'' قادر علی نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

''نازی کی شادی.....'' باسط علی نے گھبرا کر پوچھا۔

''ہاں...... بہت اندر کی بات ہے۔ نازی اور اس کے گھر والوں کو بھی نہیں پتا...... حشمت خان نے اس کی نسبت طے کر دی ہے اور فصل کی کٹائی کے بعد اس کی شادی ہے'' قادر علی نے بتایا۔

''یہ...... ناممکن ہے۔'' باسط علی نے جذباتی لہجے میں کہا۔

''بے وقوف...... مت بن...... یہی بہتر ہے کہ تو خاموشی سے شہر چلا جا...... مخمل میں ٹاٹ کا پیوند کبھی نہیں لگا...... اور...... اگر لگ بھی جائے تو کبھی نہیں جچتا۔'' قادر علی نے اس کا بازو زور سے اپنی جانب کھینچتے ہوئے کہا۔

''اتنی...... زیادتی۔'' باسط علی نے نم آنکھوں سے باپ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''بس...... اس سے زیادہ ایک لفظ نہ کہنا...... نازی کے ماں باپ اس کے لئے جو بہتر سمجھتے ہیں وہ کرنے کا انہیں پورا حق ہے...... تو کون ہوتا ہے...... انہیں کچھ کہنے والا...... اور خبردار...... تیری زبان سے اس راز کے بارے میں کوئی بات نکلی...... وہ تیری کچھ نہیں لگتی۔'' قادر علی نے خفگی سے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''کچھ...... نہیں لگتی...... وہ...... میری...... جسے...... میں نے اپنا سب کچھ سونپ دیا ہے۔ دل...... جسم...... اور...... روح...... وہ کچھ نہیں لگتی۔'' باسط علی نے باپ کی جانب حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا اور رونے لگا۔

''بکواس بند کر...... یہ شہری باتیں یہاں نہیں چلیں گی۔ یہاں عزت اور شرم وحیا کی باتیں ہوتی ہیں۔'' قادر علی نے اسے ایک تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔

''کیا...... محبت...... کرنا بے حیائی ہے؟ باسط علی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں...... اور اب مجھ سے اس کے بارے میں کوئی بات نہ کرنا میں نے جو تجھے سمجھانا تھا، سمجھا دیا ہے۔ اگر تو نے کوئی ایسا...... ویسا قدم اٹھایا...... تو...... اتنا سوچ لینا کہ تیری بہنوں کے ساتھ، کیا ہوگا۔'' قادر علی نے افسردگی سے کہا تو باسط علی نے چونک کر باپ کی جانب دیکھا اور سر جھکا لیا۔

اگلے روز اسے شدید بخار ہو گیا۔ قادر علی اور بلقیس بے حد پریشان ہو گئے اور حکیم سے دوائیں لا لا کر اسے کھلاتے رہے، مگر بخار ٹوٹنے کو ہی نہیں آ رہا تھا۔ کئی روز گزر گئے تھے مگر بخار کسی طرح بھی کم نہ ہوا۔ باسط علی سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ نازی کو جب سے اس کے بخار کی خبر ملی تھی وہ بھی بے حد مضطرب تھی۔ اس کا دل تو چاہتا تھا کہ وہ سارا وقت باسط علی کے پاس بیٹھی رہے، مگر نہ بلقیس اسے اندر گھسنے دیتی تھی اور نہ ہی اس کی اپنی ماں اسے حویلی کے پچھواڑے میں جانے دیتی تھی، جہاں دو کچے کمروں میں قادر علی اور اس کے گھر والے رہتے تھے۔ وہ رات رات بھر اس کے لئے دعائیں مانگتی رہتی۔ ہر دوسرے تیسرے روز گاؤں میں موجود دو مزاروں پر جاتی اور اس کی صحت کے لئے دعا کرتی۔ شاید اس کی لگن تھی یا جذبات کی شدت کہ باسط علی کی صحت آہستہ آہستہ بہتر ہونے لگی، وہ ہر روز پانی دم کر کے باسط علی کی بہن کے ہاتھ اسے چپکے سے بجھواتی اور وہ خود اسے پلاتی، باسط علی رفتہ رفتہ صحت یاب ہونے لگا...... بلقیس...... اور باسط علی کی بہنیں نازی کی محبت کی قائل ہونے لگیں، مگر سب بہت بے بس تھیں۔

باسط علی نے صحت یاب ہو کر شہر جانے کا فیصلہ کر لیا...... نازی نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر وہ خاموش رہا۔

''تم...... مجھے چھوڑ کر کیوں جانا چاہتے ہو؟ نازی نے تڑپ کر پوچھا اور رونے لگی۔

''رزلٹ آنے والا ہے۔ نوکری کی تلاش میں جا رہا ہوں۔'' باسط علی نے اس کی جانب پشت کرتے ہوئے جواب دیا۔

''اگر یہ بات سچ ہے...... تو...... میری آنکھوں میں دیکھ کر اس کا جواب دو۔'' نازی نے اس کے سامنے آتے ہوئے کہا۔

''نازی...... ہم دونوں کا ملاپ ممکن نہیں...... ہم کبھی بھی ایک دوسرے سے مل نہیں پائیں گے...... اس لئے بہتر یہی ہے کہ ہم...... ابھی...... سے......'' باسط علی کے ہونٹ لرزنے لگے اور اس نے نازی کی طرف دیکھنے کے بجائے سر نیچے جھکا لیا۔

''باسط علی...... یہ...... تم کیا کہہ رہے ہو...... کیا تم مجھ سے سچی محبت کرتے ہو؟'' نازی نے غصے سے پوچھا۔

''کیا تمہیں میری محبت میں شک ہے؟'' باسط علی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......'' نازی نے بے باکی سے جواب دیا۔

''کیا مطلب......؟'' باسط علی نے چونک کر پوچھا۔

''کونسا...... سچا عاشق ہے جو...... میدان چھوڑ کر بھاگا ہے...... سچی محبت کی خاطر انہوں نے سر کٹانے کو قبول کر لیا مگر محبت سے دستبردار نہیں ہوئے...... تم نے مجھ سے سچی محبت نہیں کی...... محبت کے نام پر مجھے دھوکہ دیا ہے۔'' نازی چلاتے ہوئے بولی۔

''پکڑو...... یہ چھری اور مجھے اپنے ہاتھوں سے قتل کر دو...... اُف بھی کروں تو میرا نام باسط علی نہیں......'' باسط علی نے تیز دھار چھری اپنے کرتے کی جیب سے نکال کر اس کی جانب بڑھائی۔ باسط علی نے بہادرانہ انداز میں کہا تو نازی اس کی طرف حیرت سے دیکھنے لگی۔

''پھر...... یہ...... سب کیا ہے......؟ کیوں مجھے چھوڑ کر جا رہے ہو؟'' نازی فرطِ جذبات سے لبریز ہو کر اس کے سینے سے لگ کر بولی۔

''تمہاری اور تمہارے گھر والوں کی عزت کی خاطر۔'' باسط علی نے محبت سے اس کی پیشانی چومتے ہوئے کہا۔

''ہماری عزت کی خاطر...... میری عزت...... میری شان...... میرا ایمان میرا سب کچھ تو تم ہو۔'' نازی نے روتے ہوئے کہا۔

''لیکن...... حشمت خان کی عزت تم ہو...... اور میں نہیں چاہتا کہ تمہاری کسی حرکت کی وجہ سے ان کی عزت میں کمی آئے......'' باسط علی نے کہا۔

''ان کی عزت میں کیسے کمی آئے گی؟'' نازی نے حیرت سے پوچھا۔

باسط علی خاموش ہو گیا۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہ سکا۔ وہ اس سے نظریں چرانے لگا۔

''باسط علی...... تمہیں میری قسم...... سچ سچ بتاؤ۔ آخر بات کیا ہے؟'' نازی نے قدرے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''مجھ سے مت پوچھو......'' باسط علی نے منہ پھیرتے ہوئے کہا۔

''میں تم سے ہی پوچھوں گی اور تمہیں ہی بتانا پڑے گا۔ کیونکہ ہم نے محبت کی ہے...... چوری نہیں۔'' نازی نے کہا۔

''حشمت خان نے...... شاید...... تمہاری شادی......'' باسط علی...... رک رک کر بولا۔

''میری شادی......کیا مطلب؟''اس نے چونک کر پوچھا۔

''کسی......اور......سے طے کر دی ہے۔''باسط علی نے کہا۔

''کسی......اور......سے؟''وہ چلاتے ہوئے بولی اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی......باسط علی نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔

''باسط علی......میری شادی کسی اور سے ہوتی ہے تو کیا تم دیکھتے رہ جاؤ گے؟ یہ تم کیسی محبت کرتے ہو؟ تمہاری محبت......تمہاری آنکھوں کے سامنے چھن جائے اور تم دیکھتے رہ جاؤ گے۔ یہ محبت تو نہ ہوئی......''نازی جذباتی ہو کر روتے ہوئے بولی۔

''میں تمہیں تماشا بنتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ کبھی نہیں چاہوں گا کہ لوگ تمہارے نام پر کبھی انگلی اٹھائیں۔''باسط علی نے فکرمندی سے کہا۔

''مجھے کچھ معلوم نہیں......اور میں کچھ نہیں جانتی......مجھے صرف اپنی محبت......اور تمہاری محبت چاہیے......''نازی نے قدرے ٹھوس اور ضدی لہجے میں اس کے بازوؤں کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

''نازی......ہم کیا کر سکتے ہیں......جب تک کہ تمہارے گھر والے رضامند نہ ہوں گے۔''باسط علی نے کہا۔

''مجھے کسی کی کوئی پروا نہیں......میری زندگی......میری سانسیں......میری خوشی تم ہو......میں کیسے تمہارے بغیر رہ سکوں گی۔ مجھے بتاؤ......انسان کے لئے زندگی ضروری ہے یا عزت......سانسیں اہم ہوتی ہیں یا خوشی؟''نازی نے آہ بھر کر کہا۔

''نازی یہ تمہاری اور میری سوچ تو ہو سکتی ہے، مگر ہمارے والدین کے لئے ان کی عزت، ہماری زندگیوں سے زیادہ اہم ہے۔''باسط علی نے جواب دیا۔

''کیا......تم یہ برداشت کر لو گے کہ میں کسی اور کی ہو جاؤں؟''نازی نے حیرت سے پوچھا۔

''مجھ سے ایسے سوال مت پوچھو جن کے جوابات دینا میرے لئے بہت مشکل ہو جائے۔''باسط علی نے بے بسی سے جواب دیا۔

''باسط علی......محبت......چاہت کی راہ ہے......اور چاہت......خواہش سے جنم لیتی ہے اور جہاں خواہش ہوتی ہے وہاں نہ سوالات ہوتے ہیں اور نہ جوابات......میں صرف ایک بات جانتی ہوں......محبت کی راہ بہت مشکل اور کٹھن ہوتی ہے......اس پر چلنے کے لئے بڑا حوصلہ اور ہمت چاہیے، جو لوگ ہمت ہار دیتے ہیں وہ کبھی بھی محبت نہیں کر سکتے......وہ اپنی قسمتوں پر صرف آنسو بہاتے ہیں اور اپنی کم ہمتی پر پچھتاتے رہتے ہیں......باسط علی......مجھے مایوس مت کرو......میرے لئے ساری زندگی یہ اذیت بہت تکلیف دہ ہو گی کہ میں نے ایک کم ہمت انسان سے محبت کی......محبت......بہادروں کا کام ہے......اور میں اپنی محبت پر فخر کرنا چاہتی ہوں۔''نازی نے جذباتی انداز میں کہا تو اس کے الفاظ باسط علی کے دل میں ایک خنجر کی طرح پیوست ہو گئے۔ وہ سب کچھ بھولنے لگا۔ اس کی عزت نفس اور انا آڑے آنے لگی۔

''نازی کو اس کی محبت پر فخر کرنا چاہیے......نہ کہ شرمندہ ہونا چاہیے۔''اس کے جذبات مشتعل ہونے لگے۔

''ہماری زندگی کا مقصد ایک دوسرے کی محبت کو پانا ہے......ہر حال میں......ہر صورت میں۔''نازی نے مصمم ارادے سے کہا

''ٹھیک ہے......میں تمہاری اور اپنی محبت کی خاطر سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔''باسط علی نے کہا تو وہ مسکرا دی اور محبت پاش نظروں سے

اس کی جانب دیکھتے ہوئے اس کے سینے سے لگ گئی۔

''میں اپنی اور تمہاری محبت کی کامیابی کے لئے ہر روز درگاہوں پر جاؤں گی۔ رات بھر دعائیں کروں گی...... خدا سے گڑگڑا کر تمہیں طلب کروں گی...... میں تمہیں...... اس سے اتنی شدت کے ساتھ طلب کروں گی کہ وہ مجھے۔ تمہاری محبت سے ضرور نوازدے گا......'' اس نے پریقین لہجے میں کہا۔

''کیا...... وہ...... ہمارے جذبات کی شدت دیکھ کر ہمیں...... ہماری محبت عطا کردے گا؟'' باسط علی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں...... میرا یقین کامل...... مجھے ضرور کامیاب کرے گا'' نازی نے کہا۔

''اگر تم...... مجھے...... اس قدر شدت سے طلب کروگی...... تو میں اس سے کئی گنا چاہت اور محبت کی شدت سے تمہیں طلب کروں گا۔ یہ ہماری محبت...... ہمارے یقین اور ہمارے جذبات کی شدت کا امتحان ہوگا'' باسط علی نے کہا۔

''اور...... ہم ضرور کامیاب ہوں گے'' وہ پروثوق لہجے میں بولی اور باسط علی نے فرطِ جذبات سے لبریز ہوکر اسے اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔

☆

شام ہورہی تھی۔ ماسٹر باسط علی کا دل بوجھل ہونے لگا وہ صبح سے ہی اپنی کٹیا میں بند اپنے ماضی کے دھندلکوں میں کھویا تھا اور اس کا ماضی اس کے لئے اتنا تکلیف دہ تھا کہ وہ اندر ہی اندر بے حد مضطرب اور پریشان ہوگیا وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا اور اونچے نیچے راستوں پر چلنے لگا۔ اچانک ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگی تھیں اور موسم بھی ابر آلود ہونے لگا تھا۔ صبح سورج اور بادلوں کی آنکھ مچولی میں سورج بازی لے گیا تھا اور بادل اس سے ہار گئے تھے۔ اب سورج کے غائب ہوتے ہی بادل سرد ہواؤں کے سنگ آسمان پر اٹھکیلیاں کرنے لگے، اب ان کے پاس کھلا آسمان تھا اور وہ مختلف ٹکڑیوں کی صورت میں تیرتے پھر رہے تھے۔ اور چاند، ستاروں کو وہ اپنے حصار میں لینے کی کوشش کررہے تھے۔ بارش برسنے کو بے تاب ہورہی تھی۔ اتنی سخت سردی میں ماسٹر باسط علی کے وجود میں اک آگ سی لگی تھی۔ وہ اپنی ہی سوچوں میں مگن جارہے تھے، جب پھر سائیں مٹھے سے ملاقات ہوگئی۔

سائیں مٹھے نے بغور اس کی جانب دیکھا۔

''تیرا نفس دکھی ہے اور دل جل رہا ہے...... کاہے کو مارا مارا پھر رہا ہے...... جا چلا جا...... اس کے پاس...... تجھے سکون وہاں جاکر ہی ملے گا'' سائیں مٹھے نے کہا۔

''کس کے پاس؟ نادانستہ ماسٹر باسط علی کے منہ سے نکلا۔

''وہی...... جس کا سب کچھ چھین کر تو یہاں آ گیا ہے۔ بڑا ہی خسارہ تو نے کمایا ہے...... تو نہیں جانتا وہ کون ہے؟ سائیں مٹھے نے کہا تو ماسٹر باسط علی کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔ سائیں مٹھا چھن چھن کرتا اور کلام پڑھتا ہوا آگے نکل گیا۔

عاشق عشق ماہی دے کولوں نت پھرن ہمیشہ کھیوے ہو
جنہاں جیندیاں جان ماہی نوں دتی اوہ دونویں جہانیں جیوے ہو
شمع چراغ جنہاں دل روشن اوہ کیوں بالن دیوے ہو

باسط علی حیرت سے اسے دیکھتا رہ گیا:

کیسے اس کا سامنا کر پاؤں گا......؟ اس کے اندر شدید تاسف کے جذبات پیدا ہونے لگے......دکھ اور ملال کے تاثرات اس کے چہرے پر نمایاں ہونے لگے۔

☆

نازی اور باسط علی نے قسمیں کھا رکھیں تھیں کہ وہ تب تک ایک دوسرے سے نہیں ملیں گے جب تک خدا ان کے حق میں فیصلہ نہ لکھ دے۔ باسط علی نجانے کن کن پیروں، فقیروں کے پاس جاتا۔ ان کے بتائے ہوئے وظائف پڑھتا رہتا، کبھی کوئی تعویز درخت کے ساتھ لٹکاتا، کبھی حشمت خان کے ڈیرے پر زمین میں دبا دیتا۔ رات رات بھر کھلے آسمان تلے بیٹھ کر دعائیں کرتا رہتا۔ اس کے اندر یہ یقین پختہ ہونے لگا تھا کہ خدا ضرور اس کی دعا سنے گا۔ وہ جب بھی نازی کے رشتے کے بارے میں سوچتا تو اس کے دل سے آواز آتی۔

''حشمت خان جو چاہے کر لے......نازی اسی کی ہے اور اسے ہی مل کر رہے گی۔'' وہ اپنے دل کی آواز پر مطمئن ہو جاتا۔ اس کا یقین...... اس کا ایمان بنتا جا رہا تھا۔ وہ اس قدر مطمئن تھا کہ اب اسے کسی شے کی پروا نہیں تھی اور نازی بھی بہت پراعتماد تھی، وہ بھی ساری ساری رات خدا کے حضور بیٹھ کر دعائیں کرتی نہ تھکتی تھی۔ رات رات بھر جاگنے سے اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نمایاں ہو گئے تھے۔ اس کی سرخ و سفید رنگت پیلی پڑ گئی تھی اور اس کا جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بنتا جا رہا تھا۔ باسط علی کی محبت میں وہ سنیاس لینے کو بھی تیار تھی۔ وہ سب کچھ کر گزرنے پر یقین رکھتی تھی، مگر سب سے زیادہ وہ اس بات پر یقین رکھتی تھی کہ خدا چاہے گا تو سب کچھ آسان ہو جائے گا اور وہ باسط علی کی خاطر......خدا کو منانے کے چکروں میں تھی۔ ہر وقت اس کے حضور گڑگڑاتی رہتی۔

فصل کی کٹائی کا موسم آ گیا......اور گزر بھی گیا......مگر نازی کی شادی کا شوشہ نہ اٹھا۔ قادر علی نے تو بہت پراعتماد لہجے میں کہا تھا کہ فصل کی کٹائی کے بعد اس کی شادی ہے......شادی نہیں ہو رہی تو اس کا مطلب ہے......خدا ان کی دعائیں سن رہا ہے اور ان کے لئے راہیں ہموار کر رہا ہے......اس بات نے دونوں کو اتنا پراعتماد بنا دیا تھا اور انہیں اپنی منزل بہت قریب دکھائی دینے لگی تھی۔ بس چند قدم کے فاصلے پر......دونوں کے رزلٹ آ چکے تھے۔ نازی بری طرح فیل ہوئی تھی جبکہ باسط علی پاس ہو گیا تھا مگر سیکنڈ ڈویژن میں۔ قادر علی، بلقیس اور اس کی بہنیں بہت خوش تھیں...... مگر باسط علی نازی کے فیل ہونے سے بہت دکھی تھا۔ حشمت خان نے نازی کو بہت ڈانٹا تھا اور اب اس کے شہر جانے پر پابندی لگ گئی تھی ورنہ وہ بی اے کے بعد ایم اے میں داخلہ لینے کا سوچ رہی تھی۔ انہی دنوں افشین کی شادی کا شوشا اٹھا اور حشمت خان کو جلدی جلدی اس کی شادی کرنا پڑی کیونکہ افشین کے شوہر کو بیرون ملک اچھی نوکری مل گئی تھی۔

باسط علی کو شہر میں نوکری مل گئی تھی، اس لئے وہ شادی میں شرکت نہ کر سکا۔ نازی......افشین کی شادی میں بہت خوش بھی تھی اور افسردہ بھی......افشین کی رخصتی کے بعد بھی مہمان حویلی میں ہی تھے اور واپس اپنے گھروں کو جانے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ نازنین......اٹھتی، بیٹھتی، بڑبڑاتی رہتی۔

چار روز بعد حشمت خان نے نازی کو اپنے کمرے میں بلایا وہ حیران تھی کہ باپ نے اسے اچانک کیوں بلایا ہے۔

''بیٹھو......'' حشمت خان نے نازی کو اپنے بہت بڑے کھدائی والے پلنگ کے پاس کھڑے دیکھ کر کہا تو وہ خاموشی سے بیٹھ گئی...... حشمت خان بغور اسے دیکھتا رہا ''ابھی تمہاری بارات آ رہی ہے...... تیار ہو جاؤ۔'' حشمت خان نے کہا۔

''کیا......؟ نازی گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور جیسے ہی کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا۔

''آواز مت نکالنا...... ورنہ ابھی زمین میں گاڑ دوں گا۔'' حشمت خان نے اپنی پستول کا رخ اس کی جانب کرتے ہوئے کہا۔

''ایسا کر دیں تو یہ میرے لئے زیادہ بہتر ہوگا۔ اس کی نسبت...... جو کچھ آپ میرے ساتھ کرنے جا رہے ہیں۔''

نازی غصے سے بولی اور سسکنے لگی۔

''یہ بھی کر گزروں گا...... اگر تم نہ مانی...... تو......؟'' حشمت خان نے پرمطمئن لہجے میں جواب دیا۔

''انتظار کس بات کا ہے...... چلائیں گولی......'' نازی نے پراعتماد لہجے میں کہا۔

''حشمت خان...... اتنا بے وقوف نہیں...... جتنا تم سمجھ رہی ہو...... تمہیں اس وقت تک قتل نہیں کروں گا، جب تک تمہاری نظروں کے سامنے اس کو نہ قتل کر دوں، جس نے تجھے بھڑکایا ہے۔'' حشمت خان نے جواب دیا۔

''ک...... کس...... کو......؟ نازی نے گھبرا کر پوچھا۔

''باسط...... علی...... کو......'' حشمت خان نے غصے سے کہا۔

نازی کا دل ڈرنے لگا اور وہ بلند آواز سے رونے لگی۔

''خدا کے لئے...... بابا...... اسے...... کچھ مت کہنا ہے...... آپ مجھے کہہ لیں۔'' نازی نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔

''حشمت خان...... معاف کرنے والوں میں سے نہیں...... میں صرف تمہیں اور باسط علی کو ہی نہیں...... اس کے سارے گھر والوں کو بھی نہیں چھوڑوں گا۔'' حشمت خان دانت کچکچا کر بولا۔

''خدا کے لئے...... ایسا مت کریں...... ان کا کیا قصور ہے؟ نازی باپ کے قدموں میں گڑگڑا کر بولی۔

''میرا کیا قصور ہے...... کہ میری اولاد مجھے سرِعام رسوا کرنے پر تلی ہے...... کیا تم مجھے اس بات کی سزا دے رہی ہو کہ میں نے تمہیں سب سے زیادہ پیار کیا...... تم نے جو خواہش بھی کی...... وہ سب سے پہلے پوری کی...... تم نے شہر پڑھنا چاہا...... میں نے تمہیں شہر بھیجا...... تم مجھے کس بات کی سزا دے رہی ہو...... بتاؤ...... کس بات کی...... میری محبت کی...... یا تم پر اعتماد کی۔'' حشمت خان رنجیدگی سے بولا تو نازی نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو شدت سے رواں ہو گئے۔

''بابا...... میں نے کبھی نہیں چاہا کہ آپ کو بے عزت کروں مگر......'' وہ سسکیاں بھرنے لگی۔

''خاموشی سے چلی جاؤ...... شاہ زیب بہت اچھا انسان ہے...... تم نے اولاد ہو کر اپنا فرض بھلا دیا...... مگر میں باپ ہو کر اپنا فرض نہیں بھلا

پاپا۔۔۔۔۔میں نے ایک بہت اچھے انسان کو تمہارے لئے منتخب کیا ہے۔۔۔۔۔وہ تمہیں بہت خوش رکھے گا۔ جاؤ۔۔۔۔۔تیاری کرو۔۔۔۔۔بارات آنے والی ہے۔“ حشمت خان نے حکمانہ لہجے میں کہا اور وہ روتی ہوئی باہر نکل گئی۔

☆

ماسٹر باسط علی کھلے میدان میں، چمکیلی، خوشگوار دھوپ میں بچوں کو پڑھا رہے تھے۔ وہ بلیک بورڈ پر لکھنے لگے۔

”اللہ کی عبادت کرو۔۔۔۔۔ماں باپ سے پیار کرو۔“

”ماسٹر جی۔۔۔۔۔کیا اللہ کی صرف عبادت کرتے ہیں۔ اس سے پیار نہیں کرتے۔“ آٹھویں کلاس کے طالب علم نے کھڑے ہو کر سوال کیا۔

”ماسٹر باسط علی نے چونک کر اسے دیکھا۔

”ہم اللہ سے سب سے زیادہ پیار کرتے ہیں۔“ ماسٹر باسط علی نے جواب دیا۔

مگر۔۔۔۔۔اللہ تو نظر نہیں آتا اس سے کیسے پیار کر سکتے ہیں؟ لڑکے نے پھر پوچھا۔

”اللہ سے پیار اس طرح نہیں کرتے۔ جس طرح ہم چھوٹے بچوں سے کرتے ہیں، بلکہ اس طرح کرتے ہیں کہ جب ہم ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں اور پھر ایک دوسرے کی مدد کر کے ہمیں خوشی ہوتی ہے تو وہ خوشی ہمیں بتاتی ہے کہ اللہ ہم سے پیار کرتا ہے، ہم خوش ہو کر اور اچھے کام کرتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ اللہ کو ہمارے کام اچھے لگتے ہیں۔ ان باتوں سے اللہ سے پیار بڑھنے لگتا ہے“۔ ماسٹر باسط علی نے سب بچوں کو سمجھایا۔

”ماسٹر جی۔۔۔۔۔اگر کوئی کسی کی چیز چھیننے کی کوشش کرے۔۔۔۔۔اور پھر اسے چھین بھی لے تو۔۔۔۔۔کیا اللہ اس سے ناراض ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔“ ایک اور بچے نے پوچھا تو ماسٹر باسط علی کا دل زور سے کانپا اور وہ بری طرح گھبرا گئے، ان کے چہرے پر پسینہ آنے لگا ان کی طبیعت اچانک خراب ہونے لگی۔ وہ مضطرب ہو کر کرسی پر بیٹھ گئے۔ پیریڈ ختم ہو گیا اور بیل بجنے لگی۔

”تم لوگ جاؤ۔۔۔۔۔“ ماسٹر باسط نے قدرے بے بسی سے کہا اور سب بچے اپنے بیگ اٹھا کر وہاں سے چلے گئے، مگر باسط علی وہیں بے دم بیٹھے رہے۔

”ماسٹر جی۔۔۔۔۔سارا سکول خالی ہو گیا ہے، کب تک یہاں بیٹھے رہیں گے۔۔۔۔۔؟ گھر نہیں جانا۔۔۔۔۔کیا؟ ایک اور استاد نے ان سے آکر پوچھا تو ماسٹر باسط علی ہڑبڑا گئے اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے سکول سے باہر آ گئے۔ ان کا دل گھر جانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ جب بھی گھبراتے اور پریشان ہوتے تو سکول کے پاس ایک سرسبز و شاداب میدان میں ایک پہاڑی کے اوپر جا بیٹھتے، جہاں سے بستی کے کچے پکے مکان اور ان کے آس پاس چلتے پھرتے لوگ دکھائی دیتے۔ اوپر دیکھتے تو نیلگوں آسمان پر اڑتے پھرتے پرندے نظر آتے۔ اس پہاڑی پر بیٹھ کر انہیں ایک عجیب سی خوشی اور سرشاری اپنے اندر سرایت کرتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ پہاڑی پر بیٹھنے لگے تو سائیں مٹھا پہلے ہی وہاں بیٹھا دھوپ سینک رہا تھا۔ اس نے اپنا کشکول وہاں الٹا کر کے رکھا تھا اور اپنی جیبوں سے مختلف کاغذوں کے رنگ برنگی ٹکڑے، ادھ جلے بیڑی کے ٹوٹے، چند سکے اور مختلف قسم کے رنگ برنگی موتی

اور منکے نکال کر گن رہا تھا۔

ماسٹر باسط علی کو دیکھ کر مسکرانے لگا۔

”تو...... پھر آ گیا...... کا ہے کو اپنا دشمن ہو رہا ہے۔ جس کی تجھے تلاش ہے نا...... وہ تجھے یہاں نہیں ملے گا۔ اپنا وقت ضائع نہ کر...... جا چلا جا......“ اس کے پاس سائیں نے غصے سے کہا تو ماسٹر باسط علی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا وہاں سے مڑ گئے اور سائیں بلند آواز میں پھر کلام پڑھنے لگا۔

ایمان سلامت ہر کوئی منگے، عشق سلامت کوئی ہو

منگن ایمان، شرماون عشقوں دل نوں غیرت ہوئی ہو

جس منزل نوں عشق پہنچاوے، ایمان نوں خبر نہ ہوئی ہو

میرا عشق سلامت رکھیں باہو، ایمان نوں دیاں دھروئی ہو

سائیں بلند آواز میں کلام پڑھتا رہا اور اس کی آواز سے پورے ماحول پر اک سحر سے طاری ہونے لگا۔ سائیں کی آواز کی بازگشت باسط علی کے کانوں میں نشتر چبھونے لگی۔

☆

شاہ زیب دولہا بنا کمرے میں داخل ہوا تو نازی نے نفرت سے منہ پھیر دیا وہ انتہائی خوبصورت، دراز قد اور پرکشش شخصیت کا مالک تھا اور وہ آج پہلے سے بھی کہیں زیادہ خوبصورت لگ رہا تھا۔ وہ نازی کے چہرے پر پھیلے تاثرات دیکھ کر حیران رہ گیا۔

”میری طبیعت ٹھیک نہیں۔“ شاہ زیب جیسے ہی نازی کے پاس بیٹھا تو وہ کراہت سے بولی۔

”طبیعت...... واقعی ٹھیک نہیں...... یا مجھے دیکھ کر خراب ہوئی ہے۔“ شاہ زیب نے معنی خیز انداز میں پوچھا، تو نازی نے چونک کر اس کی جانب پہلی بار دیکھا اور دیکھتی ہی رہ گئی۔ وہ بے حد خوبصورت لگ رہا تھا۔

”کیا میں اس بے زاری کی وجہ جان سکتا ہوں؟“ شاہ زیب نے پوچھا۔

”آپ مجھ پر زبردستی مسلط کیے گئے ہیں...... میں...... میں آپ سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔“ نازی نے قدرے نخوت سے کہا۔

”کیا آپ کسی اور سے شادی کرنا چاہتی ہیں؟ شاہ زیب نے اس کی جانب بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں......“ اس نے قطعیت سے جواب دیا۔

”کس سے......؟ شاہ زیب نے بمشکل تھوک نگلتے ہوئے پوچھا۔

”جس سے میں محبت کرتی ہوں۔“ وہ گہری سانس لے کر بولی۔

”کون ہے...... وہ......؟

”میری محبت...... میری چاہت اور میرا سب کچھ۔“ نازی نے کہا تو شاہ زیب نے اس کی جانب بغور دیکھا اور خاموش ہو کر اس کے بیڈ سے اٹھ کھڑا ہوا...... اور بیڈ روم سے ملحقہ کمرے میں چلا گیا۔

نازی فاتحانہ انداز میں مسکرائی۔اس نے اپنی محبت کو کسی دوسرے کی محبت سے آلودہ ہونے سے بچا لیا تھا۔

اس نے اپنی ہوشیاری اور دلیری سے باسط علی اور اس کے گھر والوں کو بھی بچا لیا تھا اور اپنی محبت کو بھی۔شاہ زیب کس اذیت میں سے گزر رہا تھا۔اسے قطعی اس کی پروا نہیں تھی۔اس کے لئے صرف اپنی محبت اور اپنی خوشیاں اہم تھیں......وہ باسط علی کو بتائے گی تو وہ کس قدر خوش ہوگا......وہ باسط علی کو جلد اپنے پاس بلا لے گی۔

شاہ زیب بہت نیک دل انسان تھا۔وہ ماں باپ کا بہت فرمانبردار تھا اور اپنے اردگرد کے لوگوں کی ضروریات اور حقوق کا بہت خیال رکھتا تھا۔اس کے مزارعے اس کی بہت عزت کرتے تھے۔اپنے علاقے میں اس کی بہت عزت و قدر تھی وہ جدھر جاتا لوگ اس کے لئے بہت دعائیں کرتے۔وہ بہت کم غصے میں آتا تھا۔مگر نازی کی باتیں سن کر اس کا دل بہت کٹا تھا۔اس کی عزت نفس اور انا کو شدید جھٹکا لگا تھا۔وہ کتنا دکھی ہوا تھا،کسی کو خبر نہ ہوئی تھی۔وہ قدرت کی اس آزمائش پر بہت زیادہ رنجیدہ ہوا تھا......وہ اس بات کا کسی سے ذکر کر کے نازی کی عزت اور اپنے مرتبے کو کم بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔وہ اس کی حویلی کی ہی نہیں......پورے علاقے کی مالکن تھی۔شاہ زیب کا ذرا سا تلخ رویہ اس کو اس کے مرتبے سے گرا سکتا تھا۔نازی کے الفاظ بار بار اس کے ذہن میں گونجتے اور اس کے دل کو کچوکے لگاتے۔

اس بات کے بعد شاہ زیب نازی کا سامنا کرنے سے کتراتا وہ جیسے ہی نظر آتی تو وہ راستہ بدل دیتا۔اس کی ماں نازی کی بلائیں لیتے نہ تھکتی تھی۔وہ اس کے ناز نخرے اٹھانے میں مصروف رہتی اور نازی دل ہی دل میں خوش ہوتی۔اس نے باسط علی کو اپنے گاؤں میں آنے کا پیغام بھیج دیا تھا۔وہ ہر وقت اس کی آمد کی منتظر رہتی۔اس نے اسے سارا منصوبہ لکھ بھیجا تھا کہ وہ کس طرح وہاں آکر رہے گا۔نازی کا ایک ایک لمحہ انتظار میں گزرتا......اور اس کے لئے انتظار کرنا قدرے مشکل ہو رہا تھا۔

''بیٹی......کیا تیرا شاہ زیب سے کوئی جھگڑا ہوا ہے؟''اس کی ساس زیتون بانو نے شاہ زیب کی جانب اس کا سرد رویہ دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں......''اس نے بوکھلا کر جواب دیا۔

''پھر کیا بات ہے......؟نہ تو تم لوگ آپس میں ایک دوسرے سے کوئی بات کرتے ہو......نہ کھانا اکٹھے کھاتے ہو......نہ ہنستے بولتے ہو......لگتا ہی نہیں کہ تم لوگوں کی شادی ہوئی ہے؟''زیتون بانو نے پریشانی سے پوچھا۔

''اماں......جی......وہ......وہ......''اس کو سمجھ میں نہیں آرہا تھا اسے کیا جواب دے۔اس کے چہرے پر پسینہ آنے لگا۔

''ٹھیک ہے......اگر ایسی کوئی بات ہوگئی ہے......جو تم مجھے نہیں بتانا چاہتی تو ایسی بات کو مٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔آج شاہ زیب آتا ہے تو میں تم دونوں سے بات کروں گی۔تمہارے بابا بھی......تم لوگوں کی وجہ سے بہت پریشان ہو رہے ہیں۔''زیتون بانو نے فکرمندی سے کہا۔

''نہیں......اماں جان......ایسی کوئی بات نہیں......آپ......آپ شاہ زیب سے کوئی بات نہ کریں......میں خود ان سے صلح کر لوں گی۔''نازی نے گھبرا کر جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔خود ہی صلح کر لو......تو......بہتر ہے۔ورنہ مجھے اور تمہارے بابا جان کو کچھ کرنا پڑے گا۔''زیتون بانو نے کہا۔

''نہیں......نہیں......میں سب کچھ ٹھیک کر لوں گی۔''نازی نے جواب دیا۔

شام کو شاہ زیب گھر آیا تو نازی اس کے آگے پیچھے پھرنے لگی وہ اس کے بدلے ہوئے رویے پر حیران ہونے لگا۔ کبھی اس کے لئے کھانا لانے کو کہتی، کبھی چائے اور کبھی پھل...... اور وہ حیرت سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

رات کو وہ اس کے کمرے میں آیا تو نازی کا رویہ پھر بدل چکا تھا۔ وہ پہلے کی طرح تلخ ہو گئی تھی۔

''وہ...... سب کیا تھا......؟ شاہ زیب نے حیرت سے پوچھا۔

''اماں...... اور بابا کے سامنے کھیل کھیلنا پڑے گا۔ وہ لوگ ہماری وجہ سے بہت پریشان ہو رہے تھے اور میں انہیں اس پریشانی سے بچانے کے لئے وہ سب کر رہی تھی۔'' نازی نے سرد لہجے میں بتایا تو شاہ زیب کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔

''تم...... مجھے کس بات کی سزا دے رہی ہو...... میں نے تو تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی۔'' شاہ زیب نے بے بسی سے پوچھا۔

''اگر...... آپ کی جگہ...... کوئی اور بھی ہوتا...... تو میرا رویہ یہی ہوتا...... کیونکہ میں اس کے ساتھ بے ایمانی نہیں کر سکتی۔ میں نے اسے قول دیا ہے کہ میرا جسم اور میری روح صرف اس کی امانت ہے...... اور میں اس میں کسی قسم کی بددیانتی نہیں کروں گی...... آپ ہی بتایئے...... مجھے کیا کرنا چاہئے؟ نازی نے جان بوجھ کر آنسو بہانا شروع کر دیئے اور شاہ زیب کا دل نرم ہونے لگا۔

''تم بھی ٹھیک کہتی ہو......'' وہ آہ بھر کر بولا اور خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ نازی دل ہی دل میں مسکرانے لگی۔ ''تم...... مجھ تک کبھی نہیں پہنچ پاؤ گے......'' نازی نے مکارانہ انداز میں سوچا۔

شاہ زیب صاف گو اور صاف دل انسان تھا۔ لوگوں کے قول و قرار پر یقین کر لیتا...... مگر ان کے دلوں کے اندر چھپی بے ایمانی اور بدنیتی تک کبھی نہ پہنچ پاتا...... وہ اپنی سادہ لوحی میں نازی کے جذبات کی قدر کرنے لگا اور نازی اس کی نرمی اور سادہ لوحی کو اس کی کمزوری سمجھ کر اس کے جذبات کے ساتھ کھیلنے لگی۔ وہ چند روز میں بہت شاطر ہو گئی تھی۔

ایک شام شاہ زیب گھر آیا تو باسط علی اس کے ساتھ تھا۔ اسے دیکھ کر نازی پاگل ہی ہو گئی۔ خوشی سے پاگل وہ یوں چلنے لگی جیسے ہوا میں اچھل رہی ہو۔ اس کے انگ انگ سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔

''اماں جی...... یہ بابو شہر سے آیا ہے۔ بہت پڑھا لکھا ہے اور روزگار کی تلاش میں تھا۔ میں نے اسے زمینوں اور فصل کے حساب کتاب کے لئے منشی رکھ لیا ہے۔ شکل سے بہت شریف اور اچھا معلوم ہو رہا ہے۔'' شاہ زیب نے باسط کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

''کیوں...... پہلا منشی کہاں چلا گیا ہے؟'' اس کے باپ نے حیرت سے پوچھا۔

''ابا جی...... فضل بابا سے اب حساب کتاب ٹھیک نہیں ہوتا...... ان کی نظر بھی بہت کمزور ہو گئی ہے، اس لئے میں نے اس بابو کو رکھ لیا ہے۔'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

''مگر بیٹا وہ ہمارا پرانا خدمتگار تھا، کیا اسے فارغ کر دیا۔'' اس کے باپ نے پوچھا۔

''نہیں ابا جی...... میں نے کسی کو فارغ نہیں کیا...... یہ بابو...... ان کے ساتھ کام کرے گا۔'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

''پھر...... ٹھیک ہے...... یہ بابو اس حویلی میں ہی رہے گا...... کیونکہ ڈیرہ اس کے رہنے کے قابل نہیں...... یہ پڑھا لکھا انسان ہے......

اس کو.....اس کے مطابق ماحول ملنا چاہئے.....اس کے لئے اچھا سا کمرہ ٹھیک کرادیں۔'' شاہ زیب نے مسکرا کر کہا۔

''نازی بیٹا.....کہاں ہو؟'' زیتون بانو نے آواز دی۔

''جی.....اماں جی'' نازی جلدی سے آئی۔ اس نے خوبصورت، کامدار، چمکیلا سوٹ اور ڈھیروں گہنے پہن رکھے تھے۔ دونوں کلائیاں سونے کے کنگنوں سے بھری تھیں۔ وہ کسی مہارانی کی طرح لگ رہی تھی۔ باسط علی نے ایک ٹک اس کی جانب دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں، نازی کا چہرہ گلنار ہونے لگا۔

''بیٹا..... یہ ہمارا مہمان ہے اور اس کے لئے دوسری منزل پر جو مہمان خانہ ہے وہ ٹھیک کرادو۔ دو تین ملازماؤں کو ساتھ لے جاؤ اور صفائی ستھرائی کرادو۔ اب اس مہمان کی ذمہ داری تم پر ہے۔ اسے ہم سے کوئی شکایت نہیں ہونی چاہئے۔'' زیتون بانو نے کہا تو نازی مسکرادی۔

''اماں جی..... آپ فکر ہی نہ کریں..... آپ کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔'' نازی نے باسط علی کی جانب معنی خیز انداز میں دیکھتے ہوئے کہا اور اوپر چلی گئی۔

''باسط علی..... شکر ہے، تم آگئے اور میرے بے قرار دل کو قرار مل گیا ہے..... تمہارے بغیر میں کتنی ادھوری، کتنی اداس اور تنہا تھی تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ یوں لگتا تھا میرا جسم روح کے بغیر حرکت کر رہا ہو۔ تمہارے آنے سے یوں محسوس ہو رہا ہے، جیسے میری روح، میرے جسم میں واپس آ گئی ہو۔'' نازی نے موقع دیکھ کر باسط علی کے قریب آ کر کہا۔

''نازی.....تم نے شادی کیسے کرلی..... تم نے تو قسم کھا رکھی تھی کہ تم میرے علاوہ کسی سے شادی نہیں کروگی۔'' باسط علی نے حیرت سے پوچھا۔

''اور..... میں..... تمہارے علاوہ کسی سے شادی کروں گی بھی نہیں، وہ ٹھوس لہجے میں مسکرا کر بولی۔

''کیا مطلب.....؟ شاہ زیب سے.....؟'' باسط علی نے حیرت سے پوچھا۔

''صرف دنیا کی نظر میں..... میں اس کی بیوی ہوں۔'' میں نے اسے اپنے قریب نہیں آنے دیا.....'' نازی نے مسکرا کر جواب دیا۔

''کیا..... واقعی..... اور شاہ زیب.....؟

''ہاں..... وہ سیدھا..... اور سادہ طبیعت کا نرم دل انسان ہے۔ وہ میرے آنسوؤں سے اس قدر پریشان ہو جاتا ہے۔ وہ میرے ساتھ کیا زبردستی کرے گا۔'' مسکرا کر نازی نے جواب دیا۔

''پھر..... یہ رشتہ بنانے کی کیا ضرورت تھی؟ اس نے حیرت سے پوچھا۔

''تمہاری زندگی کی خاطر..... اور تمہارے گھر والوں کی خاطر، مجھے یہ سب کرنا پڑا۔ میری محبت، میری وفا، میرا سب کچھ تم ہو.....'' وہ اس کے بہت قریب آ کر بولی۔

''نازی..... اب تمہاری حیثیت پہلے جیسی نہیں رہی..... تم اس گھر کی عزت ہو..... کسی نے دیکھ لیا تو تمہاری بدنامی ہوگی۔'' باسط علی نے اسے پرے دھکیلتے ہوئے کہا۔

''میں صرف تمہارا انتظار کر رہی تھی..... اب میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی..... میرا وجود..... تمہاری محبت کے بغیر ادھورا ہے.....'' نازی

قدرے بے صبری سے بولی۔

''نازی.....ہم ملیں گے.....تو جائز طریقے سے.....خدا کی نظر میں گنہگار بن کر نہیں۔'' وہ دوٹوک لہجے میں بولا۔

''کونسا خدا.....؟ کیا وہ ہماری سنے گا.....کبھی نہیں.....کتنا مان تھا مجھے اس پر.....میں نے اور تم نے کس قدر اس کی عبادت کی۔ ساری ساری رات میں اس کے سامنے گڑگڑا کر دعائیں مانگتی رہی۔ تمہیں طلب کرتی رہی، مگر اس نے ہماری ایک نہ سنی، وہی کیا، جو وہ چاہتا تھا۔ مجھے اب اس پر بالکل بھی اعتبار نہیں رہا.....میں نے اس کا ذکر کرنا چھوڑ دیا ہے۔ مجھے اپنی خوشیاں خود تلاش کرنی ہیں، جو مجھے اچھا لگے گا اور جو شے مجھے خوش کرے گی، میں وہی کروں گی۔'' وہ قطعیت سے بولی۔

''نازی.....یہ تم کیا کہہ رہی ہو.....تمہاری سوچ اس قدر بدل گئی ہے، مجھے یقین نہیں آ رہا۔'' باسط علی نے حیرت سے پوچھا۔

''تم ہی بتاؤ.....کیا ہم نے دعائیں مانگنے میں کوئی کسر چھوڑ رکھی تھی۔ اکیس دن میں دونوں درگاہوں پر ننگے پاؤں جا کر دعائیں مانگتی رہی، ہر روز کوئی نہ کوئی منت پوری کرتی، نیازیں دیتی، عبادت کرتی، کیا ہوا.....؟ تم مجھ سے چھن گئے اور نجانے شاہ زیب کہاں سے آ گیا.....خدا نے مجھے بند گلی میں کھڑا کر دیا۔ بارات آنے سے چند گھنٹے پہلے ابا نے مجھے، میری شادی کے بارے میں بتایا۔ اتنی دعاؤں کا ثمر یوں ملتا ہے.....مجھے تو افسوس ہوتا ہے.....میں نے اتنی دعائیں کیوں کیں، اگر میں نے اتنی دعائیں نہ کی ہوتیں اور میرے ساتھ یہ سب کچھ ہوتا تو شاید میں اتنی مایوس اور بددل نہ ہوتی۔ باسط علی.....میرے اندر.....میرا ایمان بکھر گیا ہے.....میرے دل میں خدا کے بارے میں جو اچھی امید اور یقین تھا وہ سب ختم ہو گیا ہے۔ اب مجھے اس سے کچھ نہیں چاہئے اور نہ ہی میں اس سے کچھ طلب کروں گی۔'' وہ ٹھوس لہجے میں بولی تو باسط علی حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

''میری.....محبت/میری چاہت.....میرا عشق صرف اور صرف تم ہو.....'' نازی نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

''عشق.....؟ باسط علی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں.....تمہارے سوا کچھ اور نظر ہی نہیں آتا.....تم دکھائی نہیں دیتے تو سب کچھ پھیکا۔ بے رنگ اور ادھورا لگتا ہے.....عشق اسی کو تو کہتے ہیں.....کیا تمہیں ویسا محسوس نہیں ہوتا.....جیسا مجھے ہوتا ہے۔'' نازی نے متجسس انداز میں پوچھا۔

''پہلے ہوتا تھا.....اور.....اب'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور اب کیا.....؟'' نازی نے حیرت سے پوچھا۔

''اب میری سوچیں گڈمڈ ہو گئی ہیں۔ میرے دل میں اک انجانا سا خوف اور بوجھ پیدا ہونے لگا ہے۔ مجھے تمہاری باتوں سے ڈر لگنے لگا ہے۔ پتہ نہیں مجھے کیا ہو رہا ہے۔'' وہ انتہائی مضطرب ہو کر بولا۔

''کیا ہونے لگا ہے؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔ میں تمہارے لئے گرم دودھ لاتی ہوں۔'' نازی کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئی اور باسط علی بلند آواز میں رونے لگا۔

(۵)

شہیر کی برتھ ڈے تھی۔

اور روشنی نے اس کو مختلف انداز میں منانے کا آئیڈیا دیا تھا۔ فائیو سٹار ہوٹل میں لنچ کرنے کے بعد سب لوگ کیک کاٹنے دریا پر جا رہے تھے۔ چاکلیٹ، بلیک فارسٹ، ویفرز اور کافی کریم کیک کے علاوہ مختلف اقسام کی بیکری، کولڈ ڈرنکس اور بوتلیں خریدی گئیں۔ دریا کے کنارے شام کا منظر انتہائی خوبصورت لگ رہا تھا۔ ڈوبتے سورج کی نارنجی شعاعوں نے آسمان کی رنگت کو بھی قدرے سرخی مائل بنا دیا تھا اور اس نارنجی سورج کا عکس پانی کی لہروں کے ساتھ ہچکولے کھاتا انتہائی دلفریب لگ رہا تھا۔ سب لوگ کافی دیر ادھر ادھر ٹہلتے اور انجوائے کرتے رہے۔ اسامہ کی آواز بہت خوبصورت تھی۔ اس نے دو تین رومانٹک گانے سنائے...... ارسلان کے چٹکلے اور باتوں کی پھلجھڑیاں فضا میں ان کے گونجدار قہقہے سارا ماحول ہی انتہائی خوشگوار اور مسحور کن لگ رہا تھا...... شہیر گاہے بگاہے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے زل کی طرف محبت پاش نظروں سے اپنے دل کا پیغام پہنچانے کی کوشش کرتا...... اور وہ ان نظروں کا مطلب سمجھتے ہوئے چہرہ دوسری جانب پھیر دیتی...... روشنی کی شاعرانہ گفتگو اور بات بے بات شعر سنانے کی عادت غالباً آج زور پکڑ رہی تھی۔ وہ ان سب سے زیادہ ایکسائٹڈ دکھائی دے رہی تھی۔

شام کے ملگجے سائے ہر طرف پھیلنے لگے اور ماحول کو اپنے وجود میں سمیٹنے لگے...... اس سرمئی شام سے لطف اندوز ہونے کے لئے تو روشنی نے یہ سارا پروگرام بنایا تھا۔ دریا کے اطراف میں برقی قمقموں کی روشنیوں کا عکس دریا کے پانی میں نمایاں دکھائی دینے لگا...... سب ایک بڑی کشتی میں سوار ہو گئے...... درمیان میں چاروں کیک ایک قطار میں ایک ساتھ رکھے گئے اور ان کے ارد گرد رنگ برنگی کینڈلز رکھی گئیں۔ عین دریا کے وسط میں جا کر کینڈلز کو روشن کر کے کیک کاٹا گیا۔ سارا منظر اس قدر دلفریب اور خوبصورت لگ رہا تھا کہ ارد گرد گھومتے لوگ بھی رک کر انہیں دیکھنے لگے...... اور مسکرانے لگے۔

سب نے تالیوں کی گونج کے ساتھ "ہیپی برتھ ڈے...... ٹو...... یو...... ڈیر شہیر" کورس کی صورت میں گا کر اسے وش کیا...... دریا کے کنارے پر موجود لوگ بھی ان کے سنگ تالیاں بجا رہے تھے اور دور کھڑے ہو کر وش کر رہے تھے...... سب لوگ بہت خوش ہو رہے تھے اور ان کے ساتھ بھرپور انجوائے کر رہے تھے...... شہیر کی خوشی دیدنی تھی...... اس کی آنکھوں سے اس کے اندر کی خوشی کا بھرپور اظہار ہو رہا تھا...... اسے قطعی معلوم نہ تھا کہ اس کے دوست اس کے لئے اتنے خوبصورت اور خوشی بھرے جذبات رکھتے ہیں...... یہ اسکی یادگار برتھ ڈے تھی...... اس نے ساری زندگی گھر میں اپنی فیملی کے علاوہ کبھی کسی اور کے ساتھ برتھ ڈے نہیں منائی تھی۔

کالج جاتے ہی اسے سب سے پہلے روشنی نے وش کیا تھا۔ پھر مریم اور اسامہ نے......

''برتھ ڈے پارٹی کہاں دے رہے ہو؟'' روشنی نے وش کرنے کے بعد پہلا سوال کیا۔

''کہیں بھی نہیں......'' شہیر نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

''کیا...... مطلب......؟ کیا تم ہم سے برتھ ڈے وشز مفت میں لے رہے ہو......'' روشنی نے منہ بنا کر کہا۔

''کیا مطلب......؟ تو کیا ان وشز کی پیمنٹ کروں؟'' شہیر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں...... وہ تو کرنی پڑے گی'' اسامہ نے جلدی سے کہا۔

''لگتا ہے...... تم لوگوں نے کچھ پلان کر رکھا ہے'' شہیر نے دونوں کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... بھئی...... پلاننگ اینڈ مینجمنٹ کا زمانہ ہے...... اس کے بغیر تو کوئی کام نہیں ہو سکتا...... اور ہم نے تمہاری برتھ ڈے منانے کا پلان کر لیا ہے'' روشنی نے مسکراتے ہوئے کہا اور شہیر کو ایک جانب لے جا کر آؤٹنگ کے بارے میں بتایا اور سختی سے منع کیا کہ وہ کسی کو کچھ نہ بتائے کہ وہ سب کہاں جا رہے ہیں۔

لیکن شہیر کو کیک کاٹنے کی اس خوبصورت اور اسپیشل تقریب کا خود بھی علم نہ تھا...... یہ سب روشنی، مریم اور اسامہ کی پلاننگ تھی جو وہ چپکے چپکے کر رہے تھے۔

اور شہیر کو 'بگ سرپرائز' دینا چاہتے تھے۔

یہ 'بگ سرپرائز' سب کو بہت پسند آیا تھا۔ زل اور ارسلان نے بھی خوب انجوائے کیا تھا۔ ان کے دلوں میں جو رنجشیں تھیں وہ سب ختم ہو گئی تھیں۔

کیک کاٹنے اور کھانے کی تقریب کے بعد کشتی نے دریا کے دوسرے کنارے تک ایک چکر لگایا۔ دریا کی لہروں سے اٹھتی نم ہوا نے مارچ کی خوبصورت شام کو مزید خوبصورت بنا دیا تھا۔

''تھینکس روشنی......'' کشتی سے اترتے ہوئے شہیر نے اسے کہا۔

''یس...... آف کورس...... تمہیں تھینکس بولنا بھی چاہیے...... کیونکہ تم نے ایسا سرپرائز اور ایسی سیلیبریشن کبھی انجوائے نہیں کی ہوگی ہے نا'' روشنی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''تھینکس شہیر......'' ارسلان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بھئی...... سب لوگ تھینکس روشنی کو بولیں...... اس پارٹی کا سارا کریڈٹ اسے مریم اور اسامہ کو جاتا ہے'' شہیر نے مسکرا کر کہا تو زل سمیت سب لوگوں نے حیرت سے روشنی کی طرف دیکھا...... جس کی چمکتی آنکھیں خوشی سے مسکرا رہی تھیں۔

''بھئی اب واپسی کا کیا پروگرام ہے......؟ گھر پہنچتے ہوئے کافی ٹائم ہو جائے گا......'' اسامہ نے اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے جن لوگوں کے روٹس (راستے) میچ کر رہے ہیں...... وہ آپس میں پلان کر لیں...... ارسلان کے پاس بائیک ہے...... وہ چلا جائے گا۔ روشنی، فوزیہ، مریم اور نینا کو ڈراپ کر دے گی...... زل کو شہیر...... اور میں اسد کو ڈراپ کر دیتا ہوں......'' اسامہ نے سب کے بارے

میں بتایا۔

''او کے......اب چلیں'' شہیر نے زل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں......کافی ٹائم ہو رہا ہے......گھر سے کئی بار فون بھی آ چکا ہے'' زل نے قدرے پریشانی سے کہا اور دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ان کے پیچھے روشنی، عمر، ارسلان اور اسامہ کی گاڑیاں تھیں۔

شہیر خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا جبکہ اس کا ذہن مسلسل زل کے بارے میں سوچ رہا تھا اور زل مکمل طور پر خاموش بیٹھی تھی۔ اس کے ذہن میں بہت سی باتیں، الجھنیں اور سوچیں تھیں......وہ اپنی سوچوں میں اتنی گم تھی کہ اسے کئی بار شہیر کی موجودگی کا احساس ہی نہ رہا۔ جب وہ اچانک بریک لگاتا تو وہ چونک کر اسے دیکھتی۔

زل کے گھر سے چند فرلانگ کا فاصلہ تھا۔ جب شہیر نے معنی خیز نظروں سے زل کی طرف دیکھا۔

''زل......'' وہ آہستہ آواز میں بولا۔

زل نے چونک کر شہیر کی طرف دیکھا۔

''زل......میں بہت دنوں سے آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں مگر......'' شہیر نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو زل نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔

''کیا آپ......آج میری خوشی کے اس موقع پر مجھے ایک اور خوشی دے سکتی ہیں؟'' شہیر نے استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔

''کیا مطلب......؟'' زل نے حیرت سے پوچھا۔

''کیا آپ مجھے اپنی محبت کا قیمتی تحفہ دے سکتی ہیں؟'' شہیر نے مسکراتے ہوئے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

زل اس کی بات سن کر چونک گئی۔ اس کی آنکھوں اور چہرے پر حیرت کے گہرے آثار نمایاں ہونے لگے......اس نے گہری سانس لی اور خاموش ہو گئی۔

''آپ خاموش کیوں ہو گئیں......؟'' شہیر نے حیرت سے پوچھا۔

''کیا آپ کو معلوم ہے......آپ نے مجھ سے کیا ڈیمانڈ کی ہے؟'' زل نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......ایک تحفہ'' شہیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تحفے کا کہہ کر آپ نے مجھے اپ سیٹ کر دیا ہے مگر آپ جو ڈیمانڈ کر رہے ہیں......وہ کوئی معمولی شے نہیں......وہ میرے لئے میری زندگی اور میری سانسوں سے بھی زیادہ قیمتی ہے......اسے میں اس قدر آسانی سے تو نہیں دے سکتی......'' زل نے انتہائی سنجیدہ لہجے میں جواب دیا تو شہیر حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''میں......اس وقت کا انتظار کروں گا......جب آپ یہ قیمتی تحفہ مجھے عنایت کریں گی......اپنی مرضی سے......خود فیصلہ کر کے......'' شہیر

نے اسے اس کے عالیشان گھر کے سامنے ڈراپ کرتے ہوئے کہا۔

زل نے اس کی جانب دیکھا اور خاموشی سے گھر کے اندر داخل ہوگئی۔

☆

''شہیر...... تم اتنے لیٹ کیوں آئے ہو؟'' مسز تہمینہ فاخر نے شہیر کو دیکھتے ہوئے پوچھا جو ڈائننگ ٹیبل پر فاخر صاحب کے ساتھ بیٹھی کھانا کھا رہی تھیں۔

''دوستوں نے میری برتھ ڈے پارٹی ارینج کی تھی...... ان کے ساتھ بزی تھا'' شہیر نے سرد لہجے میں جواب دیا۔

''اور ہم بھی تمہارا انتظار کر رہے ہیں...... کہ آج کسی ہوٹل میں تمہاری برتھ ڈے سیلیبریٹ کرتے ہیں'' مسز فاخر نے کہا۔

''ممی...... پورے دن میں مجھے وش کرنا تو آپ کو یاد نہیں رہا...... مگر پارٹی کا آپ کو یاد رہ گیا تھا......؟'' شہیر نے قدرے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''اسی لئے نہیں کیا تھا کہ میں تمہیں سرپرائز دینا چاہتی تھی...... اور میں تمہاری برتھ ڈے کیسے بھول سکتی ہوں۔ تمہارے لئے تو آج میں نے اپنی ایک اہم میٹنگ کینسل کی ہے......'' مسز فاخر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''سوری...... میں نہیں جا سکتا...... میں بہت تھک گیا ہوں...... آپ لوگ کھانا کھالیجئے......'' شہیر نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''شہیر بیٹا...... سنو...... تو'' فاخر حسین نے پیچھے سے آواز دی مگر شہیر سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

''روز بروز اس میں بہت تبدیلیاں آ رہی ہیں...... کیا آپ نے آبزرو کیا ہے؟'' مسز فاخر نے بڑبڑاتے ہوئے شوہر سے کہا۔

''کیسی تبدیلیاں......؟'' فاخر صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

''کیا آپ کو کچھ محسوس نہیں ہو رہا؟'' مسز فاخر نے حیرت سے اور قدرے طنزیہ لہجے میں فاخر حسین کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں آپ جتنا ذہین نہیں ہوں'' فاخر حسین نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''آپ طنز کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے'' تہمینہ غصے سے بولی۔

''اس میں طنز کی کیا بات ہے...... کیا یہ ضروری ہو چکا ہے کہ آپ ہر بات کا الٹا مطلب ہی لیں'' فاخر صاحب غصے سے وہاں سے اٹھتے ہوئے بولے۔

''ہاں...... کیونکہ میرا دماغ الٹا ہے...... اور...... میں آپ جیسا نہیں سوچ سکتا...... ہر سیدھی بات کا آپ الٹا ہی جواب دیتی ہیں اور پھر مجھ پر طنز کرتی ہیں'' فاخر صاحب غصے سے کہہ کر باہر نکل گئے اور مسز تہمینہ وہیں بیٹھی منہ بسورنے لگیں۔ انہیں شہیر اور فاخر حسین کے رویوں پر غصہ آنے لگا۔ انہوں نے غصے میں ہی سمیر کا نمبر ملایا۔

''ہاں...... بیٹا...... کب آ رہے ہو؟'' مسز فاخر موڈ کو اس قدر خوشگوار بناتے ہوئے بولیں کہ قطعی اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ چند ثانیے پہلے وہ کس قدر غصے میں تھیں۔

''میں شدت سے تمہارے آنے کا انتظار کر رہی ہوں...... تم نہیں جانتے...... میں تمہارے بغیر کس قدر اداس ہوں...... ایک ایک دن انتظار میں کاٹنا مشکل ہو رہا ہے'' مسز تہمینہ نے فرط جذبات سے لبریز لہجے میں کہا...... شہیر کسی کام سے سیڑھیاں اترتا ہوا نیچے آ رہا تھا...... مسز فاخر کی باتیں سن کر وہ وہیں رک کر انہیں دیکھنے لگا۔

''ہاں...... تمہاری کمپنی کی کیا بات ہے؟ میں اتنا کسی کے ساتھ انجوائے نہیں کرتی...... جتنا تمہارے ساتھ کرتی ہوں'' مسز فاخر نے ہنستے ہوئے کہا تو شہیر کے چہرے پر مختلف قسم کے تاثرات نمایاں ہونے لگے۔ وہ مسز فاخر کی باتیں سن کر انہی قدموں پر واپس لوٹ گیا۔ اس کے اندر عجیب قسم کے جذبات پیدا ہونے لگے...... پہلی بار اس کے دل کے اندر ایسے احساسات و جذبات پیدا ہو رہے تھے جو اس کی اپنی سمجھ سے بھی باہر تھے ان احساسات و جذبات میں منفی پہلو نمایاں تھا...... اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ممی کو برا سمجھے یا سمیر کو...... دونوں کے ساتھ اس کا خونی رشتہ تھا۔ دونوں سے اختلافات رکھتے ہوئے بھی وہ انہیں بہت چاہتا تھا مگر اب اس چاہت میں ناپسندیدگی کا عنصر نمایاں ہو رہا تھا۔ وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں آ گیا۔ اسے اپنے دل میں بوجھ سا محسوس ہونے لگا۔

ممی کی سمیر سے شدید محبت نے اس کے دل کے اندر اضطراب پیدا کرنا شروع کر دیا۔ ایسی بے قراری اور بے چینی اس کے اندر پیدا ہونے لگی کہ اس کو اپنے دل کے اندر اک آگ سی جلتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔

''ممی مجھ سے محبت کرتی ہیں...... مگر اتنی نہیں جتنی سمیر سے...... اور سمیر...... ان کو مجھ سے زیادہ اچھا لگتا ہے کیوں......؟''

یہ کیسی باتیں ہیں......؟ یہ کیسے احساسات ہیں...... اور یہ سب کچھ کیا ہے...... جو میرے دل کو اتنا مضطرب، اتنا بے چین اور اتنا بے قرار کر رہا ہے......؟'' شہیر جذبات سے مغلوب ہو کر نم آنکھوں کے ساتھ اپنے کمرے کی کھڑکیوں کے شیشے میں سے سیاہ آسمان کو دیکھنے لگا...... جہاں ستارے پوری آب و تاب سے چمک رہے تھے مگر ان جھلملاتے ستاروں میں کہیں کہیں ایسے ستارے بھی موجود تھے جن کی روشنی بہت کم تھی اور بہت مدھم لگ رہے تھے...... یوں جیسے بے دلی سے سب ستاروں کا ساتھ دینے پر مجبور ہوں...... جیسے ان کے دل بھی بے تاب ہوں جس طرح شہیر کا دل بھی بے تاب ہو رہا تھا......

☆

روشنی کی آنکھوں میں کل کی خوبصورت یادوں اور شہیر کے خراج تحسین سے پیدا ہونے والے خوبصورت نرم و لطیف احساسات اور ٹھنڈے جذبات سے پیدا ہوتے والی سوچوں اور ان سے جنم لینے والے رتجگوں کا عکس اس کی خوبصورت، جھلملاتی آنکھوں میں نمایاں تھا نجانے کیا ہوا تھا...... کہ...... بہت دنوں سے پیدا ہونے والے حسین خیالات کو شہیر کی باتوں سے ایسی لو ملی تھی کہ پارٹی سے واپس آنے کے بعد اس کے دل کی دنیا بدل چکی تھی...... شہیر جو پہلے بہت دور کھڑا دکھائی دیتا تھا...... اب اس کے بالکل قریب آ گیا تھا...... اور اس نے اپنے دل کے سارے دروازے اس کے لیے کھول دیئے تھے...... جن میں سے شہیر بلا روک ٹوک آ جا رہا تھا...... شہیر کے بارے میں سوچیں لہروں کی مانند ایک دم اس کے دل کا احاطہ کر لیتیں اور اگلے ہی لمحے غائب ہو جاتیں۔ کل سارا دن وہ شہیر کے قریب رہی تھی اور اس کی قربت نے اس کے دل کے اندر جو لطیف

احساسات پیدا کیے تھے......ان کو وہ ''محبت'' کا نام دے پائی تھی......شاید محبت اسے ہی کہتے ہیں......

ہاں......دل جس کے نام سے دھڑکنے لگے اور جس کو دیکھتے ہی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں......وہ......جو کہیں دور ہو مگر دل کے بہت پاس ہو......اور جس کی سوچ و خیالات سے دل کبھی بھی خالی نہ ہو......کان کچھ اور سنیں......مگر......دل کسی اور کی بات کرے......آنکھیں کسی اور طرف دیکھتی ہوں مگر دل کوئی اور منظر بیان کرے......کسی اور کو دیکھنے کے لیے مضطرب ہو......دماغ بہت سی باتیں سوچے مگر دل صرف ایک کے بارے میں کچھ خاص سوچنا چاہیے......ایسے لطیف احساسات کو 'محبت' ہی کہا جا سکتا ہے اور روشنی کے دل نے اس کو یقین دلا دیا تھا کہ شہیر صرف اور صرف اس سے محبت کرتا ہے......زمل کے بارے میں وہ کچھ روز پہلے کنفیوژ ضرور ہوئی تھی مگر شہیر اور زمل کو اس نے بارہا ایسی نظر سے دیکھا تھا......اور......اسے کچھ بھی ایسا محسوس نہیں ہوا تھا......اور پھر......اس کے پوچھنے پر زمل کا حیرانگی سے چونکنا......زمل کی آنکھوں میں شہیر کے لئے لاپرواہی اور شہیر کی آنکھوں میں زمل کے لئے گہری خاموشی......روشنی کے دل نے اس کو یقین دلا دیا تھا کہ شہیر صرف اور صرف اس سے محبت کرتا ہے......شہیر کے دل میں صرف روشنی کی وجہ سے ہی 'روشنی' ہے......اور شہیر کی آنکھیں روشنی کی وجہ سے ہی روشن رہتی ہیں......اس کے اندر باہر صرف اور صرف روشنی ہے۔

روشنی ان خوشگوار سوچوں میں گم اپنے ڈیپارٹمنٹ کی طرف جا رہی تھی جب اس نے اچانک شہیر کو سامنے آتے ہوئے دیکھا تو اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں......اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا......نجانے یہ کیسا احساس تھا......؟

جو اس کے دل پر حاوی ہو رہا تھا اور اس کا دل بے قابو ہو رہا تھا۔

شہیر نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا......

روشنی کی آنکھیں اسے دیکھ کر چمکنے لگیں......

''ہائے......روشنی......کیسی ہو؟'' شہیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''فائن......'' روشنی نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔

''میں تمہیں ہی تلاش کر رہا تھا......؟'' شہیر نے کہا۔

''کیوں......؟'' روشنی نے حیرت سے پوچھا۔

''میں تمہیں کل کی پارٹی کی مووی دکھانا چاہ رہا تھا......بہت مزے کی ہے'' شہیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ریئلی......'' روشنی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......آؤ کیفے ٹیریا میں چلتے ہیں'' شہیر نے کہا۔

''کیا آج کلاسز نہیں ہو رہیں؟'' روشنی نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں......مسز عطیہ آج آف ہیں......اس لئے ان کا پیریڈ فری ہے'' شہیر نے کہا تو وہ اس کے ساتھ چل پڑی۔

کیفے ٹیریا میں ایک کارنر ٹیبل پر دونوں بیٹھے شہیر کے موبائل پر مووی دیکھ رہے تھے اور بہت ہنس رہے تھے۔ مووی میں روشنی ہر طرف

نمایاں تھی۔ روشنی کے ہر پوز اور ہر اینگل کو capture کیا گیا تھا۔ دونوں مووی دیکھتے ہوئے باتیں بھی کر رہے تھے اور باتیں کرتے ہوئے بے تحاشا ہنس رہے تھے۔ جب عمر مصطفیٰ، اسامہ، ارسلان اور زمل کیفے ٹیریا میں داخل ہوئے......زمل نے ایک ٹک شہیر کی طرف دیکھا تو شہیر کی نگاہوں نے بے تابی سے اس کی آنکھوں کا طواف کیا......اس کا دل اسے دیکھ کر مضطرب ہونے لگا اور دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو کر اس کے سینے کے اندر مچلنے لگیں۔

''زمل......دیکھو......کیسی مزے کی مووی ہے'' روشنی نے کہا۔

''دکھاؤ......اور شہیر تم اکیلی کو مووی کیوں دکھا رہا ہے؟'' اسامہ نے مذاقاً شرارت سے کہا تو روشنی نے چونک کر اسے دیکھا......جیسے اس کی چوری اچانک پکڑی گئی ہو......

''ن......نہیں......ایسی تو بات نہیں......'' روشنی نے بوکھلاتے ہوئے کہا۔

''تو پھر کیسی بات ہے؟'' عمر نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔

''یار......تم لوگوں میں سے کوئی نظر نہیں آیا تو پھر میں نے روشنی کو دکھا دی......'' شہیر نے کہا۔

''چلو......مووی دیکھو'' ارسلان نے کہا۔

اور سب مووی دیکھنے لگے......زمل خاموش تھی اور کافی بے دلی سے مووی دیکھ رہی تھی۔ سب لوگ مووی دیکھتے ہوئے ان واقعات کو بھی ڈسکس کر رہے تھے جو ان کو کل وہاں پیش آئے تھے......شہیر گاہے بگاہے نظریں چرا کر زمل کی طرف دیکھتا اور زمل جان بوجھ کر اس سے نظریں ملانے سے احتراز کرتی۔

شہیر ہر بات میں روشنی کی تعریفیں کر رہا تھا اور روشنی کے چہرے پر قوس وقزح کے خوبصورت رنگ بکھر رہے تھے اور روشنی کا چہرہ ان رنگ برنگی کرنوں سے جگمگا رہا تھا۔ وہ مسکرا کر شہیر کی جانب دیکھتی اور ہر مسکراہٹ پر اس کا دل باغ باغ ہو جاتا۔

شہیر کی محبت نے اس کے دل کے اندر جو جوت جلائی تھی۔ اس نے روشنی کو ایسا مسرور کر دیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو آسمانوں پر اڑتے ہوئی محسوس کر رہی تھی۔

''کیا واقعی شہیر اس سے محبت کرنے لگا ہے؟'' وہ چونک کر اپنے آپ سے بار بار پوچھتی......

''ہاں......'' وہ خود ہی اپنے آپ کو جواب دے کر مسکرانے لگتی۔

''مگر......شہیر نے اظہار محبت تو نہیں کیا'' وہ دل میں اچانک اٹھنے والے وسوسے پر چونکی۔

''محبت کا اظہار اشاروں، کنایوں سے شروع ہوتا ہے اور شہیر کی ہر بات میں اس کے لئے واضح اشارہ ہے......وہ شاید اسے اس بات کے لئے ذہنی طور پر تیار کر رہا ہے'' وہ خود ہی مسکرا کر توجیہ پیش کرتی......اور خود بخود زیر لب مسکرانے لگتی......اس کا دل بھی مسکرا کر اس کی تائید کرتا۔

☆

شہیر کے لئے زمل کی خاموشی اور نظروں کا چرانا بہت حیران کن تھا......

وہ گھبرا کر بیڈ پر لیٹے ہوئے...... پینٹنگ بناتے ہوئے...... ہر وقت ہر لمحہ صرف اور صرف اس کے بارے میں سوچتا۔ زمل کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجتے۔

''تحفے میں جو آپ ڈیمانڈ کر رہے ہیں...... وہ کوئی معمولی شے نہیں...... وہ میرے لئے میری زندگی اور میری سانسوں سے بڑھ کر قیمتی ہے...... اسے میں اس قدر آسانی سے تو نہیں دے سکتی''

''اور میں اس وقت کا انتظار کروں گا...... جب آپ یہ تحفہ مجھے عنایت کریں گی...... اپنی مرضی سے...... خود فیصلہ کر کے'' شہیر بار بار اپنے الفاظ یاد کرتا......

اس کے لئے ایک ایک لمحہ اور ایک ایک پل مشکل ہو رہا تھا۔ زندگی میں انتظار کتنا کٹھن ہے...... انسان ایسی رسی کے ساتھ لٹک رہا ہوتا ہے جسے نہ چھوڑ سکتا ہے اور نہ ہی اپنے ساتھ باندھنا چاہتا ہے۔ انتظار کا ایک ایک پل کتنا اذیت ناک ہوتا ہے...... اور یہ وہی شخص جانتا ہے جو انتہائی بے بسی سے، مصلحتوں کا شکار ہو کر خاموشی سے مناسب وقت اور قدرت کے فیصلے کا منتظر ہوتا ہے...... انتظار انسان کو جس اضطراری کیفیت میں مبتلا رکھتا ہے۔ اس کیفیت کو نہ تو کوئی نام دیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس سے فرار ممکن ہے......

شہیر بھی ایسی اضطراری کیفیت میں مبتلا تھا جیسے ہی اس کے موبائل پر کوئی کال آتی وہ مضطرب ہو کر جلدی سے موبائل پکڑتا اور زمل کی بجائے کسی اور کی کال دیکھ کر گہری سانس لے کر خاموش ہو جاتا۔ کالج جاتا تو سارا راستہ زمل کے بارے میں سوچتا رہتا...... اور توقع کرتا کہ شاید آج زمل اسے کوئی خوشخبری سنائے گی...... اس سے وہ بات کہے گی...... جس کو سننے کے لئے وہ کس قدر بے تاب ہے...... مگر کالج میں زمل کو خاموش دیکھ کر وہ اور مضطرب ہو جاتا......

وہ کوئی بات کیوں نہیں کہتی......؟

اور وہ خود اس سے کیا بات کرے......؟

اس سے کیا پوچھے......؟

وہی جو وہ ایک بار کہہ چکا ہے...... اور اس کا جواب بھی سن چکا ہے...... اب کچھ بھی کہنے کی باری زمل کی ہے اور زمل کچھ کہنے میں نجانے کیوں اتنا وقت لے رہی ہے نجانے وہ کیا کچھ سوچ رہی ہے......

اس نے کہا تھا...... اس کی 'محبت' اس کی زندگی کی سب سے قیمتی شے ہے اور...... اتنی قیمتی شے کسی دوسرے کو دینے کے لئے نجانے کئی بار سوچا جاتا ہے۔ کتنے کٹھن مرحلوں میں سے انسان کو گزرنا پڑتا ہے...... شاید زمل بھی ان مراحل میں سے گزر رہی تھی...... شاید اسی لئے وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔

وہ ساری ساری رات اس کے بارے میں سوچتا......

نجانے وہ کیا فیصلہ کرے گی......؟

وہ جب اس سوال پر سوچتا......تو اپنی ذات کو، اپنی شخصیت کو اور اپنے وجود کو تنقید کے ہر زاویے سے پرکھتا......تو اس کا دل اس کو یہ کہہ کر مطمئن کرتا......کہ اس میں وہ سب کچھ تو ہے جس کی خواہش ایک لڑکی کر سکتی ہے۔خوبصورت، ہینڈسم، سمارٹ، ڈیسنٹ، امیر کبیر، ٹیلنٹڈ نوجوان......کس چیز کی اس میں کمی تھی......اور سب سے بڑھ کر اس کا زل سے خود اظہار محبت......زل کو اور کیا چاہیے تھا......؟ وہ اپنے دل کی اس توجیہہ اور تسلی پر مطمئن ہو جاتا......اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیلنے لگتی......دل خوشی سے جھوم اٹھتا......

اور وہ ان لمحوں کے بارے میں سوچتا......جب زل اس سے اقرار محبت کرے گی......وہ اس وقت کیا کرے گا؟ اس سے کیا کہے گا......؟ اس کا ردعمل کیا ہوگا......؟ وہ جواباً زل کو کیا کہے گا......؟ وہ ان تمام باتوں پر سوچتا اور مطمئن ہو جاتا......

وہ دن اس کی زندگی کا سب سے زیادہ خوشی کا دن ہوگا جب زل اس سے اقرار محبت کرے گی......اور وہ اس کی محبت کے جواب میں کیا کہے گا؟ اس نے وہ سارے الفاظ اور جملے ترتیب دے لئے تھے اور ہر رات کو سونے سے پہلے وہ کئی کئی بار ان الفاظ اور جملوں کو دہراتا اور مطمئن ہو جاتا۔

اسے کامل یقین تھا کہ زل، آج......یا......کل......یا پھر کسی روز ضرور اس سے اقرار محبت کرے گی......اس کی محبت کا جواب 'محبت' سے دے گی......اس کا دل اس کو یقین دلاتا اور وہ مطمئن ہو جاتا اور اس اطمینان سے اس کا چہرہ خوشی سے تمتمانے لگتا......

☆

زل عجیب کشمکش و پیچ میں مبتلا تھی......اسے شہیر سے اس بات کی توقع نہ تھی......کہ وہ اس سے یوں اظہار محبت کرے گا۔وہ بظاہر اً خاموش، کم گو، سنجیدہ اور سوبر انسان تھا اور اسے قطعی امید نہ تھی کہ وہ اس کے لئے ایسے جذبات اپنے دل میں رکھتا ہے......اور اس کے بعد اس کا جب بھی شہیر سے آمنا سامنا ہوتا......تو شہیر کی آنکھوں میں گہرا استفہام ہوتا......وہ اس کی طرف یوں دیکھتا جیسے اس سے اپنے سوال کا جواب طلب کر رہا ہو اور وہ اس سے نظریں چراتی......اسے کیا کہتی......؟

وہ ذہنی طور پر بہت پریشان رہنے لگی تھی۔

پروفیسر رضا ربانی کی کلاس میں سب اسٹوڈنٹس موجود تھے اور وہ اے جی، لیونارڈو......صادقین......اور استاد اللہ بخش کے اسٹائلز آف آرٹ پر ڈسکشن کر رہے تھے اور تمام اسٹوڈنٹس بہت محو ہو کر سننے میں مصروف تھے جبکہ زل کا ذہن کہیں اور گم تھا......

''آرٹ میں سب سے اہم بات سبجیکٹ اور پھر ٹریٹمنٹ آف سبجیکٹ ہوتا ہے......یہ آرٹسٹ کے ہاتھ میں ہوتا ہے کہ وہ عام اور معمولی سی شے کو بھی اپنے فن اور اسٹائل سے خاص اور یونیک بنا دے اور یہ بھی آرٹسٹ کے ہاتھ میں ہوتا ہے کہ وہ بہت خاص، خوبصورت اور یونیک چیز کو بگاڑ کر رکھ دے......''پروفیسر ربانی نے کہا۔

''سر یہ کیسے ممکن ہے......کہ ایک آرٹسٹ خود ہی خوبصورت اور یونیک چیز کو بگاڑ دے''مریم نے حیرت سے پوچھا۔

''رائٹ......یہ کوئسچن ذہن میں ضرور آتا ہے......اور اس کا جواب بھی میں آپ لوگوں سے سننا چاہوں گا......مریم کے اس سوال کا

جواب کون دے گا......؟'' سر رضا ربانی نے ساری کلاس کے چہروں کی طرف بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''عمر......آپ بتائیے......'' سر رضا ربانی نے عمر سے پوچھا۔

''سر......میرے خیال میں جان بوجھ کر تو کوئی نہیں بگاڑے گا......ممکن ہے کہ اس آرٹسٹ کو وہ چیز اتنی خوبصورت نہ لگ رہی ہو......جتنی وہ دوسروں کو لگ رہی ہو......'' عمر نے جواب دیا تو سر رضا ربانی مسکرانے لگے۔

''کسی حد تک......آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں......لیکن آپ نے وہ خاص بات پوائنٹ آوٹ نہیں کی......جو اس کی وجہ بن سکتی ہے......ارسلان آپ بتائیے؟'' پروفیسر رضا ربانی نے ارسلان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''سر......وہ آرٹسٹ اتنا انٹیلیجنٹ نہیں ہوگا......جتنا اسے دوسرے سمجھتے ہوں گے......یہ تو اس کے آرٹ سے اس کا پول کھلے گا''

ارسلان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تو ساری کلاس ہنسنے لگی......سر ربانی نے بھی قہقہہ لگایا۔ زل نے ایک دم چونک کر سب کی طرف یوں دیکھا جیسے گہری نیند سے بیدار ہوئی ہو......اس کے چہرے پر گہرا استفہام تھا۔

''ٹھیک ہے......ارسلان کو بھی ٹھیک مانتے ہیں......کیونکہ ہیں تو یہ بھی آرٹسٹ......'' پروفیسر ربانی نے مسکراتے ہوئے کہا تو ارسلان کھسیا گیا۔

''اوکے......آپ میں سے کون یہ سمجھتا ہے کہ وہ اس سوال کا بہتر جواب دے سکتا ہے......؟'' پروفیسر ربانی نے سب اسٹوڈنٹس کے چہروں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

ہر طرف گہری خاموشی چھا گئی۔

''سر......مے آئی......؟'' شہیر نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''یس آف کورس'' سر ربانی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''سر......میرے خیال میں آرٹسٹ کا اینگل آف آبزرویشن، اس میں بہت matter کرتا ہے ہر آرٹسٹ چیزوں کو اپنے اپنے اس مخصوص زاویے سے دیکھتا ہے......جو اسے قدرتی طور پر ملا ہے......آئی مین گاڈ گفٹڈ ٹیلنٹ اور یہ ٹیلنٹ ہر انسان کو دوسرے سے مختلف ملا ہے......مثال کے طور پر مجھے یہ سائیڈ پر رکھا statue بہت مختلف نظر آرہا ہے اور جب آپ ساری کلاس سے باری باری پوچھیں گے تو سب کی آبزرویشن مختلف ہوگی......اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آرٹسٹ اپنی ہی چیز کو خود ہی کیسے بگاڑتا ہے......؟

''خود کوئی بھی آرٹسٹ نہیں بگاڑتا......یہ ہم دیکھنے والے کہتے ہیں کہ اس نے چیز بگاڑ دی ہے۔ ممکن ہے اس نے اس چیز کو نیا ٹچ دینے کے لئے کوئی نئی technique استعمال کی ہو......جس کو ہمارا ذہن نہ تو سمجھ رہا ہو اور نہ ہی قبول کر رہا ہو......اور ہم اسے کہتے ہیں کہ آرٹسٹ نے وہ چیز خود ہی بگاڑ دی ہے......جبکہ آرٹسٹ اس کی بیوٹی کی 101 وجوہات بتا سکتا ہے......یہ سب کچھ ''اینگل آف آبزرویشن'' ایکسپریشن اور ایکسپوژر پر depend کرتا ہے'' شہیر نے بہت سنجیدگی اور شستہ انداز میں تفصیل بیان کی تو سب اس کی طرف پرستائش نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

''ویری گڈ......بہت اچھے انداز میں شہیر نے سب کچھ explain کیا ہے......یو آر اے جینئس......'' سر ربانی نے مسکراتے ہوئے

اس کی تعریف کی تو سب شہیر کی طرف دیکھنے لگے۔۔۔۔۔زل کبھی سر ربانی کی طرف دیکھتی تو کبھی شہیر کے چہرے کی طرف۔۔۔۔۔جو سر ربانی کے ہر تعریفی جملے پر زل کی طرف دیکھتا اور زل آنکھیں جھکا لیتی۔

روشنی کے چہرے پر مسکراہٹ نمایاں ہونے لگی۔۔۔۔۔اور اس مسکراہٹ میں اس کے دل کا اطمینان اور خوشی شامل تھی۔۔۔۔۔اسے شہیر پر فخر محسوس ہونے لگا تھا۔۔۔۔۔نجانے کیوں وہ شہیر کے بارے میں بہت پوزیسو ہوتی جا رہی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے شہیر صرف اور صرف اس کا ہی ہے۔۔۔۔۔اس کی ملکیت ہے اس کی اچھائی و برائی۔۔۔۔۔اس کی شہرت۔۔۔۔۔اس کی کامیابی۔۔۔۔۔اس کے پرابلمز اور غم وخوشی۔۔۔۔۔ہر ہر بات کو شیئر کرنے کا حق صرف اور صرف روشنی کو ہے۔۔۔۔۔

سب اسٹوڈنٹس کلاس کے بعد اپنے اپنے پراجیکٹس میں مصروف ہو گئے۔۔۔۔۔زل کے دل پر عجیب سا بوجھ تھا۔۔۔۔۔ایسی مایوسی اور بے قراری تھی جس کی اسے سمجھ نہ آ رہی تھی۔۔۔۔۔

''تم کیوں اپ سیٹ لگ رہی ہو؟'' ارسلان نے زل کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ خاص نہیں۔۔۔۔۔کبھی کبھی دل بلاوجہ اداس ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔'' زل نے اسے ٹالنے کے انداز میں کہا۔

''لیکن ہر اداسی کی بھی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے'' ارسلان نے اس کے چہرے کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''جس بات کی طرف تمہارا اشارہ ہے۔۔۔۔۔ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔۔۔وہ بات ختم ہو چکی ہے'' زل نے انتہائی سنجیدگی سے جواب دیا۔

''گڈ۔۔۔۔۔شکر ہے تم اس فیز سے نکلی۔۔۔۔۔یقیناً اب تمہیں میری باتوں پر یقین آ گیا ہو گا۔۔۔۔۔'' ارسلان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔۔۔۔۔یقین۔۔۔۔۔آ۔۔۔۔۔تو جاتا ہے مگر بہت مشکل سے۔۔۔۔۔'' زل نے آہ بھر کر کہا۔

''کیا مطلب۔۔۔۔۔؟'' ارسلان نے چونک کر پوچھا۔

''ارسلان۔۔۔۔۔کسی کی بات۔۔۔۔۔یا۔۔۔۔۔دعوے پر یقین کرنے کے لئے کیا چیز ضروری ہوتی ہے؟'' زل نے پوچھا۔

''آپ کے دل کا مطمئن ہونا۔۔۔۔۔'' ارسلان نے اس کے چہرے کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''اور دل کیسے مطمئن ہوتا ہے؟'' زل نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''جب دل میں وسوسے اور خدشے نہ پیدا ہوں۔۔۔۔۔کیا تمہارا دل مضطرب ہو رہا ہے۔۔۔۔۔؟'' ارسلان نے اچانک پوچھا تو زل چونک کر اس کی جانب دیکھنے لگی۔

''ت۔۔۔۔۔تمہیں کیسے معلوم ہوا۔۔۔۔۔؟'' زل نے حیرت سے پوچھا۔

''تمہاری آنکھیں۔۔۔۔۔تمہارے دل کی کیفیت بیان کر رہی ہیں اور اس وقت تمہارا دل بہت مضطرب ہو رہا ہے۔۔۔۔۔کیا بات ہے۔۔۔۔۔کیا مجھ سے شیئر نہیں کرو گی؟'' ارسلان نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''نہیں۔۔۔۔۔'' وہ دوٹوک لہجے میں بولی۔

''ٹھیک ہے..... ایزیوش..... کچھ خوشیاں، کچھ غم..... کچھ راز صرف انسان کے اندر تک ہی محدود رہنے چاہئیں..... بعض اوقات ان کو شیئر کرنے سے ان کی کسک اور بڑھتی جاتی ہے..... باہر چلو گی.....؟'' ارسلان نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں.....'' وہ قطعیت سے بولی۔

''ٹھیک ہے..... میں جا رہا ہوں.....'' ارسلان کہہ کر وہاں سے چلا گیا اور زل اپنے پراجیکٹ پر کام کرنے لگی.....

ارسلان ٹھیک کہتا ہے کسی پر یقین کرنے کے لئے..... دل کا مطمئن ہونا بہت ضروری ہے..... اور جب دل ہی بے قرار ہو..... تو وہ کسی پر کیا یقین کرے گا..... مجھے یقین کیوں نہیں آ رہا.....؟

میرا دل مضطرب کیوں ہے.....؟

میں اپنے دل کو کیسے مطمئن کروں.....؟

وہ بے بسی سے سوچنے لگی۔

☆

شہیر روشنی کو ڈراپ کرنے جا رہا تھا۔ روشنی کی گاڑی خراب ہو گئی تھی..... اور شہیر نے اسے کالج پارکنگ میں دیکھتے ہی ڈراپ کرنے کی آفر کی تھی..... جسے روشنی نے فوراً قبول کر لیا تھا۔ اس کے لئے شہیر کی قربت کے لمحات ہر شے سے بڑھ کر قیمتی ہوتے جا رہے تھے..... اس کے دل کے اندر شہیر کے لئے جو جذبات پیدا ہوئے تھے..... وہ اس کی قربت سے مزید پختہ ہو رہے تھے.....

''شہیر..... تم نے آج سر رضا ربانی کی کلاس میں بہت اچھی اور Logical گفتگو کی.....'' روشنی نے بات شروع کرتے ہوئے کہا۔

''اتنی Logical بھی نہیں تھی..... تم خواہ مخواہ امپریس ہو رہی ہو.....'' شہیر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''کسی میں کوئی ایسی بات ضروری ہوتی ہے..... جو دوسروں کو متاثر کرتی ہے'' روشنی نے ذومعنی انداز میں کہا۔

''ہوتی ہو گی..... مگر مجھ میں نہیں'' شہیر مسکرا کر بولا۔

''تم اپنے آپ underestimate کیوں کرتے ہو؟'' روشنی نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں..... ایسا تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں..... البتہ overestimate کرتے ہوئے کئی بار سوچنا پڑتا ہے.....'' شہیر نے کہا۔

''اب یہ مت کہنا..... کہ..... تم منفرد انسان نہیں ہو'' روشنی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تم کہتی ہو..... تو..... مان لیتا ہوں.....'' شہیر شرارت سے مسکراتے ہوئے بولا۔

''کیوں.....؟'' روشنی نے جان بوجھ کر معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''بھئی..... میں تمہیں ناراض نہیں کر سکتا'' شہیر مسکرا کر بولا۔

''کیا یہ مجھے خوش کرنے کے لئے کہہ رہے ہو؟'' روشنی نے پوچھا۔

''نہیں...... حقیقت بتا رہا ہوں...... روشنی تم بہت نائس ہو...... اور...... نائس لوگوں کو میں ناراض کرنا نہیں چاہتا......'' شہیر نے مسکراتے ہوئے کہا اور روشنی کو اس لمحے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ ہواؤں میں اڑ رہی ہو...... شہیر کی باتیں...... اس کا دیکھنا...... اسے اس کے وجود کا حسین احساس دلانا...... سب کچھ اس کے اندر ہمیشہ کے لئے امر ہوتا جا رہا تھا...... اس کا دل اس لمحے کیا کچھ محسوس کر رہا تھا...... یہ صرف وہی جانتی تھی...... وہ شہیر سے باتیں کر رہی تھی مگر اس کا دل نئے اور انوکھے جذبوں سے روشناس ہو رہا تھا...... شہیر کی ہر بات کو وہ اپنے دل کے اندر بہت گہرائی میں محسوس کر رہی تھی...... اور ان باتوں کا اثر کسی نقش کی صورت میں اس کے دل کے اندر ہمیشہ کے لئے کندہ ہو رہا تھا۔

شہیر اسے ڈراپ کر کے چلا گیا۔

مگر روشنی کہیں کھو گئی تھی......

☆

سمیر انگلینڈ سے آ رہا تھا......

مسز فاخر خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھیں...... کبھی گھر کا کوئی انتظام دیکھتی...... کبھی کوئی...... کبھی کچن میں جا کر کک کو مختلف ہدایات دیتیں...... کبھی maid کو گھر کے کونے کھدرے تک صاف کرنے کا حکم دیتی......

مسز فاخر کا پی۔اے بار بار انہیں فلائٹس کے بارے میں مختلف اطلاعات بہم پہنچا رہا تھا......

شہیر گھر پہنچا...... تو چوکیدار سے لے کر پی اے تک...... ہر شخص کو پھرکی کی طرح گھومتے دیکھا...... یوں لگ رہا تھا...... سمیر نہیں بلکہ کوئی وزیر اعظم آ رہا ہو...... اور ان سب سے بڑھ کر مسز فاخر کے چہرے پر خوشی کے نمایاں تاثرات کو دیکھ کر بری طرح چونکا۔

''شہیر...... آج شام کو سمیر آ رہا ہے...... تم کہاں تھے......؟'' مسز فاخر نے پوچھا۔

''وہ تو آپ کو دیکھ کر ہی اندازہ ہو رہا ہے...... کہ سمیر آ رہا ہے؟'' شہیر نے قدرے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب ہے؟'' مسز فاخر نے ایک دم چونک کر پوچھا۔

''دنیا میں سمیر کے علاوہ نہ تو کوئی اور آپ کو بہت عزیز ہے اور نہ ہی کوئی اور آپ کو اتنی خوشی دے سکتا ہے...... جتنی کہ سمیر......'' شہیر نے کہا۔

''تم یہ کیسی باتیں کر رہے ہو......؟'' مسز فاخر نے حیرت سے پوچھا۔

''کیا یہ حقیقت نہیں......؟'' شہیر نے مسز فاخر کی طرف بغور دیکھتے ہوئے پوچھا تو مسز فاخر اسے دیکھ کر خاموش ہو گئیں......

''ہر انسان اپنی قدر و منزلت خود اسٹیبلش کرتا ہے......'' وہ بھی قدرے توقف کے بعد بولیں۔

''اور...... جو...... لوگ ایسا کرنے میں ناکام ہو جائیں...... کیا انہیں نظر انداز کر دینا چاہیے یا پھر...... انہیں مزید ورتھ لیس سمجھنا چاہیے......'' شہیر نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''میں آبزرو کر رہی ہوں...... تم کئی روز سے بہت عجیب باتیں کر رہے ہو...... تم پہلے تو ایسے نہیں تھے...... تمہیں کیا ہوتا جا رہا ہے......

دوسروں کے لئے اتنی ناپسندیدگی...... اور وہ بھی اپنوں کے لئے...... تمہارے دل میں کیوں پیدا ہو رہی ہے؟ تم بھی میرے بیٹے ہو...... تمہارا برا نہ تو میں سوچ سکتی ہوں اور نہ ہی تمہیں نظر انداز کر سکتی ہوں'' مسز فاخر نے نرم لہجے میں اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''ممی...... انسان میں کوئی تبدیلی اچانک نہیں آتی...... سب کچھ انسان کے جینز میں موجود ہوتا ہے...... اور جینز کے ذریعے اسے وراثت میں ملتا ہے......'' شہیر نے جواب دیا۔

''تمہارا کہنے کا مطلب ہے کہ یہ نفرت...... یہ منفی جذبے تمہیں والدین سے یعنی ہم سے وراثت میں ملے ہیں......'' مسز فاخر نے حیرت سے کہا۔

''کچھ نہ کچھ...... کسی نہ کسی حد تک تو ضرور ملتا ہے...... اور کچھ والدین کا رویہ...... انسان کو ایسا کچھ دیتا ہے...... کچھ عرصہ پہلے میں ایسا نہیں تھا...... کیونکہ میں نے آپ کو اس زاویے سے آبزرو نہیں کیا تھا...... ممی...... سمیر سے بات کرتے ہوئے آپ کا لب ولہجہ بالکل مختلف ہوتا ہے اور مجھ سے بات کرتے ہوئے بالکل اور ڈیڈی سے بات کرتے ہوئے آپ اور ہوتی ہیں......'' شہیر نے جواب دیا۔

''تمہارے اندر جو نفرت پیدا ہو رہی ہے...... کیا اس کی ذمہ دار میں ہوں......؟'' مسز فاخر نے حیرت سے پوچھا۔

''معلوم نہیں...... مگر میں آپ کی وجہ سے بہت ڈسٹرب ہو رہا ہوں'' وہ قدرے صاف گوئی سے بولا۔

''میری وجہ سے ڈسٹرب...... اوہ...... تو......'' مسز فاخر نے انتہائی حیرت سے اسے دیکھ کر پوچھا۔

''یس...... آئی...... ایم......'' اس نے الفاظ پر زور دیتے ہوئے ماں کی طرف بغور دیکھا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ مسز فاخر حیرت اور تشویش سے اسے دیکھتی رہ گئیں...... انہیں قطعی معلوم نہ تھا کہ وہ اس حد تک ماں کے بارے میں منفی باتیں سوچتا ہے......

اس کی سوچ روز بروز کیوں بدلنے لگی ہے......؟

اسے مجھ سے نفرت کیوں ہونے لگی ہے......؟

اور سمیر کو وہ کیوں ناپسند کرنے لگا ہے......؟

شہیر ایسا تو نہیں تھا......؟

وہ کیوں اتنا بدل رہا ہے......؟

☆

زل اور روشنی ایک منی ایچر پینٹنگ کے بارے میں ڈسکشن کر رہی تھیں جو زل نے بنائی تھی...... مغلیہ دربار کا ایک سین تھا جس میں شہزادہ سلیم اور ملکہ نور جہاں دربار میں تخت شاہی پر بیٹھے تھے اور ان کے سامنے ایک نوجوان لڑکی کھڑی تھی...... لڑکی کے چہرے پر تاثرات سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ کوئی فریاد لے کر دربار میں حاضر ہوئی ہے......

''کیا تم اس کے تاثرات دیکھ کر بتا سکتی ہو...... کہ اس کا پرابلم کیا ہے؟'' زل نے روشنی سے پوچھا۔

''یقیناً اس کا شوہر گرفتار ہوا ہوگا اور وہ فریاد کر رہی ہے'' روشنی نے جواب دیا۔

''اس کے علاوہ......اور......کچھ......؟'' زل نے پوچھا۔

''اس کے دل میں کوئی بہت painful بات ہے جو اس کے چہرے سے نمایاں ہے......تم خود ہی بتا دو'' روشنی جھنجلا کر بولی۔

''یہ انارکلی ہے...... جو ملکہ نور جہاں کے سامنے فریاد لے کر آئی ہے......تم دیکھو......شہزادہ سلیم کی آنکھوں میں اداسی اور چہرے پر گھبراہٹ ہے......جبکہ نور جہاں قدرے غصے میں ہے اور انارکلی کے چہرے پر دکھ ہے'' زل نے کہا تو روشنی نے پھر پینٹنگ کو بغور دیکھا۔

''اوہ......ہاں......رئیلی......یہ بالکل ایسی ہی ہے جیسی تم بتا رہی ہو......تم منی ایچرز بنانے میں بہت skill رکھتی ہو......اور میرا اس میں انٹرسٹ نہیں......مجھے میورل آرٹ زیادہ اچھا لگتا ہے'' روشنی نے کہا۔

''ہاں......اپنی اپنی چوائس کی بات ہے......'' زل نے کہا۔

''میرا خیال ہے منی ایچر بنانا بہت مشکل ہے......'' روشنی نے کہا۔

''میورل بنانا بھی کوئی آسان نہیں'' زل نے جواب دیا۔

''ہاں......بات تو اپنے انٹرسٹ کی ہے......ویسے بھی میں نے آبزرو کیا ہے......تم چیزوں کو بہت depth (گہرائی) میں جا کر سوچتی ہو......جیسے شہیر......'' روشنی نے نادانستہ کہا تو زل نے ایک دم چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

''میرا نہیں خیال......کہ......میں......شہیر جیسی ہوں......یا شہیر کی سوچ میرے جیسی ہے......مجھ میں اور شہیر میں بہت فرق ہے'' وہ قدرے ٹھوس لہجے میں بولی۔

''ظاہر ہے......دو انسان کبھی بھی مکمل طور پر ایک جیسے نہیں ہو سکتے......کہیں نہ کہیں دونوں میں بہت فرق ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی......کہیں نہ کہیں......کسی نہ کسی نقطے پر دو انسانوں کی سوچ مل بھی سکتی ہے......تم دونوں کا چیزوں کو آبزرو کرنے کا انداز بہت ملتا جلتا ہے'' روشنی نے کہا۔

''بالکل بھی نہیں......یہ تمہاری سوچ ہو سکتی ہے......کیونکہ تم ہم دونوں کا موازنہ کرتے ہوئے یہ سوچ رہی ہو ورنہ مجھ سے اور شہیر سے بھی پوچھو گی تو وہ بھی یہی جواب دے گا'' زل نے جواب دیا۔

اسی لمحے شہیر کلاس روم میں داخل ہوا روشنی اور زل کو باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر ان کی طرف آ گیا۔ زل ایک دم چونک گئی۔

''کیا ڈسکشن ہو رہی ہے؟'' شہیر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''تمہیں ڈسکس کر رہے ہیں'' روشنی نے مسکرا کر جواب دیا۔

''مجھے......؟'' شہیر نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

''نہیں......یہ......یونہی کہہ رہی ہے'' زل جلدی سے بوکھلا کر بولی۔

''اگر میں یونہی کہہ رہی ہوں تو شہیر سے ہی پوچھ لیتے ہیں'' روشنی نے شہیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو زل کے چہرے پر پریشانی کے

تاثرات نمایاں ہونے لگے۔

''میں......زمل سے کہہ رہی تھی کہ شہیر تمہاری طرح بہت گہرائی میں جا کر سوچتا ہے......مگر یہ مان نہیں رہی تھی......'' روشنی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''نہیں......میں تو یہ کہہ رہی تھی......کہ دو انسان کبھی بھی ایک جیسا نہیں سوچ سکتے......دونوں کی سوچ میں کہیں نہ کہیں اختلاف ضرور ہوتا ہے......''زمل نے جلدی سے جواب دیا۔

''ہاں......اب......تم بتاؤ......کیا زمل ٹھیک کہہ رہی ہے یا میں......؟'' روشنی نے مسکرا کر پوچھا۔

''تم دونوں کسی حد تک......ٹھیک کہہ رہی ہو......انفرادی طور پر تو ہر ایک کی سوچ میں اختلاف ہوتا ہے مگر جب اجتماعی طور پر کسی نقطے پر متفق ہو کر سوچا جاتا ہے تو پھر اختلاف ختم ہو جاتے ہیں اور ایک سوچ پر عمل کیا جاتا ہے''شہیر نے جواب دیا۔

''کیا......تمہیں کبھی محسوس نہیں ہوا کہ زمل بھی اکثر چیزوں کو اس زاویے سے دیکھتی ہے جیسے تم......'' روشنی نے کہا۔

''ہاں......کبھی کبھی مجھے بھی محسوس ہوتا ہے'' شہیر نے کہہ کر معنی خیز انداز میں زمل کی طرف دیکھا تو زمل نے ایک ٹک اسی کی جانب دیکھا اور منہ دوسری جانب کر کے دیکھنے لگی......اور پھر اپنی چیزیں سمیٹنے لگی۔

روشنی کا موبائل اچانک بجنے لگا......اور......وہ فون سننے کے لئے کلاس سے باہر چلی گئی۔

''کیا......آپ کو میری کوئی بات بری لگی ہے؟'' شہیر نے زمل کے چہرے پر گہری سنجیدگی کو دیکھ کر پوچھا۔

''نہیں......'' وہ کہہ کر کلاس روم سے باہر جانے لگی......

''زمل......وہ......؟'' شہیر نے موقع دیکھ کر کچھ پوچھنا چاہا مگر پھر خاموش ہو گیا۔

زمل نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا اور بغیر رکے کلاس روم سے باہر نکل گئی۔

☆

مسز فاخر اور سمیر ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے......سمیر بہت خوشگوار موڈ میں ممی کو اپنی باتیں بتا رہا تھا......اور وہ اس کی باتوں پر بھرپور قہقہے لگا رہی تھیں......شہیر کالج سے گھر پہنچا......تو سمیر اور ممی کو باتیں کرتے دیکھ کر ٹھٹھکا......مسز فاخر ایک دم محتاط ہو گئیں......شہیر کے چہرے پر بہت عجیب سے تاثرات تھے۔

''آؤ......شہیر......ہم لوگ کھانے پر تمہارا ہی ویٹ کر رہے ہیں؟'' سمیر نے مسکرا کر اسے کہا۔

''کھانا تو آپ دونوں کھا چکے ہیں......رسمی جملہ کہنے کا شکریہ'' شہیر نے سنجیدگی سے معنی خیز انداز میں ممی اور سمیر کی پلیٹوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو تقریباً کھانا ختم کرنے والے تھے۔

''یار......ابھی کھانا ختم کہاں ہوا ہے؟ تمہارے ساتھ پھر شروع کر لیں گے......'' سمیر نے ہنستے ہوئے کہا۔

''تھینکس ...... مجھے بھوک نہیں...... آپ انجوائے کریں'' شہیر نے مسز فاخر کی طرف معنی خیز انداز میں دیکھتے ہوئے کہا اور سیڑھیاں چڑھتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

''ممی ...... یہ شہیر کو کیا ہو گیا ہے...... ؟ بہت cynic وے میں بات کر رہا تھا...... '' سمیر نے اس کے جانے کے بعد انتہائی حیرت سے پوچھا۔

''مجھے خود سمجھ نہیں آ رہا...... نجانے کیوں اتنا تلخ ہو رہا ہے...... ؟'' مسز فاخر نے تشویش سے کہا۔

''تو...... آپ کو ریزن جاننے کی کوشش کرنی چاہیے تھی...... کوئی نہ کوئی ایسی بات تو ہو گی...... جو وہ یوں ری ایکٹ کر رہا ہے...... ورنہ شہیر تو بہت ڈیسنٹ تھا...... '' سمیر نے پریشانی سے کہا۔

''وہ مجھ سے کوئی بات بھی کھل کر نہیں کرتا...... پچھلے کئی ماہ سے مجھ سے اس کی ہر بات تلخی پر ختم ہوتی ہے...... '' مسز فاخر نے بتایا۔

''کیا ڈیڈی سے بھی وہ اسی لہجے میں بات کرتا ہے؟'' سمیر نے پوچھا۔

''یہ انہی کی شہ کا نتیجہ ہے...... اس کے سامنے بیٹھ کر میرے خلاف باتیں کرتے ہیں...... مجھے زچ کرنے کا کوئی موقع وہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے'' مسز فاخر ایک دم مشتعل ہو کر بولیں۔

''ممی...... آپ اور ڈیڈی میں یہ clashes کب ختم ہوں گے...... ؟'' سمیر نے بھی قدرے تلخی سے کہا۔

''میں کیا کہہ سکتی ہوں؟ مگر انہوں نے شہیر کو میرے خلاف بھڑکا کر میرے گھر کو آگ لگانے کی کوشش کی ہے'' مسز فاخر جذباتی لہجے میں بولیں۔

''او کے...... جسٹ لیو اٹ...... آپ ایموشنل نہ ہوں...... میں شہیر سے خود بات کروں گا اور جو بھی negative باتیں اس کے ذہن میں ہیں...... ان کو دور کرنے کی کوشش کروں گا...... '' سمیر نے ممی کا ہاتھ پکڑ کر انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''تھینکس ...... مائی ڈیر...... تمہارے بغیر میں اپنے آپ کو کتنا lonely محسوس کرتی ہوں...... تمہیں اندازہ نہیں...... آئی مس یو ٹو مچ...... تھینکس گاڈ کہ میں بزی رہتی ہوں تو میرا ٹائم گزر جاتا ہے ورنہ گھر میں رہ کر تمہارے ڈیڈی اور شہیر کے attitude کی وجہ سے بیمار ہی ہو جاؤں'' مسز فاخر نے پریشانی سے کہا۔

''اور...... میں آپ کو نہ کبھی تنہا رہنے دوں گا...... اور نہ ہی بیمار...... ممی...... میں آپ کو انگلینڈ میں بہت مس کرتا تھا...... باہر کی مکینیکل لائف میں آپ جیسی ایکٹو عورتیں ہی سروائیو کر سکتی ہیں...... آپ نے جس طرح مجھے groom کیا ہے...... اس نے مجھے وہاں بہت help کیا...... آپ نے مجھے بہت ڈسپلنڈ بنا دیا ہے...... '' سمیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اور مجھے خوشی ہے کہ تم میری expectation کے مطابق ہو، میں شہیر کو بھی ایسے ہی گروم کرنا چاہتی تھی...... تمہارے جیسا بنانا چاہتی تھی...... مگر وہ میری کوئی بات نہیں سنتا...... ہمیشہ irritate ہو جاتا ہے'' مسز فاخر نے پریشانی سے کہا۔

شہیر سیڑھیاں اترتے ہوئے ان کی باتیں سن رہا تھا اور ان کی باتیں سن کر اس کے چہرے پر مختلف قسم کے اتار چڑھاؤ آ رہے تھے۔

''سمیر...... میں تم سے بہت خوش ہوں...... تم نے اپنی اسٹڈیز کے ساتھ اپنی پرسنالٹی کو بھی بہت maintain رکھا ہے'' مسز فاخر نے کہا۔
شہیر ایک دم سیڑھیاں اترتا ہوا نیچے آیا...... اور ان کی طرف دیکھے بغیر وہاں سے باہر چلا گیا۔ سمیر اور مسز فاخر حیرت سے اسے دیکھتے رہ گئے۔

☆

شہیر کا دل نت نئے جذبوں سے آشنا ہو رہا تھا...... اسے خود بھی حیرانگی ہوتی تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے...... وہ زنل کی محبت میں بہت بے قرار رہنے لگا تھا...... اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کی سوچوں کا محور زنل ہو...... اس کا ذہن زنل کے علاوہ کسی اور کو سوچنا ہی نہ چاہتا ہو...... دانستہ یا نادانستہ...... ہر بات...... اور ہر سوچ کا اختتام زنل پر ہوتا...... اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا...... کہ زنل کیسے اس کے لئے اتنی عزیز از جان ہو گئی تھی...... وہ اس سے اتنی محبت کرنے لگا تھا جسے وہ خود بھی کسی قسم کے پیمانے میں تول نہیں سکتا تھا......

زنل کے بارے میں رات رات بھر سوچنا اسے اچھا لگتا تھا...... اور اس کے بارے میں باتیں کرنا اس سے بھی زیادہ اچھا...... اس کے دل نے اسے جو یقین دہانی کرائی تھی...... اس کے بعد اسے ہر پل یہی احساس ہوتا تھا کہ زنل صرف اور صرف اس کی ہی ہے...... وہ تو بس زنل کے ''اقرار محبت'' کا انتظار کر رہا تھا...... اور جس دن اس نے اقرار کر لیا...... سارا انتظار...... اور سارا اضطراب ختم ہو جائے گا...... اس بات کو سوچ کر وہ مسرور ہونے لگتا......

نجانے اسے کیا ہوتا جا رہا تھا...... سر بازار چلتے ہوئے کسی بھی شادی شدہ جوڑے کو دیکھتا تو چونک کر دیکھتا ہی رہ جاتا...... وہ تصور میں اپنے آپ کو زنل کے ساتھ یوں گھومتے پھرتے، ہنستے مسکراتے، باتیں کرتے اور شاپنگ کرتے ہوئے دیکھتا...... گاڑی اگر کسی سگنل پر شام کو رکتی تو موتیے اور گلاب کے گجرے اور پھول بیچنے والوں سے ہر شام گجرے لے کر انہیں پکڑ کر دیکھتا...... اور...... پھر انہیں واپس کر دیتا...... وہ اپنے ساتھ والی خالی سیٹ کو دیکھتا تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے زنل اس کے ساتھ بیٹھی ہو اور وہ اسے یہ گجرے اور پھول خرید کر دے رہا ہو مگر جب پھول والے کی آواز پر وہ چونک کر اسے دیکھتا تو بوکھلا کر پھول واپس کر دیتا۔

''لے...... لو...... نا...... صاب''

''ابھی نہیں......'' وہ زیر لب مسکرا کر جواب دیتا اور گاڑی آگے بڑھا دیتا...... اس کا دل اک امید سے سرشار ہو جاتا۔ اس کا دل خواہش کرتا کہ کاش زنل اسے جلد از جلد مل جائے۔ زنل کو پانے کے لئے وہ ہر آزمائش سے گزرنے کے لئے تیار تھا...... ہر خوبصورت بات سوچتے ہوئے زنل اس کے ذہن میں ہوتی وہ اس بات کو اپنے ذہن میں دہرا کر محفوظ کرتا کہ وہ یہ بات ضرور زنل کو بتائے گا...... اور زنل مسکرا کر اس کی جانب دیکھے گی۔ وہ زنل کی ایک مسکراہٹ پر اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار تھا۔ اپنے لئے شاپنگ کرتے ہوئے وہ ان کلرز کا خیال رکھتا جو زنل کو پسند تھے...... اور اکثر شاپنگ کرتے ہوئے کوئی لیڈیز پرس، ڈریس یا جیولری پسند آجاتی تو وہ اسے پُرشوق نگاہوں سے یوں دیکھتا جیسے زنل کو اسے پہنے ہوئے دیکھ رہا ہو...... صرف زنل ایک بار ''اقرار محبت'' کر دے...... تو پھر وہ اس کے لئے ڈھیروں شاپنگ کرے گا......

اس کی ہر خواہش پوری کرے گا......

جو وہ کہے گی...... اس کی ہر بات مانے گا......

جو وہ سننا چاہے گی......صرف وہی کہے گا......

وہ زمل کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار تھا......اسے اپنا سب کچھ دینے کو تیار تھا......اپنی بھرپور محبت......چاہت......اور سب کچھ جو وہ چاہے گی......

کاش وہ اپنا دل کھول کر زمل کے سامنے رکھ سکتا......تو اسے اس کے دل کی ہر دھڑکن میں صرف زمل کا نام سنائی دیتا......اس کے دل کے اندر صرف اور صرف اسے محبت نظر آتی......وہ زمل کے بارے میں بہت پوزیسو ہوتا جا رہا تھا......کالج میں اسے زمل دکھائی نہ دیتی تو وہ بے چینی سے ادھر ادھر دیکھتا رہتا اور جیسے ہی وہ نظر آتی تو وہ مطمئن ہو جاتا......

اچانک زمل کی کھنک دار ہنسی کی آواز سنتا تو ایک دم چونک کر پرشوق نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتا اور خود ہی زیر لب مسکرانے لگتا۔

زمل جب بھی کسی سے باتیں کر رہی ہوتی......تو اس کی باتوں کو انتہائی توجہ سے سنتا......مگر اس کی طرف دیکھنے سے گریز کرتا کیونکہ اسے احساس ہونے لگا تھا کہ زمل اس کی نظروں سے شاید جھینپ جاتی تھی اور اس سے نظریں ملانے سے احتراز کرتی تھی اور وہ اسے پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا......وہ اس کی خوشی اور ناراضگی کا بہت خیال رکھنے لگا تھا......کوشش کرتا کہ کوئی ایسی بات نہ کرے جس سے اس کے چہرے پر ناراضگی کے تاثرات نمایاں ہوتے تھے۔اسے دیکھ کر اس کی آنکھیں یوں چمکنے لگتیں جیسے وہ اس کی لو سے چمک رہی ہوں......

محبت کیسا جذبہ ہے......؟ جو آہستہ آہستہ دل کے اندر کیسی آگ لگائے رکھتا ہے جو نہ کسی طور ٹھنڈی پڑتی ہے اور نہ ہی ختم ہوتی ہے۔دبی چنگاریوں کی طرح ہر وقت دل کے آتشدان کو دہکائے رکھتی ہے......اور انسان کے لئے اس آگ سے کسی طرح بھی فرار ممکن نہیں ہوتی۔

محبت کس احساس کا نام ہے......؟

جو اندر ہی اندر دل کو اتنا مضطرب اور بے قرار رکھتا ہے......کہ اس کے بغیر نہ سکون ملتا ہے اور نہ اس سے چھٹکارا۔

محبت کا حاصل کیا ہے......؟

کرب......آزمائش......یا......پھر......فنا......!

مکاں سے لامکاں کا سفر......!

حاصل سے لاحاصل کی تمنا......!

یا پھر فنا سے بقا کی جستجو......!

کیا محبت کے بغیر زندگی ممکن ہے......؟

کیا یہ وہ جذبہ ہے جو انسان کو ازل سے ودیعت کیا گیا ہے......یا پھر انسان کی سرشت میں اہم عنصر محبت کو شامل کیا گیا ہے......کیا انسان کا خمیر محبت کی مٹی سے اٹھا ہے......کہ وہ دانستہ یا نادانستہ محبت کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے......وہ چاہتے نہ چاہتے ہوئے......دانستہ نادانستہ......شعوری اور لاشعوری طور پر اس کے سحر میں مبتلا ہو جاتا ہے......محبت کے بغیر اسے زندگی اور اس کا سفر ادھورا لگتا ہے......جب تک انسان

اس احساس سے آشنا نہیں ہوتا..... تب تک کسی شے کی کمی اور نہ ہونے کا احساس اسے مضطرب رکھتا ہے..... دل کسی کو چاہے اور چاہے جانے کی تمنا کرتا ہے..... اور جب اس سے آشنا ہو جاتا ہے..... تب اسے پانے کی جستجو کرتا ہے اور جب کسی کو پا لیتا ہے تو پھر کسی اور شے کی تمنا اسے مزید اضطراب سے دوچار کرتی ہے۔

محبت ایک گورکھ دھندہ ہے.....!

ایسا خوبصورت اور سنہری جال ہے..... جو دور سے بہت خوبصورت اور دلفریب نظر آتا ہے مگر قریب جانے پر جب یہ کسی کو اپنے سنہرے ریشوں میں ایک بار پھنسا لیتا ہے..... تب اس سے فرار ممکن نہیں ہوتی..... یہ آکٹوپس کی طرح اسے اپنے شکنجے میں ایسا جکڑتا ہے کہ فرار کی ساری راہیں بند نظر آتی ہیں۔

محبت ایسے کرب مسلسل کا نام ہے جو اندر ہی اندر دل کو ایسے درد سے آشنا کرتا ہے جس کا علاج ممکن نہیں..... ایسا درد جو بتلایا نہیں جا سکتا جو صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔

وہ محبت کے ہر پہلو پر سوچتا..... اس کے کرب کو..... اس کے درد کو..... اس کی اذیت کو..... اس کی خوشی کو..... اس کے لمس کو اور اس کے احساس کو اپنے رگ و پے میں محسوس کرتا..... اس کا دل محبت کے سحر میں بری طرح گرفتار ہو گیا تھا.....

'زل' سے وہ اتنی شدید محبت کرنے لگا تھا..... کہ اب اس کی محبت سے فرار ممکن نہیں تھا..... اس کے بغیر زندگی نامکمل تھی اس کے بغیر ہر سوچ ادھوری تھی.....

اور روشنی "شہیر" کے بغیر اپنی زندگی کو ادھورا سمجھتی تھی..... اس کی سوچوں کا محور شہیر تھا..... اس کے دل کی دنیا شہیر کے نام سے متحرک تھی..... وہ اس سے اتنی محبت کرنے لگی تھی..... شاید دنیا میں کوئی کسی سے نہ کرتا ہو..... دل کی دھڑکنیں ایک ہی نام سے بے ترتیب ہوتی تھیں..... ایک ہی شخص کو سوچ کر وہ خوشی اور سکون محسوس کرتی تھی اور ایک ہی شخص کے لئے وہ اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار تھی..... اپنی محبت..... اپنی چاہت..... اپنی خواہشات اور اپنا سب کچھ..... وہ صرف اس وقت کی منتظر تھی جب شہیر روشنی کی آنکھوں میں جھانک کر اس کے دل میں چھپے اس راز کو پا لے..... جس راز کا ہر سرا شہیر سے جا کر ملتا تھا.....

کاش وہ دن جلد آئے..... جب شہیر اس سے اقرار محبت کرے..... روشنی سے کہے کہ وہ اس کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا..... اور وہ دن روشنی کے لئے سب سے قیمتی ہوگا..... تب روشنی اپنی محبت اور چاہت سے اس کے دل و دماغ کو منور کر دے گی.....

نجانے یہ انتظار کب ختم ہوگا.....؟

یہ انتظار کتنا اذیت ناک اور جان لیوا ہوتا ہے.....

کاش زندگی میں انتظار نہ ہوتا..... تو زندگی کتنی پرسکون ہوتی..... یہ انتظار کتنا مضطرب رکھتا ہے..... اندر ہی اندر دل اس قدر بے چین ہوتا ہے کہ نہ بیٹھے ہوئے سکون ملتا ہے..... نہ لیٹے ہوئے..... ہر وقت سوچیں، خیالات اور جذبات پراگندہ اور منتشر رہتے ہیں..... اور دنیا کا کوئی مرہم

اس کرب کا مداوا نہیں کر سکتا۔ روشنی مضطرب تھی...... اور منتظر بھی......

شہیر بھی منتظر تھا اور بہت بے قرار بھی......

اور زل منتظر تو نہیں تھی...... مگر مضطرب ان دونوں سے زیادہ تھی...... کیونکہ اسے ایک اہم فیصلہ کرنا تھا...... اور اس فیصلے تک پہنچنے کے لئے اسے کس قدر آزمائش، کرب اور کٹھن مراحل میں سے گزرنا پڑ رہا تھا...... یہ صرف وہی جانتی تھی......

وہ شہیر کے بارے میں کیا سوچتی تھی......؟

شہیر کے بارے میں حتمی فیصلہ کرتے ہوئے اسے کیا مسائل پیش آ رہے تھے...... یہ صرف وہی جانتی تھی...... اور وہ ایسے کرب سے گزر رہی تھی...... جس کو صرف وہی جانتی تھی...... اور وہ اسے کسی کے ساتھ بھی ڈسکس نہیں کرنا چاہتی تھی۔

☆

شہیر بہت بے چین تھا۔ کالج میں گرمیوں کی چھٹیاں ہو رہی تھیں۔ سب لوگ چھٹیوں کے پلانز بنا رہے تھے...... ایک ماہ بعد ایگزامز بھی ہونے والے تھے اور شہیر کے لئے یہ چھٹیاں کس قدر جان لیوا ثابت ہوں گی یہ صرف وہی جانتا تھا...... زل سے دور ہونے کا سوچ کر ہی وہ بے قرار ہو جاتا...... اتنے دن...... اتنے گھنٹے...... اتنے منٹ اور سیکنڈ وہ اس سے دور رہے گا...... اسے دیکھ نہیں پائے گا...... اس کی آواز نہیں سن پائے گا...... اسے ہنستا ہوا نہیں دیکھ سکے گا...... اس کی خوبصورت جھیل سی آنکھوں میں جھانک نہیں سکے گا...... اپنی آنکھوں کے ذریعے اپنے دل کا پیغام اسے پہنچا نہیں سکے گا۔

''اف یہ چھٹیاں کیوں ہو رہی ہیں......؟'' وہ جھنجھلا کر کہتا تو سب کلاس فیلوز حیرت سے اس کی جانب دیکھتے...... تو وہ بوکھلا جاتا......

''میرا مطلب ہے...... اتنے زیادہ دن فرینڈز سے دور رہنا بہت مشکل ہے......'' وہ گھبرا کر جواب دیتا۔

''میں تمہارا مطلب سمجھ رہی ہوں......'' روشنی معنی خیز انداز میں اس کے جملے کا مسکرا کر جواب دیتی۔

''یس آف کورس...... تم لوگوں سے ہی تو میری زندگی میں روشنی ہے...... کیا اتنے دن میں اندھیرے میں رہوں گا؟'' شہیر مسکرا کر کہتا۔

''لیمپ جلا کر گزارا کرنا...... اگر وہ نہ ملے تو موم بتی جلا لینا...... اگر وہ بھی نہ ملے تو اپنی جیب میں لائٹر ضرور رکھنا......'' ارسلان ہنس کر کہتا۔

''کیوں......؟'' شہیر پوچھتا۔

''کم از کم لائٹر تمہیں یہ احساس تو دلائے گا...... کہ روشنی تمہارے پاس ہی ہے......'' ارسلان جواب دیتا تو روشنی اس کی بات پر کھلکھلا کر ہنستی اور اندر ہی اندر محظوظ ہوتی۔

☆

اس کے لئے پہلی چھٹی گزارنا ہی مشکل ہو رہا تھا...... ممی اپنے کاموں اور میٹنگز میں مصروف تھیں...... ڈیڈی ملک سے باہر گئے تھے اور سمیر اپنے دوستوں کے ساتھ آوٹنگ کے لئے شہر سے باہر گیا تھا۔ وہ سارا دن گھر میں رہا۔ خاص طور پر اپنے کمرے میں بیڈ پر لیٹ کر زل کے بارے میں

سوچتا رہا......آج اسے دیکھا نہ تھا......اور اس کے بے قرار دل کو قرار نہیں مل رہا تھا......اس نے کئی بار موبائل پر اس کا نمبر ملانا چاہا مگر کچھ سوچ کر موبائل آف کر دیتا......سارا وقت وہ یہی کچھ کرتا رہا جب اچانک روشنی کا فون آ گیا۔ وہ اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی اور وہ اسے اپنی بوریت کے بارے میں بتاتا رہا......وہ بہانے سے سب دوستوں کے بارے میں پوچھتا رہا وہ بھی سب کے بارے میں بتاتی رہی سوائے زل کے......اور وہ زل کے ذکر کے بغیر سب کے بارے میں اس کی گفتگو لاپرواہی سے سنتا رہا۔

''شہیر......تم......؟'' روشنی نے معنی خیز انداز میں کچھ کہنا چاہا اور پھر ایک دم خاموش ہو گئی۔

''ہاں......کہو......کیا بات ہے؟'' شہیر نے چونک کر پوچھا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر جیسے اپنے ہی سوال پر غور کر رہی ہو۔

''کہو......کیا بات ہے؟'' شہیر نے دوبارہ پوچھا۔

''کچھ نہیں......'' روشنی مدہم لہجے میں بولی۔

''روشنی ہم اچھے دوست ہیں......اور دوستی بہت انمول رشتہ ہے......اور اچھے دوستوں سے ہم وہ سب کچھ شیئر کرتے ہیں جو بعض اوقات اپنے بہن بھائیوں سے بھی چھپاتے ہیں......یو......کین ٹرسٹ می (تم مجھ پر اعتبار کر سکتی ہو) اور اپنی ہر بات شیئر کر سکتی ہو......'' شہیر نے قدرے اپنائیت سے کہا تو روشنی کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی......اس کا دل یوں خوشی سے سرشار ہو گیا جیسے بنجر زمین بارش کی پہلی پھوار پر مسرور ہوتی ہے اور اسے دل و جان کی گہرائیوں سے خوش آمدید کہتی ہے......روشنی بھی چند لمحے پہلے بنجر زمین کی طرح مضطرب تھی......کچھ کہنا اور سننا چاہتی تھی مگر اپنے دل کی بات اپنی زبان سے نہیں کہہ سکتی تھی......نجانے شہیر کو خود بخود کیسے پتہ چل گیا......یا محبت کرنے والے خود بخود دلوں تک رسائی پا لیتے ہیں اور بن کہے سب کچھ جان لیتے ہیں اور بن سنے سب کہہ دیتے ہیں۔ شہیر نے بھی روشنی کے کہے سنے بغیر اس کے دل کی بات جان لی تھی اور ایسی اپنائیت کا اظہار کیا تھا کہ وہ باغ باغ ہو گئی۔ اس کی آواز میں ایک دم کھنک سی پیدا ہو گئی......اور......مارے خوشی کے اس سے بولنا دشوار ہو گیا۔

''تھینک......تھینک یو......شہیر......'' وہ بمشکل بولی۔

''کس بات کا......؟'' شہیر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''اتنا اعتماد دینے کا......اور اعتبار کرنے کا'' روشنی نے کہا۔

''کم آن......فرینڈز میں یہ تھینکس وغیرہ نہیں ہونا چاہیے'' شہیر نے کہا اور دونوں کافی دیر باتیں کرتے رہے۔

☆

سمیرا آؤٹنگ سے گھر لوٹا تو گھر میں پھر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ کئی دنوں سے چھائی اداسی کے بادل چھٹ گئے......کچھ لوگوں کو قدرت نے اتنا اہم بنایا ہوتا ہے کہ ان کے وجود کی برکت سے فضا بھی مہک اٹھتی ہے اور ماحول بھی پررونق ہو جاتا ہے اس کی ذات میں ایسی مقناطیسی کشش ہوتی ہے کہ نہ چاہتے ہوئے بھی لوگ ان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں......انہیں سننا چاہتے ہیں......ان سے کچھ کہنا چاہتے ہیں اور ان کی کمپنی انجوائے کرنا

چاہتے ہیں......سمیر کی ہنستی مسکراتی شخصیت......اس کی مزیدار کھٹی میٹھی باتیں ہر محفل کو کشتِ زعفران بنا دیتیں......جو بھی اس سے ایک بار ملتا......کبھی نہ بھولتا......اور دوبارہ ملنے کی خواہش ضرور کرتا......اس کی انسان دوستی اور ہمدردانہ رویہ اور ملنساری ہر ایک کو اسے چند لمحوں میں دوسروں کو اس کے قریب لے آتی......شہیر کو کالج سے چھٹیاں تھیں اور وہ زیادہ تر اپنے کمرے میں......یا اپنے اسٹوڈیو میں مصروف رہتا......گھر میں اس کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ اکثر وہ کھانا بھی اپنے کمرے میں منگوا لیتا۔ اپنے کام سے اکتاتا تو کسی دوست کی طرف چلا جاتا ورنہ زل کی سوچوں کے ساتھ مصروف رہتا......وہ اپنے کمرے میں ہوتا تو اسے یوں لگتا جیسے زل اس کے پاس بیٹھی اس سے باتیں کر رہی ہو......وہ اسے اکثر باتیں کرتی ہوئی محسوس ہوتی......خود ہی اچانک اسے کوئی جواب دیتا اور پھر خاموش ہو جاتا......میں کیسی hallucination کا شکار ہونے لگا ہوں......زل نے میرے دل، میری روح......میری سوچوں اور جذبوں پر قبضہ کر لیا ہے......زل کے بغیر ایک ایک پل......ایک ایک لمحہ گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔

اس کے کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوتی تو وہ یوں چونکتا جیسے وہ دستک زل نے دی ہو......وہ اس لمحے اسے یہ سوچ رہا تھا......اس تک رسائی پانے کا کوئی راستہ سوچ رہا تھا......اور اس کے ذہن میں بار بار روشنی آ رہی تھی......ہاں روشنی یہ کام کر سکتی ہے، وہ سوچنے لگا۔

شہیر نے بیڈ پر سے چھلانگ لگا کر قدرے پرجوش انداز میں دروازہ کھولا......سامنے سمیر کھڑا مسکرا رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک گفٹ پیک تھا۔

''اوہ......آپ'' وہ ایک دم مایوس لہجے میں بولا۔

''شہیر......تم کیوں چونکے ہو......کیا کسی اور کو expect کر رہے تھے'' سمیر نے شوخ لہجے میں مسکراتے ہوئے کہا۔

''ن......نہیں......نہیں......تو'' شہیر بوکھلا کر بولا۔

''یار......لگتا ہے......کوئی ہے'' سمیر نے چھیڑا۔

''نہیں......ایسی کوئی بات نہیں'' شہیر نے بوکھلا کر نظریں چراتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے......اگر نہیں......تو......نہ سہی۔ اگر کوئی ہوتی تو تمہاری جان کو روگ ہی لگا دیتی......اچھا ہے......بچے ہوئے ہو......'' سمیر نے ہنستے ہوئے کہا۔

شہیر کے چہرے پر سنجیدگی سی چھا گئی۔

''آپ سنائیں......ٹرپ کیسا رہا؟'' شہیر نے بات کا رخ موڑا۔

''ونڈرفل......بہت انجوائے کیا......واپسی پر دو روز تیمور ماموں کے پاس ٹھہرا......حرا......حنا اور حارث کے ساتھ بہت مزا آیا......کیا تم کبھی ان کی طرف گئے ہو؟'' سمیر نے پوچھا۔

''نہیں......کافی عرصہ ہو گیا ہے......شاید چھ سات سال یا اس سے بھی زیادہ......ان لوگوں کی آج کل کیا ایکٹویٹیز ہیں؟'' شہیر نے پوچھا۔

''حرا میڈیکل مکمل کرنے کے بعد ایک ہاسپٹل میں ہاؤس جاب کر رہی ہے۔ حنا ماس کمیونیکیشن میں ماسٹرز کر رہی ہے اور حارث ایروناٹیکل انجینئرنگ کر رہا ہے...... ایئر فورس میں ہے...... اتفاق سے ان دنوں چھٹیوں پر گھر آیا تھا...... میرے فرینڈز تو واپس آ گئے مگر میں وہیں رک گیا...... وہ لوگ مجھے آنے ہی نہیں دے رہے تھے...... میں بھی بہت عرصے بعد گیا تھا...... ان لوگوں نے اتنی محبت اور چاہت سے استقبال کیا کہ رکنا پڑ گیا...... اور...... یہ میں تمہارے لئے لایا ہوں'' سمیر نے اسے گفٹ پکڑاتے ہوئے کہا۔

''تھینکس...... اس کی کیا ضرورت تھی'' شہیر نے بے دلی سے پکڑ کر اسے ٹیبل پر رکھ دیا۔

''شہیر...... کیا زندگی محبت کے بغیر ممکن ہے؟......'' سمیر نے قدرے سنجیدگی سے پوچھا۔

''کیا مطلب......؟'' شہیر نے چونک کر یوں پوچھا جیسے سمیر نے باتوں باتوں میں اس کے دل میں چھپی کوئی تصویر دیکھ لی ہو یا کوئی تحریر پڑھ لی ہو۔

''قدرت نے انسانوں کو محبت کے ذریعے جوڑا ہے زندگی میں محبت نہ ہو تو زندگی بے رونق ہو جائے...... اور کسی کو کسی کا احساس نہ رہے...... ہم دونوں کے درمیان فطری محبت ہے...... جو وقتی طور پر دب تو جائے گی...... مگر کبھی ختم نہیں ہوگی...... محبت کبھی ختم نہیں ہوتی...... انسان اس کو ختم کرنا بھی چاہے تب بھی اس کے نقوش کبھی مٹ نہیں پاتے...... اور...... ایسے تحائف محبت کو بڑھاتے ہیں...... تم چاہو یا نہ چاہو...... سمجھو یا نہ سمجھو...... ہمارے درمیان محبت بہت گہری ہے اور کبھی ختم نہیں ہوگی'' سمیر نے نرم لہجے میں قدرے محبت سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو شہیر خاموشی سے اسے دیکھنے لگا۔

''اس لئے...... تھینکس کہنے کی ضرورت نہیں...... بس اس محبت کو محسوس کرنا جو میں تم سے کرتا ہوں...... اور ممی بھی تم سے بہت محبت کرتی ہیں...... تم کبھی بھی منفی سوچ اپنے ذہن میں نہ لانا'' سمیر نے کہا تو شہیر نے چونک کر اسے دیکھا۔

''میں آپ کی محبت پر اعتبار کرتا ہوں مگر ممی کی محبت پر نہیں'' شہیر نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔

''کیا...... کہا؟ تمہیں ممی کی محبت پر اعتبار نہیں...... اپنی ماں کی محبت پر...... جن کے پاس ہم دونوں کے سوا اور کوئی اولاد نہیں...... ممی ہم لوگوں کے بارے میں کس قدر پوزیسو ہیں...... شاید تم جانتے نہیں'' سمیر نے حیرت سے کہا۔

''یہ سب کچھ آپ اپنے بارے میں تو کہہ سکتے ہیں مگر میرے بارے میں نہیں'' شہیر نے کہا۔

''کیوں......؟'' سمیر نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

''ممی کا رویہ...... ممی کی محبت...... مجھ سے ویسی نہیں جیسی آپ سے ہے...... اور مجھے وہ سب لمحے یاد ہیں جب ممی ہر بات میں آپ کی فیور کرتی تھیں...... یہ حقیقت ہے ممی کو آپ سے بڑھ کر دنیا میں اور کوئی عزیز نہیں......'' شہیر نے آہ بھر کر کہا۔

''پلیز...... شہیر ایسا مت سوچو...... یہ سب تمہاری غلط فہمی ہے'' سمیر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... پہلے میں بھی یہی سوچتا تھا مگر اب مجھے یقین ہو گیا ہے...... اور یہ یقین وقت کے ساتھ مزید پختہ ہو گیا ہے...... آپ خود اپنی

آنکھوں سے کبھی اس کا مشاہدہ کر لینا......'' شہیر نے قدرے ٹھوس لہجے میں کہا تو سمیر خاموش ہو کر اس کے کمرے سے باہر نکل آیا مگر شہیر کی باتوں سے اس کا دل بہت مضطرب ہونے لگا۔

☆

شہیر کا دل انتہائی پریشان ہو رہا تھا اور وہ انتہائی بے قراری میں اپنے کمرے کا چکر لگا رہا تھا۔ نجانے اسے سوئے ہوئے کیا ہوا تھا کہ وہ نیند سے بیدار ہوتے ہی بے قرار ہو گیا تھا۔ دل بے قراری سے مضطرب ہو کر اس کے سینے سے باہر آنے کو مچل رہا تھا۔ زمل اسے بہت یاد آ رہی تھی۔ اس نے اس کا نمبر ملانا چاہا مگر پھر ارادہ ترک کر دیا۔ وہ کیا کرے کہ کس طرح زمل تک رسائی پا سکے اور اس سے اس کا جواب پوچھے۔ وہ انتظار کرتے کرتے تھک گیا تھا اور یہ انتظار اب ایسی بے قراری میں بدل رہا تھا جس نے اس کے دل و دماغ میں ایسی مدہم آگ سلگائی ہوئی تھی جو کسی بھی پل بجھتی نہیں تھی...... دبی چنگاریوں کی مانند اس کے دل کو سلگاتی رہتی اور اس مدہم آگ کا دھواں اس کے دماغ کو یوں مضطرب رکھتا جیسے بند کمرے میں کوئی چھوٹا سا سوراخ بھی نہ ہو بلکہ ہر طرف گھٹن ہی گھٹن ہو اور ایسی گھٹن میں سانس لینا محال ہو جائے...... اس کا دل و دماغ مسلسل سلگتے اور مضطرب رہتے...... دو ماہ ہو گئے ہیں...... مگر زمل نے ابھی تک اس سے کوئی ایسی بات نہ کہی تھی...... جس کو وہ سننے کے لئے بے تاب تھا...... مگر اس کا دل مطمئن تھا...... کہ زمل اسے پسند کرتی ہے...... اگر وہ اسے ناپسند کرتی ہوتی...... تو...... اسی لمحے اسے مسترد کر دیتی...... وہ بھی اس سے محبت کرتی ہے...... شاید اپنی اہمیت جتلانے کے لئے اس نے اسے یوں انتظار میں رکھا ہے...... اس کا دل پھر اسے مطمئن کرتا...... اسے بہت سی تسلیاں دیتا...... مگر اتنی تسلیوں کے باوجود تھوڑی دیر بعد وہ پھر بے قرار ہو جاتا۔

''جو بھی ہے...... اسے مجھ سے تو شیئر کرنا چاہیے...... آئی ایم سِک آف دس ویٹ'' اس نے گہری سانس لیتے ہوئے سوچا۔

ایک ایک لمحہ...... ایک ایک پل گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس نے تنگ آ کر روشنی کو فون کیا۔ کافی بیلز کے بعد اس نے فون اٹھایا۔

''ہائے شہیر...... کیسے ہو...... میں تمہیں ہی فون کرنے والی تھی...... یقیناً تمہیں بھی اس خبر کا پتہ چل گیا ہوگا......'' روشنی نے قدرے پر جوش آواز میں کہا۔ اس کی آواز میں بے انتہا خوشی کا عنصر نمایاں تھا۔

''کیسی خبر......؟'' شہیر نے حیرت سے پوچھا۔

''زمل کی......'' روشنی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''زمل کی...... کیا ہوا زمل کو......؟'' شہیر نے بے صبری سے پوچھا۔

''لو...... سب کو معلوم ہو گیا ہے...... اور...... تمہیں خبر ہی نہیں ہوئی'' روشنی نے کہا تو وہ جھنجھلانے لگا۔

''بھئی...... نہیں پتہ چلا نا...... اب تم ہی بتا دو'' وہ خفگی سے بولا۔

''زمل...... ارسلان سے شادی کر رہی ہے...... دونوں کی منگنی ہو گئی ہے'' روشنی نے خوشی سے بتایا۔

شہیر کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی...... اور دل کی دھڑکن اس قدر تیز ہو گئی...... جیسے پورے کمرے میں سوائے دل کے دھڑکنے

کی......کوئی......اور آواز نہ ہو۔ روشنی ......ہیلو ......ہیلو ......کہتی رہی ......مگر دوسری جانب سے کوئی آواز نہ آ رہی تھی ......اور نہ ہی فون بند ہوا تھا......

''ہیلو......ہیلو......شہیر......کہاں ہو......کیا تم مجھے سن رہے ہو؟'' روشنی نے حیرت سے پوچھا مگر دوسری جانب سے کوئی آواز نہ آ رہی تھی۔ اس نے کال آف کر کے اس کا نمبر ملایا مگر شہیر کا موبائل آف ہو چکا تھا۔

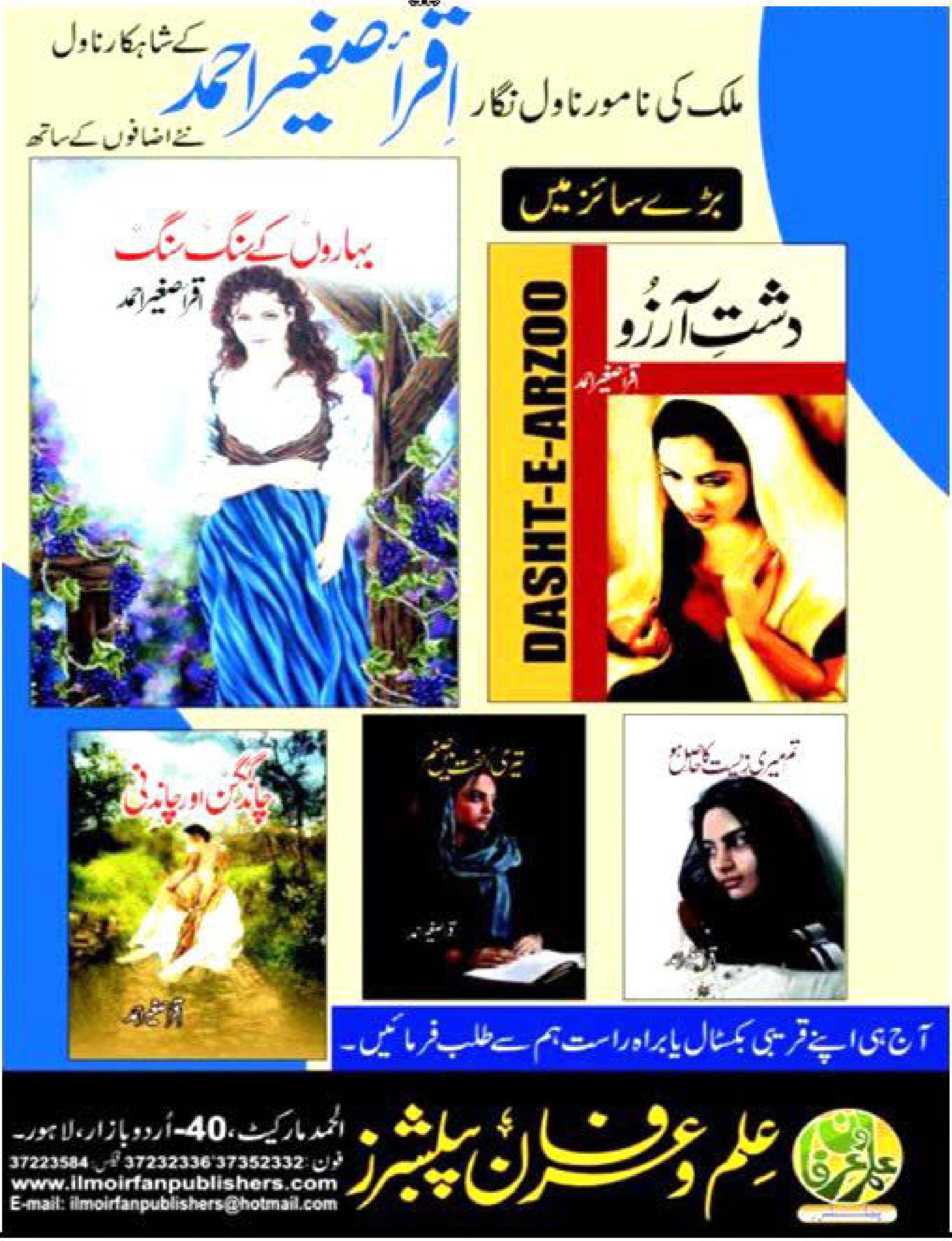

(۶)

''ڈاکٹر دانش...... آج میں آپ کی زندگی یعنی آپ کی کامیابیوں اور آپ کی پرسنل لائف کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں......'' ڈاکٹر رابرٹ نے سیشن کے دوران بہت دوستانہ انداز میں ڈاکٹر دانش سے کہا جو بلیو کلر کے تھری پیس سوٹ کے اوپر بلیک لانگ کوٹ پہنے ان کے سامنے کرسی پر بیٹھے تھے۔

''کیوں......؟'' ڈاکٹر دانش نے قدرے خشک لہجے میں پوچھا۔

''یونہی...... مجھے لائق، ذہین اور کامیاب لوگوں کی جدوجہد کے بارے میں جاننا اور پڑھنا اچھا لگتا ہے'' ڈاکٹر رابرٹ نے ان کے بدلتے ہوئے موڈ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ کسی اچھی لائبریری میں چلے جایئے...... آپ کو بہت سی کتابیں مل جائیں گی...... میرے پاس آپ کے لئے فضول ٹائم نہیں'' ڈاکٹر دانش غصے سے اٹھتے ہوئے بولے۔

''پلیز ڈاکٹر دانش...... آپ بیٹھیے...... آپ مجھے اپنا دوست سمجھئے'' ڈاکٹر رابرٹ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''دوست......؟ دنیا میں کوئی کسی کا دوست نہیں ہوتا اور مجھے کسی پر بھی ٹرسٹ (اعتبار) نہیں'' ڈاکٹر دانش نے کہا۔

''کیوں......؟'' ڈاکٹر رابرٹ نے پھر پوچھا۔

''آپ سوال بہت پوچھتے ہیں...... کیا آپ کسی سکول میں ٹیچر ہیں؟'' ڈاکٹر دانش انہیں غصے سے گھورتے ہوئے بولے۔

''ہاں...... ایسا ہی سمجھ لیجئے'' ڈاکٹر رابرٹ نے مفاہمت کے انداز میں کہا۔

''اگر آپ ٹیچر ہیں تو بہت ناکام ٹیچر ہیں......'' ڈاکٹر دانش نے کہا۔

''کیا مطلب......؟'' ڈاکٹر رابرٹ نے ایک دم چونک کر پوچھا۔

''آپ میرے ہر سوال کا جواب واضح انداز میں نہیں دیتے''۔

''آپ ٹیچر ہیں یا نہیں......؟'' ایک بات کریں...... آپ نے کہا۔ ''ایسا ہی سمجھ لیجئے'' وری نان سینس آنسر (بہت احمقانہ جواب ہے) ڈاکٹر دانش نے اپنی بارعب آواز میں انہیں قدرے ڈانٹتے ہوئے کہا تو ڈاکٹر رابرٹ بوکھلا گئے وہ بھی کم و بیش ان کے ہم عمر تھے۔ اپنے پیشے میں انہوں نے بہت نام اور عزت کمائی تھی۔ انتہائی بیمار الذہن مریض بھی ان سے اتنے بارعب اور تلخ لہجے میں بات نہیں کرتے تھے جس طرح ڈاکٹر دانش ان کو ان کی باتوں پر سرزنش کر رہے تھے۔

''مجھے بتائیے..... آپ ٹیچر ہیں یا نہیں؟'' ڈاکٹر دانش نے پھر بارعب انداز میں پوچھا۔

''یس..... آئی ایم..... آئی ایم ٹیچر'' ڈاکٹر رابرٹ نے بمشکل جواب دیا۔

ڈاکٹر دانش ان کی جانب بغور دیکھنے لگے۔ یوں جیسے کوئی بات یاد کر رہے ہوں یا پھر ان کے دماغ میں کوئی تبدیلی آ رہی ہو۔ ڈاکٹر رابرٹ بھی ان کی جانب بغور دیکھنے لگے۔ ان کے لئے ڈاکٹر دانش کی خاموشی اور چہرے پر ابھرتے مختلف تاثرات سے وہ مختلف اندازے لگانے کی کوشش کر رہے تھے۔

''ڈاکٹر رابرٹ..... میں نے بہت کوشش کی مگر ڈاکٹر دانش کے ماضی کے بارے میں ایک بات بھی نہیں جان سکا۔ وہ بہت ہوشیار انسان ہیں..... شاید میری باتوں سے ہی وہ میرا ارادہ بھانپ لیتے ہیں..... مجھے یقین ہو گیا ہے میں ان سے کچھ بھی نہیں اگلوا سکوں گا۔'' ہی از ویری ڈفرنٹ اینڈ ٹف مین (وہ بہت مختلف اور مشکل انسان ہیں)'' علی موسیٰ نے ایک روز پہلے ڈاکٹر رابرٹ کو فون پر بتایا تھا اور اب ڈاکٹر رابرٹ کو بھی یقین ہونے لگا تھا کہ ان کے لئے بھی ڈاکٹر دانش تک پہنچنا بہت مشکل تھا۔

''کیا آپ کو معلوم ہے کہ ایک ٹیچر کو کیسا ہونا چاہیے؟'' ڈاکٹر دانش نے ڈاکٹر رابرٹ کی پرسنالٹی کا بغور جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

''کیسا ہونا چاہیے.....؟'' ڈاکٹر رابرٹ نے آہستہ آواز میں پوچھا۔

''آپ جیسا بالکل بھی نہیں'' ڈاکٹر دانش نے قدرے ترش لہجے میں انہیں دیکھ کر اپنے چہرے پر ناگواری کے تاثرات لاتے ہوئے کہا۔

''وہاٹ..... ڈو..... یو..... مین؟'' ڈاکٹر رابرٹ بوکھلا کر بولے۔

''ایک ٹیچر کو بہت کونفیڈنٹ..... الرٹ..... انٹیلی جنٹ اور ویل انفارمڈ ہونا چاہیے۔ اسے اپنے اسٹوڈنٹس کی ہوشیاریاں، مکاریاں اور چوریاں موقع پر پکڑنی چاہئیں۔ آپ ایک ناکام ٹیچر ہیں..... آپ کو معلوم ہی نہیں ہوا اور میں نے ٹیبل سے آپ کا پن چرا لیا..... یہ لیجیے اپنا پن..... اور..... آئندہ مجھ سے ہوشیار رہیے گا بلکہ ہر کلاس میں جا کر الرٹ رہیے گا..... بلکہ میرا خیال ہے آپ کو ٹیچنگ سے فارغ کر دینا چاہیے..... آپ بہت ناکام ٹیچر ہیں مجھے آپ کے پرنسپل کو انفارم کرنا چاہیے..... آپ کیا اپنے اسٹوڈنٹس کو سکھائیں گے..... آپ کو خود ہی کچھ معلوم نہیں ہو پاتا'' اور ڈاکٹر دانش اپنے کوٹ کی جیب میں سے ڈاکٹر رابرٹ کا پارکر کا پن ان کی طرف بڑھا کر کھلکھلا کر ہنسنے لگے اور ان کے تلخ و ترش ریمارکس سے ڈاکٹر رابرٹ تلملانے لگے۔ انہیں ڈاکٹر دانش پر غصہ آنے لگا تھا مگر وہ بہت مشکل سے اپنا غصہ ضبط کیے بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر رابرٹ کے چہرے پر غصے کے تاثرات نمایاں ہونے لگے تھے مگر وہ خاموش رہے۔

''پلیز ڈاکٹر دانش..... لیو اٹ (اسے چھوڑیے) اور مجھے اپنی کامیابیوں کے بارے میں کچھ بتائیے..... آپ نے نیورالوجی کی فیلڈ میں بہت ریسرچ کی ہے۔ سنا ہے آپ کچھ خاص قسم کی ویکسینیشن تیار کر رہے تھے..... کیا ہوا..... کیا آپ نے اپنی ریسرچ ادھوری چھوڑ دی؟'' ڈاکٹر رابرٹ نے ان کے ریسرچ پیپرز کی فائل کو پڑھنے کے بعد سوال کیا تھا جو انہیں چند روز پہلے علی موسیٰ نے رازدارانہ انداز میں ڈاکٹر دانش کی چیزوں میں سے نکال کر دی تھی۔

''کونسی ریسرچ.....اور کیسی ویکسینیشن.....؟میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا اور نہ ہی کرنا چاہا تھا.....آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے''ڈاکٹر دانش نے حیرت سے انہیں دیکھتے ہوئے قطعی لاپرواہی کا اظہار کیا۔

''پلیز.....ڈاکٹر دانش.....آپ یاد کریں کہ ماضی میں آپ ایک ماہر اور کامیاب نیورو سرجن تھے.....کیا آپ کو یاد آیا.....؟''ڈاکٹر رابرٹ نے بھی اپنی مضبوط آواز میں الفاظ چبا چبا کر کہا۔

''میں fake ڈاکٹر تھا جیسا کہ آپ fake ٹیچر ہیں''ڈاکٹر دانش نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تو ڈاکٹر رابرٹ ان کا جواب سن کر زچ ہونے لگے۔

''ڈاکٹر دانش.....مجھے آپ کا تعاون چاہیے''ڈاکٹر رابرٹ نے مفاہمت کے انداز میں کہا۔

''کیوں.....؟''ڈاکٹر دانش نے حیرت سے پوچھا۔

''آپ ایک ذہین اور لائق انسان ہیں۔آپ نے بہت مصروف زندگی گزاری ہے.....میں چاہتا ہوں کہ آپ پہلے کی طرح نارمل زندگی گزاریں۔اپنی ٹھوس شخصیت کے ساتھ باعزت انداز میں''ڈاکٹر رابرٹ نے جواب دیا۔

''ڈاکٹر.....انسان کی کوئی عزت نہیں.....کہیں بھی نہیں ہی از اے اسٹوپڈ.....میڈ(پاگل)اینڈ ابنارمل ایوری ویئر(ہر جگہ ابنارمل ہے)آپ خود بھی نارمل نہیں.....مجھے کیسے نارمل بنائیں گے؟''ڈاکٹر دانش نے بھرپور قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تو ڈاکٹر رابرٹ پریشان ہو گئے۔

''ڈاکٹر.....آپ کا بچپن کیسا گزرا.....؟''ڈاکٹر رابرٹ نے قدرے توقف کے بعد اپنے موڈ کو نارمل کرتے ہوئے پوچھا۔

''کیا آپ کا بچپن بندروں یا جانوروں جیسا گزرا ہے جو آپ مجھ سے یہ نان سینس سوال پوچھ رہے ہیں.....؟آپ کو کس نے سائیکاٹرسٹ بنایا۔آپ کا اپنا دماغ ٹھیک طرح سے کام نہیں کر رہا''ڈاکٹر دانش نے طنزیہ انداز میں کہا تو ڈاکٹر رابرٹ غصے میں اپنی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''ڈاکٹر دانش کیا آپ ٹھیک نہیں ہونا چاہتے.....مجھے یہ بات صاف صاف بتایئے؟''ڈاکٹر رابرٹ نے ان کے قریب آ کر کہا۔

''آئی ایم ہنڈرڈ پرسنٹ آل رائٹ.....اور.....بائی داوے.....کیا آپ مجھے ٹھیک کریں گے.....آپ.....خود تو.....''ڈاکٹر دانش نے پھر ان کو زچ کرنا چاہا۔

''مجھے چھوڑیے.....اپنی بات کیجیے.....''ڈاکٹر رابرٹ نے بھی قدرے سخت لہجے میں کہا۔

''میں بیمار ہو کر بھی آپ کے پاس آنا پسند نہیں کروں گا''ڈاکٹر دانش نے ٹھوس لہجے میں کہا اور ڈاکٹر رابرٹ کی جانب بغور دیکھتے ہوئے اپنے لانگ کوٹ کے بٹن ٹھیک طریقے سے بند کیے اور ان کے کلینک سے باہر نکل گئے۔

''اوہ.....مائی گاڈ.....یہ کیسا انسان ہے.....اس قدر عجیب انسان.....میں نے آج تک نہیں دیکھا میں اس کا علاج کبھی نہیں کر پاؤں گا''ڈاکٹر رابرٹ نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے انتہائی مایوسی سے سوچا اور آنکھیں بند کر کے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا دی۔

تھوڑی دیر کے بعد ان کا موبائل بجنے لگا...... کافی بیلز کے بعد ڈاکٹر رابرٹ نے موبائل کان سے لگایا۔ دوسری جانب علی موسیٰ تھے۔ ان کی آواز میں قدرے خوشی اور جوش تھا۔ ''ڈاکٹر رابرٹ...... ایک گڈ نیوز ہے...... آج ڈاکٹر دانش کے موبائل پر ان کے ملک سے ایک کال ریسیو ہوئی ہے۔ کوئی ڈاکٹر محسن زیدی تھے ان کے دوست، وہ ڈاکٹر دانش کے بارے میں پوچھ رہے تھے...... میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر دانش کے کیس کے سلسلے میں وہ آپ کی مدد کر سکتے ہیں'' علی موسیٰ نے کہا تو ڈاکٹر رابرٹ نے بھی متجسس ہو کر ان کی بات سنی۔ وہ چند لمحے قبل ڈاکٹر دانش کے رویے سے اس قدر متنفر اور بے زار ہو گئے تھے کہ انہوں نے ان کا کیس چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر اب علی موسیٰ کے بتانے پر وہ پھر متحرک ہو گئے تھے اور انہوں نے یکدم اپنا ارادہ بدل لیا تھا۔

''اب انہیں ضرور ڈاکٹر دانش تک جانے کا راستہ مل جائے گا......'' انہوں نے سوچا اور مطمئن ہونے لگے۔

''آپ مجھے وہ نمبر لکھوایئے جس نمبر سے کال ریسیو ہوئی ہے'' ڈاکٹر رابرٹ نے کہا تو علی موسیٰ نے انہیں جلدی سے وہ نمبر لکھوایا۔

''میں ڈاکٹر محسن سے بات کرتا ہوں'' ڈاکٹر رابرٹ نے فون بند کرتے ہوئے کہا اور ڈاکٹر محسن زیدی کا نمبر ملایا اور ان سے باتیں کرنے لگے۔ ڈاکٹر زیدی، ڈاکٹر دانش کے بارے میں جان کر تاسف کا اظہار کرنے لگے۔ ان کے چہرے پر دکھ اور پریشانی کے تاثرات نمایاں ہونے لگے۔

''ڈاکٹر رابرٹ...... ہمیں ڈاکٹر دانش کو بچانا ہے۔ اگر ان کی خاطر مجھے انگلینڈ بھی آنا پڑا تو میں آؤں گا......'' ڈاکٹر محسن زیدی نے انتہائی سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''ابھی تو مجھے ان کے بارے میں کچھ انفارمیشن چاہیے اگر ضرورت پڑی تو میں آپ کو ضرور انوائیٹ کروں گا'' ڈاکٹر رابرٹ نے کہا۔

اور ڈاکٹر زیدی ان کو اس کیس کے بارے میں بتانے لگے جس کے بعد ڈاکٹر دانش ملک چھوڑ کر چلے گئے تھے اور پھر پلٹ کر نہیں گئے تھے۔

''آئی سی...... اٹس ویری ٹریجک...... مجھے اس کیس کے بارے میں تفصیلات چاہئیں اور کچھ ان کے فیملی بیک گراؤنڈ کے بارے میں بھی انفارمیشن چاہیے'' ڈاکٹر رابرٹ نے کہا۔

''آف کورس...... میں آپ کو ضرور سب کچھ provide کروں گا'' ڈاکٹر زیدی نے کہہ کر فون بند کر دیا۔

ڈاکٹر رابرٹ بہت خوش تھے...... انہیں ایسا شخص مل گیا تھا جس کے ذریعے وہ اس چیلنجنگ کیس کو اچھے طریقے سے ہینڈل کر سکتے تھے۔ وہ بہت گہرائی میں اس کیس کے بارے میں سوچنے لگے جس نے ڈاکٹر دانش کی زندگی کو بدل دیا تھا جس سے ان کی پرسنالٹی split ہو گئی تھی۔

☆

''میڈم...... مسٹر شیر افگن لائن پر ہیں...... ان سے بات کیجیے'' ٹیلی فون آپریٹر نے فریحہ کو اطلاع دی اور اس کو آن لائن کیا۔

''ہیلو...... شیر افگن اسپیکنگ'' شیر افگن نے مسکرا کر کہا۔

''ہیلو...... آئی ایم فریحہ درانی'' فریحہ نے اپنا تعارف کرایا۔

''میں سیکرٹری پلاننگ اینڈ منیجمنٹ ڈیپارٹمنٹ سے بات کر رہا ہوں...... ایک نیشنل بلڈنگ کی مرمت کا کنٹریکٹ ہم آپ کی کمپنی کو دینا چاہتے ہیں۔ کروڑوں کا کنٹریکٹ ہے مگر کام تین ماہ کے اندر مکمل ہونا چاہیے۔ اگر آپ رضامند ہیں تو میرا پی اے آپ کے پاس کنٹریکٹ لے کر آ

جائے گا" شیر افگن نے کہا تو فریحہ چونک گئی۔

"میری کمپنی نے ابھی اتنے large scale (وسیع پیمانے) پر کام شروع نہیں کیا۔ ہم تو چھوٹے پراجیکٹس کرتے ہیں، آئی مین...... گھروں کے پراجیکٹس" فریحہ کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔

"میڈم...... ہمیں سب انفارمیشن ہے اور ہمارے پاس بہت بڑی کمپنیوں کے ٹینڈرز بھی موجود ہیں اور یہ پراجیکٹ حاصل کرنے کے لئے لوگ ہمارے پیچھے بھاگ رہے ہیں مگر یہ کام ایسا ہے جس میں بہت ایمانداری اور لگن چاہیے...... ہم نے آپ کے سارے پراجیکٹس کو اچھی طرح آبزرو کرنے کے بعد یہ پراجیکٹ آپ کو دینے کا فیصلہ کیا ہے...... اس نیشنل بلڈنگ کا وقار بحال ہونے سے آپ کی کمپنی کتنی ترقی کرے گی...... شاید آپ کو اس کا اندازہ نہیں" شیر افگن نے شستہ لہجے میں کہا۔

"وہ تو سب ٹھیک ہے...... مگر اس کام کے لئے بہت پلاننگ، بہت وقت اور لیبر چاہیے...... آپ ٹائم بھی تھوڑا دے رہے ہیں اور کام بھی ہنڈرڈ پرسنٹ پرفیکٹ چاہتے ہیں...... ہماری اپنی limitations ہیں...... سب کو دیکھتے ہوئے مجھے اس پراجیکٹ کے بارے میں فیصلہ کرنا ہوگا" فریحہ نے بہت سنجیدگی سے جواب دیا۔

"میڈم پلاننگ اور لیبر کا فیصلہ آپ کو کرنا ہوگا...... البتہ ٹائم کے بارے میں میں آپ کو relaxation دے دوں گا...... اس کے علاوہ میں آپ کی ہر طرح سے مدد کروں گا۔ جو آپ کو کام کے سلسلے میں چاہیے ہوگی" شیر افگن نے کہا۔

"ٹھیک ہے...... میں ایک دو روز میں سوچ کر بتاؤں گی" فریحہ نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"ایک دو روز نہیں...... صرف ایک روز آپ کے پاس ہے، کل آپ نے مجھے اپنے فیصلے کے بارے میں بتانا ہوگا" شیر افگن نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

"رائٹ......" فریحہ نے زیر لب مسکرا کر جواب دیا اور فون بند کر دیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے عاصم گھومنے لگا۔ اس نے عاصم کی وجہ سے کبھی کسی بڑے پراجیکٹ کے بارے میں نہیں سوچا تھا ورنہ مارکیٹ میں اس کی کمپنی کو بہت اچھی شہرت تھی اور لوگ خود اس سے رابطے کرتے تھے مگر وہ ہر بڑے پراجیکٹ کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیتی کہ اس کے پاس وقت نہیں جبکہ اس کے کولیگز بھی اس پر اعتراض کرتے تھے مگر وہ خاموش رہتی۔ اس نے عاصم کے بارے میں بہت کم لوگوں کو بتا رکھا تھا۔ وہ جب بھی کسی سے عاصم کے بارے میں ذکر کرتی تو لوگ انتہائی حیرت اور قابل ترس نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتے اور ان لمحات میں اسے یوں محسوس ہونے لگتا جیسے وہ بہت بے بس اور مجبور ہو...... اور اپنی اس لاچاری اور بے بسی کا اس کے پاس کوئی جواز نہ ہو۔

وہ پریشانی سے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے ایک دو منزلہ کوٹھی کا بہت بڑا نقشہ پڑا تھا اور وہ اس کی کھڑکیوں، دروازوں کی ڈائریکشن کو انتہائی توجہ سے دیکھ رہی تھی۔ جب شیر افگن کا فون آیا تھا اور اس کے بعد اس کی سوچیں اور ذہن منتشر ہو گیا تھا۔

اس کا ایک سینئر اسسٹنٹ مرتضیٰ بیگ اس کے آفس میں داخل ہوا اس نقشے کو دیکھتے ہوئے مگر کچھ اور سوچتے ہوئے وہ حیرت سے اس کی

جانب دیکھنے لگا۔

''میڈم.......خیریت تو ہے.......سنا ہے.......ہماری کمپنی کو بہت بڑا پراجیکٹ مل رہا ہے.......مبارک ہو.......یہ تو بہت خوشی کی بات ہے'' مرتضٰی بیگ نے خوش کن انداز میں کہا۔

''آپ کو کس نے بتایا ہے.......؟'' فریحہ نے حیرت سے پوچھا۔

''میڈم مجھے ایک آرکیٹیک کا فون آیا تھا.......وہ بتا رہے تھے کہ خبر ہے تو سیکرٹ.......مگر اندر ہی اندر سارے شہر میں پھیل چکی ہے....... وہ تو مجھے مبارکباد بھی دے رہا تھا'' مرتضٰی بیگ نے خوش ہو کر کہا۔

''مگر.......میں نے تو ابھی کوئی رضا مندی ظاہر نہیں کی'' فریحہ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''میڈم.......کیا مطلب.......کیا آپ یہ پراجیکٹ نہیں کریں گی.......؟ شاید آپ کو معلوم نہیں کہ یہ پراجیکٹ کم.......ہماری ترقی اور شہرت کا پروانہ زیادہ ہے۔ اس پراجیکٹ کو کرنے سے ہماری کمپنی زمین سے آسمان پر جا پہنچے گی.......آپ اس کو چھوڑنے کا مت سوچیے گا.......یہ بہت بڑا نقصان ہوگا'' مرتضٰی بیگ نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

''مرتضٰی آپ صرف ترقی اور شہرت کی بات کر رہے ہیں۔ اس میں.......میں کس حد تک انوالو ہوں گی.......سائٹ وزٹس کے علاوہ کنسٹرکشن اور تمام ٹیکنیکل باتوں کا خیال رکھنا.......مجھے یہ بہت ناممکن نظر آ رہا ہے.......آپ تو سب جانتے ہیں۔ اس پراجیکٹ سے عاصم سب سے زیادہ متاثر ہوگا اور اب میری زندگی صرف عاصم سے وابستہ ہے۔ اس کو نظرانداز کر کے میں یہ پراجیکٹ کیسے کر سکتی ہوں۔ کام کرنا میرے لئے مشکل نہیں.......مشکل عاصم کو سمجھانا ہے جس کو کھانا بھی صرف میں ہی کھلا سکتی ہوں۔ وہ پانی کا ایک گھونٹ بھی کسی دوسرے کے ہاتھ سے نہیں پیتا.......اور جب کبھی میں گھر دیر سے جاؤں تو وہ اس قدر خفا ہو جاتا ہے کہ اس کو منانا مشکل ہو جاتا ہے.......'' فریحہ نے پریشان سے کہا۔

''میڈم.......مجبوریاں تو ہر انسان کے ساتھ ہی ہوتی ہیں۔ مجبوریوں کو ساتھ لے کر آگے بڑھنے میں ہی انسان کی کامیابی ہے.......اور یہ پراجیکٹ زیادہ سے زیادہ چار پانچ ماہ میں ختم ہو جائے گا.......اس عرصے کے لئے آپ کوئی ٹرینڈ اٹینڈنٹ عاصم کے لئے رکھ لیں.......بہت سے ایسے لوگ مل جاتے ہیں جن کا تجربہ بھی ہوتا ہے اور جن کو ضرورت بھی ہوتی ہے۔ آپ اخبار میں ایک چھوٹا سا اشتہار دے دیں'' مرتضٰی بیگ نے کہا تو وہ سوچ میں پڑ گئی۔

''میڈم.......یہ پراجیکٹ ہاتھ سے نہیں جانا چاہیے.......آپ آج ہی سیکرٹری صاحب کو فون کر کے 'یس' کر دیں'' مرتضٰی بیگ نے قدرے بے صبری سے کہا۔

''ایسی بھی کیا جلدی پڑی ہے کل تک سوچنے اور فیصلہ کرنے کا مجھے ٹائم ملا ہے.......'' فریحہ نے کہا۔

''میڈم.......نو.......مور.......تھنکنگ.......جسٹ ڈیسائیڈ اٹ (مزید مت سوچیں.......بس فیصلہ کریں)'' مرتضٰی بیگ نے کہا تو فریحہ مسکرا کر اس کی جانب دیکھنے لگی۔

عاصم کا قد زیادہ نہیں بڑھا تھا مگر جسم بہت صحت مند تھا۔ چہرے سے وہ نوجوان، صحت مند لڑکا دکھائی دیتا تھا۔ اس کا بھاری بھرکم جسم اماں سے بھی نہیں سنبھالا جاتا تھا اور خود اس سے بھی نہیں۔

وہ آفس سے واپس گھر گئی تو اماں کا موڈ پھر بگڑا ہوا تھا۔

''اماں..... آج کیا ہوا ہے؟ آپ پھر خفا دکھائی دے رہی ہیں'' فریحہ نے بیگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

''بی بی..... اب عاصم میاں کو سنبھالنا میرے بس سے باہر ہے..... آج تو اس نے حد ہی کر دی..... میں جوس پلانے گئی تو ہاتھ مار کر میرے سارے کپڑے خراب کر دیئے اور پھر غصے سے میرے چہرے پر تھپڑ مارنے لگا..... میں نے تو پاگل سمجھ کر برداشت کر لیا..... کوئی اور ہوتا تو ایک منٹ یہاں نہ ٹکتا..... بی بی..... اس کو پاگل خانے میں داخل کرا دو..... دن بدن بگڑتا ہی چلا جا رہا ہے'' اماں غصے سے بولتی رہی اور اماں کے بہت سے الفاظ پر اس کو غصہ بھی آ گیا مگر وہ خاموش رہی۔

''میں جلد کوئی اور بندوبست بھی کرتی ہوں..... مگر آپ یہاں سے جانے کے بارے میں مت سوچیے گا..... اماں..... اس گھر کو..... مجھے.....اور عاصم کو..... آپ کی عادت ہو گئی ہے'' فریحہ نے آہ بھر کر کہا تو اماں بھی اس کی بات سن کر خاموش ہو گئی۔

فریحہ نے اگلے روز آفس جا کر سب سے پہلے اپنے سٹاف کے ساتھ میٹنگ کی اور پراجیکٹ کے بارے میں ڈسکس کیا۔ سب پراجیکٹ کی فیور میں بولے اور سب سے مشورے کے بعد اس نے شیر افگن کو فون کر دیا۔

''میں اپنے اسسٹنٹ کے ساتھ ایگری منٹ سائن کرنے سے پہلے آپ کے ساتھ ایک میٹنگ کرنا چاہتا ہوں'' شیر افگن نے جواب دیا۔

اگلے روز شیر افگن اپنے اسسٹنٹ کے ساتھ سیاہ سرکاری گاڑی میں آیا۔ وہ 45 سالہ خوبصورت، دراز قد، ڈیسنٹ اور باوقار شخصیت کا مالک تھا۔ آفس میں موجود سب لوگ اسے پرستائش نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ بڑی شاہانہ چال چلتا ہوا فریحہ کے آفس میں داخل ہوا..... فریحہ نے بھی پرتپاک انداز میں اس کا استقبال کیا۔ وہ فریحہ کے بارے میں بالکل مختلف امیج لے کر آیا تھا مگر فریحہ بالکل مختلف شخصیت لیے ہوئے تھی۔ وہ دراز قد، سمارٹ، خوبصورت اور انتہائی پرکشش شخصیت کی مالک تھی۔ اس کے لمبے سلکی براؤن بالوں کی ڈھیلی ڈھالی چٹیا اس کی شرٹ سے بھی لمبی تھی۔ اس کی عمر 37 سال تھی مگر وہ اپنی عمر کی نسبت بہت جوان اور کم عمر دکھائی دیتی تھی۔ اس کی سفید بھوری رنگت پر براؤن آئی بروز اور گھنی براؤن خم کھاتی پلکیں، بڑی بڑی براؤن آنکھیں، ستواں ناک اور خوبصورت خم لیے قدرے بھرے بھرے ہونٹ..... وہ انتہائی گریس فل اور خوبصورت دکھائی دیتی تھی۔

فریحہ نے اپنے سینئر کولیگز کو اپنے آفس میں بلایا تھا اور سب شیر افگن سے بریفنگ لے رہے تھے اس کے مینرز اور انداز گفتگو سے اس کے بیک گراؤنڈ کا اندازہ ہو رہا تھا۔ اس کا تعلق پنجاب کے ایک زمیندار گھرانے سے تھا مگر اس نے ساری تعلیم انگلینڈ اور امریکہ سے حاصل کی تھی۔

فریحہ بہت پروفیشنل انداز میں پراجیکٹ کے تمام تکنیکی پہلوؤں کو ڈسکس کر رہی تھی۔ ریپئرنگ کے لئے وقت اور لیبر کے علاوہ وہ تمام نئی فنی اور آرٹسٹک ٹیکنیکس کے بارے میں بلڈنگ کی پیمائش اور رقبے کو مدنظر رکھتے ہوئے ان سے ڈسکس کر رہی تھی۔ شیر افگن اس کی ذہانت اور پروفیشنل رویے سے بہت متاثر ہو رہا تھا۔

دو گھنٹے کی میٹنگ کے بعد شیر افگن نے اپنے اسسٹنٹ کو اشارہ کیا اور اس نے اگری منٹ فریحہ کی جانب بڑھایا۔

''ہمیں خوشی ہے کہ ہم نے اس پراجیکٹ کے لئے ٹھیک لوگوں کا انتخاب کیا......آپ کی ٹیم سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے'' شیر افگن نے فریحہ کی جانب مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔

''تھینک یو......'' فریحہ نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔

''میڈم......اب یہ آپ پر ہے کہ آپ نئے میٹریل کے ساتھ اولڈ آرٹسٹک ٹچ کو کیسے برقرار رکھتی ہیں'' شیر افگن نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیا یہ آپ کا چیلنج ہے......؟'' فریحہ نے پوچھا۔

''میں چیلنج کو چیلنج نہیں بلکہ توقعات (expectations) کو چیلنج سمجھ کر کام کرنے میں یقین کرتا ہوں......اور مجھے امید ہے کہ آپ میرا مطلب اچھی طرح سمجھ گئی ہوں گی'' شیر افگن نے ذو معنی انداز میں کہا۔

اور میں چیلنج کو expectations نہیں بلکہ ایڈونچر کے طور پر لیتی ہوں کیونکہ "Great expectations always go wrong" چاہے یہ توقعات پرسنل لائف میں ہوں یا پروفیشنل لائف میں...... ہمیشہ غلط ثابت ہوتی ہیں اور یہ میرا تجربہ ہے'' فریحہ نے اگریمنٹ کی فائل پکڑتے ہوئے کہا۔

''انٹرسٹنگ......میں آپ کی بات کو بھی ویلیو کرتا ہوں۔ بہرحال میں آپ کی پروفیشنل اپروچ سے بہت متاثر ہوا ہوں......آپ کی سوچ بہت پریکٹیکل ہے اور قدرت نے آپ کو بہت ذہانت سے نوازا ہے......امید ہے آپ کے ساتھ کام کرنے سے میرے علم اور تجربہ میں مزید اضافہ ہوگا'' شیر افگن نے شستہ انگریزی بولتے ہوئے کہا۔

''تھینکس......'' وہ گہری سانس لے کر قدرے سنجیدگی سے بولی۔

''پراجیکٹ کی آدھی پیمنٹ کا چیک کل آپ کو مل جائے گا اور باقی کام مکمل ہونے کے بعد......اس پراجیکٹ کے لئے فنڈنگ بہت اسٹرونگ ہے۔ اگر ضرورت پڑی تو پیمنٹ کام کے دوران بھی مل سکتی ہے......اس کے علاوہ تمام قسم کی مدد اور تعاون کے لئے میں حاضر ہوں'' شیر افگن نے اٹھتے ہوئے کہا اور فریحہ بھی اپنی پوری ٹیم کیساتھ انہیں رخصت کرنے کے لیے اٹھی۔ شیر افگن اور اس کے اسسٹنٹ کو دروازے تک چھوڑنے آئے۔

''مبارک ہو......میڈم......'' مرتضیٰ بیگ نے انتہائی خوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا تو وہ مسکرا دی۔

''میڈم......اس خوشی میں ڈنر ہونا چاہیے'' اس کے اسسٹنٹ شہریار نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''شیور......لیکن ایک دو روز بعد......ان دنوں میں ذاتی طور پر مصروف ہوں'' فریحہ نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔

''اوکے......ایز یو وش'' مرتضیٰ بیگ اس کی ذاتی وجہ کو اچھی طرح جانتے ہوئے کہا۔

فریحہ نے عاصم کے لئے ایک تیس سالہ صحت مند آدمی ساجد کو ملازم رکھا تھا......اس کے بیوی بچے گاؤں میں رہتے تھے اور وہ نیا نیا شہر آیا تھا......فریحہ کو وہ بہت مناسب لگا کیونکہ اس کو ابھی شہر سے اتنی واقفیت نہیں تھی اور عاصم کے لئے ایسا ہی ملازم چاہیے تھا جو زیادہ وقت اس کے پاس

رہے۔ اسکے علاوہ ساجد زیادہ پڑھا لکھا بھی نہیں تھا اور دو بچوں کا باپ تھا۔ عاصم کے لئے ایسا ہی شخص چاہیے تھا جو اولاد کی محبت سے سرشار ہو۔ فریحہ نے بہت سوچ سمجھ کر اسے اس کی توقعات سے بھی زیادہ تنخواہ پر ملازم رکھا تھا اور وہ اتنی زیادہ تنخواہ اور تمام سہولتوں کے بارے میں سن کر بے حد خوش ہو گیا تھا۔

''ساجد......آؤ...... میں تمہیں اپنے بیٹے سے متعارف کراتی ہوں'' فریحہ ساجد کو لے کر عاصم کے کمرے میں چلی گئی۔

ایک ویل فرنیشڈ کمرے میں ڈبل بیڈ پر ایک برائے نام زندہ وجود لیٹا تھا۔ وہ بے حس و حرکت پڑا منہ سے عجیب و غریب قسم کی آوازیں نکال رہا تھا۔ وہ کبھی اچانک چیختا تو سب ڈر جاتے......اور کبھی خوش ہو کر گلے سے انتہائی غرغراہٹ کے ساتھ آوازیں نکالتا تو سننے والے گھبرا جاتے......وہ ہاتھ پاؤں کو بھی بہت عجیب انداز میں حرکات دے رہا تھا۔

''یہ میرا بیٹا عاصم ہے...... ساجد آپ اس کو اپنی اولاد کی نظر سے دیکھنا...... یہ صرف محبت کی زبان سمجھتا ہے۔ اس کو ذرا سختی سے بھی چھوا جائے تو یہ ناراض ہو جاتا ہے۔ یہ زبان سے بول نہیں سکتا مگر احساسات کی زبان بہت اچھی طرح سمجھتا ہے...... یہ میری کل کائنات ہے...... یہ میری زندگی کا مقصد ہے میں خود اس کی دیکھ بھال کرتی ہوں مگر کچھ ایسی مصروفیت آ گئی ہے کہ مجھے اس کے لئے ملازم رکھنا پڑ رہا ہے......اماں بھی اس کی دیکھ بھال کرنے میں آپ کی مدد کریں گی۔ وہ سولہ سال سے یہیں ہیں۔ بہت اچھی اور نیک خاتون ہیں۔ وہ آپ کو آپ کی ذمہ داریاں سمجھا دیں گی......میں نے آپ کے لئے سرونٹ کوارٹر صاف کرا دیا ہے آپ کل وہاں شفٹ ہو جائیں'' فریحہ نے قدرے ملائمت سے کہا۔

بیگم صاحبہ......کیا اس کو کھلانا پلانا بھی خود ہی پڑے گا؟'' ساجد نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......اور اس کی صفائی ستھرائی و دوسرے دیگر کام بھی آپ کو کرنے پڑیں گے'' فریحہ نے جواب دیا۔

ساجد کے چہرے پر عجیب سے تاثرات نمودار ہوئے۔

''بیگم صاحبہ...... میں نے تو کبھی اپنے بچوں کی ناک صاف نہیں کی...... اس کی صفائی ستھرائی کے کام بھلا کیسے کر پاؤں گا......معاف کریں...... مجھے یہ ملازمت نہیں کرنی'' ساجد نے دوٹوک الفاظ میں کہا تو فریحہ کو جو آس و امید بندھی تھی وہ ایک دم ٹوٹ گئی۔ وہ بہت مایوس ہو گئی اور خاموشی سے ساجد کی جانب دیکھنے لگی مگر وہ اسے روکنا نہیں چاہتی تھی کیونکہ عاصم کی دیکھ بھال کوئی صاحب دل اور خدا خوف انسان ہی کر سکتا تھا۔

ساجد کے جانے کے بعد وہ بہت پریشان ہو گئی۔

''اگر......کوئی ملازم نہ ملا تو پھر میں کیسے سب کچھ manage کر پاؤں گی......اسے کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ رات بھر اس سے اسی پریشانی میں گزری۔

وہ صبح آفس پہنچی تو شیر افگن کے اسسٹنٹ کا فون آ گیا۔ وہ ایگریمنٹ کے بارے میں پوچھنے لگا۔

''میں معذرت چاہتی ہوں کہ میں یہ ایگریمنٹ سائن نہیں کر سکتی'' فریحہ نے آہستہ آواز میں کہا۔

''میڈم...... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں......کل تک تو سب کچھ ٹھیک تھا...... پھر اچانک......آپ نے اپنا ارادہ کیوں بدل دیا؟'' اسسٹنٹ

نے حیرت سے پوچھا۔

''میری کچھ پرسنل پرابلمز ہیں'' فریحہ نے کہہ کر فون بند کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد شیر افگن کا فون آ گیا۔

''میڈم...... کیا میں آپ کا ارادہ بدلنے کی وجہ جان سکتا ہوں؟'' شیر افگن نے حیرت سے پوچھا۔

''میری کچھ ایسی ذاتی وجوہات ہیں جن کی بنا پر میں اس پراجیکٹ پر کام نہیں کر سکتی'' فریحہ نے جواب دیا۔

''کیا...... کل تک وہ پرابلمز موجود نہیں تھیں؟'' شیر افگن نے حیرت سے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

''وہ تو سولہ سال سے موجود ہے...... لیکن......'' فریحہ نے آہ بھر کر اداس لہجے میں کہا۔

''کیا میں وہ وجہ جان سکتا ہوں؟ سوری...... یہ ہے تو آپ کا ذاتی معاملہ...... مگر ممکن ہے کہ میں اس سلسلے میں آپ کی کچھ مدد کر پاؤں'' شیر افگن نے کہا۔

''نہیں...... آپ کوئی مدد نہیں کر سکتے'' فریحہ نے جواب دیا۔

''یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی مسئلے کا کوئی حل نہ ہو......'' شیر افگن نے کہا۔

''میں نے اس مسئلے کا حل ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی مگر ناکام رہی ہوں'' فریحہ نے جواب دیا۔

''میڈم...... آپ کا مایوس لہجہ مجھے مسئلے کی نوعیت بتا رہا ہے لیکن اس کے باوجود میں آپ کی پرابلم جاننا چاہتا ہوں...... پلیز...... ٹرسٹ می'' شیر افگن نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے...... پھر آج شام کو آپ میرے گھر تشریف لائیے...... میں انتظار کروں گی'' فریحہ نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔

آفس میں سارا اسٹاف منتظر تھا کہ فریحہ ایگریمنٹ کے سلسلے میں کوئی بات کرے گی مگر وہ مکمل طور پر خاموش رہی اور اس کی خاموشی سب کے لئے قدرے حیران کن تھی۔

شام کو شیر افگن اس کے گھر آیا تو اس کے گھر کی زبردست آرائش جدید اور قدیم آرکیٹیکچرل اسٹائل دیکھ کر حیران رہ گیا...... وہ ہر جانب پرستائش نظروں سے دیکھ رہا تھا گو کہ فریحہ نے عاصم کا استقبال اچھے انداز میں کیا مگر اس کا چہرہ اور آنکھیں بہت اداس تھیں۔

''آپ کا گھر بہت خوبصورت ہے کیا آپ نے اسے خود ڈیزائن کیا ہے؟'' شیر افگن نے متاثر کن لہجے میں پوچھا۔

''جی ہاں......'' اس نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''آپ بہت زبردست خاتون ہیں...... بہت لاجواب...... میں نے اپنی پوری زندگی میں حسن اور ذہانت کا اتنا خوبصورت امتزاج پہلے کبھی نہیں دیکھا...... یو...... آر...... رئیلی ونڈرفل'' شیر افگن نے مسکراتے ہوئے تعریفی لہجے میں کہا۔

''آپ چائے لیں گے یا کولڈ ڈرنک؟'' فریحہ نے اس کی تعریفی باتوں کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔

''چائے......'' وہ مسکرا کر بولا۔

فریحہ ڈرائنگ روم سے باہر چلی گئی اور اماں کو چائے لانے کو کہا۔

"کیا......اب میں وہ وجہ جان سکتا ہوں؟" شیر افگن نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

"اماں چائے لا رہی ہیں......اس کے بعد" وہ آہستہ آواز میں بولی اور خاموش ہوگئی۔

شیر افگن حیران ہو رہا تھا کہ وہ آفس میں بالکل مختلف شخصیت لیے ہوئے تھی اور گھر میں اس سے بالکل الٹ۔

آفس میں وہ بہت ذہین، ٹیلنٹڈ، ایکٹو اور پروفیشنل دکھائی دیتی تھی اور گھر میں بہت خاموش، گھریلو خاتون......اماں چائے لے کر آ گئی۔ چائے بہت پر تکلف تھی اور کراکری بھی بہت اسٹائلش اور نفیس تھی۔ چائے پینے کے بعد وہ اٹھی۔

"آپ آیئے میرے ساتھ" فریحہ نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا اور وہ اس کے پیچھے چلنے لگا۔ پیچھے چلتے ہوئے وہ اس کے براؤن بالوں کی لمبی چٹیا کو انتہائی پر شوق نگاہوں سے دیکھ رہا تھا......اس کی شخصیت بہت پر کشش اور جاذب نظر تھی۔ شیر افگن اس کے ساتھ چلتے ہوئے ایک عجیب سے مسرور کن سحر میں مبتلا ہو رہا تھا۔

وہ اس کے ساتھ عاصم کے کمرے میں داخل ہوئی۔ بیڈ پر ایک ابنارمل وجود کو لوٹ پوٹ ہوتے دیکھ کر شیر افگن چونک گیا۔ عاصم نے فریحہ کی جانب دیکھ کر عجیب سی بے ہنگم آوازیں نکالیں۔

"یہ......یہ......کون ہے؟" شیر افگن بمشکل بولا۔

"میرا بیٹا......اور یہی میری مجبوری ہے......" وہ آہ بھر کر بولی۔

"آئی......ایم......سوری......" وہ رک رک کر بولی۔

قدرت کے فیصلوں پر افسوس کیسا؟ اس نے آہ بھر کر جواب دیا۔

شیر افگن پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس عجیب الخلقت بچے کو دیکھتا رہا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے......اسے کیسے تسلی دے۔ کیسے اس کی مدد کرے۔ وہ تو بہت مضبوط ارادے اور دعوے کے ساتھ آیا تھا۔

"آیئے......ڈرائنگ روم میں چلتے ہیں" فریحہ نے اس کو خاموش دیکھتے ہوئے کہا اور عاصم فریحہ کو جاتے ہوئے دیکھ کر چلانے لگا۔

"میں ابھی آتی ہوں......" فریحہ نے اس کے قریب جا کر اس کی پیشانی محبت سے چومتے ہوئے کہا اور اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا......

عاصم خاموش ہوگیا جیسے اس کی بات کا مطلب سمجھ گیا ہو۔ اس کی بھینگی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہونے لگی۔ شیر افگن حیرت سے دونوں کی جانب دیکھنے لگا۔ فریحہ کچھ کہے بغیر کمرے سے باہر نکل گئی۔

شیر افگن اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

"کیا یہ آپ کا اکلوتا بیٹا ہے؟" شیر افگن نے ڈرائنگ روم میں صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں......"

''اور آپ کے شوہر......؟''

''وہ نہیں ہیں''

''کیا مطلب......؟''شیر افگن نے حیرت سے پوچھا۔

''انہیں ہماری ضرورت نہیں تھی'' وہ آہ بھر کر بولی۔

''کیا ضرورت ہی رشتے کی بنیاد ہے؟''شیر افگن نے پوچھا۔

''شاید ہاں......''

''اگر ایسی بات ہے تو پھر بے لوث محبت اور پر خلوص رشتے کہاں سے جنم لے سکتے ہیں...... میں ایسا نہیں سوچتا'' شیر افگن نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

''ہر انسان کی سوچ مختلف ہوتی ہے......کوئی کسی کو کسی بات کے لئے مجبور نہیں کر سکتا'' فریحہ نے جواب دیا۔

''میڈم......کیا آپ نے اس بچے کے لئے کوئی نرس...... آیا...... یا اٹینڈنٹ نہیں رکھا؟'' شیر افگن نے پوچھا۔

''کل تک اس کے بارے میں پر امید تھی کہ کوئی اٹینڈنٹ مل جائے گا مگر لوگ ایسے بچوں کو دیکھ کر فوراً خدا کو تو یاد کرتے ہیں مگر انہیں خدا کی مخلوق سمجھ کر وہ محبت اور پیار نہیں دیتے جو اس طرح کے انسان چاہتے ہیں۔لوگوں کو ان پر حیرت کے ساتھ کراہت محسوس ہوتی ہے۔وہ انہیں انسان کم بوجھ زیادہ سمجھتے ہیں......اور دوسروں سے کیا شکوہ کریں...... جب بہت سے والدین بھی اپنی اولاد کو ایسا ہی سمجھتے ہیں'' فریحہ نے آہ بھر کر کہا۔

''کیا آپ اس بچے کی وجہ سے یہ پراجیکٹ نہیں کر رہیں؟'' شیر افگن نے پوچھا۔

''ہاں...... وہ میرے علاوہ کسی سے کھانا نہیں کھاتا...... اماں صرف اسے liquid پلا سکتی ہیں...... میں اس کی ماں ہوں...... کیسے برداشت کر پاؤں گی کہ میری اولاد بھوکی پیاسی رہے......اور...... میں کام کر کے اس کے لئے پیسہ کماؤں...... اسے میرے پیسے کی نہیں میری محبت اور توجہ کی ضرورت ہے......اس پوری دنیا میں صرف ایک میں ہی تو ہوں جو اس کو انسان اور اپنے وجود کا حصہ سمجھتی ہوں......اور کون ہے اس کا میرے سوا......؟ فریحہ ایک دم سسکنے لگی۔اسے خود بھی سمجھ نہیں آیا کہ وہ کیوں اتنا حوصلہ ہار بیٹھی ہے اور رونے لگی۔شاید ابھی وہ ایک معذور و بے بس بچے کی ماں کی حیثیت سے اپنا دکھ بیان کر رہی تھی یا پھر ایسی مجبور و بے بس عورت کے...... جو کسی گرداب میں پھنسی تھی اور اسے کوئی راہ فرار نظر نہ آ رہی تھی۔

پلیز......اپنے آپ کو کمپوز کیجئے......ہم سب انسان کہیں نہ کہیں بہت بے بس اور مجبور ہوتے ہیں......ظاہراً پہاڑوں جیسے طاقتور......کبھی نہ جھکنے والے......مگر اندر سے بہت بھر بھرے گیلی ریت کی مانند لمحوں میں دب جانے والے...... میں آپ کی پرابلم کو بہت اچھی طرح سمجھ گیا ہوں...... آپ کے جذبات اپنے بچے کے لئے بہت اسٹرونگ ہیں۔میں ان کی قدر کرتا ہوں اور آپ میرے لئے پہلے سے بھی زیادہ محترم ہوگئی ہیں۔پہلے میں آپ کی عزت آپ کی ذہانت اور پروفیشنل اپروچ کی وجہ سے کرتا تھا لیکن اب ایک بہت اچھی انسان اور قابل قدر ماں کی حیثیت سے کرتا ہوں'' شیر افگن نے اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے قدرے نم آنکھوں سے کہا اس کی آنکھوں میں اس کے لئے خلوص اور آواز قدرے بھرائی ہوئی تھی۔

''تھینک یو...... میں کل آپ کو ایگریمنٹ واپس بھیج دوں گی'' فریحہ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا اور شیر افگن اس کی بات سن کر خاموش ہو گیا۔

''میڈم...... یہ آپ نے کیا کیا...... پراجیکٹ کینسل کر دیا ہے...... کیا آپ کو معلوم ہے...... آپ کتنا بڑا نقصان کر رہی ہیں؟'' مرتضیٰ بیگ اور اس کے دوسرے کولیگز نے کہا۔

''مسٹر مرتضیٰ جب کوئی پودا لگاتا ہے تو اسے پھلدار، تناور درخت بنانے میں کتنی جدوجہد کرتا ہے۔ اس کے سائے میں بیٹھنے والا کبھی بھی اس طویل جدوجہد کے بارے میں نہیں سوچتا...... میں نے اس کمپنی کو کس طرح اسٹیبلش کیا ہے اور آج میں دس سالوں کی محنت کے بعد جس مقام پر کھڑی ہوں...... مجھے سب اندازہ ہے آپ کامیابی اور ترقی کی بات کر رہے ہیں...... جو کامیابی آپ کسی کو روند کر یا کسی کے حقوق غصب کر کے حاصل کرتے ہیں کامیابی نہیں ہوتی خاک ہوتی ہے جو آپ اپنے سر میں ڈالتے ہیں...... میں بھی ترقی کرنا چاہتی ہوں...... آگے بڑھنا چاہتی ہوں مگر قدرت انسان کے گلے میں مجبوریوں کے ایسے طوق ڈالتی ہے کہ بعض اوقات اس طوق کو اتارنا مشکل ہو جاتا ہے...... میں بھی ایسی ہی مجبور ہوں'' فریحہ نے دھیمے مگر مضبوط لہجے میں یوں کہا جیسے اسے اپنے فیصلے پر کوئی پچھتاوا نہ ہو......

''تھینک یو ویری مچ...... آپ لوگ اپنا کام کیجئے'' فریحہ نے کہا اور مرتضیٰ بیگ کی جانب دیکھا جو شاید اس کی بات کا مطلب اچھی طرح سمجھ گیا تھا اور اب اس کے پاس اسے قائل کرنے کو کچھ نہیں تھا...... سب خاموشی سے باہر چلے گئے اور فریحہ اپنی ریوالونگ چیئر کی پشت کے ساتھ سر ٹکا کر چھت کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی۔ کامیابی اور اس کے مواقع بھی قسمت سے ملتے ہیں...... ورنہ قسمت انسان کو ایسی مات دیتی ہے کہ ہر کھلا نظر آنے والا دروازہ بھی بند ہو جاتا ہے۔ اسے زندگی میں ترقی کرنے کے بارہا موقع ملے تھے مگر ہر بار اسے اپنا راستہ بدلنا پڑا تھا۔ قدرت ہر بار اس کے سامنے مجبوریوں کی ایسی دیواریں کھڑی کر دیتی کہ اسے ہر بار ہی واپس لوٹنا پڑا۔

سول انجینئرنگ میں اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کرنے پر اسے بیرون ملک اعلیٰ تعلیم کے لئے اسکالرشپ مل رہا تھا مگر تب اسکو پہلے بچے کی پیدائش متوقع تھی اور اس کا شوہر اس کی راہ میں رکاوٹ بن گیا۔ اسے اپنی اولاد عزیز تھی اس کا انتخاب ہو چکا تھا مگر اسے اپنی فیملی بچانے کے لئے اپنے مستقبل کو داؤ پر لگانا پڑا اور بچہ بھی پیدائش کے فوراً بعد فوت ہو گیا اور جس کی موت کا ذمہ دار اسے ٹھہرایا جاتا...... اس کا شوہر ہر وقت اسے tease کرتا...... ہرٹ کرتا رہتا...... اور وہ کسی زخمی پرندے کی طرح صرف پھڑ پھڑاتی رہتی۔ اسے ملک کے نامور آرکیٹکس نے اپنے ساتھ کام کرنے کی دعوت دی تھی مگر اس کا شوہر اسے کام کرنے سے تو نہ روکتا مگر اس طرح زچ کرتا اور ہر ایک میں یوں نقص نکالتا کہ وہ ان کے ساتھ کام کرنے سے انکار کر دیتی...... اس کے ساتھ کام شروع کرنے والے لوگ کہاں سے کہاں پہنچ گئے تھے اور وہ وہیں کھڑی تھی۔

''میں نے حسن اور ذہانت کا خوبصورت امتزاج آپ میں دیکھا ہے'' شیر افگن کے الفاظ اچانک اس کے ذہن میں گونجے، طنزیہ زخمی مسکراہٹ سے اس نے اپنے ہونٹ سکوڑے۔

''تم اس قابل بھی نہیں کہ ایک صحت مند بچے کو جنم دے سکتی...... تم جیسی مخبوط الحواس اور سنکی عورتیں ہی ایسے عجوبے پیدا کرتی ہیں...... اس سے تو بہتر تھا کہ تم بانجھ ہی رہتیں......'' اس کا شوہر اس کی تذلیل کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا اور عاصم کی پیدائش کے بعد تو وہ اس کے طنز

اور تنقید کا ایسا نشانہ بن گئی تھی جسے وہ ہر دم نشتر چبھوتا رہتا۔ نجانے عاصم ایسا کیوں پیدا ہوا تھا......؟ وہ یہ سوال اکثر تنہائی میں اپنے آپ سے پوچھتی۔

اس کی ابنارملٹی کا ذمہ دار اسے ٹھہرایا جاتا تھا......

کیا واقعی ہی وہ اس کی ذمہ داری تھی......؟

وہ جو انتہائی ذہین اور لائق سمجھی جاتی تھی۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے والدین اور دو بہن بھائی سب ڈاکٹر تھے۔ صرف اس نے ہی سول انجینئرنگ کی تھی اور وہ بھی اپنے انٹرسٹ کی وجہ سے سکول کالج اور یونیورسٹی میں ہمیشہ اسے وظائف ملتے رہے۔ بہت اچھی مقررہ بھی تھی......وہ میتھس کے سوالات منٹوں میں حل کر لیتی تھی۔ اخبارات میں شائع ہونے والی پزلز (puzzles) حل کرنے میں اس کا جواب نہیں تھا اور شطرنج میں اسے شکست دینا بہت مشکل تھا۔ وہ اپنے دونوں بہن بھائیوں میں سب سے زیادہ لائق تھی اور اس کا شوہر اسے کند ذہن، مخبوط الحواس، احمق، نان سینسس اور نجانے کیا کیا کچھ کہتا تھا۔ ہر لمحے اس کی ذات کی نفی کرتا رہتا تھا...... جبکہ اس نے فریحہ سے شادی اس کی خوبصورتی اور ذہانت سے متاثر ہو کر کی تھی...... اس کا کمرا ٹرافیز، ایوارڈز، شیلڈز اور فریم شدہ سرٹیفکیٹس سے بھرا ہوا تھا اور تب وہ اس کی تعریفیں کرتا نہ تھکتا تھا......اور اس نے اسے اپنا بہت بڑا قدردان پا کر اس سے شادی کے لئے ہاں کہہ دی اور شادی کے بعد وہی سب سے زیادہ اس کی بے قدری کرنے لگا۔

گزرے ہوئے ماضی کا ایک ایک لمحہ اذیتوں سے پر تھا......اس کے پہلے بچے میں بھی جینیٹک پرابلمز تھیں اور اسی لئے وہ بھی زیادہ دیر زندہ نہیں رہ پایا تھا......اور...... عاصم کو کینسیو کرنے سے لے کر اس کی پیدائش تک وہ شدید ذہنی دباؤ کا شکار رہی تھی......اور عاصم کا سارا وجود ٹھیک تھا......سوائے دماغ کے......شاید قدرت جب اس کا دماغ تخلیق کر رہی ہوگی......تب اس کا اپنا دماغ پر اس کے شدید ذہنی اضطراب اور اسٹریس میں تھا۔ اس کی بے ترتیب اور منفی سوچوں کا ردعمل عاصم کی صورت میں ظاہر ہوا تھا۔

اس کا شوہر اسے دھتکار کر چلا گیا تھا۔

''آئینہ وہی عکس دکھاتا ہے جیسا وہ اپنے سامنے دیکھتا ہے اور ماں بھی ویسے ہی بچے کو جنم دیتی ہے جیسی وہ اندر سے خود ہوتی ہے......میں تمہیں دیکھ کر دھوکا کھا گیا......مگر تم اندر سے کیسی ہو......تمہارے اس بچے نے ظاہر کر دیا ہے......تم نے ایسا بچہ پیدا کر کے مجھے سوسائٹی میں تضحیک کا نشانہ بنایا ہے۔ اسے گود میں اٹھا کر میں جہاں بھی جاؤں گا لوگ مجھ پر ہنسیں گے کہ اتنی اعلیٰ ذہانت رکھنے والے شخص کے ہاں ایسی اولاد پیدا ہوتی ہے......تم نے اسے جنم دیا ہے اس لئے تم ہی اسے سنبھالو......میرا تم دونوں سے کوئی تعلق نہیں'' وہ اپنی ذات کے زعم میں نجانے کیا بڑے بڑے بول بولتا ہوا چلا گیا اور وہ اسے کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ اسے روک بھی نہ سکی...... کیسے روکتی وہ تو اس کی ذات، اس کی انا، اس کی عزت کو اپنے قدموں تلے روند کر چلا گیا اور قدرت نے اس کے گلے میں ڈالے طوق کو مجبوریوں کی گرہ سے اور مضبوط کر دیا۔ وہ اس طوق کو کبھی بھی خود اتار کر نہیں پھینک سکتی تھی۔ یہ طوق اس کے وجود کا حصہ بن گیا تھا......اس سے چھٹکارا پانا اس کے لئے ناممکن تھا......اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور وہ سسکنے لگی۔

اس کا موبائل بجنے لگا اس نے جلدی سے نمبر دیکھا اور گھبرا گئی۔

''اماں......خیریت تو ہے؟'' اس نے جلدی سے پوچھا۔

''بی بی...... عاصم بیٹا بیڈ پر سے گر گیا ہے اور مجھ بڑھیا سے اٹھایا بھی نہیں جا رہا۔ اس کی ناک اور منہ سے خون بہہ رہا ہے...... میں بہت پریشان ہوں'' اماں نے گھبرا کر کہا۔

''اماں...... آپ اس کے پاس ہی رہیے...... میں گھر آ رہی ہوں'' فریحہ نے موبائل آف کر کے جلدی سے اپنا بیگ کندھے پر ڈالا اور قدرے بھاگتی ہوئی آفس سے باہر نکلی۔

''یہ میڈم کو کیا ہوا ہے......؟'' سٹاف نے ایک دوسرے سے پوچھا۔

''یقیناً...... کوئی سیریس پرابلم ہو گی...... جو وہ یوں بھاگتی ہوئی گئی ہیں'' اس کی سیکرٹری نے کہا اور سب خاموش ہو گئے۔

عاصم بہت بے ہنگم طریقے سے رو رہا تھا اور انتہائی خوفناک آوازیں نکال رہا تھا...... اماں کاٹن سے اس کا خون صاف کرنے میں مصروف تھی جب فریحہ گھر پہنچی۔ وہ انتہائی بدحواس ہو رہی تھی...... وہ کارپٹ پر ہی پڑا تھا...... اور اماں اس کے پاس بیٹھی تھی۔

''اماں...... آئیے...... پہلے اس کو اٹھا کر بیڈ پر لٹائیں'' فریحہ نے کہا اور اماں کے ساتھ مل کر بہت مشکل سے اس کو بیڈ پر لٹایا۔ اس کا بھاری وجود ڈھیلا پڑنے سے اور بھاری ہو گیا تھا۔ وہ دن بدن موٹا ہوتا جا رہا تھا اور سر پہلے سے بھی کئی گنا چھوٹا ہو گیا تھا۔ اس نے جلدی سے اس کی بینڈج وغیرہ کی ایسا ہر دوسرے تیسرے روز ہوتا تھا۔ اگر وہ بیڈ دیوار کے ساتھ لگاتی تو وہ سر دیوار کے ساتھ مار مار کر اسے زخمی کر لیتا اور اگر دیوار سے فاصلے پر اس کا بیڈ لگاتی تو وہ کروٹیں بدلتا ہوا نیچے گر جاتا اور پھر اسے اٹھانا مشکل ہو جاتا تھا۔ اگر کارپٹ پر میٹرس بچھا کر اسے لٹاتی تو وہ سارے کمرے میں لوٹتا اور اکثر سر واش روم کے دروازے کے ساتھ جا لگتا...... اس نے اپنی ہر کوشش کر دیکھی تھی مگر وہ اس کے سونے کا انتظام نہ کر پائی تھی...... روز بروز اس کی مشکلات میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ عاصم اس کے لئے ایک کڑی آزمائش بنتا جا رہا تھا اور ہر بار اس کو چوٹیں لگنے پر وہ اس کی بے بسی پر روتی رہتی۔

نجانے قدرت ایسے انسانوں کو کیونکر تخلیق کرتی ہے...... جنہیں دوسروں کی بہت ضرورت ہوتی ہے مگر ان کی کسی کو ضرورت نہیں ہوتی۔ جن کے ہونے نہ ہونے سے دنیا کو نہ کوئی کمی محسوس ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی فرق پڑتا ہے۔ جو دوسروں کے لئے بوجھ ہوتے ہیں مگر خود کسی کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے...... جنہیں نہ زندگی کا شعور ہوتا ہے اور نہ ہی اپنا...... وہ ہر بار کھانا کھلاتے ہوئے، سلاتے ہوئے اور اس سے محبت کرتے ہوئے اس کے ہاتھ پاؤں، اس کے بالوں، اس کی آنکھوں اور جسم کے ایک ایک حصے کو دیکھتی اور قدرت پر حیران ہوتی جس نے اس کے سب اعضاء کو ٹھیک پیدا کیا تھا۔ سوائے دماغ کے...... اور دماغ بھی ٹھیک تھا سوائے ایک حصے کے...... اس کی pregnancy میں brain damaged ہو گیا تھا اور اسے معلوم تھا وہ حصہ کب damage ہوا تھا۔ جب اس کے شوہر نے اسے غصے میں بیڈ سے دھکا دیا تھا اور وہ لڑکھڑا کر کارپٹ پر گر گئی تھی...... تب اس نے اپنے اندر ایک عجیب سا درد اور اذیت محسوس کی تھی جو چند گھنٹے گزرنے کے بعد خود بخود ٹھیک ہو گئی اور وہ بھی اس بات کو بھول گئی مگر عاصم کی ذہنی حالت نے اسے پھر سے وہ اذیت ناک لمحہ یاد دلا دیا تھا...... وہ ڈاکٹروں سے بار بار پوچھتی کیا اس کی وجہ وہ لمحہ تھا...... اور وہ بے یقینی سے جواب دیتے...... شاید...... ہاں...... شاید نہیں'' یہ تو خدا کو ہی معلوم ہے جو جب چاہتا ہے اور جیسے چاہتا ہے...... تخلیق کرتا ہے...... وہ مایوسی اور نم آنکھوں سے عاصم کی جانب دیکھتی۔ ڈاکٹر صاحب کوئی امید......؟ وہ یہ سوال پوچھنے ملک کے تمام بڑے ڈاکٹروں اور ماہرین نفسیات کے پاس جاتی۔

''زندگی کے آخری لمحے تک امید کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔ جو خدا اسے یوں پیدا کر سکتا ہے وہ اسے ٹھیک بھی کر سکتا ہے'' ہر ایک کا یہی جواب ہوتا اور یہ جواب اس کی ناامید اور مایوس زندگی کو پھر سے پر امید بنا دیتا۔ وہ سولہ سالوں سے اس امید کے سہارے زندہ تھی۔ جب بھی عاصم میں کوئی مثبت تبدیلیاں دیکھتی تو خوشی سے پھولی نہ سماتی اور اس کی وہ حرکت اس کی امید کو اور مضبوط بنا دیتی......

قدرت ہر شے پر قادر ہے...... جو بے جان سے جاندار تخلیق کر سکتا ہے کیا وہ اس کے دماغ کو ٹھیک نہیں کر سکتا......؟

یقیناً ایک دن ایسا ہی ہوگا...... عاصم ٹھیک ہو جائے گا۔ دس سالوں کے بعد کبھی کبھار اس کے سہارے بیٹھنے لگتا مگر زیادہ دیر نہیں، پھر لڑھک جاتا تھا اور اچانک گرنے سے اسے چوٹیں آئی تھیں...... اور اس کی چوٹوں اور زخموں پر مرہم رکھتے ہوئے وہ کتنا روتی اور سسکتی رہتی تھی۔

نجانے قدرت اسے کیا معجزہ دکھانے پر تلی تھی......؟ وہ کتنی سخت آزمائش میں سے گزر رہی تھی...... یہ صرف وہی جانتی تھی...... قدرت نے اس کے دل کو عاصم کی محبت سے اس قدر سرشار کر دیا تھا کہ وہ اس کے لئے اس کی زندگی اور زندگی کی سب سے بڑی خوشی اور امید بن گیا تھا۔ وہ آفس میں جاتی تو اس کے ذہن میں وہی ہوتا...... ہر میٹنگ میں جانے سے پہلے اور واپس آ کر وہ فون کر کے اماں سے عاصم کے بارے میں پوچھتی رہتی۔ اس نے عاصم کی وجہ سے ہر بڑا پراجیکٹ لینے سے انکار کیا تھا۔ اس لئے اپنے اوقات کو صرف عاصم اور اپنے کام کے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔ وہ خود کہیں گم ہو چکی تھی۔

''بی بی...... اٹھو...... جا کر سو جاؤ'' اماں نے اسے سوتے ہوئے عاصم کے سر پر اپنا سر رکھ کر سوتے ہوئے دیکھ کر کہا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی......

''آج اس کی طبیعت ٹھیک نہیں...... میں ادھر ہی سو جاتی ہوں'' فریحہ نے جواب دیا۔

''دیکھ لینا...... وہ ہر روز رات کو بستر گیلا کر دیتا ہے'' اماں نے منہ بنا کر کہا۔

''میں نیچے میٹرس پر سو جاتی ہوں'' اور وہ بیڈ کے قریب میٹرس بچھا کر سو گئی......

☆

ڈاکٹر دانش انگلینڈ میں بیمار ہیں...... وہ سائیکو ہو چکے ہیں...... ان کی حالت کافی مایوس کن ہے'' ڈاکٹر محسن زیدی نے ڈاکٹر رمیض کو فکر مندی سے بتاتے ہوئے کہا۔

''کیا آپ کی ان سے بات ہوئی؟'' ڈاکٹر رمیض نے پوچھا۔

''نہیں...... ڈاکٹر رابرٹ سے ہوئی تھی وہ ان کا علاج کر رہے ہیں...... وہی بتا رہے تھے کہ ڈاکٹر دانش کی ذات بالکل بکھر گئی ہے...... اور وہ اپنے آپ کو کمپوز نہیں کر پا رہے'' ڈاکٹر زیدی نے آہ بھر کر کہا۔

''اٹس ویری سیڈ'' ڈاکٹر رمیض نے بھی تاسف کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''یقین نہیں آتا...... اس قدر جینئس...... اور ٹیلنٹڈ انسان یوں بھی بکھر سکتا ہے'' ڈاکٹر زیدی نے نم آنکھوں سے کہا۔

''سر...... خدا نے انسان کو بہت کمزور پیدا کیا ہے...... اور یہ دعویٰ بالکل سچ ثابت ہوتا ہے...... جب اتنی خوبیوں والے انسان منتشر ہو جاتے ہیں...... سر...... ہمیں ان کو بچانے کی کوشش کرنی چاہیے......'' ڈاکٹر رمیض نے کہا۔

''ہاں...... میں ڈاکٹر رابرٹ سے رابطے میں ہوں اور جب میری ضرورت پڑے گی وہ مجھے بلالیں گے......'' ڈاکٹر زیدی نے کہا۔

''سر...... میں بھی آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہوں بلکہ اگلے ماہ میں ایک کانفرنس میں انوائیٹڈ بھی ہوں...... کیوں نا...... کانفرنس سے فارغ ہوکر میں ان سے ملنے چلا جاؤں'' ڈاکٹر رمیض نے کہا۔

''ہاں...... یہ اچھا آئیڈیا ہے۔ مجھے بھی انویٹیشن لیٹر ملا ہے مگر میں ذاتی مصروفیات کی وجہ سے جا نہیں پاؤں گا...... بہتر ہے آپ ہی چلے جائیے'' ڈاکٹر زیدی نے کہا۔

''سر...... آپ کے علاوہ اور بہت سے ڈاکٹر...... ڈاکٹر دانش کی بہت تعریف کرتے ہیں...... ان کی ذہانت اور ان کی ریسرچ کی۔ میں سوچتا ہوں...... کہ صرف اس ایک واقعے نے ان کی زندگی کو اتنا بدل دیا کہ ان سے ان کا سب کچھ چھین لیا...... ان کی کامیابیاں، ان کی عزت، شہرت اور ان کا کیریئر بھی'' ڈاکٹر رمیض نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''ہاں انسان بہت عجیب ہے، کبھی کوئی ایک لمحہ اس کی زندگی سنوار دیتا ہے اور کبھی کوئی لمحہ اس سے اس کا سب کچھ چھین لیتا ہے......'' ڈاکٹر زیدی نے جواب دیا۔

''مجھے یہ سن کر انتہائی افسوس ہو رہا ہے کہ برین نیورانز کو سمجھنے اور ان پر اتنی ریسرچ کرنے والے شخص کا اپنا دماغ بکھر گیا...... اس کے اپنے نیورانز ڈسٹرب ہوگئے'' ڈاکٹر رمیض نے آہ بھر کر کہا۔

''ضروری نہیں کہ جو کسی شے کو سمجھنے کا دعویٰ کرے تو وہ اس پر مکمل قدرت بھی رکھتا ہو...... اگر ایسا ہوتا تو زندگی کے فلسفے کو سمجھنے والے فلاسفر خود زہر کا پیالہ نہ پیتے...... زندگی بہت بڑا معمہ ہے اور انسان اس معمے کو حل کرنے والا ایسا خاموش ورکر ہے جسے اپنی ساری زندگی گزارنے کے باوجود بھی نہ کوئی سرا ملتا ہے نہ کوئی حل......'' ڈاکٹر زیدی نے جواب دیا تو ڈاکٹر رمیض بھی خاموش ہوگئے...... کمرے میں گہرا سکوت چھا گیا اور دونوں کے ذہن الجھنے لگے......

☆

''میں...... کون ہوں......؟''

''میں...... کون ہوں......؟'' ڈاکٹر رابرٹ آہستہ آہستہ سرگوشیوں کی صورت میں ڈاکٹر دانش کے قریب آکر اپنے الفاظ دہرا رہے تھے اور ڈاکٹر دانش نیند اور بیداری کی درمیانی کیفیت میں آنکھیں بند کیے ایک نیم تاریک کمرے میں اسٹریچر پر لیٹے تھے۔ ڈاکٹر رابرٹ آہستہ آہستہ ان کا دماغ اپنے کنٹرول میں کر رہے تھے۔ جب علی موسیٰ کی انتہائی کوششوں کے باوجود بھی ڈاکٹر دانش انہیں ان کی زندگی کے بارے میں کچھ بھی جان نہیں پائے تھے تو ڈاکٹر رابرٹ نے انہیں ہپناٹائز کرنے کا پلان بنایا تھا اور انہیں کافی حد تک ڈاکٹر دانش کے بارے میں معلومات ڈاکٹر محسن زیدی نے دی

تھیں۔خاص طور پر شہزاد صدیقی کیس کے بارے میں......جس کی وجہ سے ڈاکٹر دانش کو جیل جانا پڑا تھا۔

ڈاکٹر رابرٹ اپنے الفاظ دہرا رہے تھے اور ڈاکٹر دانش پر ایسی کیفیت طاری ہو رہی تھی کہ جو نہیں......ان سے ملا رہی تھی......ان کا ماضی ان کے سامنے کھلنے لگا تھا......

''میں کون ہوں......؟''ڈاکٹر رابرٹ نے الفاظ انتہائی سرگوشی کی صورت میں پھر دہرائے۔

ڈاکٹر دانش کے لب آہستہ آہستہ ہلنے لگے......جیسے وہ کچھ کہنا چاہ رہے ہوں مگر آواز ان کے لاشعور سے نکلنے میں کچھ وقت لے رہی ہو......جیسے ان کا دماغ آہستہ آہستہ اس کیفیت میں جانے کے لئے ٹیون(tune) ہو رہا ہو......

☆

دن چڑھے نذیر حسین سرکس سے گھر واپس لوٹا تو سارے گھر میں بہت خاموشی تھی۔سب لوگ سو رہے تھے صرف زینب جاگ رہی تھی۔

''نذیر حسین تم آگئے ہو......؟''زینب نے آواز دے کر پوچھا۔

''ہاں......''نذیر حسین نے تھکی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''کیا اقبال حسین کا کچھ پتہ چلا......؟''زینب نے پر امید لہجے میں پوچھا۔

''نہیں......''اس نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''آج پھر نہیں......''زینب نے ایک دم مایوسی سے جواب دیا۔

''زینبے......چھوڑ دے اس کا انتظار......وہ کہیں گم نہیں ہوا......وہ ہمیں خود چھوڑ کر گیا ہے......اپنی مرضی سے......اور اپنی مرضی سے جانے والے کبھی لوٹ کر نہیں آتے''نذیر حسین خفگی اور دکھ کے ملے جلے تاثرات سے بولا۔

''وہ ضرور ایک دن آئے گا......میرا دل کہتا ہے''زینب نے اپنی آنکھوں کو بے سمت ادھر ادھر گھماتے ہوئے کہا۔

''ہمیں چھوڑ کر اسے گئے ہوئے پندرہ سال ہو گئے ہیں اور تو اس کے انتظار اور جدائی میں رو رو کر اندھی ہو گئی ہے مگر وہ نہیں آیا......''نذیر حسین نے افسردگی سے کہا۔

''میری دعائیں اسے ضرور واپس لے آئیں گی''زینب نے پھر پر امید لہجے میں کہا۔

''پتھر دل لوگوں پر دعائیں اثر نہیں کرتیں......کیا تو بھول گئی وہ الفاظ جو وہ ہمیں کہہ کر گیا تھا......''

''مجھے آپ لوگوں سے نفرت ہے......آپ لوگ میری ترقی اور کامیابی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔جب لوگ مجھے سرکس میں کام کرنے والے''جوکر''کا بیٹا کہتے ہیں تو بے عزتی کے احساس سے میرے بدن پر چیونٹیاں رینگنے لگتی ہیں......مجھے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگتی ہے کہ میں آپ کے گھر کیوں پیدا ہوا......اتنے گندے اور غلیظ لوگوں کے گھر''نذیر حسین سسکنے لگا۔

''تم تو خواہ مخواہ اس کی باتوں کو دل سے لگا بیٹھے ہو اولاد ناراض ہو کر ماں باپ سے ہی جھگڑتی ہے۔کیا ماں باپ بھی ان سے جھگڑنے لگے......ارے اللہ نے ماں باپ کے دلوں کو اس دنیا کی ساری چیزوں سے بڑا بنایا ہے......تم تو خواہ مخواہ بگڑ بیٹھے ہو اور اس کی باتوں کو دل سے لگا لیا

وہ بھی تو ٹھیک کہتا تھا...... میرا بیٹا...... اتنا قابل، لائق تھا...... اللہ نے ہمارے گھر میں اسے یوں پیدا کیا جیسے گدڑی میں لعل...... ہم اور ہمارا گھر واقعی اس کے قابل نہیں تھے...... ٹھیک کیا اس نے ہمیں چھوڑ دیا۔ بھلا اس گندے گھر اور بد بودار محلے میں رہ کر وہ کہاں ترقی کر سکتا تھا'' زینب اپنے بیٹے کی حمایت میں بلا تکان بولتی گئی۔

''زینبے تجھے دیکھ کر یقین آتا ہے کہ مولا نے ماں کا دل بہت بڑا بنایا ہے...... سچ پوچھو تو میرے دل میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں...... نہ ہی مجھے اس کے آنے کی کوئی آس امید ہے اور نہ ہی اس کے لئے کوئی محبت باقی ہے'' نذیر حسین نے غصے سے کہا۔

''نذیر حسین...... کیا ضروری ہے کہ تم اس کی بری باتوں کو ہی یاد کرتے رہو۔ اس کی اچھی باتوں کو بھی تو یاد رکھ سکتے ہو۔ وہ ہر کلاس میں فسٹ آتا تھا...... انعام کے بڑے بڑے کپ لاتا تھا...... اور جب اس نے دسویں میں سارے شہر کے لڑکے لڑکیوں سے زیادہ نمبر لیے تو اخبار میں اس کا فوٹو چھپا تھا حکومت نے اس کو انعام دیا، لوگ مجھے کہتے تھے۔

''زینبے...... تو اسے کیا کھلاتی رہی ہے۔ اتنا لائق بچہ ہے تمہارا اللہ نے اس کو بڑا ہی اچھا دماغ دیا ہے۔ فر فر سبق یاد کر لیتا تھا۔ سارے بچے بیٹھے رہتے تھے مگر وہ دو منٹوں میں یاد کر لیتا تھا اور جس دن وہ ڈاکٹر بنا تو ٹی وی والے بھی اس سے باتیں کرنے آئے...... اس کی فوٹو بنائیں، ہماری اتنی اوقات کہاں تھی کہ اسے ڈاکٹر بناتے۔ بس اللہ کا اس پر بڑا کرم تھا...... وہ تو مٹی میں بھی ہاتھ ڈالتا تھا تو وہ بھی سونا بن جاتی تھی......

''واہ ری قسمت...... مولا نے اس کا اتنا اچھا نصیب لکھ کر دنیا میں بھیجا۔ میرے سارے بچے...... بیچارے کچھ بھی نہ بن سکے۔ کسی نے کوئی ترقی نہ کی اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے آسمان پر اڑنے لگا'' زینب نے خوش ہو کر کہا۔

''ہاں...... وہ آسمان پر اڑنے لگا اور ہم اسے کیڑے مکوڑے دکھائی دینے لگے گندے...... غلیظ...... رینگنے والے...... زینب...... خدا نے اس کو بہت کچھ دیا تھا۔ اچھا دماغ...... اچھی قسمت...... مگر اچھا دل نہیں دیا تھا...... وہ بڑا ہی تھڑ دلا تھا اسے اپنے سوا کوئی دکھائی نہیں دیتا تھا...... غرور اور تکبر نے اسے سرکش بنا دیا تھا۔ اسے ہم اور ہماری محبتیں یاد نہیں رہی تھیں۔ اسے یاد رہا تھا تو ہماری غربت اور بس غربت سے ملنے والی محرومیاں زینبے...... میں نے اسے سب کچھ دینے کی کوشش کی تھی۔ مگر اسے تو مجھ سے اور میرے پیشے سے نفرت تھی۔ وہ مجھے جس حقارت سے دیکھنے لگا تھا، اس پر میرا دل کتنا تھا...... میں رات رات بھر سرکس میں ان بچوں کی خاطر اپنے آپ کو تماشا بناتا۔ اپنی جان خطرے میں ڈالتا اور وہ مجھ سے نفرت کرنے لگا تھا...... اور سن زینبے وہ تو تجھ سے بھی محبت نہیں کرتا تھا۔ تم تو خواہ مخواہ اسے یاد کر کے ہلکان ہو رہی ہو...... اپنی آنکھیں سفید کر لیں...... اور...... وہ'' نذیر حسین غصے سے بولا۔

''نہیں...... وہ مجھ سے کبھی بھی نفرت نہیں کرتا تھا'' زینب پر وثوق لہجے میں بولی۔

''زینب...... کیا تجھے یاد نہیں...... اس نے تجھے بھی کیا کچھ بولا تھا......'' نذیر حسین اسے بہت کچھ یاد دلانے لگا۔

''بس کر...... بس کر...... مجھے کچھ بھی یاد کرانے کی ضرورت نہیں مجھے بس اتنا یاد ہے کہ اقبال حسین میرا بیٹا ہے...... اور میں اس سے بہت محبت کرتی ہوں...... بس...... میرے لئے یہی کافی ہے......'' زینب مسکرا کر بولی اور پھر سسکنے لگی، نذیر حسین حیرت سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

(۷)

شامو کے ہاتھ میں بڑی مہارت آ گئی تھی۔ وہ ہر قسم کی اسٹائلش کٹنگ ماہرانہ انداز میں کرتا، جو لوگ ایک بار اس سے کٹنگ کرواتے پھر دوبارا اسی کے پاس آتے...... جمالا بھی اس کے فن کی بہت تعریف کرتا۔

''ابے...... تو...... تو...... مجھ سے بھی آگے نکل گیا ہے...... یار...... تیرا بڑا دماغ ہے اور لگتا ہے قدرت تجھ پر مہربان بھی ہے...... جو تجھے اس ہنر میں ڈال دیا، ورنہ تم لوگ تو ساری زندگی ناچ گانے میں ہی گزار دیتے ہو'' جمالے نے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

''استاد...... تیرے جیسے استاد بھی تو کسی کو نہیں ملتے نا......'' شامو نے جمالے کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

''یار...... تو...... کہتا ہے تو مان لیتا ہوں...... ورنہ...... اپنی اولاد تو نہ مجھے استاد مانتی ہے اور نہ میرے پیشے کو کچھ سمجھتی ہے...... اب میرا بڑا بیٹا یہ دکان بیچنے کو کہہ رہا ہے......'' جمالے نے افسردگی سے کہا تو شامو کو ایک دم دھچکا لگا۔

''استاد...... کیا...... کہہ رہا ہے؟ کیا تو...... یہ...... دوکان چھوڑ دے گا......؟'' شامو نے حیرت سے پوچھا۔

''پتا نہیں...... کیا ہوتا ہے...... وہ ملک سے باہر جانے کے چکروں میں ہے اور مجھے کہتا ہے کہ یہ دکان بیچ کر اسے پیسہ دوں۔ اولاد کی ضرورت پوری کرنے کے لئے ماں باپ سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں...... لگتا ہے...... مجھے یہ دکان بیچنی ہی پڑے گی۔'' جمالے نے رنجیدہ لہجے میں کہا تو شامو اس کی بات سن کر پریشان ہو گیا۔

''استاد...... میں...... میں...... کہاں جاؤں گا؟'' شامو نے پوچھا۔

''اللہ کی زمین بہت بڑی ہے...... کہیں چلے جانا'' جمالے نے جواب دیا۔

''اللہ کی زمین تو بہت بڑی ہے، مگر اللہ کے بندوں کے دل بڑے نہیں...... ہم جیسوں کو...... کون اپناتا ہے اور تیرے جیسے بندے بہت کم ہیں، اس دنیا میں۔'' شامو نے افسردگی سے کہا۔

''تو فکر نہ کر...... تیرا میں کچھ نہ کچھ بندوبست تو کروں گا۔ میرے ایک شاگرد اسلم نے دوسرے شہر میں بہت بڑا بیوٹی پارلر کھولا ہے۔ سنا ہے وہاں بڑے امیر گھرانوں کی عورتیں اور فلمی ایکٹریسیس آتی ہیں...... بڑا پیسہ کما رہا ہے۔ کل میں اس سے بات کروں گا...... دیکھو وہ کیا کہتا ہے...... تو فکر نہ کر۔'' جمالے نے اسے تسلی دی تو اس کا دل قدرے مطمئن ہو گیا...... مگر...... ساری رات اس نے اسی یقینی اور بے یقینی میں گزاری کہ...... ہو سکتا ہے جمالے کا شاگرد اسے رکھ لے اور ہو سکتا ہے، وہ نہ رکھے...... اگر اس نے نہ رکھا تو پھر وہ کہاں جائے گا...... اسے وہ دن اور وہ رات ساری زندگی نہیں بھول سکتی تھی، جو اس نے بھوکے پیٹ سڑک پر ٹھٹھرتے ہوئے گزاری تھی...... اس کے اندر جتنے دکھ جمع تھے، ان میں سے یہ

ایک ایسا دکھ تھا، جسے وہ کبھی فراموش نہیں کرسکتا تھا۔ وہ ساری رات اس نے دل ہی دل میں خدا سے گڑگڑا کر دعائیں کرتے ہوئے گزار دی۔

"تو تو سب کا رب ہے......سب انسانوں کو چاہتا ہے......ہمیں بھی تو تونے انسان بنایا ہے......اور لوگ کہتے ہیں......انسان تجھے بڑا پیارا ہے......اور تو ان کی دعائیں بھی سنتا ہے......میں نے تجھ سے کبھی کوئی دعا ہی نہیں کی......مجھے کبھی دعا کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی......میں سوچتا تھا دعا تو وہ کرتے ہیں......جسے کچھ چاہئے ہو......اور......مجھے تو کچھ بھی نہیں چاہئے تھا۔ زندگی بھی نہیں اور جسے زندگی ہی نہیں چاہئے......وہ کسی اور بات کے لئے کیا دعا کرسکتا ہے"......مگر اب اسے زندگی میں دلچسپی پیدا ہونے لگی تھی جب سے اس نے یہ کام شروع کیا تھا اسے محسوس ہوتا تھا کہ وہ دوسروں کی ضرورت بن گیا ہے اور جب کوئی دوسروں کی ضرورت بنتا ہے تو اس کی ذات اہم ہونے لگتی ہے اور جب سے اسے اپنی اہمیت کا احساس ہونے لگا تھا......وہ اپنے دل میں قدرے اطمینان محسوس کرنے لگا تھا......اب اسے اپنی زندگی کی ضرورت محسوس ہوتی تھی......اس کا وجود پیچھے رہ گیا تھا۔ اس کا کام اور ہنر آگے نکل گیا تھا۔ لوگ اسے شامو نہیں شامی کہہ کر پکارتے تھے۔ پہلے شامو کہتے ہوئے لہجوں میں طنز اور مذاق ہوتا تھا، اب شامی کہتے ہوئے محبت اور تعریف کا اظہار ہوتا تھا۔ لوگ قطار میں بیٹھ کر اپنی باری کا انتظار کرتے تھے......اور ان کے انتظار کرنے سے اسے اپنی اہمیت کا مزید احساس ہونے لگتا......وہ خدا سے یہی دعا کرتا رہا کہ اس کے لئے ایسا ہی کوئی بندوبست کردے......جہاں اس کی نہیں اس کے فن اور ہنر کی قدر ہو۔

شاید دن اور رات میں کوئی ایسا لمحہ قبولیت کا ہوتا ہے، جب خدا بہت قریب سے انسان کے دل سے نکلنے والی دعاؤں کو سنتا ہے اور بہت سی دعاؤں میں سے کسی ایک کو قبولیت کی سند عطا کرتا ہے۔ اس کی بھی مانگی ہوئی دعا پوری ہوگئی......اور جمالے نے اسے اگلے روز خوشخبری سنائی کہ اس کے شاگرد کو ایک کاریگر کی ضرورت ہے اور اس نے شامو کو بلایا ہے۔

"استاد......تو......نے......اسے میرے بارے میں بتا دیا ہے نا......" شامو نے رک رک کر پوچھا۔

"ہاں......ہاں بتایا ہے......کہ تو......بڑا کاریگر ہے......" جمالے نے مسکرا کر کہا۔

"اور کچھ نہیں بتایا؟" شامو نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"یہ بھی بتایا ہے کہ لوگ تجھ سے کٹنگ کرانے دور دور سے آتے ہیں۔" جمالے نے کہا۔

"اور......کیا بتایا ہے؟" شامو نے استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔

"یہی......کہ......تو......مجھ سے بڑا کاریگر ہے۔" جمالے نے تعریف کرتے ہوئے کہا۔

"استاد......وہ......بات......؟ شامو نے آہ بھر کر آہستہ آواز میں کہا۔

"وہ......تو......میں بھول ہی گیا......لیکن اس کو اس پر کیا اعتراض ہوسکتا ہے......اس کو تو کام چاہئے۔" جمالے نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"استاد یہ تو......تو......سوچتا ہے، ہر کوئی نہیں۔" شامو نے کہا۔

"تیرا کیا مطلب ہے......" کیا وہ یہ سن کر تجھے کام پر نہیں رکھے گا" جمالے نے پوچھا۔

"معلوم نہیں......" شامو آہستہ سے بولا۔

''ٹھیک ہے...... میں آج فون کر کے پوچھتا ہوں...... کیا کہتا ہے...... ٹھہر میں ابھی پی سی او سے فون کر کے آیا۔'' جمالا کہہ کر باہر نکل گیا اور اس کا دل پھر ڈوبنے لگا...... نجانے کیا ہو......؟ کہیں وہ نہ ہی نہ کر دے...... اس نے دکھ بھرے لہجے میں پھر خدا سے التجائیں کرنا شروع کر دیں۔

تھوڑی دیر بعد جمالا مسکراتا ہوا آیا۔

''اس کے وہاں دو پارلر ہیں...... مردوں کے لئے بھی اور عورتوں کے لئے بھی...... جہاں وہ تجھے مناسب سمجھے گا...... رکھ لے گا، ٹھیک ہے...... کل ہی چلا جا......'' جمالے نے اسے کہا۔

''استاد اتنی جلدی......'' شامو نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں...... تجھے جانا تو ہے ہی...... کیوں نا کل ہی سہی...... جتنی جلدی وہاں جا کر سیٹ ہو جائے تو بہتر ہے۔'' جمالے نے کہا تو شامو خاموش ہو گیا۔

جمالے کو چھوڑنے کا اسے بہت رنج تھا۔ جمالا اس کی زندگی میں آنے والا پہلا اچھا شخص تھا...... جو قدرے تلخ مگر دل کا بہت اچھا اور صاف انسان تھا...... اس ایک اچھے شخص نے اس کے سر پر دست شفقت کیا رکھا اس کی زندگی بدل گئی...... اس کی محرومیاں کم ہو گئیں...... اس کی بے وقعت ذات اہم ہو گئی۔ وہ ناچیز سے 'انسان' بن گیا...... اس کی ہمدردی اور پیار نے اس کے اندر کے مردہ انسان میں توانائی اور حرارت پیدا کر دی...... اس کے کمزور اور ناتواں ہاتھوں میں ہنر اور فن کے ہتھیار پکڑائے تو وہ اپنے آپ کو کارآمد محسوس کرنے لگا۔ ایک اچھا انسان دوسرے انسان کی زندگی کو کس حد تک بدل سکتا ہے اور اس پر اثر انداز ہو سکتا ہے، اسے جمالے سے مل کر پتا چلا تھا۔ اس نے صرف تین ماہ اس کے پاس لگائے تھے اور اس کی زندگی کے پچیس سالوں میں صرف تین ماہ اسے اہم محسوس ہوتے تھے۔ جمالے نے صرف اسے اپنا فن ہی نہیں دیا تھا، اسے بہت سی کارآمد باتیں سکھائی تھیں جو آئندہ زندگی میں اس کے کام آسکتی تھیں۔ زندگی کو دیانتداری اور کسی مقصد کے تحت گزارنے کا سبق سکھایا تھا، جمالے نے اس کے اندر سے ہر وقت غم، دکھ اور رنج کے موجز جذبات کی بجائے شکر، خوشی اور سکون کے احساسات و جذبات سے روشناس کرایا تھا...... شامو نے جمالے کے ہاں آنے کے بعد اپنے اندر بہت تبدیلی محسوس کی تھی...... اس نے یہاں زیادہ وقت مردوں کے سنگ گزارا تھا اور اس نے اچھے مردوں کو بھی قریب سے دیکھا تھا...... ورنہ اس سے قبل اسے آوارہ...... پھکڑ باز...... بیہودہ شوخ مزاج اور آوارہ مردوں سے پالا پڑا تھا...... اسے مردوں سے نفرت ہو گئی تھی...... مگر رانی کی محبت کے لئے اسے مردوں کا روپ دھارنا پڑا، مگر رانی پھر بھی اسے چھوڑ گئی۔ جیسے اب اسے جمالے کو چھوڑ کر جانا پڑ رہا تھا۔

جمالے نے اسے گلے لگا کر رخصت کیا...... بہت سی دعائیں اور پیسے دیئے...... شامو اتنا رویا کہ شاید زندگی بھر اتنا کبھی نہ رویا تھا...... جمالا حیرت سے اسے چپ کراتا رہا۔ ''پاگل...... تو...... کیوں رو رہا ہے؟ تو...... ترقی کرنے جا رہا ہے۔'' جمالے نے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''استاد...... زندگی میں کبھی کسی سے ایسا پیار نہیں ملا...... مجھے یوں لگتا ہے...... جیسے تو ہی میرا باپ ہو...... میں نے ماں باپ تو نہیں دیکھے، مگر تو باپ جیسا ہی لگتا ہے...... ہم تو ایسے بدقسمت لوگ ہیں، جن کو اللہ کسی رشتے میں ہی نہیں باندھتا...... پر...... تجھے باپ کہنے کو جی چاہتا ہے۔''

شاموااس کے گلے لگ کر رونے لگا۔

''ہاں......تو......میں تیرا باپ ہی ہوں...... جب دل چاہے تو میرے گھر آ...... میرے دل اور گھر کے دروازے تیرے لئے ہر دم کھلے ہیں......تو اپنے آپ کو کبھی تنہا نہ سمجھنا......اور سن اسلم بھی بہت اچھا ہے...... میں نے اسے سب کچھ سمجھا دیا ہے......اس نے مجھے بہت تسلی دی ہے کہ وہ تیری ہر طرح سے مدد کرے گا۔'' جمالے نے شامو کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔شامو نے روتے ہوئے اس سے اجازت لی۔ جمالے نے بھی نم آنکھوں سے اسے رخصت کیا اور شامو بہت سی امیدوں اور وسوسوں کے ساتھ اس سے رخصت ہو گیا۔

☆

رانی کو نگار بیگم کا خبط ہو گیا تھا، اٹھتے بیٹھتے وہ ہر وقت نگار بیگم کے بارے میں سوچتی ۔ نگار بیگم کیسے چلتی ہے...... نگار بیگم کیسے دیکھتی ہے وہ آنکھیں بند کرتی تو نگار بیگم اپنے مہندی سے نقش و نگار پاؤں کے ساتھ نوٹوں کے فرش پر چلتی نظر آتی...... اسے کبھی کبھی محسوس ہوتا جیسے وہ نگار بیگم ہو......اور اسی طرح نوٹوں کے فرش پر چل رہی ہو...... لوگوں کا ایک ہجوم اس کے آگے پیچھے چل رہا ہو...... اس کے لئے نت نئی گاڑیوں کے دروازے کھل رہے ہوں...... اور وہ ان میں بیٹھ کر سفر کر رہی ہو...... وہ جدھر سے گزر رہی ہو......لوگ اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے قطار میں کھڑے ہوں......اور وہ بس ایک نظر مسکرا کر ان کی طرف دیکھ کر منہ موڑ لیتی ہو۔ یہ خواب کتنا خوبصورت، دلفریب اور دلنشین تھا......وہ اپنے اس خواب میں نگار بیگم سے بھی آگے نکل گئی تھی۔ اس کے ذہن میں نگار بیگم ایک ایسا آئیڈیل بن چکی تھی، جس کے ساتھ دنیا کی ہر خوشی، سکون اور مسرت وابستہ ہو......نگار بیگم، اس دنیا کی پری یا خیالی پیکر...... مگر...... ایک ایسے انسان کی صورت میں اس کے سامنے موجود تھی...... جس کو اس کی آنکھوں نے ایک حقیقت کی صورت میں دیکھا تھا اور وہ اس حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتی تھی۔ وہ حقیقت اس کی آنکھوں میں ایک سہانے خواب کی مانند ایسی رچ بس گئی تھی کہ اس کے سحر سے نکلنا اس کے لئے دشوار ہو گیا تھا۔ نادانستہ اس کے قدم ہر روز ان راستوں کی طرف اٹھ جاتے جو نگار بیگم کے مسکن کی طرف جاتا تھا۔ وہ گلی کے اندر نہ جاتی کہ کہیں اچھو پھر اسے وہاں دیکھ کر نہ ڈانٹے...... وہ سڑک کے باہر بھکارن کے روپ میں کھڑی بھیک مانگتی رہتی کہ کسی وقت نگار بیگم کہیں جائے اور اس کی جھلک اسے نظر آ جائے...... ہر روز صبح سے شام وہ وہیں اردگرد منڈلاتی رہتی، مگر نگار بیگم کہیں نہ جاتی۔

ایک سہ پہر نگار بیگم بڑی سی گاڑی میں بیٹھنے لگی...... اس کے اردگرد نوکروں کی بہت بڑی تعداد تھی، ڈرائیور نے آگے بڑھ کر گاڑی کا دروازہ کھولا، نگار بیگم نے نقاب کر رکھا تھا۔ وہ بڑی شان سے گاڑی میں بیٹھنے لگی۔ رانی بہت ہمت کر کے آگے بڑھی اور نگار بیگم کے سفید مرمریں، خوبصورت ہاتھ کو چھونے کی کوشش کی، نگار بیگم نے حیرت سے ایک ٹک اس کی جانب بغور دیکھا اور اپنا پرس کھول کر اسے پچاس کا نوٹ پکڑانے لگی تو رانی نے اس کے کھلے پرس میں ہزار، پانچ سو، سو اور پچاس کے نوٹوں کی گڈیاں دیکھیں۔ دس اور پانچ کے نوٹ وہاں تھے ہی نہیں۔ اس نے نوٹ رانی کو پکڑانے کے لئے اس کی طرف بڑھایا...... رانی نے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔

''بھیک نہیں چاہئے......'' رانی نے ہمت کر کے کہا۔

''بھیک نہیں چاہئے......تو...... پھر...... کیا چاہئے؟'' نگار بیگم نے بہت شستہ اور ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں حیرت سے پوچھا۔

''میں......میں......آپ کی خدمت کرنا چاہتی ہوں۔'' رانی نے بمشکل کہا......تو......نگار بیگم حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئی......اور اس کی طرف بغور دیکھنے لگی۔

''کیسی خدمت......؟'' نگار بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

''کوئی سی بھی......؟'' رانی نے قدرے خود اعتمادی سے جواب دیا۔

نگار بیگم اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ جیسے آنکھوں سے اس کے دل کی سچائی کو جاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس نے قدرے توقف کے بعد پوچھا۔

''کہاں رہتی ہو......؟'' نگار بیگم نے پوچھا۔

''جھگی میں......نالے کے پاس......شہر سے باہر۔'' وہ رک رک کر بولی۔

''کیا تم جانتی ہو......میں......یہاں......کس جگہ رہتی ہوں؟ نگار بیگم نے پوچھا۔

''ہاں......ہاں......'' رانی نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے......کل صبح میرے پاس آنا......پھر بات کروں گی۔'' نگار بیگم نے جواب دیا تو رانی کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا......کہ نگار بیگم نے واقعی اس سے بات کی تھی......اور......یہ کہ نگار بیگم نے اسے کس قابل سمجھا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے قدرت اس پر مہربان ہو رہی ہو۔ اس کی قسمت کا ستارہ بدلنے والا ہو۔ رات بھر اس کو نیند نہ آئی۔ بار بار کروٹیں بدلتی رہی اور ہر کروٹ پر نگار بیگم کے الفاظ اسے یاد آتے۔ اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ نوٹوں کے فرش پر چل رہی ہو۔ اس کے پاؤں پر بھی مہندی کے ویسے ہی نقش و نگار ہوں جیسے نگار بیگم کے پاؤں پر تھے اور اس کے ہاتھوں میں بھی ویسی ہی انگوٹھیاں ہوں جیسے نگار بیگم کی انگلیوں میں تھیں......رات کا ایک ایک پل اس پر بھاری ہو رہا تھا، نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی......نجانے کل نگار بیگم اسے کیا کہے......اس کے اندر ایسی امید کی شمع روشن ہوئی تھی، جو اس کی زندگی کی ساری تلخیاں بھلا رہی تھی۔ اتنے دنوں کی مایوسی اور تاریکی نے جو فضا پیدا کر رکھی تھی، اس فضا کا بوجھل پن اب ختم ہو رہا تھا۔ نگار بیگم روشنی کی کرن بن کر اس کے اندر کی تاریکی کو رفتہ رفتہ کم کر رہی تھی۔ وہ صبح سویرے ہی اٹھ گئی، باپ اور بچوں کو دھندے پر بھیج کر اس نے اپنا سب سے بہتر شوخ رنگوں والا، خستہ حال سوٹ پہنا، آج اس نے نہ کشکول پکڑی اور نہ ہی اپنا تھیلا اٹھایا، جھگی سے باہر نکلنے لگی تو برکتے نے چارپائی پر لیٹے لیٹے حیرت سے اس کی طرف دیکھا......اسے رانی کے چہرے پر عجیب سی خوشی اور امید کی جھلک نظر آئی......جو......بہت دنوں بعد اس نے اس کے چہرے پر دیکھی تھی......برکتے شش و پنج میں تھی......مگر رانی سے کچھ پوچھتی......اس سے قبل ہی وہ جھگی سے باہر نکل گئی......اس کے ہر اٹھتے قدم میں امید چھپی تھی، اس کا دل مسرور ہو رہا تھا اور نت نئے خیالات کے تانے بانے بن رہا تھا......کاش نگار بیگم اسے کوئی کام دے دیں......اس سے کوئی خدمت کروا لیں......تو وہ بھی اس کی طرح خوش نصیب ہو جائے گی......کاش وہ بھی اس کی طرح کبھی نوٹوں کے فرش پر چلے......اور بڑی بڑی گاڑیوں میں بیٹھے......!'' وہ پر امید ہو کر نیلے آسمان کی طرف دیکھتی ہوئی دعائیں کرنے لگی۔

''اللہ میاں جی......تو......تو......سب کچھ کر سکتا ہے۔ کچھ ایسا کر مجھے بھی نگار بیگم بنا دے......میں سڑکوں پر بھیک مانگ کر تھک گئی

ہوں......اور...... بھیک میں ملتا بھی کیا ہے......ایک روپیہ......دو روپیہ...... پانچ روپیہ......کیا ساری زندگی میں یونہی بھیک اکٹھی کرتی رہوں گی...... مجھے بھی بہت سارا پیسہ چاہئے......اچھے کپڑے، زیور، نوکر، چاکر اور گاڑیاں...... میں بھی تو 'انسان' ہوں۔ نگار بیگم کی طرح...... پھر میں نگار بیگم کیوں نہیں بن سکتی۔

اگر میں نگار بیگم بن گئی......تو اس شہر کی سب سے بڑی درگاہ پر پانچ سو......نہیں......ایک ہزار......نہیں...... پانچ ہزار...... ہاں پورے پانچ ہزار روپے کی نیاز دوں گی......''اس نے دل ہی دل میں منت مانگی......اور مطمئن ہوگئی......وہ گلی میں داخل ہوئی تو اچھو بڑے اہتمام سے پھول پرو رہا تھا، اس نے رانی کی طرف حیرت سے دیکھا۔

''تو......پھر آگئی......؟'' اچھو نے خفگی سے پوچھا

''نگار بیگم نے بلایا ہے......اس سے ملنے جا رہی ہوں۔'' رانی نے بڑے انداز سے قدرے اکڑ کر جواب دیا۔

''کیا......کیا......کیا......نگار بیگم نے تجھے بلایا ہے......ذرا منہ دھو کر رکھ......'' اچھو نے مذاق کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں یقین آرہا......نا......تو......اب اپنی آنکھوں سے دیکھ۔ میں اوپر جا رہی ہوں......سیڑھیاں چڑھ کر۔'' وہ مڑ کر اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

''سن......یہ......مت کر......ان سیڑھیوں پر قدم رکھنے والی لڑکیاں پھر ساری زندگی کہیں اور جانے کے قابل نہیں رہتیں۔'' اچھو نے معنی خیز انداز میں سمجھانا چاہا، مگر رانی کو اس کی بات کی سمجھ نہیں آئی یا......پھر اس نے سمجھنے کی کوشش ہی نہ کی اور جلدی سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلی گئی، نوکروں نے اسے روکا......

''نگار بیگم کو بول......رانی آئی ہے......اس نے مجھے بلایا ہے۔'' رانی نے قدرے اکڑتے ہوئے کہا۔

''اری چل......بھلا نگار بیگم تجھے کیوں بلائے گی؟'' ایک ادھیڑ عمر آدمی نے کہا۔

''نہیں یقین آتا نا تو......اندر جا کر اس سے پوچھ لے......'' رانی نے کہا۔

''اس وقت وہ آرام فرما رہی ہیں......اور ہماری کیا جرات کہ ان کو پریشان کریں۔'' دوسرے آدمی نے جواب دیا۔

رانی مایوس ہونے لگی اور اس کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا۔ ''وہ......وہ......کب......؟'' وہ بمشکل بولی۔

''پورے دو گھنٹوں بعد......'' ادھیڑ عمر آدمی نے جواب دیا۔

''کیا......میں......یہاں انتظار کر سکتی ہوں؟'' رانی نے پوچھا، تو دونوں آدمیوں نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔

''ٹھیک ہے......اگر تم انتظار کرنا چاہتی ہو......تو یہاں سیڑھیوں کے ایک طرف بالکونی ہے......وہاں بیٹھ کر انتظار کر لو......اگر نگار بیگم نے تجھے بلایا نہ ہوتا تو ہم تجھے یہاں کبھی بھی نہ بیٹھنے دیتے۔'' دوسرے آدمی نے کہا اور رانی کو بالکونی میں ایک جانب بیٹھنے کو کہا۔ رانی سنگ مرمر کے ٹھنڈے فرش پر ایک کونے میں بیٹھ گئی۔ اس نے بھرپور نظروں سے جائزہ لیا۔ اسے ہر طرف کمرے اور بالکونیاں ہی نظر آئے......کمروں میں رنگ برنگی شیشوں کی کھڑکیاں اور ان کے پیچھے سفید جالی اور ان کے آگے مخمل کے پردے نظر آئے۔ بالکونیوں میں بوگن ویلا اور منی پلانٹ کی بیلوں نے

بڑے خوبصورت انداز میں ان کو آراستہ کر رکھا تھا۔ اس نے بالکونی کی چھت کو دیکھا...... رنگ برنگی ٹائلوں اور خوبصورت نقش و نگار سے آراستہ چھت کے عین وسط میں خوبصورت جھومر لٹک رہے تھے۔ اس نے ابھی بالکونیاں ہی دیکھی تھیں اور بہت متاثر ہو رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ایک آدمی میٹھے چاولوں کی ایک پلیٹ لے کر آ گیا اور اسے پکڑائی۔

''یہ...... یہ...... کیا ہے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''نگار بیگم کا حکم ہے...... یہاں پر آنے والے کو کچھ کھلائے بغیر نہ رخصت کیا جائے؟'' اس آدمی نے جواب دیا۔

''نگار بیگم کب اٹھیں گی......؟ رانی نے پلیٹ پکڑ کر بے صبری سے پوچھا۔

''ایک گھنٹے بعد......'' اس آدمی نے جواب دیا۔

''اس کا مطلب ہے...... اسے یہاں آتے ہوئے ایک گھنٹہ ہو چکا ہے۔ وہ خاموشی سے چاول کھانے لگی۔ ایسے مزیدار اور خوش رنگ چاول اس نے کبھی نہیں کھائے تھے۔ بادام، پستے اور مختلف مربوں سے آراستہ چاول، وہ ایک ایک چمچ کھاتے ہوئے دل میں تعریفیں کر رہی تھی...... اور نگار بیگم کی عظمت کی قائل ہو رہی تھی۔ چاول کھا کر وہ پھر انتظار کرنا شروع ہو گئی...... کافی دیر بعد ادھیڑ عمر آدمی اسے بلانے آیا۔

''نگار بیگم تجھے بلا رہی ہیں۔'' اس آدمی نے کہا اور اسے اپنے ساتھ لے کر مختلف برآمدوں اور کمروں میں سے ہوتا ہوا ایک بڑے سے کمرے میں داخل ہو گیا۔ ہر طرف موتیوں اور جالیوں کے پردے لٹک رہے تھے۔ خوبصورت تازہ پھولوں کے گملے اور سنگ مرمر کے فرش پر جگہ جگہ قالین بچھے تھے۔ ان مخملیں قالینوں پر چلتے ہوئے اس کے پاؤں نرم و لطیف جذبات سے سرشار ہو رہے تھے۔ نگار بیگم ایک خوبصورت سفید جھولا نما مسہری پر بیٹھی تھی، جس پر سرخ مخمل کے کشن رکھے تھے۔ نگار بیگم آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔

''نگار بیگم......'' اس آدمی نے گلا کھنکارتے ہوئے کہا۔ نگار بیگم نے آنکھیں کھول کر رانی کو دیکھا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ آدمی وہاں سے چلا گیا۔ رانی نے نگار بیگم کی طرف دیکھا اور دیکھتی ہی رہ گئی۔ وہ واقعی پری تھی، انتہائی خوبصورت، سفید جوان، دراز قد، خوبصورت جھیل سی سیاہ آنکھیں، لمبے، سیاہ ریشمی بال...... اس نے انتہائی خوبصورت ریشمی لباس پہن رکھا تھا۔ قیمتی زیورات، چوڑیاں، انگوٹھیاں، پازیبیں...... اور ہاتھوں میں گلاب اور موتیے کے گجرے۔ وہ نگار بیگم کے ہوشربا حسن کی طرف دیکھتی ہی رہ گئی۔ اس نے تو اسے نقاب میں دیکھا تھا اور اب وہ پری اس کے سامنے کھڑی تھی۔ مکمل حسن و خوبصورتی کا پیکر...... مجسم خوبصورتی کا شاہکار۔

''کیا نام ہے تمہارا......؟'' نگار بیگم نے قدرے رعب دار آواز میں پوچھا۔

''رانی......'' وہ جلدی سے بولی۔

''تم کیوں ہماری خدمت کرنا چاہتی ہو؟'' نگار بیگم نے پوچھا۔

''آپ...... آپ......؟'' رانی کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کہے۔

''کیا......؟'' نگار بیگم نے حیرت سے اسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''آپ مجھے اچھی لگتی ہیں۔'' رانی نے اس کی طرف کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم نے ہمیں کہاں دیکھا؟'' نگار بیگم نے پوچھا۔

''گاڑی میں بیٹھتے ہوئے۔'' رانی نے جواب دیا۔

''کل......؟''

''نہیں......اس سے پہلے بھی......''

''کتنی بار......؟''

''چار بار......''

''ہم تو پورے ماہ میں دن کے وقت صرف چار بار ہی نکلے ہیں۔ کیا تم ایک ماہ سے ہمیں دیکھ رہی ہو؟'' نگار بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

''جی......جی......'' رانی نے جواب دیا۔

نگار بیگم نے حیرت اور پرستائش نظروں سے اس کی جانب دیکھا اور زیر لب مسکرانے لگی۔ جیسے کوئی بات یاد آگئی ہو۔

''کیا اس جگہ کے بارے میں کچھ جانتی ہو؟'' نگار بیگم نے پوچھا۔

''نہیں......'' رانی نے جواب دیا۔

''نگار بیگم سوچ میں پڑ گئی......اور اس کی طرف بغور دیکھنے لگی۔ کیا عمر ہے تمہاری......؟'' اس نے رانی سے پوچھا۔

''معلوم نہیں......مجھ سے چھوٹے......سات......نہیں......آٹھ......نہیں سات بہن بھائی ہیں......'' رانی نے جواب دیا۔

''کیا ایک مر گیا......؟'' نگار بیگم نے اسے الجھن کا شکار دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''نہیں......ہاں......ہاں'' وہ بمشکل بولی۔

''کیا......یہاں......رہ سکو گی......مستقل......؟ تمہارے گھر والوں کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا......؟'' نگار بیگم نے پوچھا۔

''نہیں......نہیں......ان کو کیا اعتراض ہوگا؟'' رانی نے جواب دیا۔

''دن......رات......یہاں رہنا پڑے گا......سوچ لو......'' نگار بیگم نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''ٹھیک ہے......میں رہ لوں گی......میرے ماں باپ کے پاس بہت بچے ہیں......کسی ایک کے جانے سے انہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔'' رانی نے جواب دیا۔

''اور تمہیں......؟'' نگار بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

''مجھے......مجھے......بھی......نہیں'' رانی نے جلدی سے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے......جب چاہو......آ جاؤ......مگر ایک بار یہاں آگئی تو پھر یہاں سے جانے نہیں دوں گی۔'' نگار بیگم ٹھوس لہجے میں بولی۔

رانی اس کی بات سن کر خاموش ہو گئی۔

''کیا اماں...... ابے سے ملنے بھی نہیں جانے دیں گی؟ رانی نے حیرت سے پوچھا۔

''شاید وہ خود بھی تم سے ملنا نہیں چاہیں گے۔''

نگار بیگم نے معنی خیز انداز میں کہا تو رانی کو اس کی بات سمجھ میں نہ آئی۔

''اب تم جاؤ...... اور جب دل چاہے...... آ جانا۔'' نگار بیگم نے اسے سوچ میں گم دیکھتے ہوئے کہا اور رانی وہاں سے اٹھنے لگی تو نگار بیگم نے اپنے پرس میں سے سو کا نوٹ نکال کر اسے پکڑا دیا۔

''یہ...... رکھ لو...... '' نگار بیگم نے کہا اور رانی خاموشی سے وہاں سے چلی گئی۔ وہ سیڑھیاں اتر رہی تھی جب اچھو نے بغور اس کی جانب دیکھا۔

''اے...... سن...... '' اچھو نے آواز دی...... مگر...... رانی سنی ان سنی کرتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

وہ جھگی میں داخل ہوئی تو برکتے نے حیرانگی سے اس کی جانب دیکھا، رانی خاموش تھی، مگر آنکھوں میں ان گنت سوالات اور سوچ تھی۔

''کیا آج تو دھندے پر نہیں گئی...... اور بھیک نہیں لائی؟'' برکتے نے حیرت سے اسے پوچھا۔

''لائی ہوں...... '' رانی نے خاموشی سے سو کا نوٹ نکال کر اس کی جانب بڑھایا۔ برکتے اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔''

''یہ بھیک نہیں لگتی...... تو کہاں گئی تھی؟'' برکتے نے حیرت سے پوچھا۔

''جہاں بھی گئی تھی...... مگر پیسے تو لائی ہوں نا'' رانی نے جواب دیا۔

''سن...... ہم در در مانگنے والے بھکاری ہیں، ہم اپنی عزتوں کے بدلے بھیک نہیں لیتے...... بھیک ملی تو ٹھیک...... نہ ملی تو نہ سہی...... ایک ایک سکہ ہم اپنی محنت سے اکٹھا کرتے ہیں...... بھیک لینے کے لئے ہم اپنے سر اور تن سے کپڑا نہیں اٹھاتے، اس لئے کوئی ایسا کام نہ کرنا کہ بھکاری بھی تجھ پر تھو تھو کریں۔''

برکتے نے اس انداز میں کہا کہ رانی چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ میں نے بھی ایسا کوئی کام نہیں کیا...... تو بے فکر رہ۔'' رانی کہہ کر جھگی سے باہر نکل گئی۔ برکتے خاموش تو ہو گئی، مگر اس کے جواب سے مطمئن نہ ہوئی۔

''نگار بیگم اچھی عورت ہے...... اماں کو کیا پتا...... ؟ وہ تو ہر وقت جھگی کے اندر ہی رہتی ہے...... یا پھر کبھی کبھار بھیک مانگنے چلی گئی...... نگار بیگم جیسی عورت تو اس نے بھی زندگی بھر نہیں دیکھی ہو گی۔'' رانی نے اپنے دل کو تسلی دی اور روٹیاں بنانے لگی۔

''رات بھر وہ سوچتی رہی...... نگار بیگم نے اس کے سامنے بھاری شرط رکھی تھی...... مگر زندگی میں کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا بھی پڑتا ہے۔ جب ابا نے اس بچے کو کوڑے پر پھینک دیا...... تو...... اس کے لئے میں بھی اہم نہیں ہوں...... اور...... اتنے ڈھیر بچوں میں کسی کو میری کیا پروا۔ یہاں ساری زندگی سڑنے سے بہتر ہے میں نگار بیگم کے پاس چلی جاؤں، کم از کم پیٹ بھر کر کھانا تو نصیب ہو گا...... اور...... اسے وہ رنگ برنگی میٹھے چاول یاد آنے لگے تو اس کے منہ میں پانی بھرنے لگا۔

''ہمیں تو کبھی ایسا کھانا نصیب نہیں ہوا...... اور...... اس کے ہاں تو شاید ہر روز ایسے ہی کھانے پکتے ہوں گے...... اور...... جس انسان کو

پیٹ بھر کر کھانا نہ ملے ...... اسے تو جینا ہی نہیں چاہئے ...... مر جانا چاہئے۔'' اس نے قدرے سرکش انداز میں سوچا ......

یہاں بھوکے پیٹ سونے اور پھرنے سے بہتر ہے ...... میں نگار بیگم کے پاس چلی جاؤں ...... اس کے پاس جا کر میری زندگی بن جائے گی ...... اس کے کپڑے کتنے خوبصورت تھے ...... اور ...... زیورات ...... گھر ...... سب کچھ تو اس کے پاس ہے ...... اور مجھے بھی سب کچھ چاہئے ...... رنگ برنگے کھانے ...... خوبصورت کپڑے، زیور اور سب کچھ۔'' اس نے پکا ارادہ کر لیا کہ وہ کل ہی نگار بیگم کے پاس چلی جائے گی۔ اس نے اردگرد دیکھا، ہر طرف اندھیرا تھا۔ سب سو رہے تھے، اس نے چپکے سے اپنے کپڑوں کی گٹھڑی بنائی، اس میں اپنی جمع شدہ چیزیں اکٹھی کی ہوئی چھوٹے چھوٹے بندے، ہار، چوڑیاں اور لوہے کے زیورات رکھے اور گٹھڑی چھپا کر رکھ دی۔

''رانی ...... اٹھ اٹھ ...... دن چڑھ گیا ہے ...... بچوں کو چائے پانی پکا دے ...... سب نے دھندے پر جانا ہے۔'' برکتے نے رانی کو آوازیں دیں ...... مگر رانی نے کوئی جواب نہ دیا۔ برکتے گھبرا گئی اور ملکے کو اٹھایا۔

''ارے ملکے ...... اٹھ ...... بجو ...... مٹھو ...... اٹھو دیکھو ...... رانی یہاں نہیں ہے ...... دیکھو کہاں گئی ہے؟'' برکتے کی آواز حلق سے نہیں نکل رہی تھی۔ وہ چیخنے لگی۔

سب بچے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے، جھگی کے اندر اور باہر اس کی تلاش شروع کر دی، مگر رانی غائب تھی۔

''وہ ...... وہ ...... یہاں نہیں ہے ...... کہیں بھی نہیں ہے ...... کہیں چلی گئی ہے ......'' بجو نے باہر سے آ کر گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''حرام خور ...... بھاگ گئی ہے ......'' ملکا آہ بھر کر بے بسی سے بولا۔

''برکتے بے سدھ ہو کر چارپائی پر گر گئی ...... اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

''تو ...... بڑی بدبخت عورت ہے ...... کیا اولاد جنی ہے ...... ایک رانی اور ایک وہ ...... ؟ باقی نجانے کیا دن دکھائیں گے ......؟'' ملکے نے برکتے کو گالیاں دیتے ہوئے کہا تو برکتے کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے وہ بے بسی سے جھگی کے پھٹے چھت کو دیکھنے لگی، جس میں جگہ جگہ چھید تھے ...... اور ...... ان چھیدوں میں سے روشنی اندر آ رہی تھی ...... ان چھیدوں میں سے برکتے نے آسمان کی طرف دیکھا اور گہری سانس لے کر آہ بھری۔

☆

نرگس، فردوس اور جمی بچے کے پیچھے دیوانے ہو گئے تھے۔ اس کی چھوٹی چھوٹی باتوں اور حرکتوں پر دیر تک ہنستے رہتے۔ نرگس۔ اس کی ماں، فردوس۔ اس کی آپا اور جمی۔ ماموں تھا ...... وہ اتنے قریبی رشتوں کے ساتھ پل کر بڑا ہو رہا تھا، اس کی توتلی باتیں ان کو دن بھر خوش رکھتیں، ان کی زندگیوں میں گویا بہار کا خوشگوار جھونکا آ گیا تھا، جس نے ان کی افسردہ، مایوس اور مرجھائی ہوئی زندگیوں کو خوشگوار اور تروتازہ کر دیا تھا۔ بچے کے لئے نت نئے کپڑے اور کھلونے خریدے جاتے، وہ کھیلنے لگا تو اس کے لئے گاڑیاں اور سائیکلیں خریدی گئیں۔ اس کے مستقبل کی منصوبہ بندی کی جاتی، اسے کس عمر میں کس سکول میں بھیجنا ہے۔ نرگس اسے بڑا افسر دیکھنا چاہتی اور فردوس اسے پولیس میں اور جمی اسے سٹیج ایکٹر بنانے کی تجویز دیتا تو نرگس اور فردوس اس کے پیچھے پڑ جاتیں۔

''سن رے جی..... ہم اس کو ناچ گانا نہیں سکھائیں گی، یہ پڑھ لکھ کر بڑا افسر بنے گا یا پولیس والا.....'' فردوس کہتی تو جی خاموش ہو جاتا۔

''تین سال کی عمر میں وہ اسے شہر کے بہترین سکول میں داخل کرانے کے لئے چلی گئیں۔ پرنسپل نے خاموش نظروں سے دونوں کی جانب دیکھا۔

''بچے کا نام کیا ہے.....؟'' پرنسپل نے پوچھا۔

''سلیم..... ہاں..... سلیم.....'' نرگس جلدی سے بولی۔

''سوری..... ہم اسے اپنے سکول میں داخل نہیں کر سکتے..... یہ لڑکیوں کا سکول ہے..... آپ اسے لڑکوں کے سکول میں داخل کرائیں۔'' پرنسپل نے انہیں ٹالنے کے انداز میں کہا۔

''مگر..... ہم نے تو..... یہاں لڑکوں کو بھی دیکھا ہے..... اسی لئے تو ادھر آئی ہیں۔'' فردوس جلدی سے بولی۔

''پہلے ہم لڑکوں کو داخل کرتے تھے..... مگر اب نہیں.....'' پرنسپل نے دوٹوک لہجے میں کہا اور انہیں باہر کا راستہ دکھایا۔ وہ خاموشی اور بے بسی سے باہر نکل گئیں۔

بچے کا ہاتھ پکڑے وہ دوسرے سکول کی جانب چلی گئیں، مگر سارا راستہ خاموش رہیں..... اندر ہی اندر ان کے دل وسوسوں اور اندیشوں سے پریشان ہونے لگے۔

''فردوس..... اگر ہمارے بے بی کو کہیں داخلہ نہ ملا..... تو..... پھر کیا کریں گی..... اسے کہاں داخل کرائیں گی؟'' نرگس نے پریشان ہو کر سوچا۔

''آپا..... فکر نہ کر..... کہیں نہ کہیں اسے ضرور داخلہ ملے گا.....'' فردوس نے اسے تسلی دی۔

''اب تم اس کا نام سعدیہ بتانا۔'' نرگس نے ایک لڑکیوں کے سکول میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''پرنسپل ایک فیشن ایبل ادھیڑ عمر عورت تھی۔ اس نے فردوس، نرگس اور بچے کو حیرت اور ناگواری کے ملے جلے تاثرات سے دیکھا۔

''پرنسپل صاحبہ..... ہماری بچی بہت ذہین ہے..... ہم اسے آپ کے سکول میں داخل کرانے آئی ہیں۔'' نرگس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مگر یہ تو لڑکوں کا سکول ہے..... ہم آپ کی بچی کو داخل نہیں کر سکتے۔'' پرنسپل نے قدرے بے رخی سے جواب دیا۔

''مگر..... ہم تو باہر سے پوچھ کر آئی ہیں..... یہ لڑکیوں کا ہی سکول ہے۔'' فردوس نے کہا۔

''اس سال سے ہم صرف لڑکوں کا داخلہ کریں گے۔'' پرنسپل نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

''کیا ہمارے بچے کی وجہ سے آپ نے ایسا سوچا ہے؟'' نرگس قدرے خفگی سے بولی۔

''آپ خاصی سمجھدار ہیں..... آپ اسے جہاں بھی لے کر جائیں گی..... آپ کو ایسا ہی جواب ملے گا..... کیونکہ والدین بھی اعتراض کر سکتے ہیں اور بچے بھی مسئلہ کریں گے۔'' پرنسپل نے کہا۔

''کیا..... ہمارے بچے کہیں نہیں پڑھ سکتے..... ہمارا قصور تو بتائیں کہ ہم اپنے بچوں کو پڑھا بھی نہیں سکتے۔'' نرگس نے نم آنکھوں سے کہا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں..... مگر ہم بھی مجبور ہیں۔'' پرنسپل نے کہا تو، دونوں خاموش ہو گئیں اور بچے کو لے کر باہر آ گئیں۔'' فردوس.....

ہم کتنی بدنصیب ہیں.....جو.....اپنے بچے کو پڑھا بھی نہیں سکتیں۔" نرگس نے روتے ہوئے کہا۔

"ہاں.....یہ.....دنیا بڑی ہی ظالم ہے۔" فردوس نے جواب دیا۔

گھر آ کر سارا دن وہ روتی رہیں، بین کرتی رہیں، بے بی حیرانگی سے ان کو دیکھتا رہا۔

"اماں.....کیوں روتی ہے؟" بے بی نے پوچھا۔

"کچھ نہیں.....بس یونہی۔" نرگس نے اسے اپنے سینے کے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔ جمی آیا تو اس کو بھی یہ خبر سنائی گئی۔

"اے ہائے.....آپا.....کاہے کو رو رہی ہے.....باؤلی نہ ہو.....تو.....کیا ہوا.....اگر.....اسے کسی سکول میں داخلہ نہیں ملتا.....ہم اسے ٹیوشن پڑھنے بھیج دیں گے، وہاں تو کوئی مسئلہ نہیں ہوگا اور دور کیوں جاتی ہو.....میری خالہ کی بیٹی بچوں کو ٹیوشن پڑھاتی ہے، وہ اسے ٹیوشن پڑھا دے گی۔" جمی نے کہا تو جیسے ان کو حوصلہ مل گیا۔

"سچ.....جمی.....تیری خالہ کی بیٹی اسے پڑھا دے گی.....جتنی فیس کہے گی.....میں اسے دوں گی۔ بس.....میرے بے بی کو پڑھا دے....." نرگس نے قدرے خوش ہو کر کہا۔

"ہاں.....ہاں.....کیوں نہیں.....میں کل ہی اس سے بات کروں گا۔" جمی نے کہا تو وہ خاموش ہو کر اسے دعائیں دینے لگیں۔

☆

"ہم نے تو بس شمی سے ہی کٹنگ کروانی ہے.....اگر وہ ہے تو ہم بیٹھتی ہیں.....ورنہ کل آ جائیں گی۔" دو انتہائی ماڈرن لڑکیوں نے بیوٹی پارلر کی ریسپشنسٹ لڑکی سے کہا۔

"میم.....وہ بہت بزی ہیں.....آپ کسی اور سے کٹنگ کروالیں۔" لڑکی نے بتایا۔

"شمی ہے کہاں.....؟ ہم نے سنا تھا.....کہ.....وہ آؤٹ آف کنٹری گیا ہے۔" لڑکی نے پوچھا۔

"نہیں.....وہ آ چکے ہیں اور اس وقت وہ کٹنگ میں ہی بزی ہیں.....مگر بہت سی لیڈیز پہلے ہی ان کے انتظار میں بیٹھی ہیں.....آپ کی باری رات کو آئے گی.....ابھی شام کے پانچ بج رہے ہیں۔" لڑکی نے بتایا۔

"تو ٹھیک ہے.....ہم کل آ جائیں گی.....آپ ہماری کل کی بکنگ کر لیں۔" دوسری لڑکیوں نے کہا۔

"وہ کل بھی بزی ہیں.....کل.....اور پرسوں کی بھی بکنگ ہو چکی ہے۔" لڑکی نے بتایا۔

"ٹھیک ہے.....ہم اگلے ہفتے آ جائیں گی.....اس کی بکنگ کر لیں۔" "اگلے ہفتے وہ سنگا پور جا رہے ہیں.....ایک فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں۔ فلم کی ہیروئن کے میک اپ کے لئے اور شاید دو ہفتے بعد لوٹیں.....یا.....اس سے بھی زیادہ دن لگ سکتے ہیں۔" لڑکی نے بتایا۔

"اف خدایا.....! یہ شمی کو کیا ہوتا جا رہا ہے.....اس قدر بزی کیوں ہو رہا ہے.....اب کیا کریں؟ کالج میں فنکشن اگلے ہفتے ہے اور مجھے ہر صورت میں اسی سے کٹنگ کرانی ہے۔" لڑکی نے پریشانی سے دوسری کو کہا۔

''پلیز کسی طرح ...... کوئی ٹائم ہمیں دیں ...... ہم نے اسی سے کٹنگ کرانی ہے۔ ہمارے کالج میں بہت گرینڈ فنکشن ہو رہا ہے۔'' لڑکی نے پریشانی سے ریسپشنسٹ کو کہا۔

''اگر کوئی بکنگ کینسل ہوتی ہے ...... تو ...... پھر ہی ممکن ہوگا، ورنہ میں کیا کہہ سکتی ہوں۔'' لڑکی نے کہا۔

''ٹھیک ہے آپ ہمارا نمبر نوٹ کر لیں ...... اور ہم انتظار کریں گی۔'' لڑکیوں نے کہا اور نمبر نوٹ کروا کر چلی گئیں۔

شامو المعروف شمی، بڑے شہر کے سب سے مشہور اور معروف بیوٹی پارلر کا سب سے مشہور اور ماہر بیوٹیشن تھا، خصوصی طور پر کٹنگ میں اس جیسا کوئی نہیں تھا۔ کالجز اور یونیورسٹیز کی لڑکیاں، فلمی ہیروئنز اور اپر کلاس کی ساری ماڈرن اور فیشن ایبل لڑکیاں صرف شمی سے ہی کٹنگ کرانے آتی تھیں۔ جمالے کے شاگرد اسلم نے اس کے ہاتھ میں ہنر دیکھ کر اسے لیڈیز پارلر میں شفٹ کر دیا تھا۔ اس کے مردانہ پن پر کچھ خواتین کو اعتراض ہوتا، مگر جلد ہی سب میں وہ "Gay" مشہور ہو گیا تو لڑکیاں جیسے مطمئن ہو گئیں۔ بلا جھجک اس کے پاس چلی آتیں اور شمی سے کٹنگ کرواتے ہوئے بہت ایزی محسوس کرتیں۔ اس نے جلد ہی بہت ترقی کر لی تھی ...... شہر کے اچھے علاقے میں اس نے اپنا گھر خرید لیا تھا اور گاڑی بھی بہت اچھی لی تھی، بینک بیلنس بھی بہت زیادہ تھا۔ اسلم کے پاس آنے سے اس کی قسمت کے وارے نیارے ہو گئے تھے۔ اس کے ہاتھ کا ہنر اس کے کام آ رہا تھا۔ اس کی شہرت بھی پورے شہر میں پھیل چکی تھی۔ سب کو اس کی ذات سے نہیں ...... اس کے ہنر سے واسطہ تھا ...... اس کی عزت اس کے ہنر کی وجہ سے تھی ...... اور اپنی اس عزت و اہمیت پر شمی دلی طور پر بہت مطمئن ہو گیا تھا۔ اسلم اس کا بہت خیال رکھتا تھا اور اس سے بہت محبت و عزت سے پیش آتا، کیونکہ اسے اس کے استاد نے بھیجا تھا اور وہ اپنے استاد کی بہت قدر کرتا تھا۔ اسے یہاں آ کر بالکل اجنبیت محسوس نہ ہوئی۔ شروع شروع میں لوگ اس کو تنقید کا نشانہ بنانے کی کوشش کرتے، مگر اسلم کی حوصلہ افزائی اور مدد سے وہ ہر تنقید سے محفوظ رہتا۔ اسلم اس کے لئے ڈھال بن گیا تھا، جس کی پناہ میں آ کر وہ اپنے آپ کو ہر شر سے محفوظ سمجھتا تھا۔

''ہمیں شمی سے ملنا ہے ......''

''مجھے شمی کا فون نمبر چاہئے ......''

''شمی کب مل سکتے ہیں ......؟''

''ہماری بکنگ صرف شمی کے لئے کریں ......''

''پارلر میں آنے والی ہر خاتون کی زبان پر صرف شمی کا نام ہوتا اور شمی خوشی سے پھولا نہ سماتا، جب ہر کوئی شمی کے بارے میں پوچھتا۔

''یار شمی ...... تو ...... تو بڑے نصیب والا ہے ...... ہر کوئی تیرے بارے میں ہی پوچھتا ہے ...... مجھے تو ...... جیسے کوئی جانتا ہی نہیں۔ اسلم نے ایک روز شمی کو اپنے سیلون کے ویل فرنشڈ آفس میں بلا کر کہا۔

''اسلم بھائی ...... یہ تو انسان کو خود پتا ہوتا ہے ...... کہ وہ کتنے نصیب والا ہے ...... مگر آپ اور استاد جمالے جیسے اچھے لوگ دوسروں کی قسمتوں کو سنوار دیتے ہیں ......'' شامو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں.....انسان بھی بڑی عجیب مخلوق ہے.....جو کوئی اس کی مصیبت میں اس کے کام آتا ہے.....وہ ساری زندگی اس کا قرض دار ہو جاتا ہے جتنی ایک انسان کی اچھائی دوسرے انسان کے دل کو بدلتی ہے۔ دنیا کی کوئی اور شے نہیں بدل سکتی۔'' اسلم نے جواب دیا۔

''آپ لوگوں سے ملنے سے پہلے میں یہی سمجھتا تھا کہ اس دنیا کے سب انسان ایک جیسے ہی برے ہیں۔ دوسروں پر ہنسنے والے، انہیں تنقید، طنز اور مذاق کا نشانہ بنانے والے.....مگر.....اب یہ یقین ہونے لگا ہے کہ بہت سے ایسے لوگوں میں سے صرف چند ایک دوسروں کے دکھوں کو سمجھنے والے، ان کے زخموں پر مرہم رکھنے والے بھی ہوتے ہیں۔'' شامو نے کہا۔

''بس.....بھئی.....بس.....زیادہ تعریفیں نہ کرو.....کہیں ہم بھی برے نہ ہو جائیں۔'' اسلم نے ہنستے ہوئے کہا۔

''نہیں.....آپ برے نہیں ہو سکتے۔'' شامو نے مسکرا کر کہا۔

''کیوں.....؟ انسان کو بھلا بدلتے دیر ہی کتنی لگتی ہے؟'' اسلم بولا۔

''نہیں.....اچھے انسانوں کے دل اللہ نے بڑے اچھے بنائے ہوتے ہیں۔ شاید کسی خاص چیز سے.....وہ ٹوٹ تو جاتے ہیں، مگر کبھی بے ایمان نہیں ہوتے اور نہ ہی بد دیانتی کرتے ہیں۔'' شامو نے کہا۔

''تمہیں کیسے معلوم ہے.....؟'' اسلم نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے استاد جمالے کے دل کو بہت دفعہ ٹوٹتے دیکھا.....اسے روتے دیکھا.....اس کے بیٹوں نے اسے بہت تنگ کر رکھا تھا، مگر اس نے کبھی ان کو برا نہیں کہا تھا۔ اسلم بھائی کیا یہ کم بات ہے کہ وہ اپنی روزی کا اڈا بھی ان کی خاطر بیچنے کو تیار ہو گیا تھا۔ مجھے اکثر استاد بڑا یاد آتا ہے۔'' شامو نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''شامو.....استاد جیسے لوگ واقعی اس دنیا میں بہت کم ہیں اور یہ کتنی بدقسمتی ہے کہ اپنے ہی لوگ ان کی قدر نہیں کرتے۔'' اسلم نے افسردگی سے کہا۔

''کیا مطلب.....؟ شامو نے چونک کر پوچھا۔

''استاد بہت بیمار ہے.....آج کل.....کس خیراتی ہسپتال میں ہے.....اس کا بیٹا تین سال پہلے لندن گیا تھا، اس نے کبھی پلٹ کر خبر نہ لی۔ استاد کی بیوی بیٹے کے غم میں مر گئی.....دو بیٹے اپنی بیویوں کے ساتھ دوسرے شہروں میں چلے گئے۔ استاد کی ایک ہی بیٹی ہے، مگر وہ بھی بہت غریب ہے۔ اس نے ہی مجھے استاد کے کہنے پر اطلاع دی ہے۔ میں تمہیں بتانا تو نہیں چاہتا تھا کہ کل تم سنگاپور جا رہے ہو.....اب تم نے استاد کا ذکر چھیڑا ہے تو میں نے سوچا.....تجھے بتا ہی دوں۔'' اسلم نے کہا۔

''استاد کو کیا ہوا ہے؟'' شامو نے حیرت سے پوچھا۔

''معدے میں کینسر ہے.....'' اسلم آہستہ سے بولا۔

''اسلم بھائی.....کیا میرا سنگاپور جانا ملتوی ہو سکتا ہے؟'' شامو نے نم آنکھوں سے پوچھا۔

''نہیں یار.....فلم کی شوٹنگ کا مسئلہ ہے.....اور ہم ایڈوانس بھی لے چکے ہیں۔'' اسلم نے بتایا۔

''اسلم بھائی.....کسی طرح یہ ممکن ہو سکتا ہے.....کہ میں استاد کو بس ایک بار جا کر دیکھ آؤں.....'' شامو نے التجا کرتے ہوئے کہا۔

ٹھیک ہے.....میں پروڈیوسر سے بات کر کے دیکھتا ہوں۔'' اور اسلم نے فون نمبر ملا کر بات کی۔

''یار.....وہ کسی صورت نہیں مان رہا.....میں نے کسی اور بیوٹیشن کو بھیجنے کو کہا ہے، مگر وہ پھر بھی نہیں مانتا.....البتہ تم یوں کر سکتے ہو کہ ابھی چلے جاؤ اور صبح تک واپس آ جاؤ۔ میں ایک دو روز کے بعد اسے ملنے جاؤں گا۔'' اسلم نے کہا۔

''مگر اسلم بھائی.....میری ساری پیکنگ ہونے والی ہے۔'' شامو نے کہا۔

''تو.....فکر نہ کر.....میں بنٹی سے کہہ دیتا ہوں۔ وہ جا کر تمہاری پیکنگ کر دیتی ہے۔'' اسلم نے اپنی ایک اسسٹنٹ کے بارے میں کہا۔

''ٹھیک ہے.....میں گھر کی چابیاں بنٹی کو دے جاؤں گا۔'' شامو کہہ کر وہاں سے چلا گیا۔

رات کو وہ دیر سے استاد کی بیٹی کے گھر پہنچا تو ان کی غربت اور پسماندگی دیکھ کر وہ بہت پریشان ہو گیا.....استاد ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکا تھا.....اس کی حالت دیکھ کر شامو کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ رونے لگا۔

''استاد.....تو نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا.....کہ تو اتنا بیمار ہے۔ میں تجھے شہر کے سب سے بڑے ہسپتال میں لے جاتا.....یہ تو اسلم بھائی نے بتایا ہے.....اور.....میں کل سنگاپور جا رہا ہوں۔ اس لئے ابھی تجھ سے ملنے آ گیا ہوں۔'' شامو نے جواب دیا۔

''اچھا کیا.....تو.....ملنے آ گیا.....پتا نہیں.....تیرے آنے تک میں زندہ بھی رہتا ہوں.....یا نہیں۔'' جمالے نے آہ بھر کر کہا۔

''استاد.....تو.....ایسی باتیں کیوں کر رہا ہے.....؟ تو زندہ رہے گا.....'' شامو نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی آنکھوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

''شامو.....اب میری زندگی کی کسی کو ضرورت نہیں۔'' جمالے نے روتے ہوئے جواب دیا۔

''استاد.....مجھے تیری زندگی کی سب سے زیادہ ضرورت ہے تو نے کہا تھا نا.....تو میرا باپ ہے.....تو.....کیا.....تو مجھے یونہی چھوڑ کر چلا جائے گا۔'' شامو نے رنجیدگی سے کہا۔

''جانا تو ہے.....ہی.....'' جمالے نے جواب دیا اور اس کی ہچکی بندھ گئی۔

''استاد.....ہمت کر.....تو ٹھیک ہو جائے گا.....یہ.....یہ کچھ پیسے ہیں، انہیں رکھ لے.....ان سے اپنا علاج کرانا.....میں جلد واپس آؤں گا.....اور آ کر.....تجھے اپنے ساتھ لے جاؤں گا.....شہر کے بڑے ہسپتال سے تیرا علاج کراؤں گا۔'' شامو نے اسے ایک لفافہ پکڑاتے ہوئے کہا۔

''کتنے ہیں.....؟'' جمالے نے پوچھا۔

''دو لاکھ.....'' شامو نے جواب دیا۔

''کہاں سے لئے.....؟'' جمالے نے حیرت سے پوچھا۔

''میری اپنی محنت کی کمائی کے ہیں..... اسی ہنر سے کمائے ہیں جو تو نے مجھے سکھایا..... ورنہ میرے پاس تو چائے کا کپ پینے کے لئے بھی پیسے نہیں تھے..... تجھے یاد ہے نا وہ دن۔'' شامو نے اسے یاد دلاتے ہوئے کہا۔

''ہاں..... اچھی طرح یاد ہے..... مگر یہ تیری محنت کے روپے ہیں انہیں تو اپنے پاس رکھ۔'' میں نے زندہ تو بچنا نہیں۔ خواہ مخواہ تیری رقم برباد کروں..... اس بیماری سے کون بچ سکتا ہے۔'' جمالے نے افسردگی سے کہا۔

''استاد ایسی باتیں مت کر..... اب اس بیماری کا علاج ممکن ہے..... تو حوصلہ نہ ہار..... تو علاج کرا..... سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' شامو نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ نہیں شامو..... میری بیماری آخری سٹیج پر ہے، اب کوئی علاج ممکن نہیں..... بس دعا کرنا..... سکون سے مرسکوں۔'' جمالے نے کہا تو شامو سسکیاں بھرنے لگا.....

کیسے تیرے مرنے کی دعا..... کرسکتا ہوں..... یہ مجھے مت کہنا۔'' شامو کی ہچکی بندھ گئی اور وہ نوٹوں کا لفافہ وہیں رکھ کر لوٹ آیا۔

☆

رانی گھر سے کیا بھاگی تھی۔ برکتے بستر سے لگ گئی تھی۔ ملکا اٹھتے بیٹھتے اسے لعن طعن کرتا رہتا اور وہ بے بسی سے اس کی باتیں سنتی رہی۔ بجو اور مٹھو بھی اسے گالیاں بکتے۔ البتہ چھوٹے بہن بھائی اسے محبت سے یاد کرتے، تو برکتے کی آنکھیں بھیگ جاتیں برکتے کو رانی سے بہت محبت تھی، مگر وہ اس سے اپنی بھرپور محبت کا اظہار کبھی کر نہیں پائی تھی..... وہ اس کی سب سے بڑی بیٹی تھی اور بڑی اولاد سے ماں باپ کو محبت بھی کچھ زیادہ ہوتی ہے۔ رانی کے ساتھ برکتے کو بہت محبت محسوس ہوتی تھی، مگر وہ ہر وقت اسے ڈانٹتی رہتی تھی۔ رانی اکثر برکتے سے خفا بھی رہتی تھی۔ دونوں میں تلخ کلامی بھی ہوتی تھی..... مگر..... دونوں ایک دوسرے کی محبت کو بہت محسوس کرتیں تھیں گو کہ خاموش رہتی تھیں۔ رانی قدرے سنجیدہ مزاج کم گو مگر حساس طبیعت کی تھی۔ وہ برکتے کی ڈانٹ سننے سے پہلے ہی گھر کا کام شروع کر دیتی تھی۔

برکتے کو یاد آتا تھا وہ اکثر رات کو برکتے کے ساتھ جاگتی رہتی اور بچے پالنے میں اس کی مدد کرتی..... گھر کے کام کاج میں اس کا ہاتھ بٹاتی اور سارا دن کام دھندے میں بھی گزارتی۔ ''پہلے اس کا بچہ چھن گیا تھا اور اب جوان بیٹی..... رانی کے صدمے نے تو اس کی کمر توڑ دی تھی۔''

''بجو..... جا اسے کہیں سے ڈھونڈ کر لا..... میں اس کے بغیر مر جاؤں گی۔'' برکتے تنہائی میں بجو کا ہاتھ پکڑ کر روتے ہوئے التجا کرتی۔

''اماں..... تو سمجھتی کیوں نہیں..... وہ گھر سے بھاگ گئی ہے، اپنی مرضی سے گئی ہے..... اپنے کپڑے اور چیزیں لے کر..... میں اب اسے کہاں سے ڈھونڈ کر لاؤں..... خود ہی گئی ہے،، خود ہی آ جائے گی۔'' بجو منہ بنا کر جواب دیتا۔

''مٹھو..... تو ہی بہن کو ڈھونڈ لا.....'' برکتے تنہائی میں مٹھو کے آگے ہاتھ جوڑتی۔

''میں..... بھلا..... اسے کہاں سے ڈھونڈوں..... مجھے کیا پتا وہ کہاں گئی ہے؟ مٹھو قدرے معصومیت سے جواب دیتا۔

وہ اکثر ملکے کا موڈ بہتر دیکھ کر اس کے آگے ہاتھ جوڑتی۔ ''ملکے..... اللہ کے واسطے..... میری دھی کو ڈھونڈ لا..... دیکھ میرا دل اس کے بغیر بڑا اداس ہے..... کلیجہ پھٹ گیا ہے.....'' برکتے رو رو کر اس کے آگے درخواست کرتی۔

''برکتے.....اس کو بھول جا.....وہ اپنے کسی یار کے ساتھ بھاگ گی ہے، اب نہیں آنے کی۔'' ملکا غصے سے کہتا۔

''نہیں.....میری رانی ایسی نہیں ہے.....وہ ایسا نہیں کر سکتی۔'' برکتے نے اسے جھٹلاتے ہوئے کہا۔

''کر کیوں نہیں سکتی.....عورت ذات کا کیا بھروسہ؟ وہ جو کرنا چاہے تو اسے کون روک سکتا ہے؟'' ملکے نے کہا۔

''ملکے.....سچ بتا.....کیا تیرا دل اس بات کو مانے ہے کہ ہماری رانی کسی کے ساتھ بھاگ سکتی ہے۔'' برکتے نے حیرت سے پوچھا۔

''جب.....تو.....ہیجڑا پیدا کر سکتی ہے.....تو.....رانی بھی بہت کچھ کر سکتی ہے۔'' ملکے نے اسے طعنہ دیتے ہوئے کہا۔

''اللہ سے ڈر.....یہ اس کے رنگ ہیں.....وہ جو چاہے پیدا کرے.....انسان کا اس میں کیا بس ہے؟'' برکتے نے بھی غصے سے جواب دیا۔

''اللہ جو چاہے.....وہ.....کرے.....تو پھر بندہ بھی جو چاہے وہ کر سکتا ہے.....تیری رانی نے بھی گھر سے بھاگنا چاہا تو بھاگ گئی.....اس کو کس نے روک لیا؟ اس بے حیا.....بے شرم کو ذرا سی بھی لاج نہ آئی.....نہ تیرا کچھ سوچا نہ میرا.....ہماری اجت کو داؤ پر لگا گئی.....میں تو تھو کتا ہوں، اس منحوس کی شکل پر۔'' ملکا غصے سے دھاڑا تو برکتے نے خاموش رہنے میں ہی عافیت سمجھی، مگر اس کا دل ہر وقت رانی کے لئے بے تاب رہتا.....وہ اس کے غم میں روتی رہتی۔ اٹھتی بیٹھتی بڑبڑاتی رہتی جیسے اس سے کچھ کہہ رہی ہو.....بس رانی کی باتیں اور اس کے الفاظ سنائی دیتے.....رانی کہاں گم ہو گئی ہے.....؟

''ہائے.....رانی تو اپنی بوڑھی ماں کو چھوڑ کر کیوں چلی گئی۔ تجھے کہاں سے ڈھونڈ کر لاؤں۔

''یا اللہ! میری رانی کو میرے پاس بھیج دے.....سوا روپے کی نیاز چڑھاؤں گی۔'' اس نے دل ہی دل میں پکی منت مان لی تھی۔

☆

میں پانچ ہزار روپے کی نیاز دوں گی.....جس دن میں نگار بیگم کی طرح نوٹوں کے فرش پر چلوں گی۔'' وہ ہر رات کو آنکھیں بند کر کے اپنی اس منت کو یاد کرتی.....اس کو ہر طرف رنگ برنگی نوٹوں کی گڈیاں اور بکھرے نوٹ نظر آتے۔ اس کے پاس اتنی دولت ہو گی کہ وہ اچھے اچھے کھانے کھائے گی.....اچھے کپڑے پہنے گی اور زیورات.....اچھا عالیشان گھر.....گاڑی.....اور نوکر.....مجھے یہاں آئے تین سال ہو گئے ہیں.....نگار بیگم کی خدمت کرتے ہوئے اس کے پاؤں دھوتے ہوئے.....اس کے سر کی مالش کرتے ہوئے.....اس کے کندھے اور جسم دباتے ہوئے.....اس کے کمروں کی صفائی کرتے ہوئے.....اس کے گندے مندے کام کرتے ہوئے.....وہ جو خواب لے کر آئی تھی وہ پورا ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا.....نگار بیگم اس کا یہاں آنے کا مقصد نہیں سمجھ رہی تھی۔ اس نے تو اسے نوکرانی بنا کر رکھ دیا تھا۔ وہ اسے اپنی اترن پہناتی۔ اسے بچا ہوا کھانا دیتی، مگر اس کی ہتھیلی پر ایک روپیہ نہ رکھتی.....اس سے بہتر تو وہ بھکارن تھی.....دن بھر اس کی کشکول میں سکے تو رہتے تھے۔ کبھی کبھار روپے بھی مل جاتے تھے اور یہاں آ کر تو وہ بھیک سے بھی گئی تھی.....اور.....اس پر مزید یہ کہ وہ اس کو کوٹھے سے نیچے بھی نہیں اترنے دیتی تھی۔ وہ تو سارا دن سڑکوں پر پھرنے والی تھی.....اب وہ ہر وقت نگار بیگم کی خدمت میں ہی مصروف رہتی۔ اس کے لئے وہ کسی کو الزام نہیں دے سکتی تھی۔ یہ راستہ اس نے خود چنا تھا۔ اسے نگار بیگم ہی اپنی منزل نظر آتی تھی۔ بہت سی دولت حاصل کر کے اپنی زندگی کو بدلنے کا خواب اس کا اپنا تھا اور ہر انسان کو اپنی زندگی اچھی طریقے سے گزارنے کا حق ہے.....وہ اچھے طریقے سے رہ رہی تھی۔ ایک بھکارن نہیں بلکہ ایک نوکر بن کر.....وہ دن اسے اچھی طرح یاد تھا جب وہ اپنی جھگی

سے صبح سویرے بھاگ کر نگار بیگم کے کوٹھے پر آئی تھی۔

''تم آج یہاں جس راستے پر چل کر آئی ہو......اس کو ہمیشہ کے لئے بھول جاؤ۔'' نگار بیگم نے قدرے ٹھوس لہجے میں کہا۔رانی نے حیرت سے نگار بیگم کی طرف دیکھا۔

''کیا نام ہے تمہارا......؟'' نگار بیگم نے قدرے توقف کے بعد پوچھا۔

''رانی......'' اس نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

''رانی نہیں......تم......''رینا'' ہو......تم یہاں ہماری خدمت کے لئے آئی ہونا......ہم دیکھنا چاہتے ہیں......تم ہماری کتنی خدمت کر سکتی ہو......'' نگار بیگم نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''جی......جی......ہاں'' رانی بمشکل بولی۔

''چمن بیگم......'' نگار بیگم نے آواز لگائی۔

ایک سینتالیس سالہ خوش لباس اور خوش شکل عورت قدرے موٹی عورت دوڑتی ہوئی آئی۔

''چمن بیگم......آج سے آپ کی ساری ذمہ داریاں......رینا بیگم سنبھالیں گی۔'' نگار بیگم نے رانی کی طرف اشارہ کیا تو رانی حیرت سے دونوں کو دیکھنے لگی......چمن بیگم نے معنی خیز انداز میں رانی کو سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا۔

''آیئے......رینا بیگم......ہم آپ کو سب کچھ سمجھا دیتے ہیں۔''

چمن بیگم اس کو اپنے ساتھ لے کر باہر چلی گئی......اور اس روز سے لے کر آج تک وہ صبح سے لے کر رات تک نگار بیگم کی ساری ذمہ داریاں نبھاتی تھی۔رانی جب سے 'رینا بیگم' بنی تھی اس کا حلیہ بھی بدل گیا تھا اور طرز زندگی بھی......وہ خوش لباس ہوگئی تھی......اچھے کپڑے اور زیورات پہننے سے اس کی شکل وصورت میں واضح تبدیلی آگئی تھی......اس کی رنگت نکھرنے لگی تھی اور چہرے کے نقوش مزید خوبصورت اور نمایاں ہونے لگے تھے۔آنکھوں میں کاجل اور ابروؤں کو خمدار بنانے......بالوں کو مختلف انداز سے گوندھ کر چٹیا بنانے سے وہ بالکل ہی بدل گئی تھی۔نگار بیگم کی قربت نے اس کو بہت کچھ سکھلا دیا تھا۔وہ ان کے آدابِ گفتگو وطعام،نشست وبرخاست،چلنے پھرنے اداؤں وناز نخرے کا اچھی طرح مشاہدہ کرتی......وہ نگار بیگم کو لحہ لحہ اپنے اندر اتارتی......وہ ذہین تھی......کم گو......اور سنجیدہ مزاج بھی......نگار بیگم سے زیادہ گفتگو نہ کرتی......جو وہ حکم کرتیں خاموشی سے بجالاتی......نگار بیگم خوش تھیں کہ اچانک انہیں قدرت نے ایسی باادب خدمت گار مہیا کی تھی۔

نگار بیگم کے کوٹھے پہ ہر رات رقص وسرور کی محفل ہوتی۔جب سے کوٹھے کی مالکہ کندن بیگم کا انتقال ہوا تھا......نگار بیگم نے کوٹھے کا سارا انتظام سنبھالا تھا......نگار بیگم کندن بیگم کی بیٹی تھی اور شروع سے ہی اس ماحول میں پرورش پانے کے باعث اس میں طوائف زادیوں کے سے نخرے، ادب وآداب اور دل لبھانے کی ادائیں اور نخرے پختہ ہو چکے تھے۔اس کے ہاں دس طوائفیں رہائش پذیر تھیں، جو حویلی نما، کوٹھے کے پچھواڑے میں رہائش پذیر تھیں۔نگار بیگم حویلی کے اگلے حصے میں رہتی تھیں......نگار بیگم اپنے اصولوں میں بہت سخت تھیں۔رقص کی تربیت کے لئے استاد چندو خاں

اوران کے سازندے ہمیشہ مستعدرہتے۔ نگار بیگم نے ہرطوائف کی باری مقرر کررکھی تھی، جوحویلی کے اگلے حصے میں آکر نگار بیگم کی سرپرستی میں رقص کی تربیت لیتی...... صرف رقص کی تربیت حاصل کرنے والی رقاصہ ہال نما کمرے میں موجود ہوتی...... اور تربیت کے فوراً بعدوہ اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ طوائفوں کے پورشن میں کسی مرد کو جانے کی اجازت نہ ہوتی تھی۔ ہرروز دوطوائفیں مجرا کرتیں، رات گئے تک شباب وشراب، سرورو موسیقی کی محفل گرم رہتی......

نگار بیگم خود ہفتے میں ایک رات مجرا کرتی اوراس رات دوردنزدیک سے مہمان آتے...... ہال کھچا کھچ بھرا ہوتا...... اوروہ رات صبح تک ختم نہ ہوتی۔ نگار بیگم کے قدموں تلے فرش کا ایک چپہ تک نظر نہ آتا۔ اس کے مہندی بھرے پاؤں اور گھنگھروؤں کی جھنکار سے کوٹھے کے درو بام گونج اٹھتے۔ مہمان نشے میں دھت اس پرواری قربان ہوتے جاتے اور ہوئے اپنی جیبیں خالی کر کے ہی اٹھتے...... اس رات کے بعد نگار بیگم تھک کر چور ہوجاتی...... اورریناکبھی نیم گرم پانی میں اس کے پاؤں ڈبوکران کی تھکاوٹ دور کرنے کی کوشش کرتی۔ کبھی اس کے سارے بدن پر مساج کرتی...... سرمیں تیل ڈالتی...... دوتین دن نگار بیگم یونہی بے سدھ پڑی رہتی اور رینا اس کی خدمت میں لگی رہتی...... نگار بیگم کے مجرے کے بعد رینا بہت مصروف ہوجاتی جیسے ہی نگار بیگم اپنے آپ کو توانا محسوس کرتی تو اگلے روز گاڑی میں بیٹھ کروہ درگاہ پر حاضری دینے جاتی۔ ہر ہفتے اس کا یہی معمول تھا...... درگاہ سے آنے کے بعد اگلے روز وہ چاولوں کی دیگیں پکوا کر نیاز بانٹتی۔ نگار بیگم کا کوٹھا...... اس کا مجرا...... اوراس کی حویلی کی طوائفیں علاقے میں سب سے زیادہ مشہور تھیں۔ نگار بیگم بڑی تمکنت اور جاہ وحشمت والی بتیس سالہ عورت تھی، وہ طوائفوں پر بھی نظر رکھتی اور کارندوں پر بھی...... آنے والے مہمانوں پر بھی اور دل پھینک عاشقوں پر بھی...... کونسی طوائف...... کس وقت، کس مہمان کو پیش کی جائے گی، سب کچھ اس کے علم میں ہوتا...... اس کی مرضی کے بغیر اس کے کوٹھے پر کوئی چڑی بھی پر نہ مار سکتی تھی۔ رینا کا زیادہ تر وقت نگار بیگم کی خدمت میں ہی کٹتا، وہ کبھی کبھار کسی کام سے طوائفوں کے پورشن میں جاتی...... جب جاتی تو وہاں سے آنا ہی بھول جاتی۔ خوبصورت، پریوں جیسی گلبدن طوائفوں کو وہ کبھی مساج کرتے دیکھتی، کبھی بالوں کو ڈائی کرتے، کبھی فیشل کراتے اور مہندی لگواتے دیکھ کر وہ عجیب سی خوشی محسوس کرتی۔ چمن بیگم کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی، طوائفوں کی خدمت کے لئے مامور تھی۔ چمن بیگم کبھی ان کے بالوں میں تیل لگاتی، کبھی ان کے ملبوسات میں ان کی مدد کررہی ہوتی...... وہ آنکھیں پھیلائے حیرت سے ایک ایک کی جانب دیکھتی رہ جاتی...... مگر اسے بہت کم کسی سے بات کرنے کا موقع ملتا...... نگار بیگم کا حکم یاد آتے ہی وہ فوراً واپس آجاتی۔ نگار بیگم جب اس سے بہت خوش ہوتی تو سو یا دو سو کے نوٹ اسے پکڑا دیتی اور وہ ان نوٹوں کو مٹھی میں دبائے اپنے اس خواب کے بارے میں سوچتی رہتی جو وہ اپنی آنکھوں میں سجائے نگار بیگم کے کوٹھے پر آئی تھی...... مگر تین سالوں میں اس خواب کا ایک حصہ بھی پورا ہوتا دکھائی نہیں دیا تھا اور اپنی نامکمل آرزوؤں، تمناؤں اور خواہشوں پر وہ دل ہی دل میں کڑھتی رہتی۔

''کیا میں یہاں صرف نگار بیگم کی خدمت کرنے آئی ہوں...... ؟ کیا اس عورت کے لئے میں نے اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کو چھوڑا؟ کیا میں اس کی کوئی خریدی ہوئی غلام ہوں کہ اس نے میرے باہر جانے پر بھی پابندی لگادی ہے...... میں اپنی ماں سے بھی نہیں مل سکتی...... اپنے بہنوں اور بھائیوں سے بھی نہیں...... اکثر اپنے گھروالوں کو یاد کرتے ہوئے اس کی آنکھیں نم ہونے لگتیں...... اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی۔

''میں کب تک یونہی نگار بیگم کی خدمت کرتی رہوں گی...... مجھے کچھ کرنا چاہیے'' وہ قدرے باغیانہ انداز میں سوچتی۔

''اگر میں ساری زندگی یونہی اس کی خدمت کرتی رہوں گی...... تو میرے خواب کب پورے ہوں گے...... میں کب امیر ہوں گی...... کب میرے پاس دولت آئے گی......؟ کب میں نوٹوں کے فرش پر چلوں گی اور کب بڑی گاڑیوں میں بیٹھ کر سفر کروں گی؟'' وہ مضطرب ہو کر سوچتی اور اٹھ کر بیٹھ جاتی، پھر ساری رات اسے نیند نہ آتی...... کبھی اسے محسوس ہوتا کہ اپنی جھگی، اپنی دنیا، اپنی آزادی اور اپنے ماں باپ و بہن بھائیوں کو چھوڑ کر اس نے بہت بڑی غلطی کی ہے...... اس نے اپنی دنیا اور اپنے رشتے بدلنے کی کوشش کی تھی...... اور اس بدلی ہوئی دنیا میں وہ کہاں کھڑی تھی...... اور اس کا مستقبل کیا تھا، وہ سوچ سوچ کر پریشان ہو جاتی...... وہ بالکونی کے چھجے سے نیچے تنگ گلی میں جھانکتی جہاں ہر طرف مختلف دکاندار اپنی رنگ برنگی دکانیں سجائے نظر آتے۔ وہ راہ چلتے لوگوں کو کچھ دیر حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتی...... اور...... آہیں بھرتی...... اگر اچھو کی نظر اس پر پڑ جاتی...... تو وہ اسے نیچے آنے کو کہتا، مگر وہ نفی میں سر ہلا دیتی۔ اچھو تاسف سے اس کی طرف دیکھتا رہ جاتا...... اس کی آنکھوں میں اس کے لئے ہمدردی اور دکھ کے تاثرات نمایاں ہونے لگتے۔ نگار بیگم نے جس روز درگاہ پر حاضری کے لئے جانا ہوتا تو صبح سے تیاریاں شروع ہو جاتیں۔ گلاب کے پھولوں کی پتیاں، ہار، رنگ برنگی گلدستے، اگربتیاں اور مختلف قسم کی چیزیں تبرک میں بانٹنے کے لئے وہ اپنے ساتھ لے کر جاتی۔ ایک گاڑی میں وہ خود اور ڈرائیور جاتے، دوسری گاڑی میں اماں حاجن، چمن بیگم اور دوسری ادھیڑ عمر عورتیں پھولوں، پھلوں اور سامان کے ساتھ بیٹھتیں۔ اماں حاجن کو نگار بیگم نے خصوصی طور پر اس کام کے لئے تنخواہ پر رکھا تھا کہ درگاہ پر جا کر وہ ختم پڑھتی۔ نگار بیگم آنکھیں بند کئے کافی دیر اسی کیفیت میں مست ہو کر اپنا تعلق خدا سے جوڑنے کی کوشش کرتی، پھر نگار بیگم اپنے ہاتھ سے تبرک لوگوں میں تقسیم کرتیں...... شام گئے وہ واپس لوٹتی اور اس دن کوٹھے پر نہ کوئی مجرا ہوتا اور نہ ہی کوئی مہمان آتا۔ نگار بیگم کئی کئی گھنٹے اپنے کمرے میں خوبصورت نرم و گداز مخملیں بستر پر آنکھیں بند کئے، لیٹ کر کچھ سوچتی رہتی یا تصور میں کسی اور دنیا کی سیر کرنے نکل جاتی۔ اس رات کوئی بھی نگار بیگم کے کمرے میں نہ تو داخل ہوتا اور نہ ہی کسی کو اندر جانے کی اجازت ہوتی۔ اس رات رینا کو صرف ایک ہی کام ہوتا...... وہ چپکے سے استاد چندو خاں کے پاس چلی جاتی اور راگ، راگنیوں اور نئے زمانے کی موسیقی سے لطف اندوز ہوتی۔ نگار بیگم کو اس بات کی خبر مل چکی تھی، مگر انہوں نے کوئی توجہ نہ دی۔

''رینا بیگم...... آپ کب رقص سیکھنا شروع کریں گی؟'' استاد چندو نے ایک رات پوچھا۔

''میں اور رقص......؟ میں تو نہیں سیکھ سکتی......'' وہ بوکھلا کر بولی۔

''کیوں......؟''

''معلوم نہیں......''

''آپ تین سالوں سے یہاں ہیں...... اب تک آپ کو محفل میں آ جانا چاہیے...... آپ بہت سی دوسری طوائفوں سے بہت خوبصورت ہیں...... اور جہاں تک میرا خیال ہے...... آپ رقص بھی بہت عمدہ کریں گی...... پھر نگار بیگم آپ کو کیوں محفل میں نہیں لاتیں......'' استاد چندو نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''معلوم نہیں......'' وہ افسردگی سے بولی۔

''کیا نگار بیگم نے کبھی آپ سے رقص سیکھنے اور محفل میں آنے کی بات نہیں کی؟ استاد چندو نے پوچھا۔

''ن......نہیں......تو'' وہ بمشکل بولی۔

''حیرت کی بات ہے......انہوں نے آپ سے کیوں بات نہیں کی......نگار بیگم بہت جہاندیدہ اور دور شناس عورت ہیں وہ تو نئی لڑکیوں کے ہاتھ پاؤں کی انگلیوں کی حرکات و سکنات سے بھانپ لیتی ہیں کہ وہ کیسا رقص کر سکتی ہیں......اور آپ کے ہاتھ پاؤں کی حرکات سے میں جان گیا ہوں۔ کہ آپ بہت اچھا رقص کر سکتی ہیں......میرے خیال میں......آپ بہت جلد نگار بیگم سے آگے بھی نکل سکتی ہیں......اس وقت اگر اس کوٹھے پر رقص میں نگار بیگم کو کوئی مات دے سکتا ہے......تو وہ آپ ہوں گی۔'' استاد چندو نے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

''میں......میں......؟ مگر میں نے تو کبھی رقص کیا ہی نہیں......تو......پھر آپ کو کیسے معلوم ہوا؟'' اس نے بمشکل پوچھا۔

''ارے......بیٹا......ہم نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کئے۔ آپ ہمارے لڑکے کے ساتھ کھڑی ہو جائیں......وہ آپ کو کچھ اسٹیپس سکھاتا ہے......آپ اس کے ساتھ وہی کیجئے......آپ کو خود ہی معلوم ہو جائے گا......ہماری نظریں دھوکہ نہیں کھاتیں۔'' استاد چندو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''رقص......کہیں......نگار بیگم برا نہ منائیں۔'' وہ ڈرتے ہوئے بولی۔

''اری......بیٹا......یہاں رہنے والی ہر طوائف کا مستقبل رقص میں ہی ہے......آپ رقص نہیں سیکھیں گی تو اور کیا کریں گی؟ آپ کو آج نہیں تو کل رقص ہی سیکھنا ہے......اور نگار بیگم کیوں برا منائیں گی؟ وہ تو خود چاہتی ہیں کہ یہاں رہنے والی ہر طوائف رقص میں بہتر ہو......چلئے......آپ رقص شروع کریں۔'' استاد چندو نے اسے قائل کرتے ہوئے کہا تو وہ خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ پندرہ سولہ سالہ نوجوان لڑکا ڈھولک کی تھاپ اور استاد چندو کے سازندوں کی سرتال پر پاؤں میں گھنگھرو باندھے رقص کرنا شروع ہو گیا، وہ حیرت سے کچھ دیر اسے دیکھتی رہی......

''اب آپ اس کے ساتھ قدم اٹھائیں......اس کے ہاتھوں کی حرکات دیکھیں......شاباش' استاد چندو نے کہا۔

رینا اس کے ساتھ، اس کو بغور دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ جھومنے لگی۔

''واہ......واہ......کیا کہنے......بیٹا......کچھ لوگوں کو خدا قدرتی طور پر فنکار بنا کر بھیجتا ہے......انہیں بس راستہ بتانے کی ضرورت ہوتی ہے......چوٹی پر وہ خود بخود پہنچ جاتے ہیں اور کچھ لوگوں کے ساتھ سر بھی پھوڑ دیا جائے تو ان کو نہ فن کی سمجھ آتی ہے اور نہ ہی فنکار بن پاتے ہیں۔ تم ان خوش نصیب لوگوں میں سے ہو......جن کو قدرت نے فن کی سمجھ بوجھ دی ہے......میرا تجربہ یہ کہتا ہے......کہ تم بہت جلد نام پیدا کرو گی......اپنا مقام بنا لو گی......پھر اس کوٹھے پر لوگ صرف نگار بیگم کا ہی نہیں......رینا بیگم کا رقص دیکھنے آئیں گے......'' استاد چندو نے اس کی اتنی تعریف کی کہ وہ خوشی سے پھولی نہ سما رہی تھی۔

''کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں؟'' رینا نے بے یقینی سے پوچھا۔

''لو......بھلا......ہم کیوں جھوٹ بولیں گے۔'' استاد چندو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اچانک چمن بیگم کا وہاں سے گزر ہوا۔ اس نے رینا بیگم کو استاد چندو کے لڑکے کے ہمراہ رقص کرتے دیکھا تو خاموش، مگر معنی خیز نظروں سے دونوں کو دیکھتی ہوئی وہاں سے گزر گئی۔ رینا کا دل ڈرنے لگا اور وہ وہاں سے چلی گئی۔

ساری رات خوف اور ملال میں کٹی...... نجانے نگار بیگم کیا کہیں گی......؟ وہ ساری رات سو نہ سکی اور گھبرائی رہی۔ مختلف خیالات کا تانا بانا بنتی رہی۔

وہ صبح ڈرتے ڈرتے نگار بیگم کے کمرے میں گئی...... تا کہ ان کا ہاتھ منہ دھلا سکے۔ مگر نگار بیگم اپنے کمرے میں موجود نہیں تھیں اور یہ بہت عجیب بات تھی کہ نگار بیگم اپنے کمرے میں موجود نہ ہوں۔ اس کے دل میں خوف اور وسوسے پیدا ہونے لگے...... وہ کمرے سے باہر نکل کر بالکونی کے پردے ہٹانے لگی، تا کہ صبح کی تازہ ہوا اور روشنی برآمدوں اور بالکونیوں میں سے ہوتی ہوئی حویلی کے کمروں کو تازہ اور نرم ہوا کے جھونکوں سے معطر کرے...... رینا کے اٹھتے قدم اچانک رک گئے...... ایک کمرے میں سے سرگوشیوں کی آوازیں آرہی تھیں...... اس نے کان لگا کر سنا...... آواز استاد چندو اور نگار بیگم کی تھی۔ اس نے کھڑکی کی اوٹ میں سے اندر جھانکا...... نگار بیگم کچھ پریشان لگ رہی تھی۔

''نگار بیگم...... اس لڑکی میں بڑا فن ہے۔ قدرت نے اس کو فن سے مالا مال کیا ہے...... میں حیران ہوں، کہ آپ ابھی تک اسے رقص کی طرف کیوں نہیں لا رہیں۔'' استاد چندو نے حیرت سے پوچھا۔

''استاد صاحب...... ہم نے اسے اپنی خدمت کے لئے یہاں رکھا ہے، رقص سکھانے کے لئے نہیں...... وہ طوائف نہیں...... ایک بھکارن ہے اور...... بھوکے ننگے لوگوں کو جب اپنی اوقات سے زیادہ ملتا ہے تو وہ پھر اپنے آپ میں نہیں رہتے...... اور یہی ہمارا تجربہ بھی ہے اور اس دنیا کی بہت بڑی حقیقت۔'' نگار بیگم نے قدرے تلخ لہجے میں کہا تو رینا کے دل میں آگ سی لگ گئی۔

''نگار بیگم...... یہ آپ کا خیال ہے...... اور میں اس سے اتفاق نہیں کرتا...... قدرت شاہوں کے گھر گدا اور گداؤں کے گھر بادشاہ پیدا کرتی ہے۔ وہ لڑکی بھی ایسی ہی ہے...... میرا تجربہ یہ کہتا ہے کہ اگر وہ رقص کی باقاعدہ تربیت حاصل کر لے تو وہ اس کوٹھے کی سب سے کامیاب طوائف بن سکتی ہے، بلکہ میرے خیال میں رقص میں اگر کوئی آپ کے ہم پلہ ہو سکتی ہے تو وہ...... یہ لڑکی ہو سکتی ہے۔'' استاد چندو نے کہا تو نگار بیگم کا چہرہ ایک دم اتر گیا...... اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہوئی...... چہرے پر ملے جلے تاثرات نمایاں ہونے لگے......

''اب آپ جا سکتے ہیں۔'' نگار بیگم نے اچانک کہا تو استاد چندو خاموشی سے وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔

اچانک نگار بیگم بھی ان کے پیچھے کمرے سے باہر نکلیں تو رینا دروازے کی اوٹ میں کھڑی تھی...... اسے موقع ہی نہ ملا کہ نگار بیگم کے نکلنے سے پہلے ہی وہ وہاں سے چلی جاتی۔ نگار بیگم نے غضب ناک ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

''تم...... ہماری باتیں سن رہی تھی......'' نگار بیگم نے کہا۔

''ن...... ن...... نہیں......'' رینا گھبرا کر بولی۔

''اب تم ہمارے ساتھ جھوٹ بولتی ہو......'' نگار بیگم نے غصے سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں......تو......یہاں......'' رینا ہکلاتے ہوئے بولی۔

''رینا بیگم......ہم سب جانتے ہیں آپ استاد چندو خاں کے ساتھ ہماری گفتگو سن رہی تھیں......ہمارے ہاں ایسی چوری کرنے والوں کو سزا ملتی ہے......اور تم بھی اس سزا سے نہیں بچ سکو گی......'' نگار بیگم نے غصے سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ رینا کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا......اور اس کی آنکھیں پتھرا گئیں، اس کی زبان جیسے گنگ ہو گئی تھی......اس کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔

''چمن بیگم......کہاں ہیں آپ......؟'' نگار بیگم نے قدرے اونچی آواز میں کہا تو چمن بیگم قدرے بھاگتی ہوئی نگار بیگم کے پاس آئی۔

''رینا کو لے جایئے......اور انہیں اس وقت تک کمرے میں بند رکھیں جب تک ہم نہ کہیں......تاکہ اس کی عقل ٹھکانے آجائے۔'' نگار بیگم نے غصے سے کہا اور چمن بیگم نے رینا کو قدرے غصے سے دیکھتے ہوئے چلنے کو کہا۔ رینا کے چہرے کی رنگت پیلی پڑ چکی تھی اور اس نے ڈر و خوف سے رونا شروع کر دیا۔ نگار بیگم نے ایک ٹک اسے غصے سے دیکھا اور وہاں سے چلی گئی۔

چمن بیگم نے اسے ایک تاریک کمرے میں بند کر کے تالا لگا دیا، وہ روتی، سسکتی رہی اور دروازہ پیٹتی رہی، مگر کسی نے اس کی ایک نہ سنی......اس کا رو رو کر برا حال ہو گیا......صبح سے دوپہر اور پھر شام ہو گئی تھی۔ اسے کھانے کو ایک لقمہ بھی نہیں دیا گیا تھا......نہ پینے کو ایک قطرہ پانی......بھوک سے اس کا برا حال ہو رہا تھا اس کا حلق خشک ہو رہا تھا اور ہاتھ پاؤں جیسے سن ہونے لگے۔ دماغ سست ہونے لگا اور خون کی گردش گویا رکنے لگی۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا......اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کی نبضیں رکنے لگی ہوں......اور اس کے سارے محسوسات، جذبات اور سوچیں ختم ہونا شروع ہو گئی ہوں۔ اسے کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کہاں ہے وہ بھوک سے نڈھال ہو کر فرش پر گر گئی اور آہستہ آہستہ بولنا شروع ہو گئی۔

''اماں......مجھے روٹی دے......مجھے بھوک لگی ہے......گڈی۔ مجھے تھوڑا سا پانی دے......اماں......میں بھوک سے مر رہی ہوں......اماں......میرے پیٹ میں کچھ ہو رہا ہے......میرا دل ڈوب رہا ہے......میں نے کل رات سے کچھ نہیں کھایا......اماں......اماں......اماں......'' وہ نقاہت سے بولنے لگی اور اس کی آواز ڈوبنے لگی......وہ ایکدم بیٹھی بیٹھی گر گئی۔

☆

برکتے رات بھر نہ سو سکی......ہر طرف گہرا اندھیرا چھایا تھا۔ نجانے کیا ہوا تھا سارا شہر تاریکی میں ڈوب گیا تھا۔ آسمان پر بادلوں کی وجہ سے رات کی تاریکی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ نجانے کیا ہوا تھا......برکتے کو بار بار رانی کا خیال آ رہا تھا۔ نجانے وہ کہاں ہے اور کن حالات میں ہو گی؟ اتنے سال ہو گئے ہیں، اس نے پلٹ کر خبر ہی نہ لی تھی۔

''رانی تجھے کبھی ماں کی یاد نہیں آئی......تجھے کبھی ماں کا خیال نہیں آیا......تو نے ایک بار بھی نہیں سوچا کہ تیری ماں کا کیا حال ہے......وہ تیرے غم میں کتنا روتی اور تڑپتی رہتی ہے۔ تیرا دل کب سے پتھر کا ہو گیا ہے۔ تجھے تو میں اپنے سارے بچوں میں سب سے زیادہ پیار کرتی تھی۔ تجھے اپنے قریب سمجھتی تھی......تو کہاں چلی گئی ہے......تیرے بغیر نہ کچھ کھانے کو دل چاہتا ہے......نہ نیند آتی ہے......اس بھیانک رات میں تو کہاں ہو گی۔'' رانی کے بارے میں سوچتے ہوئے برکتے رونا شروع ہو گئی۔ وہ ساری رات سسکتی رہی اور اپنے منہ میں اپنا دوپٹہ ٹھونستی رہی تاکہ اس کی آواز

کوئی سن نہ لے۔ اگر...... ملکا اس کی آواز سن لیتا تو اس کو بہت بے عزت کرتا، وہ اس کی زبان سے رانی کا نام بھی سننا نہیں چاہتا تھا...... رانی کے خیال میں ہی وہ سو گئی۔

''اماں اٹھ...... دن چڑھ گیا ہے...... بھوک لگی ہے۔'' اس کے چھوٹے بیٹے مجو نے برکتے کو ہلاتے ہوئے کہا۔

''برکتے اٹھ...... سب نے دھندے پر جانا ہے...... روٹی پانی کی فکر کر۔'' ملکے نے اونچی آواز میں کہا تو برکتے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور خاموشی سے مٹی کی انگیٹھی میں لکڑیاں ڈال کر انہیں جلانے لگی۔ پھونکوں سے آگ جلاتے ہوئے اس کی آنکھوں سے پانی رواں ہو گیا اور اس پانی میں اس کے بھرے دل کی آہیں اور سسکیاں تھیں اور ان آہوں کا دھواں، سلگتی لکڑیوں کے دھوئیں کے ساتھ مل کر اس کے دل کا غبار ہلکا کر رہا تھا۔ اس نے سب بچوں کے لئے روٹیاں پکائیں اور نادانستہ ایک روٹی زیادہ پکا دی۔

''اماں...... یہ روٹی کس کے لئے پکائی ہے؟'' مٹھو نے للچائی نظروں سے اس روٹی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہٹ...... یہاں سے...... یہ تیرے لئے نہیں۔'' اس نے روٹی کاغذ میں چھپا کر رکھتے ہوئے کہا...... سارے بچوں کے کان کھڑے ہو گئے...... وہ روٹی کس کے لئے ہے؟'' سب آدھے بھوکے پیٹوں سے اپنی اپنی کشکول اٹھا کر چلے گئے۔ مگر اس روٹی کا خیال سب کے ذہن میں تھا...... برکتے خود تو روٹی نہیں کھاتی تھی...... ملکا سب سے پہلے کھا کر چلا جاتا تھا...... پھر وہ روٹی کس کے لئے تھی......؟

اماں نے وہ روٹی سب سے چھپا کر رکھی تھی۔

برکتے کو کون اتنا عزیز تھا، جس کے لئے اس نے وہ روٹی چھپائی تھی۔

سب کے جانے کے بعد برکتے نے وہ روٹی نکالی اور اسے کاغذ پر اپنے سامنے پھیلا کر بیٹھ گئی۔

''رانی...... تو مجھے بہت یاد آ رہی ہے...... یہ روٹی میں نے تیرے لئے پکائی ہے...... تجھے کیسے کھلاؤں......؟ ایک بار میرے پاس آ جا...... میں تجھے اپنے ہاتھوں سے ایک ایک لقمہ کھلاؤں گی...... بس ایک بار تو آ جا......'' برکتے روٹی کو سامنے رکھ کر بڑبڑاتی رہی اور روتی رہی۔

''اور مجھے وہ بھی بہت یاد آتا ہے...... جسے میرے دودھ کا ایک قطرہ بھی نصیب نہ ہو سکا...... وہ بھی کیسا بدقسمت انسان تھا...... اور...... رانی بھی...... دونوں نجانے کہاں گم ہو گئے ہیں۔ برکتے رونا شروع ہو گئی اور روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے چڑیوں کو ڈالے...... ایک دم کافی زیادہ چڑیاں اور کوے اکٹھے ہو گئے اور ان ٹکڑوں کو یوں کھانے لگے جیسے کب کے بھوکے ہوں۔ انہیں کھاتے دیکھ کر برکتے کی آنکھیں برسنے لگیں، اسے اپنے بچے یاد آنے لگے۔

''نجانے میرے بچوں کو بھی کچھ کھانے کو ملتا ہے یا نہیں...... رانی جب تک جھگی میں رہی...... اسے پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہیں ہوا...... اللہ جانے کہاں بھٹک رہی ہو گی...... بھوکی...... پیاسی...... اور منا...... اس بیچارے کو تو بھوکا، پیاسا ہی مجھ سے چھین لیا گیا۔ معلوم نہیں وہ زندہ بھی ہے یا......؟ سوچ کر اس کا دل لرزنے لگا۔

''یا اللہ! میرے بچوں کی حفاظت کرنا...... وہ اس مجبور بھکارن کے بچے ہیں...... میں تجھ سے ان پر کرم کی بھیک مانگتی ہوں۔ سنا ہے تو کسی

کو خالی ہاتھ نہیں لوٹاتا.....رانی کو بھی حفاظت سے رکھنا اور منے کو بھی.....'' وہ دونوں ہاتھ باندھ کر کھلے آسمان کے نیچے کھڑی ہو کر آنکھیں بند کر کے سسکنے لگی اور آہیں بھرنے لگی۔

☆

تین دن سے بے بی کی طبیعت سخت خراب تھی۔ اسے پانی کا ایک قطرہ تک ہضم نہیں ہو رہا تھا، جو کھاتا پیتا وہ الٹ دیتا۔ بھوک اور پیاس سے اس کے ہونٹوں پر پپڑی سی بن گئی تھی۔ نرگس اسے ہر وقت گود میں لئے بیٹھی رہتی۔ اس کی حالت دیکھ دیکھ کر روتی اور بین کرتی جاتی۔ فردوس کبھی پانی میں نمکول ڈال کر لاتی۔ کبھی حکیم سے لائے ہوئے رنگ برنگے شربت، کبھی گھریلو ٹوٹکے، مگر اس کی حالت سنبھل ہی نہیں رہی تھی۔

''آپا..... کب تک اسے یونہی گود میں لئے بیٹھی رہو گی..... نہ حکیم کی دوا اثر کر رہی ہے اور نہ ہی کچھ اور..... بے بی کی حالت تو دیکھو کیسے بے سدھ پڑا ہے..... چل اسے کسی ہسپتال لے کر چلتے ہیں۔'' فردوس نے تشویش سے کہا۔

''ہاں..... مجھ سے تو اس کی یہ حالت دیکھی نہیں جا رہی..... ہائے میرا بچہ کیسے بے ہوش پڑا ہے..... اسے دیکھ دیکھ کر تو میرا دل کٹ رہا ہے..... کلیجہ منہ کو آ رہا ہے.....'' نرگس نے دوپٹہ اپنے منہ میں ٹھونس کر اونچی آواز میں رونا شروع کر دیا۔

''آپا..... کاہے کو رو رہی ہے، باؤلی نہ ہو تو..... ابھی اپنے چندا کو ڈاکٹر کے پاس لے کر چلتے ہیں تو دیکھنا کیسے ٹھیک ہو جائے گا۔'' فردوس نے اسے تسلی دی۔

نرگس نے بے بی کو اپنے کندھے کے ساتھ لگایا اور قریبی سرکاری ہسپتال میں پہنچ گئیں۔ وہاں پرچی بنوانے کے لئے طویل لائن میں کھڑا ہونا پڑتا تھا۔ بے بی کی حالت بہت بگڑ رہی تھی۔ نرگس بے بی کو لے کر بنچ پر بیٹھ گئی اور فردوس پرچی بنوانے چلی گئی۔

''ارے بھیا..... ہمارے بچے کی طبیعت بڑی خراب ہے..... ہمیں پہلے پرچی بنوا لینے دو۔'' فردوس نے ایک آدمی کی منت کرتے ہوئے کہا جو لائن میں سب سے آگے کھڑا تھا، اس نے فردوس کو سر سے لے کر پاؤں تک مضحکہ خیز انداز میں دیکھا۔

''تمہارا بچہ..... کہاں ہے؟'' اس آدمی نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''وہ..... دیکھو بنچ پر..... آپا..... اسے لئے بیٹھی ہے۔'' فردوس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بتایا۔

''بچہ..... بیچارا بڑا ہی بیمار ہے..... تین دن سے اسے کچھ ہضم ہی نہیں ہو رہا، بڑی مہربانی ہو گی اگر تم اپنی باری دو۔'' فردوس نے التجا کرتے ہوئے کہا۔

''اری چل..... کیسے تجھے اپنی باری دے دوں..... میں کب سے کھڑا ہوں.....'' آدمی نے منہ بنا کر غصے سے کہا۔

''مگر وہ بہت بیمار ہے'' فردوس نے نم آنکھوں سے کہا۔

''یہاں سب بیمار ہی آتے ہیں..... چل جا اس لائن کے پیچھے لگ۔'' اس آدمی نے غصے سے کہا تو وہ بے بسی سے لمبی لائن کو دیکھنے لگی اور نرگس کے پاس چلی گئی۔

"آپا...... یہاں تو لائن بڑی لمبی ہے......" فردوس نے پریشانی سے کہا۔

"اچانک بے بی نے ایک بار پھر قے کر دی۔ سارا فرش گندا ہو گیا۔ ارد گرد کے لوگ غصے سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔

"اے...... ہے...... کتنی بدبو ہے...... یہ کم بخت نجانے کہاں سے آ گئے ہیں......" پاس بیٹھی عورتوں نے بڑبڑاتے ہوئے اپنی اپنی ناکوں پر کپڑے رکھ لئے...... ہر طرف اک شور سا مچنے لگا۔ لوگ ناگواری کا اظہار کرنے لگے...... منہ بنانے لگے...... بڑبڑانے لگے، انہیں گالیاں دینے لگے۔

"ارے Sweeper (خاکروب) کو بلاؤ...... یہاں آ کر صفائی کرے۔" کسی آدمی نے زور سے چلاتے ہوئے کہا...... فردوس اور نرگس اپنی جگہ شرمندہ ہونے لگیں...... بے بی کی حالت اور بگڑنے لگی۔

"چل فردوس اسے کسی اور ڈاکٹر کے پاس لے کر چلتے ہیں، یہاں تو شاید کوئی ہمارا علاج نہیں کرے گا۔" نرگس نے بے بسی سے کہا۔

"اے پہلے یہاں سے یہ گند صاف کرو...... خاکروب کہیں نہیں مل رہا...... پتا نہیں کہاں چلا گیا ہے...... لوگ اس بدبو میں نہیں بیٹھ سکتے۔" ہاسپٹل کی ایک نرس نے دونوں کو ڈانٹتے ہوئے کہا تو فردوس بے بسی سے نرگس کی طرف دیکھنے لگی۔

"فردوس...... اپنے دوپٹے سے ہی یہ جگہ صاف کر دے...... ہماری زندگیوں اور عزتوں سے زیادہ انہیں یہ جگہ پیاری ہے......" نرگس نے روتے ہوئے کہا تو فردوس نے اپنا دوپٹہ اتار کر اس سے جگہ صاف کی...... اسے جگہ صاف کرتے دیکھ کر کتنے مردوں نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا...... اس کی لمبی چٹیا...... تنگ قمیص اور فٹنگ کو للچائی نظروں سے دیکھ کر مذاق اڑانے کی کوشش کی...... فردوس فرش صاف کر کے دوپٹہ واش روم میں دھونے گئی تو خاکروب وہاں کھڑا سگریٹ پی رہا تھا اور کسی ملازمہ سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ فردوس کی طرف اس نے معنی خیز انداز میں دیکھ کر ملازمہ کو آنکھ ماری...... اور...... دونوں مسکرانے لگے...... فردوس دوپٹہ دھوتے ہوئے شدت سے رونے لگی۔

"یا اللہ! تو نے ہمیں کیا بنا کر اس دنیا میں بھیجا ہے...... ہمیں تو کوئی انسان سمجھتا ہی نہیں...... تو نے ہماری اتنی بے عزتی کرانی تھی تو...... کاہے کو ادھر بھیجا...... تجھے کچھ نہیں ہوتا جب تیرے یہ بندے ہمیں ذلیل کرتے ہیں۔" فردوس پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور گیلے دوپٹے کو نچوڑ کر اور اسے پھیلا کر اپنے اوپر لیتے ہوئے باہر آ گئی۔

"آپا...... چل...... بے بی کو کسی پرائیویٹ ڈاکٹر کے پاس لے کر چلتے ہیں......" فردوس نے نرگس سے کہا اور دونوں ہسپتال سے باہر نکل گئیں۔

"فردوس...... کیا ڈاکٹر کی فیس کے لئے ہمارے پاس پیسے ہیں؟" نرگس نے اس سے پوچھا۔

"ہاں...... جی نے رات کو کچھ پیسے دیئے تھے...... وہ میرے پاس ہی ہیں۔" فردوس نے اس سے کہا۔

"کب......؟ جی نے تو کئی دنوں سے کوئی پیسہ نہیں دیا۔" نرگس نے حیرت سے پوچھا۔

"تو فکر نہ کر...... ہیں میرے پاس۔" فردوس نے کہا...... تو...... نرگس نے خاموشی سے اس کی طرف دیکھا۔

"مجھے پرس دکھا......" نرگس نے اس کے ہاتھ سے پرس لیتے ہوئے کہا اور اسے کھول کر دیکھا...... اس میں چند سو سو کے نوٹ تھے اور فردوس کی دو سونے کی انگوٹھیاں تھیں جو اس نے بہت پیسے جوڑ کر بنوائی تھیں اور بہت سنبھال کر رکھی تھیں...... خود اسے کتنی ہی ضرورت کیوں نا پڑ جاتی

کبھی ان انگوٹھیوں کی طرف کسی کو دیکھنے نہ دیتی......اور بے بی کے لئے وہ خود ہی انہیں لے آئی تھی......نرگس نے اس کی طرف محبت بھری نگاہوں سے دیکھا اور اس کے سر اور چہرے پر ہاتھ پھیر کر رونے لگی۔

''شکر ہے...... جو ہم ایک دوسرے کا دکھ درد محسوس کرتے ہیں......'' نرگس نے کہا تو فردوس مسکرا کر اس کی جانب دیکھنے لگی۔فردوس نے جلدی سے رکشہ کرایا اور ایک ڈاکٹر کے کلینک پر لے گئیں۔ڈاکٹر مصروف تھا، انہوں نے ریسپشنسٹ کی بہت منت سماجت کی......ان کے شور کی آواز سن کر ڈاکٹر خود اپنے کمرے سے باہر آیا۔

''کیا بات ہے......شور کیوں ہو رہا ہے؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''ڈاکٹر صاحب...... ہمارا بچہ بہت بیمار ہے......اسے ایک بار دیکھ لیں......اسے تین دنوں سے کچھ ہضم نہیں ہو رہا۔'' نرگس نے التجا کرتے ہوئے کہا۔ڈاکٹر نے ایک ٹک بچے کی طرف دیکھا۔

''ٹھیک ہے پہلے فیس جمع کراؤ......اور...... پھر اندر آ جاؤ'' ڈاکٹر نے کہا۔انہوں نے خوش خوش فیس جمع کرائی اور ڈاکٹر کے کمرے میں چلی گئیں۔ڈاکٹر نے بے بی کا اچھی طرح چیک اپ کیا۔

''اس کے جسم کا پانی ختم ہو گیا ہے......حالت بہت نازک ہے۔'' ڈاکٹر نے قدرے مایوسی سے کہا تو دونوں گھبرا گئیں۔

''ڈاکٹر صاحب...... خدا کے لئے کچھ کریں...... ہمارے بے بی کو بچا لیں......اسے کچھ ہو گیا تو ہم مر جائیں گی......'' دونوں نے روتے ہوئے کہا۔

''میں کوشش کرتا ہوں۔'' ڈاکٹر نے کہا اور بچے کو ایڈمٹ کر کے اسے انجکشنز اور ڈرپ لگائی۔

''اگر......ڈرپ ختم ہونے تک یہ کوئی قے نہیں کرتا تو یہ بہتر ہو جائے گا......آپ دعا کریں۔'' ڈاکٹر نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

دونوں گڑگڑا کر اور رو رو کر خدا سے دعائیں کرنے لگیں۔ان کی ایک نظر ڈرپ کے قطروں پر تھی اور ایک بے بی کے چہرے پر...... بے بی نے تھوڑی دیر کے بعد آنکھیں کھولنے کی کوشش کی، مگر نقاہت کے باعث کھول نہ سکا۔آہستہ آواز میں بڑبڑانے لگا۔

''اماں......'' وہ آہستہ سے بولا۔

دونوں نے نم آنکھوں کے ساتھ خوش ہو کر بے بی کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

''اماں صدقے...... اماں قربان اپنی جان پر......میرے چندا جلدی سے ٹھیک ہو جا......اماں ...... تیرے ٹھیک ہونے پر بچوں میں نیاز بانٹے گی......درگاہ کے دیوں میں تیل ڈالے گی......درگاہ پر چادر چڑھائے گی......بس تو ٹھیک ہو جا......آنکھیں کھول......'' نرگس نے والہانہ انداز میں اسے چومتے ہوئے کہا۔

بے بی نے پھر آنکھیں کھولنے کی کوشش کی......

''اماں......آپا......'' وہ پھر بڑبڑایا۔

''ہائے...... میں...... واری جاؤں...... اپنے بے بی پر......آپا کو اتنے پیار سے بلانے والے......ارے تجھ پر تو آپا ساری کی ساری قربان......تجھ پر یہ دنیا نہ واردوں۔اک بار شہزادی ٹھیک تو ہو جا......پھر دیکھنا ہم کیا کیا کرتی ہیں۔'' فردوس نے بھی محبت سے کہا۔

''لگتا ہے آپا...... بے بی ٹھیک ہو رہا ہے میں ڈاکٹر کو بلا کر لاتی ہوں۔'' فردوس نے خوشی سے کہا اور وارڈ سے باہر نکل گئی۔

بے بی نے نرگس کی طرف دیکھا اور پھر ایک قے کی......ڈرپ اس کے ہلنے سے جھولنے لگی......اس کے سارے کپڑے لت پت ہو گئے۔بستر بھی خراب ہو گیا، قے کرنے کے بعد وہ ایکدم نڈھال ہو گیا اور پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ڈرپ رک گئی......نرگس نے اسے بے سدھ پڑے دیکھا تو اس کی سانس چیک کرنے کی کوشش کی۔رکی ڈرپ کی طرف دیکھا تو پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھتی رہ گئی......اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

فردوس ڈاکٹر کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی......ڈاکٹر نے جلدی سے بے بی کی نبض چیک کی۔وہ اسے تھوڑی دیر چیک کرتا رہا۔ فردوس اور نرگس رکی سانسوں سے اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

''سوری......بہت کوشش کے باوجود بھی میں اسے بچا نہیں سکا۔'' ڈاکٹر نے قدرے مایوسی سے کہا۔

''کیا......ہمارا بے بی مر گیا ہے؟'' فردوس نے حیرت سے پوچھا تو ڈاکٹر نے گہری سانس لی اور وہاں سے چلا گیا۔

''چل آپا......چلیں۔'' فردوس نے روتے ہوئے نرگس کی طرف دیکھا۔

''نہیں فردوس......میں......میں ایسے نہیں جاؤں گی......میں اپنے بے بی کو زندہ یہاں لائی تھی......مرے ہوئے کو کیسے لے جاؤں؟'' خدا کے لئے مجھ سے یہ مت کہنا......کہ بے بی مر گیا ہے ورنہ میں بھی اس کے ساتھ مر جاؤں گی۔'' نرگس پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

فردوس نے آگے بڑھ کر اس کو اپنے گلے لگا لیا۔

''آپا......ہم بے بس انسان کیا کر سکتے ہیں......جو رب کی مرضی۔'' فردوس نے کہا۔

''رب کی مرضی......رب کیوں ہمارے ساتھ ایسا کرتا ہے......ہر بار ہر بار ایک خوشی دے کر دو گنا غم دے دیتا ہے......فردوس ہم نے کیا گناہ کیا ہے......کیوں وہ ہمارے ساتھ ایسا کرتا ہے......کیوں کرتا ہے......؟'' نرگس پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور سسکیاں بھرنے لگی۔''آپا......ہمت کر......'' فردوس نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''کہاں سے لاؤں ہمت......میری ساری ہمت......میری خوشیاں میرا حوصلہ تو میرا بچہ لے گیا......ہائے کہاں سے ڈھونڈ کر لاؤں......ہائے فردوس......اسے مرا ہوا دیکھنے سے پہلے میں ہی کیوں نہ مر گئی......ربا......تو......میری جان لے لیتا......مگر میرے بچے کو تو زندہ رکھتا......اس کے تو ابھی کھیلنے کے دن بھی پورے نہیں ہوئے تھے......ابھی تو اس نے پڑھنا شروع کیا تھا......اس نے تو بہت بڑا افسر بننا تھا......اس نے تو ہمارے جنازوں کو کندھا دینا تھا۔ہم اس کے جنازے کو کندھا نہیں دے سکتیں۔فردوس مجھ سے یہ سب کچھ نہیں ہوگا۔میرا بے بی مر نہیں سکتا......'' نرگس بدحواسی میں چلاتی ہوئی وہاں سے باہر نکل گئی اور فردوس اسے دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔بڑی مشکل سے اس نے بے بی کے مردہ جسم کو چادر

میں لپیٹ کر اٹھایا.....اپنے کندھے کے ساتھ اسے لگاتے ہوئے وہ بری طرح بلکنے لگی۔ چار سالوں کی محبت ایکدم ختم ہوگئی تھی۔ اس کا سارا وجود بری طرح لرز رہا تھا.....اور اس کا دل جیسے اس کے قابو میں ہی نہیں تھا..... رشتے کتنے انمول ہوتے ہیں..... چاہے خون کے ہوں یا محبت کے..... ان کے ٹوٹنے پر دل تڑپتا ہے اور روح مضطرب ہو جاتی ہے..... آنکھیں برستی ہیں اور حوصلہ جواب دینے لگتا ہے۔

وہ بچے کو لے کر کلینک سے باہر نکلنے لگی.....تو اسسٹنٹ نے اسے آواز دی۔

''اے.....بل تو ادا کر کے جاؤ''

فردوس نے مڑ کر دیکھا.....آہ بھری اور اپنا پرس اس کے سامنے رکھ دیا، پرس میں انگوٹھیاں اور پیسے تھے۔ وہ پرس ٹٹولنے لگا.....اسسٹنٹ نے پرس ٹیبل پر الٹ دیا.....اچانک ڈاکٹر باہر نکلا.....اور اسسٹنٹ کو دیکھا.....پھر روتی ہوئی فردوس کو.....

''انہیں جانے دو.....'' ڈاکٹر نے کہا تو اسسٹنٹ نے سب کچھ پرس میں واپس رکھ دیا، مگر چپکے سے ایک انگوٹھی اپنی جیب میں ڈال لی۔

فردوس نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا اور باہر نکل گئی.....نرگس کلینک کی سیڑھیوں پر بیٹھی بری طرح رو رہی تھی۔ فردوس کو دیکھ کر اٹھی اور بے بی کو اس سے چھین کر اپنے ساتھ لگا لیا۔

''فردوس یہ بولتا کیوں نہیں..... یہ مت کہنا کہ میرا بچہ مر گیا ہے.....'' نرگس نے پھر کہا تو فردوس خاموش ہوگئی۔ نرگس اسے ہلاتی رہی اسے اپنے کندھے کے ساتھ لگایا تو اس کی گردن ایک طرف لٹک گئی.....نرگس نے زور سے چیخ ماری ''فردوس میرا بے بی مر گیا ہے.....'' اس نے چیخ مار کر کہا اور بے ہوش ہو کر سڑک پر گر گئی۔ فردوس گھبرا گئی لوگ اکٹھے ہونے لگے.....اس نے جلدی سے رکشہ کرایا اور ان کو اس میں ڈال کر روتی ہوئی گھر آ گئی.....

دو بوندیں ساون کی

دو بوندیں ساون کی، ترجمہ ہے جیفری آرچر کے شہرہ آفاق ناول کین اینڈ ایبل کا جسے اُردو زبان میں ترجمہ کیا ہے علیم الحق حقی نے۔ دو بوندیں ساون کی کہانی ہے دو ایسے افراد کی جو ایک دوسرے سے شدید نفرت کرتے تھے اور ایک دوسرے کو شکست دینے اور تباہ و برباد کرنے کے درپے تھے۔ ان میں سے ایک منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوا اور دوسرا در بدر کی ٹھوکریں کھاتا رہا۔ ایک شخص نے دُنیا کے بہترین تعلیمی اداروں سے تعلیم پائی اور دوسرے کا استاد زمانہ تھا۔

یہ ناول کتاب گھر کے **معاشرتی اصلاحی ناول** سیکشن میں پڑھا جا سکتا ہے۔

(۸)

دل دریا سمندروں ڈونگے کون دلاں دیاں جانے ہو
وچے بیڑے، وچے جھیڑے وچے ونج مہائے ہو
چوداں طبق، دلے دے اندر طنبو وانگوں تانے ہو
جو دل محرم ہووے باہو سو یو رب پچھانے ہو

سائیں مٹھا گنگناتا ہوا سڑک پر جا رہا تھا۔ ماسٹر باسط علی سکول سے واپس آ رہے تھے۔ رک کر ایک ٹک سائیں کی جانب دیکھا اور گہری سانس لی۔

''من کے اندر لگی آگ یونہی نہیں بجھتی...... بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں...... اس ویرانے میں مارے مارے پھرنے سے کچھ نہیں ملے گا...... جا...... چلا جا...... اس کے پاس...... جا...... جاتا...... کیوں نہیں......؟'' سائیں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے جانے کو کہا۔

'' کیسے چلا جاؤں......؟ وہ بہت آہستہ آواز میں بڑبڑایا۔

''جیسے یہاں چلا آیا...... جا...... چلا...... جا...... جا...... جا'' سائیں بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔

اور ماسٹر باسط علی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

☆

شاہ زیب...... باسط علی پر بہت اعتماد کرنے لگا تھا۔ اسے بھائیوں کی طرح چاہتا تھا۔ وہ خود زیادہ تعلیم یافتہ نہیں تھا، مگر علم والوں کی بہت قدر کرتا تھا اور باسط علی اسے اپنے سے بہت بہتر اور مرتبے والا انسان محسوس ہوتا تھا۔ شاہ زیب کے والدین بھی باسط علی کو اپنی اولاد کی طرح چاہنے لگے تھے۔ بہت جلد وہ ان کے گھر کا فرد بن گیا تھا۔ کبھی کبھی باسط علی کو اندر ہی اندر کوئی چیز بہت تکلیف دیتی...... اس کو اپنے دل کے اندر آرے سے چلتے ہوئے محسوس ہوتے کہ شاہ زیب جیسا اچھا انسان...... جو اس پر اندھا دھند اعتبار کر رہا تھا...... کس طرح اسی کے ہاتھوں دھوکہ کھا رہا تھا...... اسے اپنا آپ ایک زہریلے ناگ کی طرح محسوس ہوتا، جس کو دودھ پلا پلا کر توانا کیا جاتا ہے اور توانا ہو کر وہ ڈنگ مارنے سے باز نہیں آتا۔ کبھی اسے اپنا آپ مکار لومڑی جیسا محسوس ہوتا جو شیر کی کچھار میں اس کا شکار چھیننے کے لئے گھستی ہے اور کبھی اس گدھ جیسا جو دوسروں کے مارے ہوئے شکار پر اپنی بدنظر رکھتا ہے۔ وہ...... شاہ زیب کے ہاں آ کر اندر سے خوش نہیں تھا۔ شاہ زیب کو نازی دھوکہ دے رہی تھی اور وہ باسط علی کی وجہ سے اسے دھوکہ

دے رہی تھی۔ شاہ زیب کے ساتھ نازی کتنی بڑی زیادتی کر رہی تھی اور اس شخص نے اف بھی نہ کی تھی۔ کسی سے کوئی شکوہ بھی نہیں کیا تھا۔ وہ کسی سے تذکرہ کر کے نازی کا بھرم نہیں توڑنا چاہتا تھا۔ وہ نازی کو اپنی عزت سمجھتا تھا اور نازی اس کی عزت کو تار تار کرنے پر تلی تھی...... وہ خاموش تماشائی بنا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

باسط علی کے ساتھ شاہ زیب کی دوستی اور قربت بہت بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کے بہت قریب آنے پر باسط علی کو اکثر محسوس ہونے لگا تھا کہ اکثر باتیں کرتے ہوئے شاہ زیب کہیں کھو جاتا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گوشے نم ہونے لگتے تھے اور اس کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگتے تھے۔ ان لمحوں میں باسط علی اپنے آپ کو اس کا مجرم سمجھنے لگتا تھا

شاہ زیب...... باسط علی کو اپنی زمینیں دکھانے لے گیا، اس بار فصل بہت اچھی ہوئی تھی، مزارعے بھی بہت خوش تھے، وہ ڈیرے پر پہنچا تو سب مزارعے اکٹھے ہو گئے اور اسے مبارکباد دینے لگے۔

''سرکار...... لگتا ہے آپ کی گھر والی بڑے نصیب والی عورت ہے، آپ کے گھر میں قدم کیا رکھا ہے کہ...... آپ کی زمین سونا اگلنے لگی ہے۔'' ایک بوڑھے مزارعے نے خوش ہو کر کہا تو شاہ زیب نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

''بابا...... یہ تو اللہ جانتا ہے کہ کس کے آنے سے...... کس کا نصیب کھلتا ہے...... اور کس کا بند ہوتا ہے۔'' شاہ زیب نے آہ بھر کر کہا تو باسط علی اس کی بات سن کر چونک گیا۔

''مبارک تو مجھے تم لوگوں کو دینی چاہئے...... جن کی محنت رنگ لائی ہے۔'' شاہ زیب نے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔

''سرکار...... محنت تو ہم ہر سال ہی کرتے ہیں...... مگر جب پھل، محنت سے زیادہ ملے تو پھر انسان کسی انہونی اور نئی بات کے بارے میں سوچنے لگتا ہے...... اور اس برس...... نئی بات تو آپ کی شادی ہی ہے۔'' مزارعے نے مسکرا کر جواب دیا۔

''ٹھیک ہے...... بابا...... اگر تم ایسا سمجھ رہے ہو...... تو یہ سچ ہی ہوگا، مگر میں اس بار تم لوگوں کو بہت خوش کروں گا۔'' شاہ زیب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''سرکار ہم تو پہلے ہی آپ سے بہت خوش ہیں۔ آپ سے ہمیں کبھی بھی کوئی شکایت نہیں رہی...... آپ نے کبھی ہمارا حق نہیں مارا...... ہمارا...... اور ہمارے بچوں کا اتنا خیال رکھتے ہیں کہ شاید ہی کوئی اور زمیندار اپنے مزارعوں کا یوں خیال رکھتا ہو...... مولا نے آپ کو سچے موتی جیسا پاک دل دیا ہے...... اور وہ لوگ بڑے نصیب والے ہوتے ہیں، جن کو مولا ایسا دل دیتا ہے...... مولا آپ کو لمبی حیاتی دے...... اور بہت ساری نعمتیں اور خوشیاں دے۔'' بوڑھے مزارعے نے خوش ہو کر اسے ڈھیروں دعائیں دیں۔ شاہ زیب مسکرانے لگا اور باسط علی کے اندر بہت کچھ ٹوٹنے لگا۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے ایک ایک لفظ اسے سنایا جا رہا ہو...... اور اس لفظ میں چھپے نشتر اس کے دل کو لہولہان کر رہے ہوں۔

''یہ لوگ عجیب ہی باتیں کرتے ہیں...... انہیں کیا معلوم...... کہ......؟'' شاہ زیب کچھ کہتے ہوا رک گیا اور معنی خیز انداز میں باسط علی کی جانب دیکھنے لگا۔

''نجانے کیوں...... تم پر اعتبار کرنے کو دل چاہتا ہے...... یوں لگتا ہے...... جیسے تم میرے دل کے بہت قریب ہو...... یار سمجھ میں نہیں آتا...... مجھے تم سے اتنی محبت کیوں ہوگئی ہے...... شاید تم بہت اچھے انسان ہو...... اس لئے......'' شاہ زیب نے مسکرا کر کہا تو باسط علی ہڑبڑا گیا، اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے شاہ زیب نے سرعام اس کی چوری پکڑ کر اسے طمانچہ مارا ہو...... اور وہ اس طمانچے سے گھبرا گیا ہو۔ اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔

''کیا وہ بھی اس کے لئے اتنے اچھے جذبات رکھتا ہے...... کیا واقعی شاہ زیب اس کے بارے میں دھوکہ کھا رہا ہے......؟'' وہ گنگ سا اس کا منہ دیکھنے لگا۔

''تمہاری بھابھی نے میرے گھر میں رہنے کے باوجود مجھے قبول نہیں کیا...... بھلا وہ میرے لئے کس طرح خوش نصیب ہوسکتی ہے......'' شاہ زیب نے آہ بھر کر کہا تو باسط علی حیرت سے اس کی جانب دیکھنے لگا، جس نے کبھی اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں ایک لفظ کسی سے نہیں کہا تھا۔ اپنی اتنی بڑی بات اس نے اسے کہہ دی تھی۔

''کیوں......؟'' نادانستہ باسط علی کے منہ سے نکلا

''جب دل میں کوئی اور ہو...... تو سامنے والا کہاں نظر آتا ہے......'' شاہ زیب نے آہ بھر کر نم آنکھوں سے جواب دیا۔

''کیا آپ اسے جانتے ہیں...... کہ وہ کون ہے؟ باسط علی نے متجسس لہجے میں پوچھا۔

''میں اسے جان کر کیا کروں گا...... جو موجود نہ ہو کر بھی ہر وقت مجھے اپنے ہونے کا احساس دلائے...... اس کے بارے میں...... میں اور کیا جانوں گا......؟ شاہ زیب نے سنجیدگی سے کہا تو باسط علی اس کی بات سن کر چونک گیا۔ وہ عام سا، سیدھا، سادہ انسان تھا مگر اس کی بات میں کتنی گہرائی تھی، وہ حیرت سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔

''کیا آپ کو غصہ نہیں آتا......؟'' باسط علی نے پوچھا۔

''کس پر......؟ شاہ زیب نے پوچھا۔

''اس شخص پر...... جو...... آپ کے اور آپ کی بیوی کے درمیان ایک دیوار بن کر کھڑا ہے۔'' باسط علی نے پوچھا۔

''نہیں......'' شاہ زیب نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''کیوں......؟''

''معلوم نہیں...... شاید اس لئے بھی نہیں کہ وہ مجھ سے پہلے نازی کی زندگی میں آیا ہے...... اس میں اس کا کیا قصور ہے۔'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

''اور اگر...... آپ کے بعد ان کی زندگی میں آتا...... پھر بھی آپ غصہ نہ کرتے؟ باسط علی نے حیرت سے پوچھا۔

''معلوم نہیں...... تب میں کیا کرتا...... شاید...... تب بھی کچھ نہ کرتا۔'' شاہ زیب نے کہا۔

''آپ کا دل کتنا بڑا ہے......اور آپ کا ظرف اس سے بھی بڑا'' باسط علی نے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں......اور......شاید اسی لئے......ایسے لوگوں کے لئے آزمائش بھی بڑی ہوئی ہیں......قدرت انہیں دوسرے لوگوں سے زیادہ آزماتی بھی ہے اور نوازتی بھی ہے۔'' شاہ زیب نے جواب دیا اور کھلے آسمان کی جانب دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں کے گوشے مزید نم ہونے لگے۔

باسط علی کو وہ آسمان پر چمکتا ہوا اک درخشاں ستارہ دکھائی دینے لگا وہ اس کے سامنے ذرہ خاک تھا......ہوا میں اڑتا پھرتا......قدموں تلے روندے جانے کے قابل......بہت معمولی اور حقیر ذرہ۔ اس کا دل پھر نا آشنا بوجھ تلے آنے لگا۔ اندر شدید اضطراب جنم لینے لگا۔

وہ شاہ زیب کے سامنے بیٹھ کر اس کے ساتھ دھوکہ کر رہا ہے، اس کے اعتبار کو کرچی کرچی کر رہا ہے اور وہ شخص اس پر آنکھیں بند کر کے بھروسہ کر رہا ہے......باسط علی تم بہت بڑے گنہگار ہو......تم یہاں اپنی محبت پانے آئے تھے اور اپنا سب کچھ لٹا رہے ہو......جو شخص کسی کے اعتبار کے قابل نہ رہے......اور......جس تھالی میں کھائے......اس میں چھید کرے۔ وہ کیا محبت کر پائے گا......اور وہ کیسی محبت حاصل کر سکے گا......کیا وہ اس قابل تھا کہ اس کو اس کی محبت مل جائے......قدرت کا انمول تحفہ......ایسے کم ظرف انسانوں کو کیسے مل سکتا ہے......اسی لئے وہ یہاں آ کر اس محبت سے بیگانہ ہو رہا تھا، جس کی جستجو میں وہ اتنا لمبا سفر طے کر کے آیا تھا......اپنا سب کچھ چھوڑ کر آیا تھا، بہت کچھ پانے کے چکروں میں رفتہ رفتہ اپنا سب کچھ کھو رہا تھا۔ وہ بہت مضطرب اور دکھی ہونے لگا۔

شاہ زیب کسی کام سے گاؤں سے باہر گیا تھا، باسط علی اپنے کمرے میں چارپائی پر لیٹا تھا، وہ اپنی ہی سوچوں میں بہت مضطرب ہو رہا تھا۔ رات گہری ہو رہی تھی اور اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ پہلے وہ جب بھی تنہا ہوتا تو اسے نازی شدت سے یاد آنے لگتی۔ وہ اس کے دیدار اور قربت کے لئے بے قرار ہونے لگتا اور اب اسے نجانے کیا ہو گیا تھا کہ نازی اسے دور سے ہی دیکھتی تو وہ راستہ بدل لیتا۔ نازی کی قربت اب اسے وہ لطف اور سکون نہ دیتی جو وہ پہلے محسوس کرتا تھا، وہ اس سے فرار چاہتا تھا، اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے......؟ وہ شاہ زیب کو دیکھتا تو مضطرب ہو جاتا اور نازی کو دیکھتا تو پریشان......اور اپنے آپ کو دیکھتا تو بے بس ہو جاتا۔

دروازہ کھلا اور نازی مسکراتی ہوئی اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

''اس......اس وقت؟'' وہ دروازے کی جانب گھبرا کر بولا۔

''ہاں......جب موقع ملتا تھا۔ تب ہی آنا تھا نا......اور تم نہیں جانتے......میں سارا دن......کس کس طرح تم سے ملنے اور دیکھنے کے بہانے ڈھونڈتی رہتی ہوں......باسط علی اب مجھ سے مزید انتظار نہیں ہو رہا......میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی......کچھ کرو......اور مجھے یہاں سے لے چلو'' وہ اس کے قریب بیٹھ کر بولی۔

''نازی......یہاں سے اٹھ جاؤ......اگر کسی نے دیکھ لیا تو بہت برا ہو گا......تمہاری عزت خاک میں مل جائے گی۔'' باسط علی جلدی سے کھڑا ہو کر بولا۔

''کوئی نہیں آئے گا......شاہ زیب دوسرے گاؤں گیا ہے، کل آئے گا۔'' نازی اس کے ساتھ چمٹتے ہوئے بولی۔

''نازی...... یوں مت کرو...... یہ ٹھیک نہیں...... مجھے خدا سے ڈر لگتا ہے...... کہ......'' باسط علی اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے بولا۔

''اور مجھے خدا سے کوئی ڈر نہیں لگتا اور ڈر لگے بھی کیوں......؟ ڈر تو اس سے لگنا چاہئے جو کسی کے لئے کچھ کر سکے۔ جسے نہ ہماری خوشیوں کی پروا ہے اور نہ دکھوں کی...... جو نہ تو ہماری دعائیں سنتا ہے اور نہ ہمارا رونا...... سسکنا...... وہ ہم سے لاتعلق رہتا ہے تو پھر ہم کیوں اس سے ڈریں یا خوف کھائیں...... ہمیں بھی اس سے کوئی سروکار نہیں......'' نازی نے اس قدر بے باکی سے کہا تو باسط علی حیرت اور خوف سے اسے دیکھنے لگا۔ اسے قطعی یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی نازی ہے جو رات رات بھر خدا کے حضور جھکی رہتی تھی۔ درگاہوں پر نیازیں بانٹتی تھی، ذوق وشوق سے خدا کی عبادت کرتی تھی اور اب کیسے کافروں جیسی باتیں کر رہی تھی۔

''نازی...... تمہیں کیا ہو گیا ہے...... تم تو خدا سے بہت محبت کرتی تھی۔'' باسط علی نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں...... میں اس سے محبت نہیں...... بس اس کی عبادت کرتی تھی، محبت تو صرف میں تم سے کرتی ہوں۔'' نازی نے اکڑ کر جواب دیا۔

''یہ...... تم...... کیسی باتیں کر رہی ہو؟ تم اس قدر بدل گئی ہو مجھے یقین نہیں آ رہا، باسط علی نے حیرت سے پوچھا۔

''میں بالکل بھی نہیں بدلی...... میں نے تو تمہاری محبت حاصل کرنے کے لئے خدا کی عبادت شروع کی تھی...... جب تم نہیں ملے تو میں نے اس کی عبادت چھوڑ دی۔ اب مجھے اس کی کسی بات کی پروا نہیں...... میں وہی کروں گی، جو میرا دل چاہے گا...... اور تم مجھے اس سے ڈرنے کی باتیں مت سناؤ...... مجھے کسی سے ڈر نہیں لگتا، اگر ڈر لگتا ہے تو صرف اس بات سے کہ تم مجھے چھوڑ کر چلے نہ جاؤ۔'' وہ معنی خیز انداز میں مسکرا کر بولی۔

''نازی...... مجھے تمہاری ان بڑی بڑی باتوں سے ڈر لگ رہا ہے......'' باسط علی نے اس کی جانب بغور دیکھتے کہا۔

''میں تو ہمیشہ سے ہی ایسی باتیں کرنے کی عادی ہوں...... لگتا ہے تم نے میری باتوں کو اب توجہ سے سننا شروع کیا ہے۔'' نازی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ہاں...... مجھے بھی یہی لگ رہا ہے۔'' وہ قدرے مایوسی سے بولا۔

''چھوڑو...... ان باتوں کو...... اور اب یہاں سے نکلنے کا منصوبہ بناؤ...... ہم دونوں یہاں سے دور چلے جائیں گے اور اپنی محبت کی دنیا بسائیں گے اس دنیا میں صرف میں ہوں گی اور...... تم...... تیسرا کوئی نہیں، نازی پھر اس کے سینے سے لگتے ہوئے بولی۔

''ایسا مت کرو...... یہ ٹھیک نہیں...... شاہ زیب۔'' وہ زیر لب بڑبڑایا اور اس سے پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

''باسط علی...... مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ تم بدل گئے ہو...... تم وہ...... والے باسط علی نہیں لگ رہے، جس سے میں نے محبت کی ہے...... تم بہت ڈرپوک اور بزدل ہو گئے ہو، تمہیں کیا ہو گیا ہے...... تم ایسے تو نہیں تھے۔'' نازی نے قدرے خفگی سے کہا۔

معلوم نہیں...... لیکن مجھے بھی یوں محسوس ہو رہا ہے، جیسے میں بہت بدل گیا ہوں۔ میرے اندر کوئی بھونچال آنے والا ہے۔ نازی میرے دل پر ایک عجیب سا بوجھ اور خوف طاری رہتا ہے۔ پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔ بس دل چاہتا ہے کہ یہاں سے چلا جاؤں...... سب کچھ چھوڑ کر۔'' باسط علی نم آنکھوں سے بولا۔

''مجھے بھی......؟'' نازی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......'' اس نے آہ بھر کر جواب دیا۔

نازی نے غصے سے اس کی جانب دیکھا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆

ماسٹر باسط علی صبح سویرے چائے پینے کھوکھے میں چلے گئے تھے۔ آج موسم قدرے سرد تھا۔ اس لئے اکا دکا لوگ ہی کھوکھے میں بیٹھے تھے۔ آج ملازم بھی نہیں آئے تھے۔ کھوکھے کے مالک نے ماسٹر صاحب کے لئے خود چائے بنائی، الماری میں سے ولایتی چینی کا کپ نکالا اور اس میں چائے ڈال کر ان کے آگے رکھی، ماسٹر باسط علی بہت خاموش تھے اور چہرے سے بہت افسردہ اور رنجیدہ لگ رہے تھے۔

''کیا بات ہے...... ماسٹر صاحب...... طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' شیرے نے پوچھا۔

''بس...... یونہی......'' ماسٹر باسط علی نے بے دلی سے جواب دیا۔ کچھ تو بات ہے ورنہ آپ یوں پریشان دکھائی نہیں دیتے۔'' شیرے نے پھر پوچھا۔

اس سے قبل کہ ماسٹر باسط علی کوئی جواب دیتے سائیں مٹھا چھن چھن کرتا اندر داخل ہوا۔

''بسم اللہ...... سائیں جی...... آج کیسے یہاں صبح سویرے آ گئے...... چائے لاؤں۔'' شیرے نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''ارے...... ہمیں چائے...... پانی سے کیا کام......؟ فقیروں کو تو بس اللہ اور اس کے بندوں سے غرض ہوتی ہے۔ کیوں...... ماسٹر......؟ سائیں مٹھا نے معنی خیز انداز میں ماسٹر باسط علی سے پوچھا تو وہ چائے پیتے ہوئے بڑبڑا گئے۔

''ہاں...... ہاں......'' ماسٹر باسط علی نے چونک کر دیکھا اور خاموش ہو گئے۔

''سائیں جی...... آج ماسٹر صاحب بہت خاموش ہیں، چہرے سے بھی اداس لگ رہے ہیں۔ آپ ہی ان سے پوچھیں...... کیوں پریشان ہیں...... میں آپ کے لئے بھی چائے لاتا ہوں۔'' شیرے نے کہا اور جا کر چائے بنانے لگا۔ سائیں نے قہقہہ لگا کر ماسٹر باسط علی کی جانب دیکھا۔

''یہ بھی جھلا ہے...... مجھے کہتا ہے...... تجھ سے پوچھوں کہ تو اداس کیوں ہے؟ کیا میں نہ تجھے بتاؤں کہ تو اداس کیوں ہے؟ اور آج ساری رات نہیں سویا تو سو بھی کیسے سکتا ہے...... جو کچھ تو نے کیا ہے...... کیا وہ تجھے سونے دے گا...... تجھے تو اک پل بھی چین نہیں آئے گا...... یہ دل اپنے ٹوٹنے پر تو دکھی ہوتا ہی ہے مگر بندہ جب کسی کا دل توڑتا ہے تو پھر اس کے اندر ایسی آگ بھڑکتی ہے جو چین نہیں لینے دیتی۔ کیوں ماسٹر؟''

مسجد ڈھا دے، مندر ڈھا دے

ڈھا دے، جو کچھ ڈھیندا ای

دل نہ کسی دا ڈھاویں

دلاں وچ رب رہیندا ای

تو نے تو اس نمانے کا دل ڈھایا ہے.....اور پناہ لینے یہاں آ گیا..... تیرے لئے اب کہیں ٹھکانہ نہیں، چاہے تو سیڑھی لگا کر آسمان پر چڑھ جائے۔ جا.....ایک بار.....اس سے جا کر مل.....جاتا کیوں نہیں..... یہاں رہ کر وقت ضائع کر رہا ہے۔'' سائیں خفگی سے بولا اور اسے گھورنے لگا۔

''کس منہ سے جاؤں.....اور اسے جا کر کیا کہوں؟'' ماسٹر باسط علی نے آہ بھر کر آہستہ آواز میں کہا۔

''اور اس ڈر سے تو اس کے پاس ہی نہیں جائے گا..... بڑا ہی بے وقوف ہے.....'' سائیں نے غصے میں کہا۔

ماسٹر باسط علی نے سرد آہ بھری اور نم آنکھوں کے ساتھ سائیں کی جانب دیکھا۔

''اور یہاں رہ کر تو گیلی لکڑی کی طرح سلگ رہا ہے۔ اس کا کیا فائدہ ہے؟ کرما نوالے بڑے اونچے بندے ہوتے ہیں۔ مولا نے ان کو بڑے سوہنے دل دیئے ہوتے ہیں اور ان سوہنے دلوں میں بڑی سچی اور میٹھی سوچیں ہوتی ہیں۔ وہ بھی ایسا ہے..... تو..... گھبراتا کس بات سے ہے؟ سائیں نے حیرت سے پوچھا۔

''اونچے ظرف والوں کی اعلیٰ ظرفی سے۔'' ماسٹر باسط علی نے مغموم لہجے میں جواب دیا۔

''سائیں مٹھا نے معنی خیز انداز میں اس کی جانب دیکھا اور خاموش ہو گیا۔ شیرا چائے کا کپ لے کر آ گیا.....اور سائیں کے سامنے ٹیبل پر رکھ دیا۔ سائیں نے چائے کی جانب دیکھا اور ''حق اللہ'' کا نعرہ بلند کرتے ہوئے کھوکھے سے باہر نکل گیا۔ شیرا چائے کا کپ اٹھا کر باہر لے گیا۔

نازی کی ناراضگی نے باسط علی کو عجیب سی الجھن میں پریشانی میں ڈال دیا تھا۔ نازی کئی روز سے اس کے سامنے نہیں آئی تھی اور گھر میں چلتی پھرتی بھی دکھائی نہ دی تھی۔ ایک روز شاہ زیب کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ نازی کی طبیعت خراب ہے۔ اسے بیہوشی کے دورے پڑ رہے ہیں، بخار بھی آ رہا ہے اور اس کی بیماری کی وجہ سے شاہ زیب اور اس کے گھر والے بے حد پریشان تھے۔ شاہ زیب شہر سے ڈاکٹروں کو بلا رہا تھا اور ایک دوبارہ خود نازی کو بھی شہر لے کر گیا تھا، مگر نازی کی طبیعت سنبھل نہیں پا رہی تھی اور اس بات نے باسط علی کو اندر ہی اندر بے حد پریشان کر رکھا تھا۔ وہ اس کی بیماری کی وجہ جانتا تھا۔ نازی کو بیہوشی نہیں بلکہ ڈپریشن کے دورے کیوں پڑ رہے تھے۔ وہ نازی کی خاطر یہاں آیا تھا اور نازی اس کی وجہ سے بیمار پڑ گئی تھی۔ اس نے نازی کو کیا دیا تھا ڈپریشن، بیماری اور مایوسی۔ اس نے اس کے لئے کتنی بڑی قربانی دی تھی۔ اس کی محبت کی خاطر اس نے اپنے شوہر کو اپنے قریب نہیں آنے دیا تھا اور اس نے اس کے احساسات اور جذبات کی ذرا بھر بھی پروا نہیں کی تھی۔ وہ تو اس کی خاطر سنیاس لینے کو بھی تیار تھی۔ کنوئیں میں کودنے کی باتیں کرتی تھی، زہر کھانے کے منصوبے بناتی تھی اور اس نے اس کی محبت کی کیا قدر کی تھی۔ اس قدر جذباتی اور حد سے گزر جانے والی لڑکی کے جذبات کو جب یوں ٹھیس لگے تو اس کا دل یونہی کرچی کرچی ہو جاتا ہے۔ نازی کا ردعمل قدرتی تھا۔ نازی بے حد مضطرب ہو گئی تھی۔ باسط علی کی باتوں سے اس کا دل بہت بری طرح ٹوٹا تھا۔ اس کی سوچیں منتشر ہو گئی تھیں اور اس کے آنسو نہ تھمتے تھے۔ زیتون بانو اس سے اس کے آنسوؤں کی وجہ پوچھتی، مگر اس کے پاس بتلانے کو کچھ نہ تھا۔ انہوں نے شاہ زیب سے بھی وجہ جاننے کی کوشش کی تو وہ خاموش ہو گیا۔

''معلوم نہیں.....اماں جی.....اسے میری کونسی بات بری لگی ہے، ہو سکتا ہے۔ میں نے انجانے میں کوئی ایسی بات کہہ دی ہو، جس سے اس کا دل دکھی ہو گیا ہو.....میں اس سے پوچھ کر اسے منانے کی کوشش کرتا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔'' شاہ زیب نے ماں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

''ہاں...... بیٹا...... انجانے میں انسان سے بہت کچھ ہو جاتا ہے تو اس کو منا لے...... تو بہتر ہے...... وہ گھر میں ہنستی، مسکراتی، چلتی پھرتی اچھی لگتی ہے۔ جب سے بستر سے لگی ہے گھر کی رونق ہی ختم ہو گئی ہے، سچ...... مجھے تو اس سے اپنی سگی بیٹیوں جیسی محبت ہو گئی ہے۔'' زیتون بانو نے محبت بھرے لہجے میں کہا تو شاہ زیب کی آنکھیں نم ہونے لگیں اور اس نے حسرت سے ماں کی جانب دیکھا اور وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔

''کاش...... وہ مجھے کسی قابل تو سمجھے...... کاش...... وہ مجھ سے بات کرنا تو پسند کرے...... کاش...... وہ میرے دل کے اندر لگی آگ کو محسوس تو کرے...... کاش...... میرے جذبات کی شدت کا اسے بھی اندازہ ہو سکے...... میں کس اذیت ناک تنہائی میں سے گزر رہا ہوں...... اور میں اپنے آپ کو کس کس طرح سمجھاتا ہوں...... کیسے اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہوں...... اسے تو کچھ بھی احساس نہیں ہوتا...... کبھی بھی نہیں...... ذرا بھر بھی نہیں۔'' شاہ زیب نے آہ بھر کر سوچا اور نازی کے کمرے میں چلا گیا، وہ بستر پر آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔

''نازی......'' اس نے آہستہ آواز میں پکارا، نازی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ تھوڑا سا آگے بڑھا اور اس کے اوپر قدرے جھکتے ہوئے محبت بھرے انداز میں سرگوشی کی۔ نازی ہڑبڑا کر اٹھی اور حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

''میرے قریب مت آنا......'' وہ قدرے خفگی سے بولی۔

شاہ زیب جہاں تھا، وہیں رک گیا...... اس نے نازی کی جانب حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس کو اپنی شدید بے عزتی کا احساس ہونے لگا۔ اس کا دل ایسے دکھ اور ذلت کے احساس سے دوچار ہونے لگا جس کو بیان کرنے کے لئے اس کے پاس الفاظ نہیں تھے۔ اس کے دل میں ایسی آگ سلگ رہی تھی جو کسی کو دکھائی نہیں دے رہی تھی، مگر جس کے شعلے اس کے دماغ کو بھی سلگا رہے تھے، اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں، جیسے آتش فشاں کے اندر کھولتے ہوئے لاوے کا منظر پیش کر رہی ہوں۔ اس نے نازی کے ساتھ ہمیشہ اچھا سلوک ہی کیا تھا۔ اس کی بے رخی کے باوجود اپنے گھر میں اسے مالکن کا مقام دیا تھا، مگر نازی نے ہمیشہ اسے دھتکارا تھا اور نظر انداز کیے جانے کا یہ احساس اس کی روح کو بھی سلگا تا رہتا تھا۔

شاہ زیب کے کمرے سے جانے کے بعد نازی رونا شروع ہو گئی، جس کو پانے کے لئے وہ اس شخص کو جھٹلا رہی تھی، وہ اس سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا...... وہ اسے چھوڑ کر جانا چاہتا تھا۔ نازی شاہ زیب اور باسط علی کا موازنہ کرنا شروع ہو گئی۔ شاہ زیب ہر لحاظ سے اچھا انسان تھا۔ شاید باسط علی سے بھی...... اگر وہ باسط علی سے پہلے نہ ملتی اور شاہ زیب سے پہلے مل چکی ہوتی تو وہ شاید باسط علی کی طرف دیکھنا بھی پسند نہ کرتی۔ شاہ زیب خوبصورت تھا، مالدار تھا، سخی تھا، صاحب دل اور اعلیٰ ظرف انسان تھا۔ سب لوگ اس سے محبت کرتے تھے۔ اس کے لئے دعائیں کرتے تھے۔ وہ سب کچھ ہونے کے باوجود بھی اس کے لیے کچھ نہیں تھا۔ وہ اس سے محبت نہیں کر پائی تھی اور باسط علی کی محبت کو اپنے دل سے کھرچ نہیں پائی تھی۔ وہ دو کشتیوں کی سوار تھی اور دونوں کشتیوں سے وہ پاؤں اٹھانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ عجیب مخمصے میں پڑ گئی تھی۔ شاہ زیب کی اعلیٰ خوبیوں کی قائل ہونے کے باوجود وہ اس کو اپنے قریب پا کر بوکھلا جاتی تھی۔ اسے اپنے دل کے اندر داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتی تھی اور باسط علی جہاں کھڑا تھا، وہیں کھڑا تھا۔ وہ آگے نہیں بڑھ رہا تھا، وہ کیا کرے......؟ اس نے تو یہی منصوبہ بنایا تھا کہ باسط علی کے آتے ہی وہ شاہ زیب سے طلاق لے کر یہاں سے چلی

جائے گی، مگر باسط علی تو بہت بدل گیا تھا۔ اس کی سوچ بدل گئی تھی۔ وہ تو اسے چھوڑ کر جانے کی باتیں کر رہا تھا، ایسے میں اس کا دل ٹوٹ کر کرچی کرچی نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ اس نے بری طرح مات کھائی تھی۔ اس کا مستقبل کیا ہوگا...... وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔ اگر باسط علی اسے چھوڑ کر چلا گیا تو وہ کہاں جائے گی؟ شاہ زیب اسے کیسے قبول کرے گا اور وہ شاہ زیب کو کیسے......؟ اس کا دل انجانے خوف و خدشات سے دوچار ہونے لگا وہ ہر پل...... بستر پر لیٹی یہی کچھ سوچتی رہتی۔ اسے ہر راستہ بند نظر آتا...... اسے ڈپریشن کے دورے پڑنے شروع ہو گئے۔ اس کی بیماری کی کسی کو سمجھ نہ آ رہی تھی، نہ ڈاکٹروں کو...... اور نہ ہی کسی اور کو......

''مجھے باسط علی سے ایک بار کھل کر بات کرنی چاہئے...... پھر اس کے بعد...... مجھے فیصلہ کرنا چاہئے۔'' نازی نے سوچا مگر اس کی طبیعت سنبھل نہیں پا رہی تھی۔ اس نے کھانا پینا بھی بالکل چھوڑ رکھا تھا۔ نقاہت کی وجہ سے چند قدم چلنا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ شادی کے بعد وہ ایک بار بھی حشمت خاں کی حویلی نہیں گئی تھی اور نہ ہی ان لوگوں سے کسی قسم کا رابطہ رکھا تھا۔ زیتون بانو اکثر شاہ زیب سے کہتی کہ وہ نازی کو اس کے گھر والوں سے ملالائے، مگر نازی جانے سے انکار کر دیتی۔ اب بھی زیتون بانو کی ایک ہی رٹ تھی کہ شاہ زیب...... اس کو چند روز کے لئے اس کے ماں باپ کے پاس لے جائے یا انہیں بلوا لے...... نازی ان کے بغیر اداس ہو گئی ہے...... نازی نے سنا تو اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے...... اگر اس کے ماں باپ آ گئے تو باسط علی کو یہاں دیکھ کر وہ یقیناً طوفان کھڑا کر دیں گے۔ اس نے عافیت اس میں سمجھی کہ خود ہی ان سے ملنے چلی جائے۔ شاہ زیب نے اس کے کمرے میں جانا اور اس سے بات کرنا مکمل طور پر بند کر دیا تھا۔ مگر زیتون بانو کے بے حد اصرار پر وہ نازی کو خود اس کے گاؤں لے گیا۔ اتنا لمبا سفر دونوں نے خاموشی سے کاٹا۔ نازی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی مسلسل باہر دیکھتی رہی اور شاہ زیب ڈرائیور کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر خاموش بیٹھا رہا، کسی وقت ڈرائیور سے باتیں کرنے لگتا، مگر زیادہ تر خاموش ہی رہا۔

نازی مسلسل باسط علی کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے حشمت خاں کی حویلی جانے کی قطعی خوشی نہ تھی، بلکہ وہاں جاتے ہوئے اس کا دل گھبرا رہا تھا۔ اس کے باپ نے اس کے ساتھ جو زبردستی کی تھی وہ اس کی وجہ سے اس سے بہت متنفر ہو گئی تھی اور اس کی ماں نے بھی اس کا کوئی ساتھ نہیں دیا تھا، اس لئے وہ ماں سے بھی خائف تھی۔ ان سے ملنے جانا اس کی مجبوری تھی۔ حشمت خاں اور اس کی ماں اسے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ وہ بہت کمزور ہو چکی تھی، اس کی ماں اسے گلے لگا کر رونے لگی، مگر وہ خاموش رہی۔ حشمت خاں شاہ زیب کی پہلی بار اپنے ہاں آمد پر بے حد خوش ہوا اور اس کی خاطر و تواضع میں لگا رہا...... شاہ زیب کے لئے حویلی کا سب سے بہترین کمرہ صاف کرایا گیا۔ اس کے لئے انواع و اقسام کے کھانے پکوائے گئے۔

قادر علی، بلقیس اور باسط علی کی بہنیں بھی اس سے ملنے آئیں اور اس کی حالت دیکھ کر بہت رنجیدہ ہوئیں۔ سب چلے گئے تو باسط علی کی بہن ثمینہ اس کے پاس بیٹھی رہی۔ نازی اس سے باسط علی کے بارے میں پوچھنا چاہتی تھی، اس لئے اس نے جان بوجھ کر اسے اپنے پاس روک لیا۔

''باسط علی کہاں ہے...... آج...... کل؟ نازی نے جان بوجھ کر پوچھا۔

''وہ...... سمندر پار چلے گئے ہیں، وہاں ان کو اچھی ملازمت مل گئی ہے۔'' ثمینہ نے خوش ہو کر جواب دیا تو نازی نے چونک کر اس کی جانب دیکھا...... اس کے پاس مزید کچھ پوچھنے کو باقی نہ تھا۔ ثمینہ ادھر ادھر کی باتیں کر کے وہاں سے چلی گئی اور نازی کا دل بوجھ تلے دبنے لگا۔

''نازی......شاہ زیب تمہارے ساتھ ٹھیک ہے نا؟'' نازی کی ماں نے پوچھا۔

''ہاں......'' وہ آہستہ آواز میں بولی۔

''اور تمہاری ساس......؟''

''وہ بھی بہت اچھی ہیں؟'' نازی نے جواب دیا۔

''تمہارا دل وہاں لگ گیا ہے نا؟''

''ہاں......''

''تم خوش ہونا......؟''

''ہاں......'' اس نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''تمہاری آنکھوں میں اداسی کیوں ہے؟''

''کیا آپ کو یہ اب نظر آئی ہے؟'' نازی نے حیرت سے پوچھا۔ اس کی ماں اس کی بات سن کر خاموش ہوگئی اور نازی وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔

وہ بمشکل ایک دن وہاں رہی اور اگلے روز واپس لوٹ آئی۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ مغموم، اداس اور پریشان ہوگئی تھی۔ باسط علی نے اس کی خاطر اپنے گھر والوں کے ساتھ کتنا بڑا جھوٹ بولا تھا، وہ اس کے بیرون ملک جانے سے کس قدر خوش اور مطمئن تھے اور ان کا اطمینان دیکھ کر وہ پریشان ہوگئی تھی۔ اس کی خاطر وہ شاہ زیب کو دھوکہ دے رہی تھی اور باسط علی اس کی وجہ سے اپنے گھر والوں کو......اور حاصل کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ اس کے اندر شدید اضطراب اور بے چینی بڑھنے لگی۔

''شاہ زیب...... حشمت خاں کی مہمان نوازی اور خاطر تواضع سے بے حد متاثر ہوا تھا۔ نازی پہلے سے بھی زیادہ اداس اور پریشان لگ رہی تھی، کوئی شے اندر ہی اندر اس کے دل میں خنجر کی طرح پیوست ہوگئی تھی اور وہ بات کسی سے شیئر نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ جاتے ہی باسط علی سے دو ٹوک بات کر کے معاملے کو ختم کرے گی۔

وہ گھر لوٹے تو زیتون بانو نے بہت خوش دلی سے ان کا استقبال کیا۔ حشمت خاں اور اس کی بیوی نے بے شمار تحائف دے کر انہیں رخصت کیا تھا کہ بیٹی پہلی بار میکے آئی تھی۔

نازی جب سے واپس آئی تھی بہت خاموش تھی۔ ایک عجیب سا بوجھ اس کے دل و دماغ پر حاوی تھا۔ باسط علی کی محبت نے اسے اس حد تک دیوانہ بنا رکھا تھا کہ وہ اس سے کسی بھی صورت میں دستبردار نہیں ہونا چاہتی تھی اور باسط علی کا بدلا ہوا رویہ اسے اندر ہی اندر خوفزدہ کر رہا تھا۔ وہ کوئی ایسی بات سننے کو بھی تیار نہ تھی، جو اسے باسط علی سے دور لے جائے۔ اٹھتے بیٹھتے...... سوتے جاگتے...... ہر وقت ذہن میں باسط علی رہتا...... سامنے گھومتے پھرتے شاہ زیب کی جگہ اسے باسط علی دکھائی دیتا...... وہ دن بدن شدید ذہنی انتشار کا شکار ہو رہی تھی۔ وہ اپنی ہی سوچوں میں گم اور پریشان رہتی۔

شاہ زیب کو ڈیرے پر بہت کام تھا۔ دوسرے گاؤں سے کچھ لوگ اس سے ملنے آئے تھے۔ اس لئے وہ رات گئے تک گھر نہیں لوٹا تھا۔

سردیوں کی خنک رات میں ہر جانب ہو کا عالم تھا۔ سب اپنے اپنے کمروں میں سو رہے تھے، ملازمین بھی سو چکے تھے۔ نازی کو یہ موقع غنیمت لگا اور وہ اوپر باسط علی کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ میز پر بہت سے کاغذات پھیلائے کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ نازی کو کمرے میں دیکھ کر وہ ہڑبڑا گیا۔

''تم......اور......اس وقت......؟'' باسط علی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......میں......آج تم سے دوٹوک بات کرنے آئی ہوں۔ باسط علی......اب میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ تمہیں اب کس بات کا انتظار ہے......مجھ سے اب مزید انتظار نہیں ہو سکتا۔ تم نے مجھے کیوں اذیت میں ڈال رکھا ہے؟ نازی اس کی جانب محبت پاش نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی شدت جذبات سے مغلوب ہو کر اس کے سینے سے لگ گئی۔ باسط علی نے اسے اپنے سے پیچھے ہٹانا چاہا۔

''نہیں......باسط علی......آج نہیں......'' وہ ہٹ دھرمی سے بولی۔

''نازنین......'' شاہ زیب ایکدم پیچھے سے آ کر چلایا۔ باسط علی بری طرح گھبرا کر پیچھے ہٹا اور نازی بھی ایک دم گھبرا گئی۔ شاہ زیب کا چہرہ غصے سے سرخ ہونے لگا۔ وہ غصے سے باسط علی کو گھورنے لگا۔

''تم......؟'' وہ غصے سے چلانے لگا۔

''یہی......میری محبت ہے......'' نازی ایک دم اس کے سامنے اکڑ کر بولی۔

شاہ زیب کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے اور اس نے گہری سانس لے کر قدرے بے بسی سے نازی کی طرف دیکھا۔ ''میں سب جانتا ہوں۔'' شاہ زیب نے آہ بھر کر انتہائی کمزور لہجے میں جواب دیا اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگیں۔ باسط علی ایک مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔

''شاہ زیب......اچھا ہوا......آج تم نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا مجھے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں......بہتر یہی ہے کہ تم مجھے آزاد کر دو......میں باسط علی سے شادی کرنا چاہتی ہوں......اب میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔'' نازی نے فیصلہ کن لہجے میں شاہ زیب سے کہا تو باسط علی حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

''ہاں......اب تم دونوں کا ایک دوسرے سے مل جانا ہی بہتر ہے۔'' شاہ زیب نے شکستہ لہجے میں کہا تو باسط علی نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ نازی کے دل کی کلی کھل اٹھی......اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔

''میں آج ہی تمہیں......ابھی......اور......اسی وقت طلاق دیتا ہوں۔'' شاہ زیب نے تین بار جملہ دہرایا اور ہر بار وہ بری طرح سسکا، وہ جیسے جیسے الفاظ ادا کرتا باسط علی کے دل میں کوئی شے بری طرح ٹوٹتی۔ اس کا دل لرزنے لگتا۔ اس کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے بھرنے لگیں، مگر وہ اس کے ہر جملے پر خوش ہو رہی تھی۔

شاہ زیب اسے طلاق دے کر بری طرح سسکنے لگا اور سسکیاں بھرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ باسط علی حیرت زدہ نگاہوں سے اسے باہر جاتے ہوئے دیکھنے لگا۔ وہ ساکت کھڑا تھا۔ نازی نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا۔

''شکر ہے..... آج فیصلہ ہو گیا۔'' وہ مسکرا کر بولی۔

''بہت برا ہوا.....'' باسط علی زیر لب بڑبڑایا۔

''کیا..... تم..... خوش نہیں ہوئے؟ نازی نے حیرت سے پوچھا۔ باسط علی نے چونک کر نازی کی جانب دیکھا اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ وہ اسے بچوں کی طرح بلکتے ہوئے دیکھ کر گھبرا گئی۔

''کیا..... ہوا..... تم رو کیوں رہے ہو؟'' نازی نے حیرت سے پوچھا۔

''تمہیں کس بات کا دکھ ہو رہا ہے؟ اس نے پھر پوچھا معلوم نہیں۔

''کیا..... تم شاہ زیب کے دکھی ہونے سے پریشان ہو رہے ہو..... یا..... پھر.....؟'' نازی نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''میں کچھ نہیں جانتا..... کچھ نہیں جانتا..... اور مجھ سے مت پوچھو..... مجھے کچھ معلوم نہیں، مگر بہت برا ہوا ہے..... بہت برا.....'' باسط علی نے پھر روتے ہوئے کہا تو نازی اس کی بات سن کر خاموش ہو گئی..... اور حیرت سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔

''تم..... خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو..... ہمیں تو خوش ہونا چاہئے کہ ہم اپنی محبت کی منزل کی جانب بڑھ رہے ہیں، اب ہم ایک دوسرے کی محبت کو پانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اب ہمارے راستے میں کوئی بھی نہیں ہو گا..... میرا باپ بھی نہیں..... اور تمہاری کوئی مجبوری بھی نہیں۔'' نازی نے خوش ہو کر کہا۔ باسط علی سسکتا رہا..... اور..... اپنی ہی سوچوں میں مگن رہا۔ اسے قطعی احساس نہیں ہو رہا تھا کہ نازی اس کے پاس بیٹھی ہے..... وہ اس کی ذات سے مکمل طور پر بے خبر ہو گیا تھا۔ اس کے اندر ایسی چبھن۔ ایسی کسک..... اور ایسا درد تھا جو اس کی روح کو کچوکے لگا رہا تھا کہ اس سے سانس لینا مشکل ہو گیا تھا۔

''باسط علی..... تمہیں کیا ہو گیا ہے..... کیا تم اپنے حواسوں میں ہو؟'' نازی نے اسے یوں بے خبر دیکھ کر قدرے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

''تم..... اس وقت یہاں سے چلی جاؤ'' باسط علی نے قدرے جذباتی لہجے میں کہا۔ نازی نے اس کی طرف بغور دیکھا اور خاموشی سے اٹھ کر چلی گئی۔

شاہ زیب کہاں چلا گیا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا۔ صبح سویرے اس نے ماں کو طلاق کے بارے میں بتایا تھا اور زیتون بانو کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔

''طلاق..... کیوں..... اور..... کس وجہ سے؟ زیتون بانو نے حیرت سے پوچھا۔

''اماں..... میرا اور اس کا ساتھ ناممکن ہے..... اسے میرا ساتھ قبول نہیں اور اس کی بیماری کی وجہ بھی یہی ہے..... اس لئے میں نے اسے آزاد کر دیا ہے''۔ وہ آہستہ آواز میں بولا۔

''شاہ..... زیب..... یہ..... تو نے کیا کیا..... مجھے کچھ تو بتاتے..... میں اس سے بات کرتی..... تو نے اس کے ساتھ بہت ظلم کیا ہے..... وہ میری بہو نہیں..... بیٹی ہے۔ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی.....'' زیتون بانو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

شاہ زیب نے چونک کر ماں کی جانب دیکھا۔اس کی آنکھیں رات بھر رونے سے سرخ ہو رہی تھیں۔ماں کی ناراضگی پر وہ تڑپ گیا اور ......اور خاموشی سے گھر سے باہر نکل گیا...... زیتون بانو...... نازی کے کمرے میں گئی اور اسے اپنے گلے سے لگا کر بلند آواز میں رونے لگی۔ نازی......قدرے حیران ہو رہی تھی۔

''اسے......میں......کبھی معاف نہیں کروں گی......اس نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے......بہت ظلم'' زیتون بانو روتے ہوئے بولی تو نازی خاموشی سے سب کچھ سنتی رہی۔

''کاش! میرے بس......میں ہوتا......تو میں تمہیں......کبھی اس گھر سے جانے نہ دیتی......لیکن عدت تمہیں یہیں گزارنی ہو گی۔'' زیتون بانو نے کہا تو نازی نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

''نہیں......اب......میں یہاں نہیں رہ سکتی......آپ مجھے یہاں سے جانے دیں۔'' نازی نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے......میں تمہارے گھر اطلاع بھجواتی ہوں، تمہارے والدین آ کر تمہیں یہاں سے عزت سے لے جائیں۔'' زیتون بانو نے کہا۔

''نہیں......ایسا......مت کیجیے گا......ابا......مجھے جان سے مار دیں گے......'' نازی نے گھبرا کر کہا۔

''پھر......کہاں جاؤ گی؟'' زیتون بانو نے حیرت سے پوچھا۔

''شہر......میں......اپنی ایک سہیلی کے پاس......'' اس نے جواب دیا۔

''کیا مطلب......؟ تم اپنے گھر کبھی نہیں جاؤ گی؟'' زیتون بانو نے چونک کر پوچھا۔

''جاؤں گی......مگر کچھ روز بعد......'' اس نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے......میں......تمہیں خود......تمہاری سہیلی کے پاس چھوڑ کر آؤں گی۔'' زیتون بانو نے کہا تو نازی پریشان ہو گئی۔اس کے پاس اب انکار کا کوئی جواز نہیں تھا۔وہ خاموش ہو گئی، مگر اندر ہی اندر وہ پریشان ہو گئی۔

چار پانچ روز گزر گئے تھے۔شاہ زیب گھر نہیں آیا تھا اور زیتون بانو نے بھی غصے میں اس کی کوئی خیریت نہ پوچھی تھی۔شاہ زیب کس ذہنی اذیت سے گزر رہا تھا کسی کو کانوں کان خبر نہ تھی اس کی وجہ سے باسط علی کو شدید رنج پہنچا تھا۔ایک عجیب قسم کا احساس گناہ اسے اندر ہی اندر پریشان کر رہا تھا۔شاہ زیب سے ملنے اور اس کا سامنا کرنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔وہ اس سے ملے بغیر......بنا کچھ کہے اور بتائے زیتون بانو سے اپنی ذاتی مصروفیات کا بہانہ بنا کر چلا گیا تھا۔

ماسٹر باسط علی صبح سویرے ہی سکول پہنچ گیا۔موسم بے حد ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ہر طرف گہری دھند چھائی تھی کہ سامنے آتا شخص بمشکل دکھائی دے رہا تھا۔ماسٹر باسط علی رات بھر نہیں سو پایا تھا۔ماضی کی راکھ میں دبی چنگاریاں اس کے سینے میں ایسی آگ سلگائے رکھتی تھیں جو کسی پل بھی ٹھنڈی نہیں ہو پا رہی تھیں۔ان سلگتی چنگاریوں سے شعلے بھڑک اٹھتے تو پھر سرد نہیں ہو پاتے تھے۔وہ اپنے ماضی اور اس کی تلخ یادوں سے فرار پانے کے لئے وہ منہ اندھیرے سکول جا پہنچا۔سکول کا گیٹ بند تھا۔چوکیدار اسے دیکھ کر چونکا۔

''ماسٹر صاحب...... آج تو سکول میں چھٹی ہے...... کیا آپ کو معلوم نہیں...... یا...... پھر......؟ چوکیدار نے معنی خیز انداز میں پوچھا تو ماسٹر باسط علی ایک دم بوکھلا گئے۔

''ہاں...... ہاں...... مجھے پتا ہے...... آج سکول میں چھٹی ہے۔ موسم بہت خراب ہو رہا ہے...... اس لئے میں دیکھنے آیا ہوں کہ یہاں سب خیریت تو ہے نا۔'' ماسٹر باسط علی نے بات بدلتے ہوئے کہا تو چوکیدار نے بغور اس کی جانب یوں دیکھا جیسے اسے اس کی بات پر یقین نہ آ رہا ہو۔

''پہلے...... تو...... آپ کو کبھی خیال نہیں آیا۔'' چوکیدار نے حیرت سے کہا اور خاموش ہو گیا۔

ماسٹر باسط علی خاموشی سے وہاں سے چل پڑے۔ انہیں اپنے آپ پر افسوس ہونے لگا۔ اب ان سے اکثر ایسی حرکات سرزد ہونے لگی تھیں، جن کی وجہ سے وہ دوسروں کی نظروں میں اپنے لئے حیرت اور تاسف کے تاثرات محسوس کرتے اور یہ بات ان کے لئے بہت تکلیف دہ تھی۔ وہ اپنے اندر ندامت محسوس کرتے ہوئے سڑک پر چلنے لگے۔ وہ اپنی سوچوں میں اس قدر مگن تھے کہ انہیں سامنے آنے والا سائیں مٹھا بالکل دکھائی نہ دیا۔ وہ اس کے ساتھ بری طرح ٹکرائے اور ہڑبڑا کر انہیں دیکھنے لگے۔

سائیں نے بلند آواز میں بے ہنگم قہقہہ لگایا اور کتنی ہی دیر ہنستا رہا۔ اس کا ہنس ہنس کر بُرا حال ہو رہا تھا۔ ہنسنے کی وجہ سے اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ ماسٹر باسط علی کو مزید ندامت محسوس ہونے لگی۔ سائیں ہنستے ہوئے بولا۔

''ماشٹر جی...... کاہے کو باؤلا ہو رہا ہے، نہ اپنی ہوش...... نہ من کی...... مارا مارا ادھر ادھر پھر رہا ہے...... کچھ نہیں ملنے کا...... پاگل ہو جائے گا...... دیوانہ......'' سائیں نے سنجیدگی سے کہا۔

''وہی تو ہو گیا ہوں...... کچھ سمجھ نہیں آ رہا...... میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے......؟ ماسٹر باسط علی نے آہ بھر کر کہا۔

''شی......'' سائیں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش ہونے کو کہا۔

ماسٹر باسط علی نے چونک کر اس کی طرف حیرت سے دیکھا۔

''اتنا علم پڑھ پڑھ کر پھر اندھیرے کی باتیں کر رہے ہو...... بڑے ہی نادان ہو...... کیا فائدہ...... اس علم کا جس نے تیرا من نہیں دھویا''۔ سائیں نے کہا تو وہ چونکے۔

''من نہیں دھویا کیا مطلب......؟'' ماسٹر باسط علی نے حیرت سے پوچھا۔

پڑھ قرآن تے حافظ ہویا دور نہ ہویا پردا ہو
پڑھ پڑھ عالم فاضل ہویا مڑوی طالب زردا ہو
لکھ ہزار کتاباں پڑھیاں ظالم نفس نہ مردا ہو
باجھ فقیراں مردا ناہیں باہو چور اندر دا ہو

ماسٹر باسط علی یوں بوکھلا گئے جیسے سائیں نے ان کے اندر کا چور واقعی پکڑ کر انہیں دکھا دیا ہو......

زیتون بانو کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی تھی اور وہ نازی کو چھوڑنے خود شہر نہ جا سکی تھی۔ انہوں نے اسے ڈرائیور اور دو ادھیڑ عمر ملازماؤں کے ساتھ بھیج دیا۔ نازی مطمئن ہوگئی۔ زیتون بانو کا رو رو کر برا حال تھا۔ انہوں نے کئی روز سے کھانا نہیں کھایا تھا۔ نازی سے وہ بہت محبت کرنے لگی تھیں۔ نازی کو یوں اپنے سے جدا کرنا ان کے لئے بہت مشکل ہو رہا تھا۔ انہوں نے اسے اپنے بہت سے زیورات اور کپڑے دے کر رخصت کیا تھا۔ نازی جانے سے پہلے ان سے ملنے آئی تو انہوں نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔ وہ نازی کو یوں جاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ نازی کے جانے کے بعد انہیں دل کا دورہ پڑا تھا اور انہیں جلدی سے قریبی شہر لے جایا گیا تھا۔ شاہ زیب پھر بھی گھر نہیں آیا تھا، وہ نجانے کہاں چلا گیا تھا۔ نازی شہر میں کالج کی ایک دوست کے پاس آ کر بے حد خوش تھی۔ کچھ روز بعد باسط علی بھی اس سے ملنے آیا تھا، مگر بہت اداس اور خاموش تھا۔

''باسط علی...... تم ابھی تک اداس ہو......؟'' نازی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......'' اس نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''کیوں......؟''

''معلوم نہیں...... مگر بہت مضطرب کرنے والی اداسی...... میری روح میں کہیں ٹھہر سی گئی ہے...... مجھے سمجھ میں نہیں آتا...... مجھے کیا ہو گیا ہے...... لیکن جو کچھ بھی ہوا ہے...... بہت......'' اس نے آہ بھر کر کچھ کہنا چاہا۔

''بہت اچھا ہوا ہے......'' نازی اس کا جملہ کاٹتے ہوئے بولی۔

''نہیں...... اچھا...... نہیں ہوا ہے......'' باسط علی نے افسردگی سے جواب دیا۔

''مت...... ایسی باتیں کرو...... تم صرف میرے بارے میں سوچو...... اپنی محبت کو پانے کے بارے میں......'' نازی نے مسکرا کر کہا۔

''محبت...... نجانے کہاں چلی گئی ہے؟'' باسط علی نے افسردگی سے جواب دیا۔

''باسط علی...... مجھے اپنی فضول باتوں سے پریشان مت کرو، تمہیں ذرا خیال نہیں آتا کہ میں نے تمہاری خاطر کیا کچھ کیا ہے......؟ شاہ زیب...... اس کی محبت...... اس کی حویلی سے ملنے والی عزت دولت۔ آن...... بان سب کچھ صرف اور صرف تمہارے لئے چھوڑ کر آئی ہوں...... اور وہ بھی تمہاری محبت کی خاطر...... اور اب تم کہہ رہے ہو...... کہ محبت نجانے کہاں چلی گئی ہے...... باسط علی...... میں یہ بات سننا ہی نہیں چاہتی...... مجھے...... تمہاری محبت اور چاہت کی تمنا ہے...... اور...... اب اگر تم نے مجھے چھوڑنے کی بات کی...... تو میں تمہیں اور اپنے آپ کو مار ڈالوں گی۔'' نازی نے غصے سے چلاتے ہوئے کہا تو باسط علی اس کی آنکھوں میں بے باکی اور غصے کے تاثرات دیکھ کر چونک گیا۔

''باسط علی...... اب مجھ سے فرار ممکن نہیں...... اس لئے بہتر یہی ہے کہ اپنا ذہن بدل لو...... ورنہ......'' نازی پھر دھمکی کے انداز میں بولی تو باسط علی نے پھر چونک کر اسے دیکھا۔

''ورنہ...... کیا......؟'' باسط علی نے حیرت سے پوچھا۔

''ورنہ...... ہم دونوں کے لیے بہت برا ہوگا۔'' نازی نے گہری سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

باسط علی خاموشی سے اس کی جانب دیکھنے لگا اور اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ نازی نے اس کی جانب دیکھا اور اس کے دل میں باسط علی کے لئے محبت کے جذبات مشتعل ہونے لگے۔

''تم...... کیوں ایسی باتیں کرتے ہو...... جو مجھے غصہ دلاتی ہیں...... کیا تمہیں...... میں...... اور میری محبت نظر نہیں آتی؟'' نازی نے محبت بھرے لہجے میں اسے کہا اور شدتِ جذبات سے مغلوب ہو کر اس کے گلے لگ گئی۔ باسط علی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''اسی لئے...... تو میں کہتی ہوں...... کہ ہمیں ایک دوسرے کی محبت کی بہت ضرورت ہے...... باسط علی...... میرا دل...... میری روح...... اور میرا جسم...... تمہاری محبت کے لمس کے بغیر ادھورا ہے۔ میں جس محبت کے لئے تڑپ رہی ہوں...... مجھے اس کے لئے مزید بے قرار نہ کرو...... تم نہیں جانتے...... میں تمہارے بغیر کتنی ادھوری ہوں...... کتنی بے تاب...... وہ والہانہ انداز میں اس کے ہاتھ کو چومتے ہوئے بولی...... مگر...... باسط علی مٹی کا مادھو بنا خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا۔ اس کے اندر کوئی حرارت پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ وہ بے حس و حرکت اداس بیٹھا تھا۔

''باسط علی......'' نازی نے اسے زور سے جھنجھوڑا۔ کیا تم مجھے محسوس کر رہے ہو......؟'' نازی نے اس کے کان میں محبت سے سرگوشی کی۔

''میری طبیعت ٹھیک نہیں...... تم اس وقت یہاں سے چلی جاؤ...... ابھی یہ سب کچھ مناسب نہیں...... شادی کے بعد'' وہ آہستہ آواز میں بولا۔

نازی نے اس کی جانب دیکھا اور خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ٹھیک ہے...... اب میں تم سے تب ہی ملوں گی......'' اس سے پہلے بالکل بھی نہیں......'' نازی کہہ کر چلی گئی۔ اور باسط علی خاموش نگاہوں سے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

زیتون بانو کی حالت روز بروز خراب ہو رہی تھی۔ انہیں دو بار دل کا دورہ پڑ چکا تھا۔ وہ ہاسپٹل میں ایڈمٹ تھیں جب شاہ زیب ان سے ملنے آیا۔ وہ بہت کمزور، پریشان اور دکھی لگ رہا تھا۔ زیتون بانو نے اسے دیکھ کر غصے سے منہ پھیر لیا اور سسکنے لگی۔

''اماں...... آپ جو کچھ سمجھ رہی ہیں...... وہ ٹھیک نہیں''۔ شاہ زیب نے آہستہ آواز میں کہا۔

''قدرت نے تجھے اختیار کیا دیا...... تم اپنے آپ کو خدا سمجھ بیٹھے'' زیتون بانو نے غصے سے کہا۔

''میری اتنی اوقات کہاں......؟ وہ آہ بھر کر بولا۔

''پھر...... تو نے یہ سب کیوں کیا؟ زیتون بانو نے پوچھا۔

''یہ اس کی خواہش تھی۔''

''کیا......؟''

''ہاں...... وہ اپنی محبت کو پانا چاہتی تھی...... باسط علی کو''۔ شاہ زیب نے نم آنکھوں سے جواب دیا۔

''وہ...... وہ...... لڑکا......؟'' زیتون بانو نے بے یقینی سے پوچھا۔

''ہاں...... وہ...... اسی کی خاطر یہاں آیا تھا...... مجھے سب معلوم تھا...... اگر میں نازنین کو طلاق نہ دیتا تو شاید......؟ اس نے آہ بھر کر جملہ

ادھورا چھوڑ دیا۔

''کیا اس نے...... تمہارے ساتھ...... دھوکہ کیا ہے...... زیادتی کی ہے...... تمہارے گھر میں رہ کر......'' زیتون بانو نے مایوسی اور بے بسی سے شاہ زیب کی جانب دیکھا اور رونے لگی۔

''مجھے معاف کردے...... میں اسے کیا سمجھتی رہی...... اور...... وہ...... کیا تھی......؟ زیتون بانو نے پریشانی سے کہا۔

''اماں...... انسان کو سمجھنا بہت مشکل ہے......'' شاہ زیب نے آہ بھر کر کہا۔

''میں...... اس کے ماں باپ کے پاس جا کر ان کو بتاؤں گی کہ ان کی بیٹی نے کس طرح ہمیں دھوکہ دیا۔ دن دیہاڑے وہ ہماری آنکھوں میں دھول جھونکتی رہی اور ہم بس دیکھتے ہی رہ گئے۔'' زیتون بانو نے خفگی سے کہا۔

''اماں...... کسی کو کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں...... وہ غصے میں آ کر فساد ڈالیں گے اور نازی کی شادی پھر باسط علی سے نہیں ہو سکے گی...... پہلے بھی حشمت خاں نے اس کے ساتھ زبردستی کی تھی۔'' شاہ زیب آہستہ آواز میں بولا۔

زیتون بانو بغور اس کی جانب دیکھتی رہی۔

''مولا...... نے تجھے کتنا بڑا دل دیا ہے...... اتنا سب کچھ جان کر تم نے اپنے دل میں چھپایا...... اور ان کے ملاپ کی تمنا رکھتا ہے۔ بیٹا...... اتنی برداشت، صبر اور شکر والے لوگ بڑے قیمتی انسان ہوتے ہیں۔ نازنین بڑی بدقسمت نکلی جو تجھ جیسے انسان کو جان نہ سکی...... میں ٹھیک ہو جاؤں تو بہت اچھی لڑکی دیکھ کر تیری شادی کروں گی۔'' زیتون بانو نے پرامید لہجے میں کہا۔

''نہیں...... اماں...... اب نہیں...... اب میں ساری زندگی شادی نہیں کروں گا...... کبھی بھی نہیں۔'' شاہ زیب نے کہا۔

''کیوں......؟'' زیتون بانو نے چونک کر پوچھا۔

''اماں...... میرے ٹوٹے دل میں اب اتنی ہمت نہیں رہی کہ اور دکھ اٹھا سکے...... بس...... اتنا ہی کافی ہے۔'' شاہ زیب نے آنسوؤں سے بھری آواز سے کہا۔

''اور...... میں اپنے بیٹے کو یوں اداس اور تنہا نہیں دیکھ سکتی...... میں تیرے لئے ایسی لڑکی لاؤں گی...... جو تجھے خوش رکھے گی۔'' زیتون بانو نے محبت سے اس کے سر پر پیار پھیرتے ہوئے کہا۔

''اماں...... اب مجھے دنیا کی کوئی شے خوش نہیں کر سکے گی...... اماں...... میں کبھی کبھی سوچتا تھا کہ وہ عورت دنیا کی خوش نصیب عورت ہوگی جو مجھ سے شادی کرے گی...... میں اسے اتنی محبت اور خوشیاں دوں گا...... شاید ہی دنیا کے کسی شوہر نے اپنی بیوی کو دی ہوں...... شاید...... مجھے اپنے بارے میں یہ خوش فہمی تھی یا گھمنڈ...... جسے مولا نے توڑ دیا...... اور میرے نصیب میں ایسی عورت لکھ دی جسے نہ میری محبت کی ضرورت تھی اور نہ میری خوشیوں کی تمنا اس نے مجھے اپنے قریب ہی نہیں آنے دیا...... شاید مجھے پا کر وہ اپنے آپ کو بدقسمت خیال کرتی تھی...... اس نے میری خوش فہمی اور گھمنڈ ایسا توڑا ہے کہ اب میرے اندر نہ کوئی امید رہی ہے اور نہ ہی کوئی خوش فہمی...... میں اب بالکل خالی ہو گیا ہوں...... بالکل خالی......'' وہ نم آنکھوں کے ساتھ شکستہ لہجے میں بولا۔

زیتون بانو خاموشی سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا......شاہ زیب بھی خاموش بیٹھا سرد آہیں بھرتا رہا۔

زیتون بانو ٹھیک ہو کر حویلی آ گئی۔حویلی بے حد اداس، ویران اور سونی سونی لگ رہی تھی زیتون بانو نے گھر کی ویرانی دور کرنے کے لئے شاہ زیب کے لئے لڑکی کی تلاش شروع کر دی......وہ ہر دوسرے......تیسرے دن......شاہ زیب سے کسی نہ کسی لڑکی کا ذکر کرتی تو وہ خاموش ہو جاتا۔ وہ بہت اصرار کرتی تو وہ آہ بھر کر رہ جاتا۔

''اماں......میرے لئے لڑکی کی تلاش چھوڑ دو......مجھے اب کسی کی تمنا نہیں......میرے دل میں اس قدر اضطراب اور بے چینی ہے......جو کسی طرح بھی ختم نہیں ہوتی۔مجھے سمجھ میں نہیں آتا......کہ مجھے کیا ہو گیا ہے......؟ میرا دل بہت اداس اور پریشان رہتا ہے۔میں شادی نہیں کر سکتا۔'' شاہ زیب نے آہ بھر کر کہا۔

''شادی ہو گی......تو سب ٹھیک ہو جائے گا'' زیتون بانو نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''نہیں......اماں......اب......شادی ہو گئی......تو میں اس لڑکی کو خوش نہیں رکھ پاؤں گا......کیونکہ نازنین کی وجہ سے جس طرح میرا دل ٹوٹا ہے، اسے اب کوئی نہیں جوڑ سکتا......وہ لمحے......وہ باتیں......وہ یادیں......میرے اندر ایسی اذیت بن کر ٹھہر گئی ہیں......جو مجھے بہت تکلیف دیتی رہتی ہیں......مجھے بہت مضطرب اور بے چین رکھتی ہیں۔'' شاہ زیب نے کہا۔

''کیا......زندگی یونہی گزار دو گے؟'' زیتون بانو نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......'' اس نے آہ بھر کر جواب دیا اور نم آنکھوں سے ماں کی جانب دیکھنے لگا۔

''اور تمہاری یہ باتیں......مجھے کتنی تکلیف دیتی ہیں، شاید تمہیں اس کا اندازہ نہیں۔'' زیتون بانو نے روتے ہوئے کہا۔

''اچھی طرح جانتا ہوں......اسی لئے تو اپنے دل کی ساری باتیں......صاف صاف تجھے بتا دی ہیں......اماں......ضروری تو نہیں کہ انسان جس بات کی تمنا کرے......وہ پوری بھی ہو جائے......اور جس شے کو اپنے لئے خوشی سمجھے وہ شے اسے خوشی بھی دے دے۔'' شاہ زیب نے کہا اور اٹھ کر چلا گیا۔

شاہ زیب بہت کم گھر آتا، زیادہ تر وقت وہ ڈیرے پر رہتا۔اکثر راتوں کو بھی گھر نہیں آتا تھا۔زیتون بانو کو اس کی بہت فکر لاحق رہتی۔اسے کھانے بنا بنا کر بھیجتی اور گھر آنے کو کہتی، مگر وہ کبھی کبھار آتا......ماں کا حال واحوال پوچھ کر چلے جاتا......نہ زیتون بانو اس سے زیادہ پوچھ گچھ کرتی نہ وہ بتاتا، مگر زیتون بانو کو ملازمین سب خبریں دیتے تھے کہ شاہ زیب کے ڈیرے پر کون آتا جاتا ہے......اور شاہ زیب کیا کچھ کرتا رہتا ہے۔وہ سارا وقت زمینداری میں اور مزارعوں کے ساتھ مصروف رہتا......اور رات بھر وہ کھلے آسمان تلے کھیتوں، کھلیانوں میں پھرتا رہتا، تھک ہار کر ڈیرے پر آ کر سو جاتا، وہ دن بدن کمزور ہوتا جا رہا تھا۔چہرے پر ہر وقت تفکر اور سنجیدگی کے تاثرات نمایاں رہتے۔اس کی خوبصورت سرخ وسفید رنگت بے رونق اور گندمی رہی تھی۔وہ بہت کم باتیں کرنے لگا تھا۔ہر وقت کسی نہ کسی سوچ میں ڈوبا رہتا۔زیتون بانو جو بھی پوچھتی......اس کا ہاں یا ناں میں جواب دے کر خاموش ہو جاتا۔اس کی حالت دیکھ کر زیتون بانو اندر ہی اندر کڑھتی رہتی۔ان کا دل بھر آتا اور نادانستہ ان کے دل سے نازی کے لئے بددعائیں نکلتی۔

''جس محبت کی خاطر......تو نے میرے بیٹے کی زندگی برباد کی ہے......خدا کرے وہ محبت، تمہیں کبھی نہ ملے......اپنے دل سے نکلنے والی

صدا پر وہ خود ہی چونک اُٹھتیں......

’’یہ...... میں...... کیا سوچ رہی ہوں...... میں نے تو کبھی کسی کا برا نہیں چاہا...... پھر...... نجانے...... کیوں...... ؟ یا خدایا...... ! مجھے معاف کرنا...... میں اپنے بیٹے کی ایسی حالت دیکھ کر اپنے دل کو قابو میں نہیں رکھ پاتی...... اور...... اور...... اور‘‘ وہ پریشان ہو کر سوچنے لگتی۔

نازی بہت خوش تھی۔ وہ اپنی سہیلی کے ساتھ مل کر شادی کی خریداری کرنے میں مصروف تھی۔ زیتون بانو نے اسے بہت سے زیورات اور روپے دے کر رخصت کیا تھا۔ اس کے پاس اپنے باپ کے دیئے ہوئے بھاری زیورات بھی موجود تھے۔ اس نے شہر میں گھر کرائے پر لیا تھا اور اس کی مکمل آرائش وسجاوٹ بھی خود کی تھی۔ وہ بہت محبت اور چاہت سے گھر کو سجا رہی تھی۔ ان کی شادی میں چند روز باقی تھے...... اس روز کے بعد وہ باسط علی سے نہیں ملی تھی۔ باسط علی کو ایک کالج میں نوکری ملی تھی اور اس کے ساتھ وہ کچھ ٹیوشنز پڑھانے لگا تھا اسے ہر ماہ گھر میں بھی اپنے ایک دوست کے ذریعے پیسے بھیجنے ہوتے تھے۔

شادی میں دو دن رہ گئے تھے۔ نازی کی سہیلی نے باسط علی کو نکاح کی تقریب اور انتظامات کے بارے میں معلومات پہنچا دی تھیں۔ باسط علی خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا۔

’’آپ بہت خوش قسمت ہیں کہ آپ کو نازنین جیسی لڑکی مل رہی ہے...... وہ آپ سے محبت نہیں...... عشق کرتی ہے۔ میں نے بہت کم لڑکیوں کو...... کسی کے لئے اتنی تکالیف اٹھاتے ہوئے دیکھا ہے۔‘‘ نازی کی سہیلی ثروت نے مسکرا کر اسے بتایا تو وہ خاموشی سے سنتا رہا۔

کیا...... آپ خوش نہیں؟ ثروت نے حیرت سے پوچھا۔

’’ہاں...... ہوں......‘‘ اس نے گہری سانس لیتے ہوئے سنجیدگی سے جواب دیا تو ثروت حیرت سے اس کی جانب دیکھنے لگی...... یہ کیسی خوشی ہے جس کا اظہار نہ اس کے لہجے سے ہو رہا تھا...... نہ آنکھوں سے...... نہ آواز میں خوشی کی رمق تھی...... نہ چہرے کے تاثرات میں...... اسے خوشی کا کوئی شائبہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

’’ٹھیک ہے...... آپ وقت مقررہ پر پہنچ جایئے گا۔‘‘ ثروت نے کہا تو جواباً وہ خاموش رہا۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا۔ باسط علی کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کے اندر پھیلی بے چینی اور بے قراری میں مزید اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

کبھی اس کا دل چاہتا کہ سب کچھ چھوڑ کر کہیں بھاگ جائے...... نازی سے دور...... مگر اگلے ہی لمحے اس کا دل انکار کرتا۔

نہیں...... نازی نے میری خاطر بہت قربانیاں دی ہیں...... مجھے اس کی محبت کی خاطر...... اس سے شادی کرنا پڑے گی۔ فرار کا کوئی راستہ نہیں...... وہ چارپائی پر لیٹا کروٹیں بدلتا رہا اور سوچتا رہا اور اسی کشمکش میں اسے نیند آ گئی۔

ہر طرف گہری تاریکی چھائی تھی۔ باسط علی کسی تاریک راستے پر سرپٹ بھاگ رہا تھا اور انتہائی خوفزدہ تھا۔ اس کے پیچھے ایک شیر اسے مارنے کو آ رہا تھا اور اسے کوئی جائے پناہ نظر نہ آ رہی تھی...... نہ کوئی راستہ نہ کوئی منزل...... اچانک اسے اپنے سامنے گھوڑے پر سوار ایک شخص دکھائی دیتا ہے۔ باسط علی اسے رکنے کو کہتا ہے، سوار رکتا ہے۔ باسط علی بھاگتا ہوا اس کے پاس جاتا ہے اور روتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ اسے بچا لے۔ سوار اپنے چہرے سے کپڑا ہٹاتا ہے تو وہ 'شاہ زیب' ہے۔ اس کے چہرے سے سفید روشنی کی شعاعیں نکل رہی ہیں۔ باسط علی اسے دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتا

ہے۔شاہ زیب اپنی پستول سے شیر پر فائرنگ کرتا ہے۔اندھیرے میں شیر کے دھاڑنے کی آواز بند ہو جاتی ہے۔شاہ زیب...... باسط علی کی طرف خاموش نگاہوں سے دیکھتا ہے۔اس کی آنکھوں میں باسط کے لئے نفرت، غم اور غصہ ہے۔

''میں...... نے...... نازی......کو'' باسط علی روتے ہوئے اسے کچھ بتانا چاہتا ہے مگر شاہ زیب اس کی بات نہیں سنتا اور گھوڑے کو ایڑ لگا دیتا ہے۔باسط علی اسے آواز دیتا رہ جاتا ہے۔

''شاہ زیب......خدا کے لئے......میری بات سنو...... مجھے معاف کر دو...... میں نے نازی کو نہیں بہکایا...... مجھے معاف کر دو...... میری طرف یوں مت دیکھو......'' باسط علی اونچی آواز میں بڑبڑانے لگتا ہے۔اس کا چہرہ اور جسم پسینے سے تر ہو رہا ہے۔وہ ہڑبڑا کر اٹھ جاتا ہے۔وہ خواب تھا یا حقیقت......شکر ہے......وہ خواب تھا......وہ سر جھٹک کر سوچ میں پڑ گیا۔

نہیں...... وہ حقیقت ہی تھی۔شاہ زیب نے جب اسے نازی کے ساتھ دیکھا تھا تو اس کی آنکھوں میں ویسے ہی تاثرات تھے......نفرت، غم و غصے اور حسرت سے بھرے تاثرات۔اس لمحے بھی اسے شاہ زیب کی آنکھوں سے ویسا ہی خوف آیا تھا، جیسے اب ایسے خواب میں اسے دیکھ کر وہ ڈر گیا تھا......وہ عجیب سی الجھن کا شکار ہو گیا تھا۔

نجانے کہاں غلطی ہو گئی ہے...... نجانے شاہ زیب مجھے کیوں گنہگار سمجھ رہا ہے...... وہ سمجھتا ہے کہ میں نے اسے دھوکہ دیا ہے...... میں اسے کیسے سمجھاؤں کیسے بتاؤں کہ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا...... میں بے قصور ہوں...... میں نے کچھ نہیں کیا...... کچھ نہیں...... اس نے سوچا ''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو...... کہ تم گناہ گار نہیں...... تم نازی کی محبت میں اندھے ہو گئے اور اس کی محبت کی خاطر...... تم اس کے پاس چلے گئے......شاہ زیب کو دھوکہ دیا...... اس کے پاس ملازمت کی...... اس نے تم پر اعتبار کیا، اپنے گھر میں مہمان ٹھہرایا، تمہیں اپنے گھر کا فرد سمجھا......اور تم نے اس سے غداری کی۔اس کی امانت میں خیانت کی۔اس کا سب کچھ لوٹ کر لے آئے......تم نے شاہ زیب جیسے اچھے انسان کے ساتھ بہت برا کیا...... بہت برا......باسط علی تمہیں کبھی سکون نہیں ملے گا۔اس کا ضمیر اسے ملامت کرنے لگا۔باسط علی گھبرا گیا وہ اپنے ضمیر کی عدالت میں مجرم بنا کھڑا تھا اور اس کا ضمیر اس پر تازیانے برسا رہا تھا۔اس پر فرد جرم عائد کر رہا تھا۔اسے اس کی غلطیاں اور گناہ گن گن کر بتا رہا تھا اور باسط علی کے پاس اپنی حمایت میں بولنے کے لئے کوئی الفاظ نہیں تھے۔

''نہیں......میں......'' باسط علی کے دل نے کچھ کہنا چاہا۔

''نہیں...... باسط علی...... تم ہی گنہگار ہو...... تم نے شاہ زیب کے ساتھ غداری کی...... اس کے ساتھ بے وفائی کی......اس کو دھوکہ دیا...... تم نے اس کے ساتھ زیادتی کی ہے...... ظلم کیا ہے، تم بہت ظالم ہو'' اس کا ضمیر پھر اسے ملامت کرنے لگا۔

باسط علی کا دل گھبرانے لگا، وہ بے بسی سے بلند آواز میں رونے لگا۔اس کی سسکیاں آہستہ آہستہ بلند ہونے لگیں۔اس کے ضمیر نے اسے مجرم اور گنہگار ٹھہرا دیا تھا۔اب دنیا کی کوئی عدالت بھی اسے بری الذمہ قرار دیتی تو اسے سکون نہیں آ سکتا تھا۔اس کے ضمیر نے اسے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا کہ وہ مجرم اور گنہگار ہے اور اب اس فیصلہ......کو وہ جھٹلا نہیں سکتا تھا۔وہ گھبرا کر رونے لگا اور اس کے دل پر بوجھ بڑھنے لگا۔

(۹)

شہیر کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے دل نے کام کرنا بند کر دیا ہو۔ اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ روشنی کے الفاظ اس کے کانوں میں بار بار گونجتے......وہ خود ہی تردید کرتا......اس کی باتوں پر یقین نہ کرتا......

مگر اگلے ہی لمحے اپنے دل کو کوسنے لگتا......جس نے اسے دھوکہ دیا تھا، اسے ورغلایا تھا......اسے بہلایا تھا......اسے ہر طرح سے مطمئن کیا تھا......کہ زل صرف اور صرف اس کی ہے......اس کا جواب بہت جلد اسے 'ہاں' کی صورت میں ملے گا اور زل اس کے علاوہ کسی اور سے محبت کر ہی نہیں سکتی......

کیا کسی کا دل کسی کو اس قدر دھوکہ بھی دے سکتا ہے اور وہ کتنا بے وقوف تھا جو دل کی باتوں پر یقین کر گیا......اس نے جو سوچنا چاہا......دل نے ویسے ہی اس کو خواب دکھائے......جیسی میٹھی، محبت بھری باتیں وہ سننا اور کہنا چاہتا تھا۔ دل نے وہی کچھ کہا......اسے اتنی امیدیں دلائیں تھیں کہ وہ اپنے آپ کو زل کے قریب محسوس کرتا تھا۔ زل اس سے صرف چند قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی......اور دل اسے بہلاتا تھا کہ وہ بہت جلد اس کی دسترس میں ہوگی......اس کا دل اس کو کیسے کیسے بہلاتا رہا......اور اس کو بہکاتا رہا مگر سب کچھ بے ثمر نکلا۔

اب دل مکمل طور پر خاموش تھا۔ کچھ کہہ نہیں رہا تھا کچھ سن نہیں رہا تھا۔ اس کی برستی آنکھوں سے ٹپ ٹپ گرتے آنسوؤں کا دلدوز نغمہ خاموشی سے سن رہا تھا......اور خاموش تماشائی بن کر اس کی بے بسی کا تماشا دیکھ رہا تھا۔

''میں......کیوں دل کی باتوں میں آیا......میں نے کیونکر اس پر یقین کر لیا کہ زل صرف اور صرف میری ہے'' وہ بار بار پوچھتا کر اپنے آپ سے سوال کرتا مگر اب کی بار اسے کوئی جواب نہ ملتا......اس کا دل ہر الزام سے بری الذمہ تھا......یوں جیسے کہہ رہا ہو کہ نادان تو وہ خود تھا جو اس کی باتوں میں آیا......اور ویسے بھی اس نے یہ کب کہا تھا......کہ زل اس سے شادی کرے گی۔

ہوسکتا ہے وہ اس سے اب بھی محبت کرتی ہو......یہ ارسلان نجانے کہاں سے آ گیا......اور......ارسلان تو اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھا......نہ اچھی شکل وصورت نہ اچھا بیک گراؤنڈ......نہ مالی طور پر مستحکم......وہ ایک اسٹور کیپر کا بیٹا تھا......متوسط گھرانے سے اس کا تعلق تھا اور......اور......اس کے پاس کچھ بھی ایسا نہیں کہ زل جیسی اعلیٰ خاندان کی خوبصورت پری پیکر لڑکی ارسلان جیسے شخص کا انتخاب کرے۔ نجانے ارسلان نے اس کو کیا سبز باغ دکھائے ہیں......کہ......زل......؟ لیکن زل بے وقوف نہیں......کہ وہ ارسلان کی باتوں میں آ جائے......اور اس نے تو کہا تھا کہ اس کی محبت بہت قیمتی ہے اور اس نے اپنی قیمتی شے ایک ادنیٰ اور کم تر انسان کو دے دی......اور اسے مسترد کر دیا اس کی ذات کی نفی کر دی......

اسے کسی قابل ہی نہ سمجھا......

شطرنج کی یہ بازی ارسلان کیسے جیت گیا......؟

میں کیا کروں......؟ میرا دل نہیں مانتا کہ زمل مجھے یوں مسترد کر سکتی ہے...... میرا دل مجھے دھوکہ نہیں دے سکتا......اف خدایا! میں کیا کروں! وہ اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے زور زور سے رونے لگا......اپنے ہاتھوں کو ایک دوسرے میں پیوست کر کے پوری شدت سے روتا رہا کہ اس کے رونے کی آواز باہر نہ جائے کبھی ہاتھوں کی بند مٹھیوں کو زور زور سے بیڈ پر مارتا، اسے یقین نہیں آرہا تھا......

کہ وہ محبت کی بازی ہار گیا ہے......

محبت کے میدان میں وہ کس شان سے نکلا تھا......

ایک بہادر اور متکبر شہسوار کی طرح پرعزم اور پراعتماد فتح کا علم بلند کرنے کی تیاری کر رہا تھا کہ اچانک کہیں سے ایک تیر اس کے سینے میں پیوست ہو گیا تھا......اور چند لمحے پہلے جیت کے جشن کا سوچنے والا اب ہار کے ساتھ ساتھ زخمی دل کی تکلیف سے بھی دوچار ہو گیا تھا......یہی حالت اس کی ہو رہی تھی......اس کا دل لہولہان ہو رہا تھا......نجانے اس میں سے کس قدر خون بہہ نکلا تھا۔ کتنا باقی رہ گیا تھا......وہ کچھ نہیں جانتا تھا صرف اتنا جانتا تھا کہ اس سے اس کا سب کچھ چھن گیا ہے......اس کی زمل......اس کی پہلی محبت......اور آخری چاہت......وہ آئندہ زندگی میں کسی پر اعتبار نہیں کرے گا......

اس کی انا کو بھی شدید ٹھیس لگی تھی......

اس نے کس قدر پراعتماد ہو کر اس سے اظہار محبت کیا تھا......اور......زمل نے اس کی محبت کو دھتکار دیا تھا۔ اسے اس کی محبت نہیں چاہیے تھی......اسے شہیر بھی نہیں چاہیے تھا......اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ شہیر اس سے کتنی شدید محبت کرتا ہے......جب اس نے اسے ہی مسترد کر دیا تو پھر محبت کی شدت اور تڑپ اس کے لئے کیا مفہوم رکھتی تھی......وہ اس قدر شدت سے رو رہا تھا......کہ پوری زندگی میں اتنا نہیں رویا تھا......

وہ جو اپنے آپ کو......اپنی سوچوں کو......اپنی باتوں کو ہمیشہ دوسروں سے چھپانے کا عادی تھا......اسے زمل نے کیسے سرعام رسوا کر دیا تھا......

اس سے کیا کچھ چھنا تھا......

اس کی محبت......!

اس کی انا......!

اس کی عزت نفس......!

اس کا اعتبار......!

سب کچھ تو چھن گیا تھا......اب باقی کیا رہ گیا تھا......سوائے کسک، تڑپ، دکھ، رنج و کرب کے......

وہ ساری رات روتا رہا......کبھی بے قرار ہو کر کمرے میں چکر لگانے لگتا......کبھی پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیتا......تو کبھی اپنے آپ کو ختم کرنے کے منصوبے بناتا......اس کی آنکھیں مسلسل رونے سے سرخ ہو گئی تھیں اور آنکھوں کے پپوٹے مسلسل رونے سے یوں سوج کر بھاری اور موٹے ہو گئے تھے جیسے کسی آشوب چشم میں مبتلا ہوں......مسلسل رونے سے اس کا سر شدید درد سے پھٹ رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اگر

وہ چند لمحے نہ سویا تو بے خوابی اور درد سے مر جائے گا۔ اس نے سائیڈ ٹیبل کی دراز میں رکھی نیند کی دو گولیاں کھائیں۔ چند لمحوں کے لئے اسے غنودگی ہوئی مگر پھر وہ زیادہ بے خوابی اور درد میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے نہ پورا دن کچھ کھایا تھا نہ رات کو...... ممی اور سمیر شہر سے باہر کہیں گئے تھے اور ڈیڈی کئی ہفتوں سے بزنس ٹور کے سلسلے میں امریکہ گئے تھے۔ وہ بوجھل قدم اٹھاتا نیچے اترا...... پورے گھر میں سکوت طاری تھا...... صرف ٹیوب لائٹس آن تھیں...... جو گھر میں کسی کے ہونے کا احساس دلا رہی تھیں ورنہ ہر طرف ڈسنے والی خاموشی تھی۔ وہ چپکے سے ڈیڈی کے کمرے میں گیا اور ان کے کمرے میں موجود شیلف کے ایک خفیہ خانے سے شیمپئن کی ایک بوتل نکالی...... اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ڈیڈی اکثر ڈرنک کرتے ہیں اور وہ سب کچھ کہاں رکھتے ہیں۔ وہ بوتل نکال کر اپنے کمرے میں لے گیا...... مگر...... اس سے قبل اس نے کبھی ڈرنک تو کیا...... شراب کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا...... ممی اکثر ڈیڈی سے اس بات پر جھگڑتی تھیں...... اور سمیر کو وہ اس لئے بھی پسند کرتی تھیں کہ بیرون ملک جا کر بھی اس نے کبھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ شہیر کے لئے بھی یہ لمحہ بہت بھاری تھا...... وہ جانتا تھا...... کہ یہ ایک ایسی برائی ہے جس کو انسان ایک بار چھو لے...... تو یہ عمر بھر ساتھ نہیں چھوڑتی...... اس کو پینے والے اس کے حق میں چاہے کتنا ہی کیوں نہ بولیں مگر اس کو لعنت وہ بھی دل سے سمجھتے ہیں۔

شہیر کا ذہن بری طرح الجھ رہا تھا۔ اس لمحے وہ شدید ذہنی اذیت میں مبتلا تھا اور اس اذیت سے کسی نہ کسی طرح چھٹکارا پانا چاہتا تھا۔ شیمپئن گلاس میں ڈالتے ہوئے صرف ایک معمولی سی سوچ اس کے ذہن میں آئی جس نے اسے روکنا چاہا۔

''کیا وہ ٹھیک کر رہا ہے......؟''

اس نے ایک لمحے کو رک کر گلاس کی طرف دیکھا...... اور گہری سانس لی۔

''اور جو کچھ میرے ساتھ ہو رہا ہے...... کیا وہ ٹھیک ہے؟'' اس نے زخمی دل کے ساتھ سوچا۔ ایک گہری لمبی سسکی لی اور اس کے ساتھ ہی اس کی نم آنکھیں برسنے لگیں۔

''زندگی میں کچھ بھی اہم نہیں رہتا...... جب دل بے قرار ہو...... زخمی ہو...... اور...... تڑپ رہا ہو...... میں اس لمحے کچھ نہیں سوچنا چاہتا...... میرا دل پھٹ رہا ہے......'' اس نے غصے سے سوچا اور گلاس پکڑ کر منہ کو لگایا۔

اس لمحے اسے یوں محسوس ہوا...... جیسے کائنات ہل گئی ہو...... اس کے قدموں تلے زمین لرز رہی ہو...... اس کا دل اور دماغ سن ہو گئے ہوں...... اس کی زبان گنگ اور آنکھیں پتھرا گئی ہوں...... اس کے تمام احساسات...... جذبات...... وخیالات سب تھم گئے ہوں...... اس نے دو گلاس پیے...... اور نیم بیہوش ہو کر بیڈ پر گر گیا۔ روشنی۔ شہیر کو بار بار فون کر رہی تھی مگر اس روز زل کی منگنی کی خبر سنانے کے بعد شہیر کا موبائل مسلسل بند تھا...... روشنی حیران تھی کہ شہیر کو اچانک کیا ہو گیا تھا......

کیا وہ زل سے محبت کرتا ہے......؟

لیکن یہ کیسے...... ممکن ہے......؟

زل نے تو اس کی محبت کو جھٹلایا تھا...... اور...... اس نے ارسلان کو منتخب ہی اس لئے کیا ہے کہ وہ اس سے محبت کرتی تھی...... شہیر اور زل کے

درمیان ایسا کچھ بھی نہیں ہوسکتا......اس کے دل نے اس کو تسلی دی......مگر اس کے دل کے اندر کچھ ایسی بے قراری تھی کہ اس نے زل سے ملنے کا فیصلہ کیا۔

زل کا گھر......اس کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر وہ حیران رہ گئی......مگر زل نے کبھی بھی ظاہر نہیں کیا تھا کہ اس کا تعلق بہت امیر گھرانے سے ہے۔اس کے اندر نمود و نمائش بالکل بھی نہیں تھی......زل......روشنی سے مل کر بہت خوش ہوئی۔

''زل......میں تمہیں مبارک دینے آئی ہوں......'' روشنی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تھینک یو......'' زل نے مسکرا کر جواب دیا......اور اس کے لئے چائے کا آرڈر دیا۔

تھوڑی دیر بعد نوکر پر تکلف چائے لے آیا......اور چائے بنا کر دونوں کو پکڑائی۔

''زل......ہم سب بہت حیران ہیں......کہ......یہ سب......کیسے اچانک ہوگیا......؟ روشنی نے حیرت سے پوچھا۔

''کیا......؟'' زل نے جان بوجھ کر حیرت سے پوچھا۔

''تم......اور......ارسلان......کیا ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے......؟ مگر......کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی'' روشنی نے انتہائی حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب......؟ تم لوگوں کو خبر دے کے میں اپنا اسکینڈل بنواتی......'' زل نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

''مگر......پھر بھی......یہ کیسے ہوگیا......؟ اور وہ بھی ایگزامز سے پہلے......سب لوگ پیپرز کی تیاریاں کر رہے ہیں اور تم لوگوں نے منگنی کر لی''۔روشنی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......بس حالات ہی کچھ ایسے ہو گئے تھے......ارسلان نے پرپوز کیا......تو مجھے فیصلہ کرنا پڑا......کیا ارسلان اچھا نہیں......؟'' زل نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''ن......ن......نہیں......یہ بات نہیں......وہ بہت اچھا ہے......اور میرا خیال ہے تم لوگوں کی زندگی بہت اچھی گزرے گی......ارسلان بہت خوش مزاج ہے'' روشنی نے کہا۔

''ہاں......مگر......میں نے صرف اس کی ایک بات کو بہت شدت سے محسوس کرتے ہوئے یہ فیصلہ کیا......کہ......وہ دوسروں کے دکھ اور ان کے احساسات کو اپنے دل میں ہی نہیں......اپنی روح میں بھی محسوس کرتا ہے......اور میرا خیال ہے کہ جس میں اتنی بڑی خوبی ہو......وہ کسی کو ہرٹ نہیں کر سکتا......ارسلان خوبصورت نہیں مگر وہ خوبصورت انسان ہے......وہ امیر نہیں......مگر اس کا دل بہت امیر ہے......'' زل نے پرامید لہجے میں مسکرا کر کہا تو روشنی بھی مسکرا دی۔

''یہ بات سن کر سب بہت خوش ہوئے ہیں......شہیر کو بھی میں نے بتایا......تو......'' روشنی رک رک کر بولی۔

''تو......؟'' زل نے انتہائی حیرت سے چونک کر پوچھا۔

''تو......وہ......بھی......'' روشنی پھر رکی۔

''کیا......وہ بھی جان کر خوش ہوا؟'' زل نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

''معلوم نہیں......اچانک اس کا فون disconnect ہو گیا اور اس کے بعد میری اس سے بات نہیں ہوئی'' روشنی نے قدرے سنجیدگی سے جواب دیا تو زل بھی چند ساعتوں کے لئے خاموش ہو گئی۔

''اور......سب دوستوں کا کیا حال ہے؟'' زل نے بات کا رخ موڑتے ہوئے کہا۔

''سب ٹھیک ہیں......اب کالج کھلنے میں ایک ماہ تو رہ گیا ہے......تم سے اور ارسلان سے تب ٹریٹ لیں گے'' روشنی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''یس......آف کورس......'' زل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''زل......شہیر......؟'' روشنی کچھ کہتے ہوئے رکی۔

''ہاں......کیا ہوا......شہیر کو......؟'' وہ ایک دم پھر چونکی۔

''کچھ......نہیں......کچھ نہیں'' وہ ہونٹ چباتے ہوئے بولی۔

''روشنی......کیا تم شہیر کو پسند کرتی ہو؟'' زل نے اچانک پوچھا تو روشنی نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا......اس کی آنکھیں چمکنے لگیں......اور وہ بغیر کچھ کہے وہاں سے نکل گئی۔ زل حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئی......

☆

''ممی......ممی......ایمبولینس کو جلدی کال کریں......شہیر کمرے میں بے ہوش ہے......اور......اور......اس کی حالت بہت خراب ہے'' سمیر چلاتا ہوا سیڑھیاں اترتے ہوئے بولا۔

مسز تہمینہ اور فاخر حسین جلدی سے اپنے بیڈ روم سے باہر نکلے......اور شہیر کے کمرے کی طرف بھاگے......وہ کارپٹ پر گرا ہوا تھا اور اس کی ٹیبل پر ایش ٹرے میں جلے ہوئے سگریٹوں کے ٹکڑے، نیند کی گولیوں کی شیشی اور شیمپئن کی بوتلیں رکھی تھیں۔

''اوہ......نو......'' مسز تہمینہ حیرت اور صدمے سے گھبرا کر بولیں۔

''اوہ......گاڈ......یہ......یہ......یہاں کیسے؟'' ڈیڈی نے شیمپئن کی بوتل ہاتھ میں پکڑ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

''ممی......ہاسپٹل میں فون کریں......'' سمیر نے انہیں جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

مسز تہمینہ نے بمشکل اپنے حواس پر قابو پایا اور موبائل پر ہاسپٹل کا نمبر ملایا۔ تھوڑی دیر بعد ایمبولینس آ گئی اور شہیر کو ہاسپٹل لے جایا گیا۔

سمیر، ممی اور ڈیڈی بھی ہاسپٹل پہنچ گئے......اسے ایمرجنسی روم میں لے جایا گیا۔

''ڈاکٹر صاحب اسے کیا ہوا ہے'' فاخر حسین نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

''انہوں نے suicide (خودکشی) کرنے کی کوشش کی ہے اور شیمپئن کے ساتھ سلیپنگ پلز کھالی ہیں۔

''یہ شکر ہے کہ آپ وقت پر انہیں ہاسپٹل لے آئے......ورنہ ان کو بچانا بہت مشکل ہو جاتا......ہم نے ان کا معدہ واش کر دیا ہے مگر ابھی

کچھ روز انہیں ہاسپٹل میں رہنا پڑے گا......اب فکر کی بات نہیں" ڈاکٹر نے مسکرا کر تسلی دیتے ہوئے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔

"شہیر نے ایسا کیوں کیا......؟اف خدایا......!وہ اس حد تک ہائپر ہو سکتا ہے......وہ تو بہت خاموش اور سنجیدہ انسان ہے" سمیر نے حیرت سے کہا......

مسز فاخر نے اس کی بات سن کر رونا شروع کر دیا۔

"ممی......پلیز......ایسا مت کریں......وہ اب ٹھیک ہے" سمیر نے ماں کو اپنے ساتھ لگا کر تسلی دی......مگر ہاسپٹل کے کوریڈور میں ان کی سسکیوں اور آہوں کی آواز واضح طور پر سنائی دینے لگی۔

☆

سمیر، شہیر کے بیڈ روم میں گیا اور اس کے کمرے کی تلاشی لینے لگا......اس نے اس کا موبائل آن کیا جو نجانے کتنے روز سے بند تھا......شہیر نے سکرین سیور پر لکھا ہوا تھا "لو یو زل" سمیر چونکا، اس نے سارا موبائل چیک کیا اس میں ایک میسج saved تھا۔

"زل......میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا......لو......یو......شہیر"

سمیر کی آنکھیں حیرت سے پھیلنے لگیں......پوری سکرین پر یہی الفاظ بار بار لکھے گئے تھے......سمیر سوچ میں پڑ گیا......اور اسی لمحے روشنی کا فون آ گیا......سمیر نے جیسے ہی ہیلو کہا......تو وہ ایک دم بول پڑی۔

شہیر......تم کہاں ہو؟ میں کب سے فون کر رہی ہوں مگر تمہارا فون آف تھا......موبائل کیوں آف تھا......؟"

"میں سمیر بات کر رہا ہوں......شہیر کا بڑا بھائی" سمیر نے جلدی سے تعارف کرایا۔

"آئی ایم سوری......" روشنی نے کہا۔

"کوئی بات نہیں......دراصل شہیر ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہے......وہ بہت بیمار ہے" سمیر نے اسے بتایا۔

"ک......کک......کیا ہوا اسے؟" روشنی نے گھبرا کر پوچھا۔

"کچھ خاص نہیں----stomach کچھ اپ سیٹ ہے......" سمیر نے ٹالتے ہوئے کہا......روشنی نے کچھ تفصیلات پوچھیں اور موبائل بند کر دیا۔

"کم از کم......اسے تو خبر کرنی چاہیے جس کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا ہے......" سمیر موبائل کو ہاتھ میں پکڑ کر سوچنے لگا اور کافی دیر سوچنے کے بعد زل کا نمبر ملایا......"زل نے ہیلو کہا۔

"آئی ایم سمیر......شہیر کا بڑا بھائی......کیا آپ زل ہیں؟" سمیر نے پوچھا۔

"جی......ہاں......" زل نے جواب دیا۔

"شہیر......ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہے......" سمیر نے بتایا۔

''کیوں......کیا ہوا......اسے؟'' وہ قدرے سرد لہجے میں بولی۔

''میرا خیال ہے......کہ جب کوئی suicide کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کی reasons کیا ہو سکتی ہیں''

"suicide"؟ زمل نے حیرت سے چونکتے ہوئے کہا۔

''ہاں......اس نے attempt کی ہے......مگر شکر ہے بچ گیا ہے ابھی ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہے......'' سمیر نے کہا۔

''کیا......اس نے میرے بارے میں آپ کو......؟'' زمل نے پوچھنا چاہا۔

''نہیں......اس کے موبائل میں ایک میسج دیکھ کر میں نے آپ کو فون کیا ہے......کہ آپ کو بھی اس کا علم ہونا چاہیے کہ وہ آپ کی محبت میں کس حد تک جا سکتا ہے'' سمیر نے سنجیدگی سے کہا۔

''ہم......میں......ایسی کوئی بات نہیں تھی......'' زمل بمشکل بولی۔

''ٹھیک ہے......آپ کہتی ہیں تو میں مان لیتا ہوں......مگر......شاید......شہیر اس بات کو نہ مانے......'' شہیر نے کہہ کر فون بند کر دیا۔

زمل سمیر کی باتیں سن کر پریشان ہوگئی......اسے قطعی امید نہیں تھی کہ شہیر اس کی محبت میں اس قدر دیوانہ بھی ہو سکتا ہے......وہ تو اس کی محبت کو یونہی اس کی دل لگی سمجھتی رہی......اور انتہائی کوشش کے باوجود بھی اس کے دل نے شہیر کو ایک لمحے کے لئے بھی قبول نہیں کیا......وہ جب بھی اپنے دل سے پوچھتی......تو اس کو جواب نفی میں ملتا......

نہیں......شہیر وہ شخص نہیں......جس کے نام وہ اپنی محبت، چاہت اور زندگی کر دے اس نے کئی بار اپنے دل سے پوچھا......بار بار پوچھا......مگر جواب نفی میں ملتا......میں شہیر سے کبھی بھی محبت نہیں کر پاؤں گی......'' اس کا دل جواب دیتا۔

''مگر اب یہ سب کیا ہو گیا تھا......ارسلان کو اس کے گھر والوں نے کتنی مشکل سے قبول کیا تھا......یہ وہی جانتی تھی......اس نے اپنی زندگی کو ختم کرنے کی دھمکیاں دیں تھیں......اور......شہیر نے اس کی خاطر خودکشی کر لی تھی۔ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے......؟ میں کس الجھن کا شکار ہو رہی ہوں......مگر......جو کچھ بھی ہوا ہے وہ بہت شاکنگ ہے......مجھے......شہیر کو دیکھنے......اور اسے تسلی دینے کے لئے ہاسپٹل جانا چاہیے......'' اس نے سنجیدگی سے سوچا......اور گھر سے باہر چلی گئی۔

☆

شہیر کی بیماری کی خبر سن کر روشنی بے تاب ہوگئی......اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کے دل پر کسی نے نشتر چلا دیا ہو......شہیر کسی تکلیف میں مبتلا ہو......اور اسے خبر ہی نہ ہو......یہ کیسے ممکن ہے؟

جس روز سے شہیر سے اس کا رابطہ منقطع ہوا تھا اس کا دل بری طرح بے چین اور بے قرار ہو رہا تھا......اور اسے اس بے قراری کی وجہ صرف اور صرف شہیر معلوم ہوتا تھا مگر شہیر اس سے بات کیوں نہیں کر رہا تھا......اس کی وجہ جان کر وہ زخمی پرندے کی طرح پھڑ پھڑانے لگی اور گاڑی کی چابی لے کر سمیر کے بتائے ہوئے ہاسپٹل کی طرف چل پڑی۔

شہیر کو میری محبت اور توجہ کی ضرورت ہے...... میں کب تک اپنی انا کو اپنی محبت پر ترجیح دیتی رہوں گی...... میں آج اس سے خود اظہار محبت کروں گی...... وہ اس وقت بیمار ہے اور میری محبت...... میری چاہت اس کی بیماری میں مرہم کا کام کرے گی...... اس نے پرعزم ہو کر سوچا...... اس لمحے اس کے ذہن میں صرف شہیر اور اس کی زندگی اہم تھی...... اس کی عزت اور انا، اب پس منظر میں چلی گئی تھی۔

وہ ہاسپٹل میں داخل ہوئی تو ریسپشنسٹ سے شہیر کے روم کا پوچھ کر کوریڈور میں داخل ہوئی...... اس نے کمرے کا مطلوبہ نمبر پڑھا...... دروازہ تھوڑا سا کھلا تھا...... وہ دستک دینے لگی مگر ایکدم ٹھٹک گئی...... وہ کمرے میں زل کی جھلک دیکھ کر چونکی۔ اس کے چہرے پر حیرت اور تشویش کے آثار نمایاں ہونے لگے...... وہ دروازے سے ہٹ کر کھڑی ہوگئی اور بغور سننے لگی۔

''شہیر...... میں کیسے بتاؤں...... میرے پاس الفاظ نہیں...... جو میرے دل کی حالت بتا سکیں کہ میں کس قدر اذیت میں سے گزری ہوں...... میں نے بہت کوشش کی...... اپنے آپ کو سمجھانے کی...... مگر میں اپنے دل کو قائل نہ کرسکی...... میرے دل میں تمہارے لئے محبت پیدا نہیں ہوسکی......'' زل نے بمشکل کہا...... تو...... روشنی کی آنکھیں حیرت سے پھیلنے لگیں...... اس کا دل زور سے دھک دھک کرنے لگا اور زمین اسے قدموں تلے سرکتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''مجھے...... میرا قصور بتاؤ...... جو تمہارے علاوہ کسی سے محبت کا سوچ بھی نہیں سکتا'' شہیر نے سسکتے ہوئے کہا۔

روشنی کے چہرے پر پسینے کے قطرے نمودار ہونے لگے...... اسے دل کی دھڑکن ڈوبتی ہوئی محسوس ہوئی......

''آئی ایم سوری...... شہیر...... پلیز...... مجھے معاف کردو...... میں نہیں جانتی تھی کہ...... تم...... میری خاطر خودکشی بھی کرسکتے ہو......'' زل نے نم آنکھوں کو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''میں...... تمہیں کبھی بھی بھلا نہیں سکتا...... پلیز مجھے یہ مت کہو کہ میں تم سے محبت نہ کروں...... میں مرتے دم تک یہ نہیں کرسکوں گا......'' شہیر نے کہا۔

''پھر...... میری وجہ سے اپنی زندگی کو یوں برباد مت کرو...... میں گناہ کے اس احساس کے ساتھ کبھی بھی زندہ نہیں رہ سکوں گی...... اور ضروری تو نہیں کہ ہم جس کو چاہیں...... اور جس سے محبت کریں...... وہ ہمارا نصیب بھی بنے...... زندگی میں بہت کچھ ہمیں اپنی خواہشات کے مطابق نہیں ملتا......'' زل نے کہا۔

''تم ارسلان سے محبت کرتی ہو...... اور...... اس کو پا بھی لیا...... تمہاری تو خواہش پوری ہوگئی'' شہیر نے آہ بھر کر کہا تو زل خاموش ہوگئی......

کمرے میں سکوت طاری ہوگیا...... صرف شہیر کے سسکنے کی آوازیں آنے لگیں...... وہ بیڈ پر لیٹا زل کو دیکھ رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو مسلسل گر رہے تھے...... روشنی سے وہاں رکنا محال ہوگیا...... اور وہ...... وہیں سے باہر لوٹ آئی...... جلدی سے گاڑی ہاسپٹل کے گیٹ سے باہر نکالی اور انتہائی تیزی سے چلاتی ہوئی سڑک پر آگئی...... اس کا دل پھٹنے کو بے تاب ہو رہا تھا...... اس کی آنکھیں آنسوؤں کو ضبط کرنے کی وجہ سے سرخ ہونے لگی تھیں اور دل و دماغ میں ابال اٹھنے کی وجہ سے آنکھیں جل رہی تھیں اس کا رواں رواں دل میں لگی آگ سے سلگ رہا تھا...... وہ اتنی تیز

ڈرائیونگ کر رہی تھی کہ کئی بار اس نے سگنلز توڑے...... مگر اس کو گردوپیش کی کوئی خبر نہ تھی......

گھر پہنچ کر وہ سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی اور دروازہ بند کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی......

''یہ...... یہ سب کیا ہو گیا ہے......؟ وہ کسی اور سے محبت کرتا رہا...... اور...... میں خود فریبی میں مبتلا رہی...... میرے دل نے مجھے کیسے امید دلائی...... اور کیسے بہلاتا رہا...... کہ وہ مجھ سے ہی محبت کرتا ہے...... میں کیسے دھوکہ کھا گئی۔

روشنی تم اتنا بڑا دھوکہ کھا گئی...... اپنے آپ سے...... اپنے دل سے...... شہیر کی باتوں کو اپنے لئے سمجھتی رہی اس کے لفظوں سے اپنے لئے مفہوم اخذ کرتی رہی...... وہ تو اس وقت کی منتظر تھی جب شہیر خود اس سے اقرار محبت کرے گا...... اور...... وہ اس دن کے انتظار میں ایک ایک پل بے قراری سے گزار رہی تھی...... وہ اس قدر شدت سے رو رہی تھی کہ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی سانس سینے میں بند ہو رہی ہوں...... اور...... اسے کہیں سے آکسیجن نہ مل رہی ہو......

''روشنی...... محبت نے تمہیں کتنا بڑا فریب دیا ہے...... تم سے تمہارا سب کچھ چھین لیا ہے...... میں کیسے اس احساس کے ساتھ زندہ رہوں گی...... کہ میں نے اپنی یکطرفہ محبت سے دھوکہ کھایا ہے روشنی ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی...... وہ ایسے درد میں مبتلا تھی...... جس کا کوئی علاج نہ تھا اور ایسے دکھ سے دوچار ہو رہی تھی جس کا کوئی مداوا نہ تھا...... روشنی کا محبت پر سے اعتبار اٹھنے لگا تھا......

کہتے ہیں دل کو دل سے راہ ہوتی ہے...... جس کے لئے دل میں محبت اور چاہت محسوس کی جائے...... وہ بھی ویسے ہی لطیف احساسات اس شخص کے لئے اپنے دل میں محسوس کرتا ہے...... مگر روشنی کے معاملے میں یہ بات بھی غلط ثابت ہوئی تھی......

اسے زندگی بے معنی اور بے کار لگنے لگی تھی......

جیسے شہیر کو زل کے بغیر نامکمل اور ادھوری لگ رہی تھی...... روشنی کو شہیر کے بغیر سانسیں لینا بھی محال لگ رہا تھا...... اور شہیر کو زل کے بغیر......

محبت ہمیشہ دکھ دیتی ہے...... ایک بار دل میں گھر کر لے...... تو اس دل کو برباد کر کے رکھ دیتی ہے...... اور روشنی کے دل کی دنیا مکمل طور پر برباد ہو گئی تھی۔

شہیر کے نام نے آکٹوپس کی طرح اس کے دل کو اپنی زہریلی ٹانگوں میں جکڑا تھا...... اور اب یوں چھوڑا تھا کہ اس کا دل مردہ ہو چکا تھا......

☆

''ممی...... شہیر کا دل بری طرح ٹوٹا ہے...... اس لئے پلیز...... آپ کو اپنا رویہ اس کے ساتھ بدلنا ہو گا...... ڈاکٹر کہہ رہا تھا وہ ایک بار attempt کر چکا ہے...... دوبارہ بھی کر سکتا ہے ہمیں اس کی زندگی کی خاطر...... اسے خوش رکھنا ہے...... اسے زندگی کی طرف واپس لانا ہے ممی...... وہ زندگی کی امید چھوڑ چکا ہے...... ہمیں اس کے اندر یہ امید دوبارہ پیدا کرنی ہے۔'' سمیر نے بہت سنجیدہ لہجے میں مسز فاخر سے باتیں کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... ہمارے لئے اس کی زندگی سب سے اہم ہے......'' مسز فاخر نے بھی سنجیدگی سے جواب دیا۔

شہیر کو کئی روز بعد ہاسپٹل سے گھر شفٹ کیا گیا...... مسز فاخر نے اس کا بیڈروم نیچے شفٹ کر دیا تا کہ وہ اور گھر کے دوسرے افراد ہر وقت اس کی دیکھ بھال کر سکیں اور اس کے پاس آتے جاتے رہیں۔

شہیر گھر آنے کے بعد مکمل طور پر خاموش رہتا تھا...... وہ نیچے بیڈروم میں اپنے آپ کو اجنبی محسوس کرتا تھا اس لئے پھر اوپر شفٹ ہو گیا......

کالج کھل چکے تھے...... مگر اس نے کالج جانا بھی چھوڑ دیا تھا...... دوستوں کی فون کالز اس کے موبائل پر آتیں تو ان سے چھٹکارا پانے کے لئے اس نے نمبر بدل لیا۔ اس کا ہر ایک سے رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔ سمیر اس کے ساتھ بہت محنت کر رہا تھا...... وہ اس کو لے کر باہر گھومنے جاتا...... اس کے ساتھ باتوں میں مصروف رہتا...... مسز فاخر نے بھی اپنا رویہ بہت بدل لیا تھا...... وہ شہیر کی کسی بات کا الٹا جواب نہ دیتیں...... فاخر حسین کے ساتھ بھی شہیر کی موجودگی میں بالکل نہ جھگڑتیں......

بظاہر وہ نارمل ہوتا جا رہا تھا...... مگر جو آگ اس کے دل میں لگی تھی...... وہ کسی بھی پل نہ بجھتی...... وہ ہر وقت اندر ہی اندر سلگتا رہتا...... اندر کی سلگتی آگ کو وہ اپنے سگریٹوں کے دھوئیں سے اڑانے کی کوشش کرتا...... وہ کثرت سے شراب نوشی اور سگریٹ نوشی کرنے لگا تھا کہ ان کے بغیر اسے کسی پل چین نہ آتا۔ دن کا آغاز وہ سگریٹ سے کرتا اور رات کا آغاز شراب نوشی سے......

''شہیر...... پلیز...... ڈرنک کرنا چھوڑ دو...... اس سے تمہاری صحت بہت خراب ہو رہی ہے'' ڈیڈی اور سمیر نے ایک روز اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''والدین اپنی بہت سی عادتیں...... اولاد کو منتقل کرتے ہیں اور مجھے یہ عادت آپ سے ملی ہے...... جب آپ چھوڑیں گے تو میں بھی چھوڑ دوں گا'' شہیر نے قدرے طنزیہ انداز میں کہا کہ ڈیڈی نظریں چرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگے...... سمیر نے دونوں کی طرف دکھ بھرے انداز میں دیکھا۔

''کیا یہ ضروری ہے کہ والدین کی بری عادتیں ہی اپنائی جائیں......'' سمیر نے خفگی سے کہا۔

''یہ تو جینز پر منحصر ہے...... کہ وہ کیا دیتے ہیں...... والدین کی خوبیاں یا خامیاں......'' شہیر نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

سمیر نے ڈیڈی کی طرف ایسی نظر سے دیکھا جس میں بہت مفہوم اور شکوے تھے...... اس نے گہری سانس لی اور وہ بھی کمرے سے باہر نکل گیا......

☆

ایگزامز شروع ہو گئے تھے مگر روشنی اور شہیر ایگزامز بھی نہیں دے رہے تھے...... سنا تھا کہ روشنی بیرون ملک اپنے والد کے پاس چلی گئی تھی...... اور...... شہیر بیمار ہونے کی وجہ سے پیپرز نہیں دے رہا تھا......

مگر زل بخوبی جانتی تھی کہ وہ ایگزامز کیوں نہیں دے رہا تھا...... صرف اور صرف زل کی وجہ سے......

اس نے ہاسپٹل میں اس سے کہا تھا......

''میں کوشش کروں گا کہ زندگی میں کبھی تمہارا سامنا نہ کروں...... ورنہ......'' اس نے منہ موڑتے ہوئے کہا اور زل کے کانوں میں اس کے

الفاظ بار بار گونجتے تھے جب وہ ہر روز کالج جاتی تھی...... کالج جاتے ہوئے...... کالج میں پڑھائی کے دوران...... اور کالج سے واپسی پر...... ہر لمحہ ہر پل...... اس کا ذہن الجھا رہتا...... ارسلان سے منگنی کے بعد وہ بہت بجھی بجھی رہتی...... ارسلان اس سے پوچھتا رہتا...... مگر وہ کوئی جواب نہ دیتی۔

''کیا...... تم مجھ سے منگنی کر کے پچھتا رہی ہو؟'' ارسلان کبھی کبھی اس سے دبے الفاظ میں احتجاج کرتے ہوئے کہتا۔

''نہیں......'' وہ آہ بھر کر جواب دیتی۔

اس کا دل بہت مضطرب رہنے لگا تھا...... وہ اپنے آپ کو بارہا سمجھاتی...... مگر کوئی شے اندر ہی اندر اسے کسی چبھن کی طرح تکلیف میں مبتلا رکھتی......

''شہیر...... میں اپنے دل کو تمہاری محبت کے لئے مجبور نہیں کر پائی...... تمہارے اظہار محبت کے بعد میں نے تمہارے بارے میں بہت سوچا...... مگر تمہارے لئے نرم احساسات پیدا نہیں ہو سکے۔ اپنے دل کو کسی کی محبت کے لئے قائل کرنا بہت مشکل کام ہوتا ہے میں کیا کروں......؟'' وہ جھنجھلا کر سوچتی...... مگر جتنا زیادہ سوچتی اتنا ہی مضطرب رہنے لگی تھی۔ ارسلان کو پانے کی خوشی کو وہ صرف چند روز سے زیادہ انجوائے نہیں کر پائی تھی...... یوں لگتا تھا...... اس کی خوشی کہیں کھوگئی ہو...... غم دل میں ٹھہر گیا ہو اور اداسی نے اس کی خوبصورت جھیل سی آنکھوں کی رنگت کو ملگجا کر دیا ہو۔

''ارسلان...... ہم شادی کب کریں گے؟'' ایک روز زل نے انتہائی مضطرب ہو کر اس سے سوال کیا۔

''زل...... کم آن...... یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ ابھی ہمارے فائنل ایگزامز نہیں ہوئے...... میں نے ابھی جاب تلاش کرنی ہے...... میرے حالات اس قابل نہیں کہ ہم شادی کر سکیں...... اور تمہیں یہ اچانک کیا سوجھی ہے...... تم تو صرف منگنی کا کہتی تھی...... شادی کے بارے میں...... تم نے کوئی پلاننگ نہیں کی تھی...... پھر...... یہ سب کیوں......؟'' ارسلان نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

''میں تمہارے ساتھ ہر قسم کے حالات میں گزارہ کر لوں گی...... مگر پلیز...... شادی کے بارے میں سوچو'' زل نے التجائیہ انداز میں کہا۔

''کب تک......؟'' ارسلان نے حیرت سے پوچھا۔

''اسی ماہ...... یا...... اگلے ماہ'' زل نے قطعیت سے جواب دیا۔

''اتنی جلدی...... کیا تم مجھے اس کی وجہ بتا سکتی ہو؟'' ارسلان نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''پلیز...... مجھ سے کچھ مت پوچھو...... بس گھر کے حالات کچھ ایسے ہو گئے ہیں کہ مجھے یہ فیصلہ کرنا پڑا ہے......'' زل نے سنجیدگی سے جواب دیا تو ارسلان خاموش ہو گیا۔

''ٹھیک ہے...... میں کچھ سوچتا ہوں...... مگر میری مالی حالت اتنی مستحکم نہیں...... کہ......'' ارسلان نے کہا۔

''مجھے کچھ نہیں چاہیے...... اور نہ ہی میری خواہشات اتنی زیادہ ہیں...... کہ تمہیں کسی بات کے لئے مجبور کروں......'' زل نے جواب دیا تو ارسلان اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

☆

سمیر کے بہت قائل کرنے پر شہیر نے ڈرنک کم کردی تھی...... وہ رات دیر تک اس کے کمرے میں بیٹھا اس سے باتیں کرتا رہتا...... کبھی اس کے ساتھ chess کھیلتا...... کبھی کیرم...... کبھی اسے ڈنر کے لئے باہر لے کر جاتا...... سمیر نے اس کی خاطر اپنی ساری سرگرمیاں ختم کر دیں تھیں...... اس کی اسٹڈیز مکمل ہو چکی تھی اور وہ انگلینڈ میں ہی جاب کرنے کا ارادہ رکھتا تھا...... مگر شہیر کی خاطر اس نے واپس جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا...... مسز فاخر کو اس بات کا بخوبی احساس تھا اور وہ سمیر کی اور قدر دان ہو گئیں تھیں...... ایک شام اسامہ اور ارسلان شہیر سے ملنے آئے...... تو شہیر کو دیکھ کر چونک گئے...... اس کی سانولی رنگت کالی ہو چکی تھی اور وہ بے حد کمزور لگ رہا تھا۔ سرخ آنکھوں میں ٹھہری غمی اور اداسی اس کے ویران دل کی عکاس تھی۔

''ہم تمہیں انوائیٹ کرنے آئے ہیں......'' اسامہ نے اسے شادی کا کارڈ پکڑاتے ہوئے کہا۔

''کیا تم شادی کر رہے ہو؟'' شہیر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''یار...... میری قسمت اتنی تیز کہاں......؟ یہ ارسلان اور زمل کی شادی کا کارڈ ہے'' اسامہ نے کہا...... تو شہیر کی سانس ایک دم رکنے لگی...... اس نے حسرت بھری نگاہوں سے ارسلان کی طرف دیکھا۔ نجانے کہاں سے نمی آنکھوں میں بھر گئی۔

''مبارک ہو......'' وہ جلدی سے یوں بولا...... کہیں اس کی آواز میں اس کی آنکھوں کی نمی اور دل کی کپکپاہٹ نہ شامل ہو جائے۔

''تھینکس...... اور تمہیں ضرور آنا ہے......'' ارسلان نے مسکراتے ہوئے کہا...... شہیر نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس اس کی طرف یوں دیکھتا رہا...... جیسے اس کی قسمت پر رشک کر رہا ہو۔ ان کے جانے کے بعد اس کا دل اس قدر بے تاب ہونے لگا کہ اس کی سانس گھٹنے لگی...... شدید غم کو ضبط کرنے کی ناکام کوشش کے باوجود اس کی آنکھیں بری طرح برسنے لگیں اس کے سینے میں ایک دم شدید درد اٹھا...... اور پھر اسے ہوش نہ رہی...... کہ وہ کہاں ہے؟

جب ہوش آئی تو وہ cardiac ہاسپٹل کے ICU میں انتہائی گھمبیر خاموشی سے بستر پر لیٹا تھا۔ اسے آکسیجن لگی تھی...... اس نے نظریں دوڑا کر ارد گرد دیکھا...... تو ہر طرف زمل اور ارسلان کی شادی کا کارڈ نظر آ رہا تھا اور ان کے سنگ ارسلان کا مسکراتا چہرہ...... زمل کی خوبصورت جھیل سی آنکھیں......

''میں پھر کیوں بچ گیا ہوں؟'' اس نے دکھ بھرے انداز میں سوچا...... جب اسے معلوم ہوا کہ اسے انجائنا اٹیک ہوا تھا......

☆

''نجانے کیوں...... شہیر...... اس لڑکی کے بارے میں اس قدر سیریس ہو گیا ہے...... میرا تو دل چاہتا ہے...... ایک بار اسے ملوں اور پوچھوں کہ میرے بیٹے نے کیا قصور کیا ہے جو تم اس کی جان کے درپے ہو...... کیا ضرورت تھی اسے شادی کا کارڈ بھیجنے کی......'' مسز فاخر غصے سے بول رہی تھیں۔ فاخر حسین اور سمیر بھی کامن روم میں بیٹھے اس بات کو ڈسکس کر رہے تھے۔ شہیر گھر آ چکا تھا اور اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔

''میرا خیال ہے...... ہم بھی شہیر کی شادی کر دیتے ہیں...... ہو سکتا ہے اس کا بھی غم کچھ کم ہو جائے......'' فاخر حسین نے اچانک رائے دی تو سمیر اور تہمینہ نے حیرت سے فاخر حسین کی طرف دیکھا...... اور سب ایک لمحے کے لئے خاموش ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

''ہاں...... ڈیڈی ٹھیک کہہ رہے ہیں...... اس وقت وہ بہت ڈسٹرب ہے...... اور اسے کسی ایسے ہمدرد کی ضرورت ہے جو ہر وقت اس کے ساتھ ہو'' سمیر نے مشورہ دیا۔

''ٹھیک ہے.....میں تیمور بھائی سے بات کرتی ہوں.....ویسے تو میں نے بچپن سے ہی حرا کو تمہارے لئے.....اور حنا کو شہیر کے لئے سوچ رکھا ہے.....ان سے بات کر کے تم دونوں کی ہی شادی کر دیتی ہوں.....تمہارا کیا خیال ہے؟'' مسز فاخر نے سمیر سے پوچھا۔

''ٹھیک ہے.....جیسے آپ کی مرضی'' سمیر نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

''شہیر کی طبیعت بھی کچھ بہتر ہو جائے تو اس سے پوچھ کر تیمور بھائی سے بات کروں گی'' مسز فاخر نے کہا تو سمیر اور فاخر حسین خاموش ہو گئے.....

☆

شہیر کی میڈیسنز کا ٹائم ہو رہا تھا اور وہ ابھی تک سو رہا تھا۔ سمیر اسے خود مقررہ اوقات پر دوائیں کھلاتا تھا.....وہ اس کے بیدار ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔

''شہیر.....اٹھو.....میڈیسنز کا ٹائم ہو رہا ہے'' سمیر نے اسے ہلاتے ہوئے کہا مگر وہ نیم بیہوشی میں تھا.....آنکھیں کھول کر پھر سو گیا.....سمیر صوفے پر بیٹھ کر اس کے اٹھنے کا انتظار کرنے لگا اور ممی کی باتوں پر غور بھی کرنے لگا۔ اسے حرا شروع سے ہی بہت پسند تھی.....اور جب سے اسے مل کر آیا تھا۔ تب سے اس کے ساتھ رابطے میں تھا۔ وہ اسے بہت حد تک اپنی ہم مزاج لگتی تھی۔ وہ اسی کی طرح خوش مزاج، ہنس مکھ اور زندگی کو انجوائے کرنے والی تھی جبکہ حنا سنجیدہ مزاج اور بہت سوبر تھی.....مطلب کی بات کرتی ورنہ زیادہ تر خاموش رہتی.....سمیر ممی کی بات سن کر بہت خوش ہوا تھا.....وہ جلد از جلد حرا کو یہ خبر سنانا چاہتا تھا.....مگر اپنے کمرے میں جا کر.....لیکن کمرے میں جانے سے پہلے شہیر کو دوائیں کھلانا بہت ضروری تھا.....

اچانک اس کا موبائل بجنے لگا.....حرا کا فون تھا.....شہیر موبائل کی تیز رنگ ٹون سے جھنجھلا کر بیدار ہو گیا اور آنکھیں کھول کر سمیر کی طرف دیکھنے لگا۔ سمیر خوشی سے حرا کو آہستہ آہستہ ساری بات بتا رہا تھا۔ شہیر آنکھیں بند کر کے سننے لگا.....اسے صرف ایک جملہ سنائی دیا۔

''حرا.....آئی لو یو ٹو مچ'' اور سمیر نے فون آف کر دیا۔

وہ جملہ بار بار شہیر کے ذہن میں گونجنے لگا۔

''زل.....آئی لو یو ٹو مچ''.....آئی لو یو.....زل.....''زل.....آئی لو یو ٹو مچ'' شہیر آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگا۔

سمیر نے اس کی سرگوشیوں کی آواز سنی اور اس کی طرف بڑھ کر آواز دی۔

''شہیر.....پلیز اٹھو.....میڈیسنز کا وقت ہو رہا ہے'' سمیر نے قدرے ملائمت سے کہا تو وہ آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھنے لگا اور خاموشی سے اٹھ بیٹھا.....سمیر نے اسے دوائیں کھلائیں اور اسے لٹا کر کمرے سے باہر نکل گیا.....

شہیر کا سر بوجھل ہو رہا تھا اور بہت زیادہ سونے سے آنکھیں کھل نہیں رہی تھیں.....اس کی غنودگی ابھی بھی ختم نہیں ہو رہی تھی.....اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا دماغ گھڑی کی سوئیوں کی مانند ٹک ٹک بج رہا ہو.....اس نے آنکھیں کھول کر بے بسی سے چھت کی طرف دیکھا اور بغیر پلکیں جھپکائے اسے دیکھتا ہی رہا.....آنسو اس کی پتھرائی آنکھوں سے گر گر کر تکیے میں جذب ہونے لگے۔

☆

''بیٹا...... میں سوچ رہی ہوں۔ آج تمہارے ماموں تیمور سے حرا اور حنا کے لئے بات کروں...... لیکن اس سے پہلے شہیر کی رائے جاننا بھی ضروری ہے...... اب شہیر کی طبیعت بھی پہلے سے بہتر ہے...... کیوں نا اس سے بات کر لی جائے'' مسز فاخر نے سمیر کو دیکھ کر کہا جو شہیر کے کمرے سے باہر نکل کر ان کے پاس لاؤنج میں آیا تھا۔

''ہاں...... ٹھیک ہے...... میں اس کو بلاتا ہوں'' سمیر نے کہا اور واپس جا کر اسے اپنے ساتھ لے کر آیا۔

''آؤ بیٹا...... اب کیسے ہو؟'' مسز فاخر نے محبت بھرے انداز میں شہیر سے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں......'' اس نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

''یہاں بیٹھو...... میرے پاس۔ آج میں نے تم سے ایک اہم بات کرنی ہے'' مسز فاخر نے کہا تو شہیر نے چونک کر انہیں دیکھا اور ان کے پاس بیٹھ گیا۔

''ہم سب سوچ رہے ہیں...... تمہاری شادی کر دی جائے'' مسز فاخر بولتے ہوئے رک کر اس کی جانب دیکھنے لگیں۔

''شادی......؟'' اس نے حیرت سے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔

''ہاں...... اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟'' مسز فاخر نے کہا۔

''مجھے شادی نہیں کرنی......'' وہ آہ بھر کر بولا۔

''کیوں......؟ اور کس کی خاطر......؟'' مسز فاخر نے پوچھا۔

''کسی کی خاطر نہیں'' وہ آہستگی سے بولا۔

''کوئی کام نہ کرنے کی...... کوئی وجہ بھی تو ہونی چاہیے...... محض ایک سوچ کی خاطر پوری زندگی کو داؤ پر لگانا کہاں کی عقلمندی ہے'' مسز فاخر نے کہا۔

''شہیر...... شادی کرنے سے تمہیں ایک ایسا ہمدرد ساتھی مل جائے گا...... جو تمہارے دکھ کو سمجھے گا......'' سمیر نے کہا۔

''بس میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ حنا کے ساتھ تمہاری شادی کر دوں......'' مسز فاخر نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

شہیر ان کی بات سن کر چونکا اور اس کے کانوں میں سمیر کے الفاظ گونجنے لگے۔

''حرا...... آئی لو یو ٹو مچ''

شہیر کچھ دیر سوچتا رہا...... سمیر اور مسز فاخر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

''تمہارا کیا خیال ہے......؟'' مسز فاخر نے پھر پوچھا۔

''حرا...... کیوں نہیں......؟'' شہیر نے ایک دم کہا تو مسز فاخر اور سمیر دم بخود رہ گئے...... انہیں اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا...... مسز فاخر ہونٹ چبانے لگیں اور بے بسی سے سمیر کی طرف دیکھا...... جو ممی سے حرا کے بارے میں کئی بار بات کر چکا تھا...... اور وہ اس کی پسندیدگی کو اچھی

طرح جانتی تھیں۔ سمیر کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا...... وہ لمحہ اس پر کتنا بھاری ہو رہا تھا...... یہ صرف وہی جانتا تھا...... اس کی محبت اس کی چاہت...... کو کوئی اور چھین رہا تھا...... اور چھیننے والا اس کا اپنا بھائی تھا...... وہ بھائی...... جسے وہ بہت چاہتا تھا اور جس کو زندگی کی طرف واپس لانے کے لئے اس نے کتنی تگ و دو کی تھی...... اب وہ خود ہی اسے کیسے اس دلدل کی طرف دھکیل دیتا...... جس کی زندگی کے لئے وہ دن رات اس کی تیمارداری کرتا تھا...... وہی اس سے اس کی محبت چھین رہا تھا...... جس کی چاہت میں اس نے اپنی جاب اور اپنا مستقبل داؤ پر لگایا تھا...... وہ اس سے اس کی چاہت طلب کر رہا تھا...... حرا اس سے محبت کرتی تھی...... اور...... وہ حرا سے...... مگر یہ کیسا مشکل مرحلہ آ رہا تھا...... قدرت نے اس کے لئے کیسی آزمائش تیار کر رکھی تھی...... کہ اس کی حرا...... اس سے دور جا رہی تھی......

ہر طرف گھمبیر خاموشی طاری ہو گئی...... مسز فاخر سمیر کے فیصلے کی منتظر تھیں...... اور سمیر اپنے آپ سے جنگ کرنے میں مصروف تھا...... اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا...... اس کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں۔

شہیر معنی خیز انداز میں کبھی ممی کی طرف دیکھنے لگا...... کبھی سمیر کی طرف...... جیسے دل ہی دل میں خوش ہو رہا ہو...... انہیں آزمائش میں ڈال کر وہ اندر ہی اندر اس صورت حال سے لطف اندوز ہو رہا تھا...... سمیر کے چہرے سے وہ اس کے دل کی کیفیت کو جان رہا تھا...... اور اسے سمیر کے الفاظ...... اور اس کے چہرے کی بدلتی رنگت اسے حرا سے اس کی محبت کی داستان سنا رہی تھی...... اسے ایک لمحے کے لئے بھی سمیر کی محبتوں...... اس کی قربانیوں کا احساس نہیں ہو رہا تھا...... اس کے ذہن میں صرف ایک ہی بات تھی......

''اگر مجھے میری محبت نہیں ملی...... تو...... پھر...... کسی اور کو کیوں ملے؟ جب کسی کی محبت چھنتی ہے...... تو کیسا احساس ہوتا ہے...... وہ اپنی نظروں سے دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے اندر انتقامی جذبے اتنی قوت اور شدت سے سر اٹھا رہے تھے کہ وہ اس صورت حال سے ایک مخصوص سی لذت محسوس کر رہا تھا وہ لمحے جب کوئی کسی دوسرے پر حاوی ہونے کی کوشش کرتا ہے اور دوسرا اپنی کوشش کے باوجود مدافعت نہیں کر پاتا...... اور اس کی کمزوری پہلے کی طاقت بننے لگتی ہے...... اور وہ اس طاقت سے اپنے اندر ایک عجیب سی سرشاری محسوس کرتا ہے تو اس وقت وہ تمام نازک احساسات، جذبے اور رشتے بھول جاتا ہے...... اور وہ اس طاقت کو تقویت دینے کے لئے مزید انتقامی کارروائیوں پر اتر آتا ہے...... اسے تو اپنے دل کی تسکین چاہیے ہوتی ہے......

''ممی...... شہیر کو حرا پسند ہے تو آپ حرا سے ہی اس کی شادی کر دیں......'' سمیر بمشکل بول پایا...... اس کی آواز میں چھپی آنسوؤں کی نمی...... نمایاں تھی...... جسے مسز فاخر محسوس کیے بغیر نہ رہ سکیں۔

''مگر......'' مسز فاخر نے کچھ کہنا چاہا......

''مگر...... وگر...... کچھ نہیں...... ہمیں تو شہیر کی زندگی اور اس کی خوشی عزیز ہے...... اگر شہیر کو حرا پسند ہے...... تو حرا کے ساتھ ہی اس کی شادی ہونی چاہیے'' فاخر نے کہا۔

شہیر نے فاتحانہ انداز میں سمیر کی طرف دیکھا اور مسکرانے لگا۔

''ٹھیک ہے.....میں کل ہی تیمور بھائی سے بات کرتی ہوں'' مسز فاخر نے بہت آہستہ اور مایوس کن لہجے میں کہا۔

''شہیر اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

''یہ..... یہ.....تم نے کیا کیا.....؟ تم حرا کو پسند کرتے ہو.....اور وہ تم سے محبت کرتی ہے.....تم.....سمیر.....تم کیسے برداشت کر پاؤ گے.....کہ.....وہ اس گھر میں تمہارے سامنے.....اوہ نو.....'' مسز فاخر خفگی اور دکھ بھرے لہجے میں بولیں۔

''ممی.....آپ سوچ نہیں سکتیں.....کہ میں نے یہ فیصلہ کس قدر مشکل سے کیا ہے.....مگر شہیر کی زندگی کی خاطر مجھے یہ فیصلہ کرنا پڑا.....اس کا دل پہلے ہی ٹوٹ چکا ہے.....اور میں نہیں چاہتا.....کہ اس بار پھر وہ ٹوٹے.....اور اس کا ذمہ دار میں ہوں.....ممی.....شہیر نے جان بوجھ کر مجھے آزمائش میں ڈالا ہے.....میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ حرا سے محبت نہیں کرتا.....وہ صرف اور صرف زل سے محبت کرتا ہے.....وہ مجھے اور آپ کو آزمانا چاہتا ہے.....کہ ہم اس سے کتنی محبت کرتے ہیں مگر وہ یہ نہیں جانتا کہ محبت کرنے والے تو پہلے ہی آزمائش میں سے گزر رہے ہوتے ہیں.....میں حرا کو سمجھا دوں گا.....اور میں حنا سے شادی نہیں کر سکتا.....میں شہیر کی شادی کے بعد انگلینڈ واپس چلا جاؤں گا'' سمیر نے اپنا فیصلہ سنایا تو مسز فاخر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں.....ورنہ وہ بہت کم روتی تھیں.....وہ ایک بہادر اور حوصلہ مند عورت تھیں۔

''ممی.....پلیز.....ایسا مت کریں.....ورنہ میرا حوصلہ ٹوٹ جائے گا.....دعا کریں.....ہماری یہ کوشش رائیگاں نہ جائے اور شہیر ٹھیک ہو جائے.....محبت.....تو شاید پھر کبھی نہ کبھی.....کسی نہ کسی موڑ پر.....مل جائے گی.....شہیر کو پھر کچھ ہو گیا.....تو ہم اسے دوبارہ کہاں سے لیں گے'' سمیر نے نم آنکھوں سے کہا تو مسز فاخر والہانہ انداز میں اس کو چومنے لگیں.....سمیر نے انہیں اپنے ساتھ لگایا اور وہ بھی بے بس ہو کر رونے لگا۔

''مجھے فخر ہے.....کہ میں نے تم جیسے بیٹے کو جنم دیا'' ممی نے اسے چومتے ہوئے کہا تو سمیر سسکیاں بھرنے لگا.....

ہر طرف دونوں کی دبی دبی سسکیوں کی آواز سنائی دینے لگی۔

☆

مسز فاخر نے تیمور سے بات کی تو وہ خاموش ہو گئے۔ حرا کو جیسے ہی خبر ملی.....اس نے سمیر کو فون کیا.....وہ اس لمحے شہیر کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھا اسے زبردستی کھانا کھلا رہا تھا۔ اس نے اس کی کال ریجیکٹ کی اور فون آف کر دیا۔ شہیر نے اپنے دل میں اک خوشی سی محسوس کی۔ شہیر کو کھانا کھلا کر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا اور حرا کو فون کیا.....سمیر کے لہجے میں بہت سنجیدگی اور ٹھہراؤ تھا۔ حرا رو رہی تھی۔

''حرا.....پلیز.....کسی کی زندگی کی خاطر.....کوئی سوال مت کرنا.....'' سمیر نے کہا۔

''سمیر.....آپ مجھے ہی قربانی کا بکرا کیوں بنا رہے ہیں۔ اس سے بہتر ہے میں ساری زندگی شادی نہ کروں.....کیا آپ کو معلوم ہے.....آپ میرے ساتھ کتنا بڑا ظلم کر رہے ہیں'' حرا نے روتے ہوئے کہا۔

''نہیں.....میں تو اپنے آپ پر ظلم کر رہا ہوں.....شہیر کی زندگی کی خاطر.....حرا کیا تم میرے احساسات کو سمجھ سکتی ہو.....؟ میں اس لمحے کس عذاب سے گزر رہا ہوں.....شاید تم اندازہ بھی نہیں کر سکتی.....محبت کرنے والے تو ایسے مراحل سے اکثر گزرتے ہیں.....ہر دور میں آزمائش

ان کا مقدر رہی ہیں......شاید ہم دونوں کا بھی یہی مقدر ہے......حرا......وعدہ کرو......اس فیصلے پر کبھی نہ پچھتانا......زندگی میں جب پچھتاوے شامل ہو جاتے ہیں تو زندگی......زندگی نہیں رہتی......نہ ختم ہونے والا عذاب بن جاتی ہے" سمیر نے کہا تو حرا سسکنے لگی......جواباً سمیر اس کو کچھ بھی نہ کہہ سکا نہ کوئی تسلی دے سکا......اور نہ ہی امید دلا سکا۔ بس خاموشی سے حرا کی سسکیاں سنتا رہا اور کچھ کہے، سنے بغیر روتے ہوئے فون بند کر دیا۔

☆

زل اور ارسلان کی شادی کو چند روز ہو گئے تھے......ارسلان اور اس کے گھر کے ماحول میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ عرش سے فرش پر آ گئی ہو......مگر اس فرش پر مخمل کا بچھونا ہو......جو ارسلان کا دل تھا......ارسلان اس کی جتنی پذیرائی کر سکتا تھا......اس سے بڑھ کر کی تھی......وہ جتنی محبت کی توقع اس سے کر سکتی تھی......ارسلان نے اس سے بڑھ کر اس کو دی تھی......اپنی ساری تمنائیں، چاہتیں اس کی خوشیوں پر نچھاور کیں تھیں وہ اپنی خوش مزاجی سے اس کے دل کی دنیا کو خوش رکھنے کی بھرپور کوشش کرتا......اسے اپنی خامیوں اور گھریلو پسماندگی کا اچھی طرح احساس تھا مگر وہ ہر ممکن طریقے سے زل کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا مگر نجانے کہاں کمی تھی کہ زل کا دل کسی بھی پل مطمئن نہیں ہو پا رہا تھا......محبت پا کر بھی وہ خوش نہیں تھی اور محبت سے سیراب ہو کر وہ اور پیاسی ہو گئی تھی......بظاہر کسی شے کی کمی نہ تھی مگر یوں محسوس ہوتا تھا جو محبت اسے ملی ہے وہ ادھوری ہے......ارسلان جو چاہے اس پر نچھاور کرتا رہے......مگر اس میں کوئی کمی تھی......شدید قسم کا احساس زیاں اسے ہر لمحہ، ہر پل اندر ہی اندر کچوکے لگاتا......

محبت کا یہ کیسا المیہ ہے......؟

جب نہیں ملتی......تب بھی دکھ دیتی ہے۔

اور جب مل جاتی ہے تو بھی مطمئن نہیں کرتی......

ارسلان کا انتخاب اس نے خود کیا تھا......اس کو پانے کی تمنا کی تھی......

یا پھر محبت میں جدوجہد کا بہت عمل دخل ہوتا ہے......جو محبت بغیر کسی جدوجہد کے مل جاتی ہے......اس میں وہ لطف اور اطمینان شامل نہیں ہوتا جو بہت جدوجہد اور کٹھن مراحل سے گزرنے کے بعد نصیب ہوتا ہے۔ کہیں نہ کہیں وہ 'کمی' اس کے دل کو مضطرب رکھتی......جب بھی ارسلان کی موجودگی میں اسے اچانک شہیر یاد آ جاتا......تو وہ یوں بے قرار ہو جاتی جیسے بند پنجرے کا پنچھی......جس کے سامنے کھانے پینے کا سارا سامان رکھا ہو مگر وہ مضطرب ہو کر پنجرے کی سلاخوں کے ساتھ پھڑ پھڑاتا پھر رہا ہو......اس کی گھبراہٹ، بے قراری اور اضطراب کی نہ سمجھ آنے والی وجہ خود اس کو بھی پریشان کر دیتی......ارسلان اکثر اس سے اس اضطراب کی وجہ پوچھتا مگر وہ خاموش رہ جاتی......ارسلان کو محسوس ہوتا کہ وہ اس کے گھر کے ماحول سے غیر مطمئن ہے......اس لئے وہ زیادہ نہ کریدتا۔

زل اور ارسلان دونوں کالج بھی باقاعدگی سے جاتے۔ فائنل ایگزامز میں صرف چند ہفتے رہ گئے تھے اور انہیں اپنی تعلیم ہر صورت میں مکمل کرنا تھی۔ کالج کے اساتذہ اور کلاس فیلوز اکثر انہیں چھیڑتے کہ آخر شادی سے انہیں کیا فائدہ ہوا ہے......؟

ارسلان مسکرا کر زمل کی طرف دیکھتا اور جواب میں زمل خاموش ہو جاتی......

واقعی جس مقصد کے لئے اس نے شادی میں جلدی کی تھی وہ تو اسے بالکل حاصل نہیں ہوا تھا......

وہ تو اس اضطراب سے چھٹکارا پانا چاہتی تھی...... جو دن رات اسے کسی نہ کسی طرح...... کسی گناہ کا احساس دلاتا تھا...... مگر وہ اضطراب تو اس کے دل کے اندر جوں کا توں موجود تھا۔ اس میں ایک فیصد بھی کمی نہ آئی تھی......

☆

حرا حجلۂ عروسی میں شہیر کے سامنے دلہن بنی بیٹھی تھی...... حرا کو وہ بہت عرصے بعد دیکھ رہا تھا۔ وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ شہیر اسے دیکھتا ہی رہ گیا...... دونوں خاموش تھے۔ حرا منتظر تھی کہ وہ کوئی بات کرے...... اور وہ خاموش تھا...... کہ وہ کیا کہے...... اس نے اپنے تصور میں سوائے زمل کے کسی اور کو دلہن کے روپ میں نہیں دیکھا تھا۔

''زمل...... تمہارے ہونٹ کے پاس ایک تل تھا...... وہ کہاں ہے؟'' اچانک وہ بولا تو حرا کو یوں لگا جیسے اسے کسی نے زمین پر پٹخ دیا ہو...... اس کو اپنے دل کی دھڑکنیں رکتی ہوئی محسوس ہونے لگیں اور آنکھیں جیسے پتھرا گئی ہوں۔

''میں...... میں...... حرا ہوں'' وہ بمشکل اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے بولی۔

''کون حرا...... ؟ میرے دل میں تو صرف زمل ہے...... کیا تم زمل نہیں ہو...... پھر تم کون ہو؟'' شہیر نے اس انداز سے کہا تو وہ خاموشی سے بیڈ سے اٹھی اور برستی آنکھوں کے ساتھ واش روم میں چلی گئی۔ اپنا ایک ایک زیور نوچتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی...... اس کی ذات کی ایسی نفی ہو رہی تھی جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا...... اور وہ شخص جس کے لئے نجانے کتنے لوگوں نے قربانیاں دی تھیں...... وہی اس کو رسوا کر رہا تھا...... سمیر کی خوشی کی خاطر اس نے کس کس طرح اپنے دل کو منایا تھا...... کیسے کیسے سمجھایا تھا...... اب اس کے ارمان، خون کے آنسوؤں کی صورت میں بہہ نکلے تھے......

''سمیر...... تم نے میرے ساتھ بہت ظلم کیا ہے'' اس کو سمیر سے اپنے کہے ہوئے الفاظ بار بار یاد آئے۔

''ہم اپنی قسمتوں کے ہاتھوں مجبور ہیں...... محبت عطا کم کرتی ہے اور سزا زیادہ دیتی ہے اور وہ ہمیشہ سے محبت کا تاوان دیتا آیا ہے'' سمیر کی باتیں یاد کر کے وہ رونے لگی۔

واش بیسن میں چہرہ دھوتے ہوئے آنکھوں کے چشمے شدت سے پانی اگلتے رہے...... اور وہ کتنی ہی دیر ان کو صاف کرتی رہی۔ کمرے میں واپس آئی تو شہیر صوفے پر بیٹھا ڈرنک کر رہا تھا...... وہ حیرت سے کبھی شہیر کو...... اور کبھی بوتل کو دیکھتی رہی...... یوں لگتا تھا...... جیسے آج کی رات اس پر انکشافات منکشف ہونے کے لئے منتخب ہوئی تھی...... وہ خاموشی سے بیڈ پر بیٹھ گئی...... دکھ اور کرب کے شدید احساس سے اس کا دل لہولہان ہو رہا تھا اور آنکھیں سرخ اور متورم...... شہیر کی موجودگی سے اسے کراہت سی محسوس ہونے لگی...... وہ جو اپنے دل کو بہت مشکل سے قائل کر کے...... بہت منا کر اس کی سیج تک لائی تھی۔ وہ دل اب اس شخص کے کمرے میں موجود ہونے کے احساس سے مضطرب ہو رہا تھا۔ شہیر شدید نشے میں اس کے

ساتھ لپٹ رہا تھا......اور اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ مٹی کا مجسمہ ہو......جس کے سینے میں نہ دل ہو......نہ جسم میں حرکت اور حرارت......وہ ایک ڈمی تھی جس سے وہ دل بہلا رہا تھا اور وہ خاموشی سے اس کے ہاتھوں میں کھلونا بنی ہوئی تھی۔ وہ نشے میں مدہوش بار بار اسے ''زل......آئی لو یو ٹو مچ'' کہہ کر پکارتا......وہ ہر بار چونکتی اور ہر بار اس کے دل پر چوٹ سی پڑتی......ہر بار دل ڈوبنے لگتا......برستی آنکھوں کے بہاؤ میں اور شدت آ جاتی۔ مگر محبت کا کھیل جاری رہا......

ٹوٹے دلوں کے ساتھ......

بہتے اشکوں کے ساتھ......

ادھورے جذبوں کے ساتھ......

اور زخمی دل کے ساتھ......

شاید محبت اپنا تاوان وصول کر رہی تھی......جذبوں کو کچل کر......اور احساسات کو روند کر......

☆

سمیر دو روز کے بعد انگلینڈ واپس جا رہا تھا......اس میں حرا کا سامنا کرنے کی ہمت نہ تھی......حرا سے جب بھی سامنا ہوتا وہ نظریں چرا لیتا......اپنے آپ کو اس کا مجرم سمجھتا......حرا کی آنکھوں میں بے شمار شکوے اور دکھ کے اداس رنگ دیکھ کر مضطرب ہو جاتا......صرف دو روز میں حرا مرجھا کر رہ گئی تھی......اس کی آنکھیں ایسی سونی ہو گئی تھیں جن میں نہ زندگی کی رمق باقی تھی اور نہ ہی جینے کی کوئی امید......لبوں پر مسکراہٹ یوں غائب تھی جیسے خزاں رسیدہ پتوں سے تازگی اور شگفتگی......چہرے کی پژمردگی سے یوں معلوم ہوتا جیسے اس کی رگوں میں گردش کرنے والا خون باسی ہو گیا ہو......یا اس کی سرخی غائب ہو گئی ہو......

سمیر جانے سے پہلے اس کے پاس آیا......تو حرا نے اسے دیکھ کر منہ موڑ لیا۔

''حرا......پلیز......'' سمیر التجائیہ انداز میں بولا۔

''پلیز......کچھ مت کہنا......میں تمہیں ہرگز معاف نہیں کروں گی......تم نے بھائی کی زندگی بچانے کے لئے......میری زندگی داؤ پر لگا دی......تم جانتے تھے......نا......کہ وہ ڈرنک بھی کرتا ہے......اور......اس کے دل میں سوائے 'زل' کے اور کوئی نہیں سما سکتا......پھر بھی تم لوگوں نے میرے ساتھ جان بوجھ کر زیادتی کی'' حرا روتے ہوئے بولی۔

سمیر شرمندگی سے ہونٹ چبانے لگا۔ اسے قطعی امید نہ تھی کہ شہیر اس سے زل کی باتیں کرے گا۔

''کیا......زل کے بارے میں شہیر نے تمہیں بتایا ہے؟'' سمیر نے حیرت سے پوچھا۔

''وہ مدہوشی میں مجھے زل سمجھتا ہے اور ہوش میں مجھ سے دور بھاگتا ہے'' حرا نے انکشاف کیا تو سمیر کے قدموں تلے سے زمین نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''اوہ......گاڈ......تم اس قدر اذیت میں ہو......اور......اور میں یہی سمجھتا رہا کہ وہ......'' سمیر نے انتہائی حیرت سے کہتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''اور مجھے......زندگی کے جہنم میں جھونک کر تم جا رہے ہو......میرا تماشا تو اچھی طرح دیکھتے......'' حرا نے آہ بھر کر کہا۔

''آئی......ایم......ریئلی......'' وہ بمشکل بولا۔

''سوری......مت کہنا......اس لئے کہ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی......'' حرا کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئی اور سمیر کا دل کسی شدید صدمے کے احساس سے دوچار ہونے لگا۔ اسے قطعی امید نہ تھی کہ حرا اس قدر اذیت سہہ رہی ہو گی اور شہیر اس کے ساتھ کیسا سلوک کرے گا......وہ تو پرامید تھا کہ حرا شہیر کو سنبھال لے گی......اس کی محبت اور دیکھ بھال اس کے دل سے زمل کا غم دور کر دے گی مگر وہ تو زمل کو نہ بھول پایا تھا......اور نہ ہی اس کی جگہ کسی اور کو دے رہا تھا......وہ تو حرا کی ذات کی نفی کر رہا تھا......وہ تو اس سے اس کی شناخت بھی چھین رہا تھا۔ وہ کیسے اور کب تک نام نہاد شادی کے بندھن کو نبھائے گی......اور......میری اتنی بڑی قربانی رائیگاں گئی......میں اس کو زندگی دینا چاہتا تھا......اور وہ سب سے زندگی کی امیدیں چھین رہا تھا۔ سمیر کو گہری تشویش ہونے لگی۔ اس کا دل کٹنے لگا اور کسی بھاری بوجھ کے احساس سے اسے گھٹن سی محسوس ہونے لگی۔ اس سے وہاں رکنا محال ہو گیا۔

''میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی'' حرا کے الفاظ اس کے دل میں کسی نشتر کی طرح پیوست ہو گئے تھے......اور اس نشتر کی چبھن سینے میں کسی درد کی طرح ٹھہر گئی تھی......اور اس درد سے نجات پانا اس کے بس سے باہر تھا......

''یہ کیسے ممکن ہے......کہ کسی کی بہتری کے لئے کیا گیا فیصلہ......خود انسان کے لئے وبال جان بن سکتا ہے......کیا انسان کی نیت کو نہیں دیکھا جاتا......کیا اس نیت میں پوشیدہ سچائی اور دیانت کو نہیں جانچا جاتا......پھر انسان کیوں ناحق اتنی اذیت سہتا ہے......'' سمیر کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے فیصلے پر پچھتائے یا مطمئن ہو جائے......سب کچھ بکھر گیا تھا......اس کا سکون اور اضطراب کہیں کھو گیا تھا......اور وہ مایوسیوں کی تاریک راہوں کی طرف جاتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔

☆

حرا نے ایک ہاسپٹل جوائن کر لیا تھا......اور وہ ہاسپٹل جانے کے لئے تیار ہو رہی تھی......شہیر نیند سے بیدار ہوا تو نشے کا خمار قدرے کم تھا......اس نے حرا کی طرف بغور دیکھا۔

''آپ کہاں جا رہی ہیں؟'' شہیر نے حیرت سے پوچھا۔

''ایک ہاسپٹل جوائن کیا ہے'' اس نے جواب دیا۔

''کب سے......؟''

''آج سے......''

''میں ڈراپ کر دوں......''

''نہیں......میں خود چلی جاؤں گی''

شہیر خاموش ہو گیا......اور واش روم میں چلا گیا۔

حرا تیار ہو کر کمرے سے باہر جا چکی تھی......وہ واش روم سے باہر آیا اور ناشتہ کرنے نیچے چلا گیا......یہی ایک ماہ سے ہو رہا تھا......وہ جب بھی ہوش میں ہوتا تو حرا سے یوں بات کرتا جیسے دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہوں اور دونوں میں بہت فاصلہ ہو......ہمیشہ چند جملوں پر بنی بات چیت کرتے......اور اس کے علاوہ کچھ نہیں......شہیر اس سے یوں مخاطب ہوتا جیسے وہ کوئی بہت محترم ہستی ہو......اور اس کے ساتھ زیادہ بات چیت ادب کے تقاضوں کے خلاف ہو......ان کے رشتے میں ایسی اجنبیت اور سرد مہری تھی کہ حرا خود ہی چونک جاتی......ابتداء میں تو اس کا ذہن ہر وقت الجھنوں کا شکار رہتا......اس نے ایسے رشتے کے بارے میں کبھی کسی سے نہ سنا تھا......اس کا شوہر اسے محبوبہ سمجھ کر محبت کرتا......اور بیوی کے روپ میں اسے قبول نہ کرتا......حرا کا دل ہر وقت ایک شدید غم کے احساس زیاں سے دوچار رہتا......شہیر کبھی اس سے کھل کر بات نہ کرتا......اپنے دل کا کوئی حال نہ کوئی اپنا راز......نہ اپنی نفرت، نہ اپنی محبت......نہ اپنے خیالات کچھ بھی اس سے شیئر نہ کرتا......شاید وہ اسے اس قابل ہی نہ سمجھتا یا پھر اس سے کچھ بھی کہتے ہوئے جھجھکتا......

''شہیر تم بھی اب کوئی کام شروع کرو......تم نے اپنی اسٹڈیز بھی مکمل نہیں کی......اگر زندگی میں کوئی mishap ہو جائے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انسان ساری زندگی اس کا سوگ مناتا رہے......اور سارے کام چھوڑ کر بیٹھ جائے۔ زندگی میں حرکت کرنا بہت ضروری ہے'' ڈیڈی نے اسے ایک شام سمجھاتے ہوئے کہا۔

''کیا کروں......؟ مجھے تو کسی بھی کام کا کوئی تجربہ نہیں'' شہیر نے بے دلی سے جواب دیا۔

''تجربہ کام کرنے سے آتا ہے......گھر بیٹھے کبھی تجربہ نہیں آتا......میں چاہتا ہوں تم کل سے میرا آفس جوائن کر لو......میری فیکٹری کے کاموں میں میری مدد کرو......'' ڈیڈی نے کہا تو وہ کچھ سوچنے لگا۔

''ٹھیک ہے......جیسا آپ کہتے ہیں'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

''گڈ......ویری گڈ'' ڈیڈی نے خوش ہو کر جواب دیا۔

☆

کالج میں فیئر ویل تھی۔ سارے اسٹوڈنٹس کالج سے رخصت ہو رہے تھے۔ سب کی آنکھوں میں مستقبل کی امیدیں تھیں اور بے شمار امیدیں تھیں۔

''آج اس موقع پر میں اپنے دو ٹیلنٹڈ اسٹوڈنٹس شہیر اور روشنی کو بہت مس کر رہا ہوں......شہیر بہت ٹیلنٹڈ تھا۔ اس کے آرٹ میں ایک یونیک ٹچ تھا اور میں اس کے مستقبل کے بارے میں بہت پر امید تھا کہ وہ آرٹ کی دنیا میں نام پیدا کرے گا......ہو سکتا ہے وہ دوبارہ کبھی آرٹ کی طرف لوٹ آئے مگر اس کی ادھوری تعلیم کا مجھے ہمیشہ دکھ رہے گا'' پروفیسر رضا ربانی نے ساری کلاس کو خدا حافظ کہتے ہوئے کہا تو سب خاموش ہو

گئے......زمل کو یوں احساس ہونے لگا جیسے پروفیسر ربانی اسے احساس دلا رہے ہوں کہ شہیر کی ناکامی اور ادھوری تعلیم کی ذمہ دار وہ ہے...... چند لمحے قبل وہ سب کے ساتھ کھڑی مسکرا رہی تھی......اب اس کے چہرے پر ایسی اداسی چھا گئی کہ وہاں رکنا اس کے لئے محال ہو گیا۔

''ہاں......وہ بہت ٹیلنٹڈ تھا......اور ٹیلنٹڈ اسٹوڈنٹس ہمیشہ اساتذہ کے ذہن میں رہتے ہیں'' مسز عطیہ نے کہا۔

''سر اس نے شادی کر لی ہے'' اسامہ نے بتایا۔

''گڈ......یہ تو خوشی کی خبر ہے......چلو ایک اچھا کام تو کیا'' پروفیسر ربانی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''سر شادی تو زمل اور ارسلان نے بھی کی ہے......مگر انہوں نے تعلیم ادھوری نہیں چھوڑی......اس کا مطلب ہے انہوں نے دو اچھے کام کئے'' عمر مصطفیٰ نے شوخ لہجے میں کہا۔

''ہاں......بالکل......شادی کے ساتھ پڑھائی جاری رکھنا بہت مشکل کام ہے......اور یہ دونوں بہت بہادر ہیں'' پروفیسر رضا نے ہنستے ہوئے جواب دیا تو سب ہنسنے لگے۔

ارسلان اور زمل نے مسکرا کر ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔

''تھوڑی دیر کے لئے مما اور پاپا سے ملنے کے لئے چلے جائیں......'' زمل نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا گاڑی اسے پاپا نے شادی پر گفٹ کی تھی......اور اسے صرف وہی چلاتی تھی کیونکہ ارسلان اس کے ماں باپ کی دی ہوئی چیزوں کو بہت کم استعمال کرتا تھا زمل کے مجبور کرنے پر کبھی کبھار وہ اس کی چیزوں کو استعمال کرتا تو اس کے اندر ایک شدید احساس کمتری کا احساس ہوتا۔

''ٹھیک ہے......جیسے تمہاری مرضی'' ارسلان نے جواب دیا۔

اور زمل گاڑی ڈرائیو کرنے لگی۔

گھر پہنچنے پر مما پاپا اسے بہت تپاک سے ملے......البتہ ارسلان سے ہاتھ ملاتے ہوئے پاپا کے چہرے پر مایوسی اور شرمندگی کے تاثرات نمایاں ہونے لگے۔ ارسلان نے کئی بار پہلے بھی ان کے رویے کو محسوس کیا تھا مگر زمل سے اس کا ذکر نہیں کیا تھا کہ وہ اس کی خاطر اپنے گھر والوں سے متنفر نہ ہو جائے۔ زمل کے بھائی بھی اسے کسی قابل نہ سمجھتے تھے......اور اکثر اس کی موجودگی میں آپس میں طنزیہ گفتگو کرتے۔ ارسلان ان کے رویے سے ہرٹ ہوتا مگر خاموش رہتا۔

''آج تم لوگ بہت دنوں کے بعد آئے ہو......خیریت تو تھی'' پاپا نے پوچھا۔

''ہاں......آج کالج میں ہمارا آخری دن تھا......فیئرویل تھی......سوچا آپ سے ملتے جائیں'' زمل نے جواب دیا۔

''اوہ......آئی......سی......اس کے بعد کیا کرنے کا ارادہ ہے؟'' پاپا نے زمل سے پوچھا۔

''فی الحال تو اگیزامز کی تیاری کریں گے......اس کے بعد میں اور ارسلان آرٹ اکیڈمی کھولنے کا ارادہ رکھتے ہیں'' زمل نے جواب دیا۔

''زمل زندگی میں ترقی کرنے کے لئے اپنے پاؤں کے ساتھ پہیے باندھنے پڑتے ہیں......اور ذہن کو آسمان کی اونچائی تک لے کر جا کر

سوچنا پڑتا ہے...... مگر تم پر افسوس ہے...... جو ہمیشہ اپنے لئے لولی، لنگڑی بیساکھیاں منتخب کرتی ہو......'' پاپا نے ارسلان کی طرف دیکھتے ہوئے اس قدر ترش لہجے میں کہا کہ ارسلان سمیت، زل بھی ان کے طنز کی چبھن کو محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی...... اور خاموش ہوگئی۔

''آرٹ اکیڈمی سے تمہیں کیا ملے گا......؟ نان سینس آئیڈیا'' پاپا خفگی سے بولے۔

''مگر پاپا...... ہم وہی کام کریں گے نا...... جو ہمارے taste کے مطابق بھی ہو...... اور جسے کرتے ہوئے ہم انجوائے بھی کریں...... اس کے علاوہ ہم اور کیا کر سکتے ہیں؟'' زل نے آہستہ آواز میں کہا۔

''میں تو پہلے دن سے ہی تمہارے اس آرٹ کے خلاف تھا...... اوپر سے...... تم مزید غلطیوں پر غلطیاں کرتی گئی...... بہرحال اب پروفیشن کا انتخاب سوچ سمجھ کر کرنا...... زندگی میں غلطیوں کو دہرانے کی گنجائش نہیں ہوتی اور جو لوگ بار بار غلطیاں کرتے ہیں...... They are considered big failures پاپا نے الفاظ چبا چبا کر کہا تو زل کے لئے مزید وہاں ٹھہرنا مشکل ہوگیا۔

''ارسلان...... چلیں...... کافی ٹائم ہو رہا ہے'' زل نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''بیٹھو...... بیٹا......'' مما نے اسے روکنا چاہا۔

''نہیں...... گھر پر سب انتظار کر رہے ہوں گے......''

زل نے کہا اور ارسلان کی طرف دیکھا...... دونوں خاموشی سے باہر نکل آئے۔

''آئی ایم سوری......'' زل نے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے کہا۔

ارسلان خاموش رہا۔

''مجھ سے خفا ہو......'' زل نے کنکھیوں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں......'' ارسلان گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔

''پھر خاموش کیوں ہو؟'' زل نے پوچھا۔

''مجھے کس بات کا احساس دلانا چاہتے ہیں...... میری غربت کا...... یا...... پھر احساس کمتری کا'' ارسلان نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''سب لوگ اسٹیٹس کونشس ہیں؟...... اور یہ mania بہت مشکل سے ذہنوں سے جاتا ہے...... اب میں دوبارہ تمہیں کبھی وہاں لے کر نہیں جاؤں گی...... میرے لئے تم...... اور تمہاری عزت سب لوگوں کی عزت سے بڑھ کر ہے......'' زل نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''تھینک یو...... تم نے میری خاطر بہت قربانی دی ہے......'' ارسلان نے مسکرا کر جواب دیا۔

''نہیں...... ارسلان...... میں نے کچھ بھی نہیں کیا...... جو کچھ تم نے میری خاطر کیا ہے...... مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے...... جس روز شہیر میرا پورٹریٹ بنا رہا تھا اور میں بہت اپ سیٹ تھی...... کیونکہ میرے کزن نے مجھے کینیڈا سے ڈائیورس بھیجی تھی...... وہ بہت اذیت ناک دن تھا...... اور تم مجھے console کرتے ہوئے اس حد تک چلے گئے تھے کہ تم نے مجھے یہاں تک کہہ دیا...... دیکھو زل...... آج کے بعد مت رونا...... اگر تمہیں محبت کھونے کا دکھ ہے تو میں تمہیں اتنی محبت دوں گا...... کہ تم سارے غم بھول جاؤ گی...... اور اگر تمہیں اپنے گھر کے اجڑنے کا دکھ ہے تو میں

تمہارا گھر بساؤں گا..... ارسلان اس روز تم نے تو مجھے اپنا سب کچھ دے دیا تھا..... مگر مجھے افسوس ہے کہ میں تمہیں اپنے گھر والوں کی نظر میں وہ مقام نہیں دلا سکی جوان کو تمہیں دینا چاہیے تھا..... آئی ایم سوری..... ریئلی سوری.....'' زل نم آنکھوں اور شرمندگی سے بولی۔

''ہم نے زندگی کی خوشیاں، دکھ، سکھ ایک دوسرے کے ساتھ نبھانے کا عہد کیا ہے..... مجھے ان کا رویہ برا لگتا ہے مگر تم اپنے رویے سے ساری تلخیاں مٹا دیتی ہو..... وعدہ کرو..... زل تم مجھے کبھی ایسی نظروں سے نہ دیکھنا..... جیسے تمہارے گھر والے دیکھتے ہیں''۔ ارسلان نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''ارسلان میں نے تم سے محبت کی ہے..... پلیز تم بھی میری محبت پر کبھی شک مت کرنا'' زل نے جذباتی لہجے میں جواب دیا۔

''مجھے تمہاری محبت پر اپنی ذات سے بھی زیادہ اعتبار ہے'' ارسلان نے مسکرا کر کہا تو وہ بھی مسکرا دی۔

''آئس کریم کھاؤ گے.....'' زل نے پوچھا۔

''ہاں..... اس وقت آئس کریم کھانا بہت ضروری ہے..... دل کی جلن کو ٹھنڈا کرنے کے لئے'' ارسلان نے جواب دیا۔

زل نے ایک آئس کریم پارلر کے سامنے گاڑی روکی اور دونوں آئس کریم کھانے لگے..... وہ آئس کریم کھاتے ہوئے ایک دوسرے کی جانب مسکرا کر دیکھتے ہوئے باتیں کر رہے تھے..... جب اچانک شہیر نے گاڑی میں گزرتے ہوئے دونوں کو ہنستے مسکراتے ہوئے دیکھا اس کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا..... وہ تقریباً ایک سال بعد دونوں کو دیکھ رہا تھا اور دونوں کس قدر خوش تھے..... اس کا مطلب ہے دونوں خوشگوار میریڈ لائف گزار رہے ہیں..... اس کی نظریں مسلسل ارسلان پر تھیں..... اس کا خوشی سے مسکراتا ہوا چہرہ..... اس کی نظروں میں کھٹکنے لگا.....

ارسلان زل کے ساتھ خوش ہے..... دونوں ایک دوسرے سے خوش ہیں..... اس کا مطلب ہے دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہیں..... شہیر کا دل نفرت و کدورت کے شدید احساس سے بے قرار ہونے لگا..... اسے ارسلان سے شدید نفرت محسوس ہونے لگی..... نجانے کہاں سے کینہ، بغض اور حسد اس کے دل کے خانوں میں خون کی بجائے گردش کرنے لگا تھا اور شاید ان کی گردش، خون کی گردش سے بھی تیز تھی..... غم و غصے کی شدید لہریں اس کے دماغ میں ابھرنے لگیں..... اور اس کا دل کھولنے لگا۔

''ارسلان..... تم نے مجھ سے زل کو چھینا ہے..... اور تم خوش ہو..... مگر میں تمہیں خوش نہیں رہنے دوں گا..... میں تم سے تمہارا سکون، تمہاری خوشیاں اور تمہارا سب کچھ چھین لوں گا.....'' انتقامی جذبات سے اس کا دل پھٹنے کو بے قرار ہو رہا تھا..... غصے سے اس کی ناک کے نتھنے پھڑ پھڑانے لگے..... اور وہ اپنے ہاتھوں کی مٹھیوں کو اسٹیرنگ پر زور زور سے مارنے لگا۔

نفرت، کدورت، عداوت، دشمنی، کینہ، بغض، حسد..... کونسا جذبہ تھا..... جو وہ ارسلان کے لئے محسوس نہیں کر رہا تھا.....

ارسلان اور زل خوش ہو رہے تھے کہ قدرت نے ان کے دلوں کو ایک دوسرے کے لئے محبت سے بھر دیا ہے اور انہیں دیکھ کر شہیر کا خون غصے سے کھول رہا تھا.....

(۱۰)

ٹھیک ہے.....نہیں تا کچھ یاد.....تو پھر سوجا'' نذیر حسین غصے سے چار پائی پر لیٹتے ہوئے بولا اور زینب بھی اپنی چار پائی پر لیٹ گئی۔مگر اسے نیند کہاں آرہی تھی۔وہ جب بھی چار پائی پر لیٹتی تو اقبال حسین کے الفاظ اس کو انتہائی اذیت دیتے۔اسے کچوکے لگاتے، وہ سسکیاں بھرتی...... دبی دبی آواز میں آہیں بھرتی، کہیں نذیر حسین اس کی آوازیں سن کر بیدار نہ ہو جائے اور جس رنج اور دکھ کو وہ اپنے اندر چھپاتی آرہی تھی اس پر ظاہر نہ ہو جائے۔اقبال حسین کے الفاظ اسے اندر ہی اندر کیسے نشتر چبھوتے تھے یہ صرف وہی جانتی تھی۔وہ کتنا چونکی تھی اور کتنا روئی تھی جب اس نے انتہائی غصے میں ماں کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''اماں.....تو نے گندگی کے ڈھیر پر بیٹھ کر صرف گندگی ہی اکٹھی کی ہے۔ایسی گندی اولاد سے تو بانجھ ہی رہتی تو اچھا تھا..... مجھے تم سب سے بو آتی ہے.....اگر میں زیادہ دیر تم لوگوں کے درمیان رہا تو میرا دماغ اس بو سے پھٹ جائے گا'' اقبال حسین کراہت سے ماں، باپ اور ان کے آٹھ بچوں کو دیکھ کر بولا۔سب اس کی بات سن کر تلملانے لگے اور اس سے جھگڑنے لگے۔مگر زینب آگے بڑھ کر اسے بچاتی رہی۔

''ٹھیک ہے بیٹا.....تو یہاں سے چلا جا..... مجھے تو بس تیری سلامتی چاہیے.....تو جہاں رہے.....خوش رہے، بہت ترقی کرے'' زینب نے اس کا بازو کھینچ کر اسے اپنے ساتھ لگا کر سسکتے ہوئے کہا اور پھر وہ ایسا گیا دوبارہ لوٹ کر نہ آیا۔زینب تب سے اب تک اس کا غم اپنے دل میں چھپائے اس کے لئے زندہ تھی۔وہ اس کا سب سے بڑا بیٹا تھا اور پورے نو عدد بچوں میں سب سے زیادہ عزیز اور پیارا تھا۔اس نے اس کے جتنے لاڈ اٹھائے تھے کسی اور کے نہیں اٹھائے تھے۔اس سے جتنی محبت کی تھی کسی اور سے نہیں کی تھی۔راتوں کو اٹھ اٹھ کر اس کا خیال رکھتی اسے اس پر فخر ہوتا کہ وہ سب سے زیادہ لائق تھا۔اس کی ساری اولاد میں سے صرف وہی پڑھا لکھا تھا اور وہ خود ان پڑھ تھی مگر پڑھے لکھے لوگوں کی بڑی عزت اور قدر کرتی تھی۔اقبال حسین جب کالج جانا شروع ہوا تو وہ اسے تم اور تو سے آپ کہنے لگی۔شوہر سے زیادہ بیٹے کی عزت اور خدمت کرنے لگی۔باقی ساری اولاد اس سے جھگڑتی مگر وہ مسکرا دیتی.....اس نے اپنی اٹوٹ محبت میں نفرت کی گنجائش کہیں نہیں رکھی تھی نجانے وہ اقبال حسین سے اتنی شدید محبت کیوں کرتی تھی۔اسے آج تک یہ بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔اس نے تو ایک روپیہ بھی اپنی کمائی کا اس کی ہتھیلی پر نہیں رکھا تھا اور اس نے تو وہ عزت بھی اسے نہیں دی تھی جو ایک عام مہذب انسان اپنی ماں کو بحیثیت ماں دیتا ہے جبکہ اس کی دوسری اولاد ماں کی عزت بھی کرتی تھی اور اسے کمائی بھی دیتی تھی پھر وہ کیوں اس سے اتنی محبت کرتی تھی.....اس کی جدائی میں رو رو کر وہ نابینا ہو گئی تھی.....مگر اس کے لئے دن رات دعائیں کرتی نہ تھکتی تھی...... اور ہر روز نذیر حسین سے باتیں کرتے ہوئے اس کی حمایت میں بولتی تھی۔نذیر حسین اس کی محبت کے سامنے ہار جاتا تھا.....مگر وہ نہیں ہارتی تھی۔اس کے باقی آٹھ بچے اپنے اپنے گھروں میں اچھے سیٹ ہو گئے تھے۔دو بیٹوں کی دکانیں تھیں۔دو سعودیہ چلے گئے تھے۔ایک ان کے پاس تھا..... جو

کباڑیا تھا وہ اپنی بیوی اور چار بچوں کے ساتھ اس گھر میں رہتا تھا۔ تینوں بیٹیاں بھی اپنے گھروں میں ٹھیک تھیں۔ نذیر حسین پہلے سرکس میں جوکر اور رنگ ماسٹر تھا...... کبھی کبھی سائیکلنگ بھی کرتا تھا مگر اب وہ بوڑھا ہو چکا تھا۔ اب اس سے زیادہ کام نہیں ہوتا تھا اس لئے وہ گیٹ پر جوکر کا لباس پہن کر بچوں کا دل بہلاتا۔ بچے خوشی میں اسے سکے دیتے اور وہ تمام جمع شدہ سکوں میں سے آدھے سرکس کے مالک کو دے کر آدھے اپنے حصے کے لئے لے کر صبح سویرے گھر آ جاتا اور پھر دن بھر سوتا رہتا۔ زندگی کی گاڑی چل رہی تھی۔ ہر دوسرے تیسرے مہینے سب بچے اور ان کی اولادیں اکٹھی ہوتیں۔ وہ ماں باپ سے ملنے آتے مگر کوئی بھی اقبال حسین کا ذکر نہ کرتا مگر زینب سارا وقت اسے یاد کرتی رہتی نجانے وہ کہاں ہوگا......؟

ان سب بچوں کو دیکھ کر وہ مجھے کتنا یاد آتا ہے...... مگر زینب اس کا اظہار کسی سے نہ کرتی کیونکہ نذیر حسین سمیت تمام بچے بھی اس کا ذکر سننا پسند نہیں کرتے تھے۔

''جب اسے ہماری ضرورت نہیں...... تو ہمیں بھی اس سے ملنے کی کوئی خواہش نہیں'' سب بہن بھائی غصے سے بولتے۔ زینب اس کی حمایت میں کچھ بولنا چاہتی مگر اس کے لئے سب کی نفرت دیکھ کر خاموش ہو جاتی اور بیٹھی آہیں بھرتی رہتی اور خدا سے دن رات ایک ہی دعا کرتی رہتی۔

''بس ایک بار اس سے ملا دے...... مجھے اور زندگی میں کچھ نہیں چاہیے'' وہ رات بھر کروٹیں بدلتی، روتی، سسکتی خدا کے حضور اس کے لئے گڑگڑا کر دعائیں مانگتی...... مگر پندرہ سالوں سے اس کی دعائیں قبول نہیں ہو رہی تھیں...... اس کے اندر ایک امید تھی جو اسے مایوس نہیں ہونے دیتی تھی...... اور وہ امید اس کا خدا تھا...... جس نے اقبال حسین جیسے بچے کو چار سال بعد اس کے ہاں پیدا کیا تھا...... بہت سی دعاؤں اور منتوں، مرادوں کے بعد وہ پیدا ہوا تھا۔ تب بھی اس کی دعائیں رایگاں نہیں گئی تھیں اور اب بھی رایگاں نہیں جائیں گی۔ اس کا اسے پورا یقین تھا اور اس یقین نے اس کو اندر سے مرنے نہیں دیا تھا۔

☆

شہزاد...... صدیقی کون تھا؟ ڈاکٹر رابرٹ سرگوشی کے انداز میں ڈاکٹر دانش کے انتہائی قریب ہو کر یہ الفاظ دہرا رہے تھے۔ ڈاکٹر دانش ان کے نیم تاریک کیبن میں بیڈ پر لیٹے تھے۔

ڈاکٹر رابرٹ انہیں ہپناٹائز کر کے اس ٹرانس میں لے گئے تھے جہاں ان کا ذہن اور لاشعور ان کے کنٹرول میں تھا۔ علی موسیٰ اور ڈاکٹر رابرٹ کی انتہائی کوششوں کے باوجود بھی ڈاکٹر دانش اپنا کوئی راز بھی ان سے شیئر کرنے پر رضامند نہیں تھے۔ ڈاکٹر رابرٹ، ڈاکٹر محسن زیدی کے تعاون سے اس اہم بات تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے جس نے ڈاکٹر دانش کی زندگی کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

''شہزاد صدیقی...... کون تھا؟ ڈاکٹر رابرٹ الفاظ بار بار دہرانے لگے۔ ڈاکٹر دانش کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے۔ وہ آنکھیں بند کیے نیم بیداری کی حالت میں لیٹے تھے۔ ان کا جسم ڈھیلا ہو گیا تھا اور لاشعور متحرک ہو گیا تھا۔

''ڈاکٹر دانش کے لب آہستہ آہستہ ملنے لگے...... پھر رک گئے وہ پھر بڑبڑائے...... شہزاد...... صدیقی......'' ڈاکٹر رابرٹ کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ انتہائی آہستہ آواز میں بڑبڑا رہے تھے۔ شہزاد...... صدیقی......

ڈاکٹر رابرٹ نے پھر الفاظ دہرائے۔

''اس کو میں نے قتل نہیں کیا...... وہ حادثے میں زخمی ہوا تھا...... ڈاکٹر ثاقب نے میرے خلاف سازش کی...... وہ مجھ سے حسد کرتا تھا۔ اس نے شہزاد صدیقی کو میرے سامنے زہر کا انجکشن دیا اور آپریشن تھیٹر سے چلا گیا...... شہزاد کو میں نے قتل نہیں کیا مگر الزام مجھ پر لگا...... ڈاکٹر دانش رکے...... پھر کچھ بڑبڑانے لگے ان کی آہوں اور سسکیوں سے کیبن کی خاموشی میں دراڑیں پیدا ہونے لگیں۔

''ڈاکٹر دانش...... آپ بے گناہ ہیں...... آپ نے کسی کو قتل نہیں کیا...... شہزاد صدیقی کو بھی نہیں...... آپ اپنے آپ پر اعتماد کریں...... آپ بہت لائق ڈاکٹر ہیں۔ بہت اچھے انسان ہیں...... اور...... لوگوں کو آپ کی ضرورت ہے'' ڈاکٹر رابرٹ آہستہ آہستہ سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔

ڈاکٹر دانش خاموشی سے انہیں سنتے رہے...... جیسے ان کے ایک ایک لفظ کو اپنے اندر جذب کر رہے ہوں...... صرف ان کے چہرے کے تاثرات بدل رہے تھے...... اور...... ان تاثرات سے ڈاکٹر رابرٹ ان کے شعور میں جنم لینے والے اضطراب کا بغور مشاہدہ کر رہے تھے۔

''ڈاکٹر دانش...... آپ قاتل نہیں...... بی کونفیڈنٹ...... ساری دنیا کو بتائیں...... کہ آپ قاتل نہیں'' ڈاکٹر رابرٹ نے پھر سرگوشی کی۔

ڈاکٹر دانش نے اپنی بند آنکھوں کو عجیب انداز میں حرکت دی۔ گویا انہیں کھولنے اور بند کرنے کی کوشش کی...... مگر وہ انہیں کھول نہ سکے، ان کا لاشعور...... ان کے شعور پر حاوی تھا...... وہ آہستہ آواز میں بڑبڑائے۔

''ہاں...... میں...... قاتل نہیں...... میں قاتل نہیں'' ڈاکٹر دانش نے سرگوشی کی۔

''کیا آپ سب کو یہ بات بتائیں گے؟'' ڈاکٹر رابرٹ نے پوچھا۔

''ہاں......'' ڈاکٹر دانش نے جواب دیا۔

''کیا آپ اتنے اسٹرونگ ہیں کہ سب کو یہ بات بتا سکیں گے؟''

''ہاں......''

''کیا آپ اپنی ریسرچ دوبارہ شروع کرنا چاہتے ہیں؟''

''ہاں''

''کیا آپ کو اپنا پروفیشن پسند ہے؟''

''ہاں......''

''گڈ...... ڈاکٹر دانش لوگوں کو آپ کی ضرورت ہے...... آپ کی ریسرچ لوگوں کو بہت فائدہ پہنچا سکتی ہے...... اپنے ذہن سے تمام خوف، شکوک و شبہات، غصہ اور رنج کے جذبات ختم کر دیں۔ ایک بار پھر اپنی زندگی کو اسی جوش اور جذبے کے ساتھ گزاریں جس طرح آپ گزارتے آئے ہیں۔ آپ اپنا مشن جاری رکھیں'' ڈاکٹر رابرٹ نے آہستہ آہستہ ایک ایک لفظ یوں بولا جیسے ان کے دماغ کے خلیاتی دیواروں پر کندہ کر رہے ہوں۔

ڈاکٹر دانش کے چہرے کے تاثرات پھر بدلنے لگے۔انہوں نے اپنی بھنوؤں کو جنبش دی جیسے کوئی بات سننے والا بغور کسی کی بات سنتا ہے اور اپنی بھنوؤں کو سکیڑتا اور پھیلاتا ہے۔

''ڈاکٹر دانش آپ ایک کامیاب ڈاکٹر بنیں......آپ کو اپنا پروفیشن دوبارہ شروع کرنا ہے......کیا آپ بھی ایسا چاہتے ہیں؟ ڈاکٹر رابرٹ نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔

''ہاں......'' ڈاکٹر دانش نے بڑبڑاتے ہوئے جواب دیا۔

ڈاکٹر رابرٹ ان کے دماغ کو رفتہ رفتہ اس نقطے پر لے آئے تھے جو ان کا مقصد تھا......اب ان کا ذہن ڈاکٹر رابرٹ کے مکمل قبضے میں تھا اور اب وہ......ویسے ہی ری ایکٹ کر رہا تھا جیسا وہ چاہتے تھے۔ڈاکٹر رابرٹ کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیلی......ڈاکٹر رابرٹ بغور ان کے چہرے کی جانب دیکھتے رہے۔

ڈاکٹر دانش آہستہ آہستہ بڑبڑا رہے تھے۔

''ہاں......میں اپنا پروفیشن دوبارہ شروع کروں گا......میں ضرور کروں گا......ضرور......ضرور......'' ڈاکٹر دانش آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگے یہاں تک کہ ان کی آواز کہیں گم ہونے لگی۔ان کے لب ساکت ہو گئے اور ان کے چہرے پر سکون سا پھیلنے لگا۔سیشن اوور ہو گیا تھا ڈاکٹر رابرٹ نے مسکرا کر ان کی جانب دیکھا۔وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے تھے۔خوشی سے ان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

☆

ڈاکٹر رمیض کو اپنی مصروفیت سے جیسے ہی فرصت ملی، انہوں نے ڈاکٹر رابرٹ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی وہ جب بھی ان کو فون کرتے۔ ان کا موبائل آف ملتا......اور اگر آن ہوتا تو کوئی لڑکی یہ جواب دے کر فون بند کر دیتی کہ ڈاکٹر رابرٹ بزی ہیں''

ڈاکٹر رمیض کو بہت مایوسی ہونے لگی۔ملک واپس جانے میں صرف تین دن باقی تھے اور وہ ڈاکٹر دانش سے ملے بغیر جانا نہیں چاہتے تھے۔انہوں نے ڈاکٹر محسن زیدی سے رابطہ کیا اور ان کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

''آپ فکر نہیں کریں......میں ڈاکٹر رابرٹ سے ڈسکس کر کے آپ کو فون کرتا ہوں'' ڈاکٹر محسن زیدی نے کہا اور ڈاکٹر رمیض ان کی کال کا انتظار کرنے لگے۔

اگلے روز ڈاکٹر رمیض نے ڈاکٹر محسن زیدی کے فون کے بعد ڈاکٹر رابرٹ سے بات کی اور ڈاکٹر دانش کے بارے میں پوچھنے لگے۔

آپ ان سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟ ڈاکٹر رابرٹ نے پوچھا۔

''وہ ہمارے ملک کا قابل قدر سرمایہ ہیں'' ڈاکٹر رمیض نے جواب دیا۔

''آپ ان کے کیا لگتے ہیں؟'' ڈاکٹر رابرٹ نے پھر سوال کیا۔

''کیا ایک انسان رشتہ داری کے بغیر دوسرے انسان سے نہیں مل سکتا؟'' ڈاکٹر رمیض نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

میں نے یہ بات اس لئے پوچھی ہے کہ ڈاکٹر دانش کے سب خیر خواہ اجنبی اور غیر لوگ ہیں۔ علی موسیٰ ان کے رومیٹ ان کو میرے پاس علاج کے لئے لائے اور آپ...... بھی یقیناً ان کو پہلی بار ملنے جا رہے ہیں...... مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ان کے اپنے لوگ کہاں گئے...... وہ ان کے لئے ایسی تڑپ کیوں نہیں رکھتے جیسے اجنبی لوگ رکھتے ہیں ان کی فیملی کہاں ہے؟ کیا ان کو ڈاکٹر دانش کی ضرورت نہیں؟ ڈاکٹر رابرٹ نے حیرت سے سوال کئے۔

''سوری...... میں ان کی فیملی لائف کے بارے میں کچھ نہیں جانتا......'' ڈاکٹر رمیض نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے...... میں آپ کو ان کا ایڈریس دیتا ہوں...... لیکن پلیز ان سے گفتگو میں بہت احتیاط کیجئے...... آئی مین ان کے ماضی سے متعلقہ کوئی منفی بات نہ کیجئے گا...... اس سے ان کو ڈپریشن ہونے لگتا ہے...... میں بہت مشکل سے ان کو ٹریک پر لے کر آیا ہوں...... ورنہ وہ تو بہت منتشر ہو چکے تھے۔ ان کا ذہن اور شخصیت بری طرح متاثر ہوئے تھے اب وہ قدرے بہتر ہو رہے ہیں۔ آپ ان سے پرامید باتیں کیجئے...... امید...... مایوس دلوں میں نئی زندگی اور حرارت پیدا کرتی ہے...... انسان ذہنی طور پر تب بیمار اور مردہ ہونے لگتا ہے جب اس کے اندر سے امید ختم ہو جاتی ہے...... ناامیدی...... انسان کو زندگی میں ہی موت سے ہمکنار کرتی ہے اور امید...... مردہ دلوں کو پھر سے زندہ کر دیتی ہے...... امید...... ڈاکٹر دانش کو دوبارہ زندگی کی طرف لا سکتی ہے اس وقت انہیں صرف اور صرف امید دلانے کی ضرورت ہے'' ڈاکٹر رابرٹ نے نرم لہجے میں ڈاکٹر رمیض کو سمجھایا۔

''تھینک یو...... ڈاکٹر رابرٹ...... آپ نے ڈاکٹر دانش کا بہت خیال رکھا اور مجھے بھی گائیڈ کیا...... ڈاکٹر...... امید کا دوسرا نام ہوتا ہے...... اور ڈاکٹر وہی ہوتا ہے جو بیمار جسموں کو ہی نہیں...... بیمار دلوں اور ذہنوں کا بھی علاج کرتا ہے'' ڈاکٹر رمیض نے خوشگوار لہجے میں جواب دیا۔

''آپ کی بات سن کر مجھے خوشی ہوئی ہے...... آئی ایم شیور اب ڈاکٹر دانش بالکل ٹھیک ہو جائیں گے'' ڈاکٹر رابرٹ نے پرامید لہجے میں جواب دیا اور مسکراتے ہوئے فون بند کر دیا۔

☆

''آپ...... کون......؟ علی موسیٰ نے دروازہ کھول کر اپنے سامنے ایک خوبصورت سمارٹ نوجوان سے حیرت سے پوچھا'' کیا ڈاکٹر دانش یہیں رہتے ہیں۔

''جی ہاں...... مگر آپ کون ہیں؟'' علی موسیٰ نے پوچھا۔

''میں ڈاکٹر رمیض ہوں، ان سے ملنے آیا ہوں۔ ڈاکٹر رابرٹ سے مل کر آ رہا ہوں''

''آئی...... سی...... اندر تشریف لائیے'' علی موسیٰ نے اپنے لہجے کو قدرے خوشگوار بناتے ہوئے کہا اور اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔ ڈاکٹر رمیض حیرت سے اپارٹمنٹ کو دیکھتے ہوئے ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔

''میں ابھی ڈاکٹر دانش کو انفارم کرتا ہوں...... لیکن ان سے بات چیت کرتے ہوئے آپ کو کتنا محتاط ہونا پڑے گا...... اس کے بارے میں یقیناً ڈاکٹر رابرٹ نے آپ کو بریف کیا ہوگا'' علی موسیٰ نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔

''جی...... ہاں'' ڈاکٹر رمیض نے شستہ لہجے میں جواب دیا۔

علی موسیٰ ایک کمرے میں چلے گئے اور تھوڑی دیر بعد باہر آئے، ان کے ساتھ بلیک تھری پیس سوٹ میں قدرے ادھیڑ عمر شخص تھا۔ ڈاکٹر رمیض کو دیکھ کر ان کے چہرے پر حیرانگی اور نا آشنائی کے تاثرات نمایاں ہوئے۔

''السلام وعلیکم...... میں ڈاکٹر رمیض ہوں...... یقیناً آپ ڈاکٹر محسن زیدی کو جانتے ہوں گے...... ہمارے ملک کے ٹاپ کلاس نیورو سرجن'' ڈاکٹر رمیض نے تعارف کرانا چاہا۔

''ہاں...... میرے بعد وہ ٹاپ کلاس ہوگا...... ورنہ میری موجودگی میں تو وہ......'' ڈاکٹر دانش طنزیہ مسکراہٹ سے بولے۔ ان کے جملے نے ڈاکٹر محسن زیدی کی حیثیت واضح کر دی تھی۔

''خیر...... بتایئے...... آپ کون ہیں اور کیوں مجھ سے ملنے آئے ہیں؟'' ڈاکٹر دانش نے قدرے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''میں بھی نیورو سرجن ہوں اور برین نیورانز پر ریسرچ کر رہا ہوں۔ ڈاکٹر رمیض میرا نام ہے اور ڈاکٹر محسن زیدی کو اپنا استاد سمجھتا ہوں۔ انہوں نے آپ کے بارے میں بتایا تو آپ سے ملنے کا شوق پیدا ہوا...... میں یہاں ایک کانفرنس میں شرکت کے لئے آیا ہوں...... سوچا...... آپ سے بھی مل لوں'' ڈاکٹر رمیض نے جواب دیا۔

''ڈاکٹر محسن زیدی نے آپ کو میرے بارے میں کیا بتایا ہے؟'' ڈاکٹر دانش نے قدرے مشکوک انداز میں پوچھا اور ایک دم ان کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے۔

''یہی...... کہ آپ بہت قابل، لائق اور مشہور ڈاکٹر ہیں۔ نیورالوجی کی فیلڈ میں آپ کا بہت نام ہے'' ڈاکٹر رمیض نے مسکرا کر جواب دیا۔

''میرا نام تھا...... مگر اب نہیں'' ڈاکٹر دانش نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''سر...... ذہانت اور عقل اللہ کی عطا ہے۔ وہ کچھ خاص انسانوں کو بہترین صلاحیتوں سے نوازتا ہے اور جن کو عطا کرتا ہے ان کو تھوڑی بہت آزمائشوں میں بھی ڈالتا ہے اور یہ آزمائش انسان سے اس کی صلاحیتیں کبھی چھینتی نہیں...... بلکہ انسان کو پھر سے مضبوط اور توانا بناتی ہیں...... سر نے مجھے شہزاد صدیقی کیس کے بارے میں بتایا تھا...... لیکن آپ اس میں قطعی قصوروار نہیں تھے۔ یہ تو ایک حادثہ تھا اور حادثہ کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے لیکن اس حادثے کی خاطر اپنی ساری زندگی اور مستقبل داؤ پر نہیں لگانا چاہیے...... کل بھی آپ کا بہت نام اور عزت تھی اور آج بھی آپ کو بہت عزت سے ہی یاد کیا جاتا ہے...... اس لئے تو میں آپ سے ملنے آیا ہوں اور چاہتا ہوں کہ آپ ملک واپس آیئے...... میں آپ کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہتا ہوں...... ایک محترم اور لائق استاد کی حیثیت سے میں آپ کی رہنمائی چاہتا ہوں'' ڈاکٹر رمیض نے قدرے مودبانہ انداز میں کہا تو ڈاکٹر دانش کی آنکھیں خوشی کے احساس سے چمکنے لگیں...... بہت عرصے بعد کوئی ان کو یوں عزت دے رہا تھا...... ورنہ گمنامی کے ان سالوں میں ان کی ذات کی جس طرح نفی ہوئی تھی اور وہ جس شدید ذہنی بحران میں سے گزرے تھے اس نے ان کی شخصیت کو منتشر کر دیا تھا...... ڈاکٹر رمیض کے الفاظ انہیں ہمت اور دلاسا دے رہے تھے وہ تو منتظر تھے کہ کوئی ان کو ایک بار باعزت طریقے سے بلائے اور وہ فوراً ملک واپس چلے جائیں۔

''سر...... ہم سب لوگ آپ کی بہت عزت کرتے ہیں...... ہمارے ملک کو اور اس کے لوگوں کو آپ کی ضرورت ہے...... آپ جیسے ذہین

لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں...... آپ دوسرے لوگوں کے لئے کتنا بڑا سرمایہ ہیں...... شاید آپ کو اس کا اندازہ نہیں'' ڈاکٹر رمیض نے ان کی تعریف کرتے ہوئے کہا تو ڈاکٹر دانش تعریفی الفاظ سن کر مسکرانے لگے۔ ان کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے اور چہرے کی رنگت سرخ ہونے لگی جو ان کے بدلتے جذبات کی عکاس تھی۔ ان کا دل خوشی سے لبریز ہونے لگا اور آنکھیں فرط جذبات سے چمکنے لگیں۔

ڈاکٹر رمیض ان کے تاثرات سے ان کے دل کی کیفیت کا اندازہ لگا رہے تھے اور انہیں خوشی ہو رہی تھی کہ وہ ایک ٹوٹے دل اور مایوس انسان کا حوصلہ بندھا رہے ہیں۔

''سر...... سارا ملک آپ کا منتظر ہے۔ پلیز آپ جلد واپس آنے کی کوشش کریں...... ڈاکٹر رمیض نے کہا تو ڈاکٹر دانش مسکرانے لگے۔

علی موسیٰ ان کے لئے کافی لے کر آئے اور ڈاکٹر دانش کو پہلی بار مسکراتے دیکھ کر قدرے حیران ہوئے۔

''کیا آپ نے میرے ریسرچ پیپرز پڑھے ہیں؟'' ڈاکٹر دانش نے خوش ہو کر پوچھا۔

''نہیں...... کبھی اتفاق نہیں ہوا......'' ڈاکٹر رمیض نے جواب دیا۔

''ٹھہریے...... میں ابھی آپ کو دکھاتا ہوں' اور ڈاکٹر دانش اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔

''تھینکس گاڈ...... آج میں نے پہلی بار ان کو اتنا خوش اور نارمل دیکھا ہے...... ورنہ وہ ہر وقت اپ سیٹ رہتے ہیں'' علی موسیٰ نے کافی کا کپ ڈاکٹر رمیض کو پکڑاتے ہوئے کہا۔

''آپ...... ڈاکٹر دانش کو کیسے جانتے ہیں؟'' ڈاکٹر رمیض نے کافی پیتے ہوئے پوچھا۔

''ان کا دوست ہوں......'' علی موسیٰ نے مختصر جواب دیا۔

ڈاکٹر دانش ایک بڑا سا بیگ اٹھا کر لے آئے اور ڈاکٹر رمیض کو اپنی فائلز کھول کھول کر دکھانے لگے...... ڈاکٹر رمیض بھی انتہائی دلچسپی سے ان کی فائلز کو دیکھنے لگے۔

''واؤ...... ایکسیلنٹ...... سر...... یو آر...... ریئلی اے جینئس'' ڈاکٹر رمیض نے ڈاکٹر دانش کی بھرپور انداز میں تعریف کرتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر دانش کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا اور وہ خوش ہو کر انہیں مزید فائلیں دکھانے لگے۔

''تھینک یو...... ویری مچ...... آپ سے ملاقات بہت اچھی رہی۔ مجھے آپ سے مل کر کس قدر خوشی ہو رہی ہے۔ آپ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے...... مجھے آپ جیسے انسان کی ہی تلاش تھی۔ مجھے امید ہے کہ آپ کی مدد اور تعاون سے میں بھی اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں گا'' ڈاکٹر رمیض نے کہا۔

''کیسا مقصد......؟'' ڈاکٹر دانش نے چونک کر پوچھا۔

''اپنی ریسرچ کا مقصد......'' ڈاکٹر رمیض نے بے یقینی سے کہا۔

''آپ کیسا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں؟''

''ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا مگر جب آپ میری لیب میں آئیں گے تو پھر......شاید میں آپ کو کچھ بتانے کے قابل ہو جاؤں گا......میں آپ کی آمد کا شدت سے منتظر رہوں گا'' ڈاکٹر رمیض نے مسکرا کر پرجوش انداز میں کہا۔

''آئی......ول......سی یو ویری سُون (میں بہت جلد آپ سے ملوں گا)'' ڈاکٹر دانش نے خوش ہو کر کہا اور مسکراتے ہوئے ڈاکٹر رمیض کو رخصت کیا۔

☆

دو روز سے اماں کی طبیعت بہت خراب تھی اور اس وجہ سے فریحہ آفس میں نہیں جا سکی تھی۔ عاصم کی ساری ذمہ داری اس پر آن پڑی تھی ورنہ اماں نے اس کی آدھی سے زیادہ ذمہ داریاں اٹھا رکھی تھیں۔ اماں سرونٹ کوارٹر میں ہی رہتی تھی اور اماں کی دیکھ بھال کے لئے اس نے ایک کولیگ کی ملازمہ کو چند روز کے لئے بلایا تھا مگر عاصم کی ساری ضروریات اسے خود پوری کرنی پڑتی تھیں۔ عاصم اب کتنا ڈیمانڈنگ ہو رہا تھا اور کس قدر تنگ کرنے لگا تھا یا اسے دو دن میں ہی اندازہ ہو گیا تھا۔ اسے اماں کی باتوں پر اب یقین آنے لگا تھا جو ہر روز اس سے شکایت کرتی تھیں کہ اب عاصم ان سے سنبھالا نہیں جاتا......اور......وہ نئے ملازم کو ڈھونڈنے کا کہہ کر خاموش ہو جاتی۔

عاصم کوئی بھی liquid پیتے ہوئے سارا اپنے کپڑوں پر بھی گرا لیتا اور پلانے والے پر بھی۔ پہلے وہ اس کا ڈریس چینج کرتی پھر اپنا......بڑی مشکل سے اسے کھانا کھلا کر فارغ ہوتی تو وہ بیڈ گیلا کر دیتا۔ اسے پھر اپنے اور اس کے کپڑے تبدیل کرنے پڑتے۔ وہ تو الجھ کر رہ گئی تھی اور بار بار خدا کا شکر ادا کر رہی تھی کہ اماں اس کے پاس موجود ہے اس لئے اسے اتنی تکالیف نہیں اٹھانی پڑتیں۔ عاصم کی وجہ سے وہ سارا وقت مصروف رہتی۔ اس کا موبائل بجتا رہتا مگر وہ کوئی کال ریسیو نہ کرتی۔

عاصم سو رہا تھا اور وہ بھی اسے سلاتے ہوئے سو گئی تھی۔ جب گیٹ بیل بجی اور چوکیدار نے اسے شیر افگن کے آنے کی اطلاع دی۔ وہ چونک گئی اور حیرت سے کلاک کی جانب دیکھا۔ رات کے آٹھ بج رہے تھے اس نے اپنا حلیہ ٹھیک کیا اور ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔

شیر افگن آف وہائٹ تھری پیس سوٹ میں انتہائی گریس فل لگ رہا تھا۔ وہ کشمیری کڑھائی کی بلیک شال کندھوں پر اوڑھے، قدرے نیم بیدار آنکھوں کے ساتھ پہلے سے بھی زیادہ پرکشش لگ رہی تھی۔

''آپ کیسے؟'' فریحہ نے انتہائی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''میں آپ کے موبائل پر کال کر رہا تھا مگر آپ کال اٹینڈ نہیں کر رہی تھیں......مجھے فکر ہونے لگی سوچا......کہیں آپ......؟'' شیر افگن نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا۔

''اماں آج بیمار ہیں......اور عاصم کی دیکھ بھال وہی کرتی ہیں اس لئے مجھے عاصم کی وجہ سے گھر پر ہی رہنا پڑ رہا ہے'' فریحہ نے جلدی سے بتایا۔

''کیا اماں......آپ کی کوئی عزیزہ ہیں؟'' شیر افگن نے پوچھا۔

''نہیں......مگر کبھی کبھی کوئی غیر بھی اپنوں سے بڑھ کر ہوتے ہیں......رشتے تو وہی ہوتے ہیں جو دکھ سکھ میں کام آئیں......اور اماں......

میرے لئے میرے اپنوں سے بھی بڑھ کر ہیں......'' فریحہ نے جواب دیا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں...... بات تو احساس، محبت اور ہمدردی کی ہوتی ہے......جس کی وجہ سے ایک انسان کو دوسرے انسان کی ضرورت ہوتی ہے'' شیر افگن نے جواب دیا۔

''آپ کیا لیں گے...... چائے یا کافی......؟'' فریحہ نے پوچھا۔

''کافی...... باہر خاصی ٹھنڈ ہو رہی ہے'' شیر افگن نے کہا۔

''آئی ایم سوری...... مجھے یاد ہی نہیں رہا کہ ہیٹر آن کر دیتی......'' اور فریحہ نے اٹھ کر آتشدان میں رکھا انتہائی سٹائلش ہیٹر آن کیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ٹرے میں کافی اور دوسرے لوازمات لے آئی۔

''آئی ایم سوری...... آپ کو میں نے تکلیف میں ڈال دیا'' شیر افگن نے کہا۔

''کوئی بات نہیں...... مجھے بھی کافی کی بہت طلب ہو رہی تھی۔ عاصم کو سلاتے ہوئے وہیں سو گئی'' فریحہ نے ٹرے اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''مسز فریحہ اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو کیا ہم وہاں ہیٹر کے پاس بیٹھ کر کافی پی سکتے ہیں؟'' شیر افگن نے ڈرائنگ روم کے اس کونے کی جانب اشارہ کیا جہاں ہیٹر آن تھا۔ وہ انتہائی منفرد اور اسٹائلش انداز میں ڈیکوریٹ کیا گیا تھا۔ آتشدان کے سامنے انتہائی خوبصورت ایرانی کارپٹ بچھا تھا اور اس کے اردگرد فلور کشنز اور صوفہ کشنز رکھے تھے۔ اردگرد کین (Cane) کی صوفہ نما کرسیاں تھیں جن پر سرخ ویلوٹ کے کشنز رکھے تھے۔ اردگرد انتہائی خوبصورت ڈرائی فلاور ارینجمنٹس پڑی تھیں۔ اس کارنر کو جس جمالیاتی ذوق کے ساتھ ڈیکوریٹ کیا گیا تھا وہ انسان کی نفسیات پر گہرا اثر ڈالتا تھا۔ آتشدان کے پاس بیٹھ کر انسان خود بخود کسی رومانٹک ورلڈ کی طرف قدم بڑھانے لگتا تھا۔ اس گوشے میں اسٹائلش بلب آن تھے۔ فریحہ اور شیر افگن کافی کے کپ لیے کین کے صوفوں پر بیٹھ گئے۔

''کافی بہت اچھی ہے'' شیر افگن کافی کا سپ لیتے ہوئے بولا۔

''تھینکس......'' اس نے زیرلب مسکرا کر جواب دیا۔

''مسز فریحہ...... میں نے آپ جیسی عورت پوری زندگی میں نہیں دیکھی یو...... آر...... اے جینئس...... ونڈرفل...... اینڈ امیزنگ ویمن'' شیر افگن قدرے محبت پاش نظروں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

''تھنگ از سپیشل وومی...... آئی ایم ویری نارمل پرسن'' فریحہ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''یو...... آر...... ویری ہمبل اینڈ ڈاؤن ٹو ارتھ...... آپ اس قدر ذہین...... اور سپرب عورت ہیں...... کہ میں تو آپ کا مداح ہو گیا ہوں...... سوچتا ہوں اگر آپ کو بچے کی مجبوری نہ ہوتی تو اس وقت آپ کتنی اچیومنٹس حاصل کر چکی ہوتی...... آپ میں کس قدر پوٹینشل ہے......اور آپ کہاں تک جا سکتی ہیں......شاید آپ کو اس کا اندازہ نہیں'' شیر افگن انتہائی شستہ الفاظ میں اس کی تعریف کرتے ہوئے بولا۔

''شیر افگن صاحب...... مجھے نہ تو اپنے بارے میں کوئی زعم ہے اور نہ ہی میں کوئی بڑا دعویٰ کرنا چاہتی ہوں...... مگر اتنا جانتی ہوں کہ جب انسان کو مات ہوتی ہے تو اسے اپنی قدر و قیمت کا بہت اچھا اندازہ ہو جاتا ہے......'' فریحہ نے کافی کا سپ لیتے ہوئے کہا۔

''آپ ایک عام عورت نہیں'' شیر افگن نے کہا۔

''عورت بس عورت ہوتی ہے...... خاص اور عام...... اسے دیکھنے والی نظر بناتی ہے'' فریحہ نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''کیا زندگی میں کوئی بہت تلخ تجربہ ہوا ہے؟'' شیر افگن نے پوچھا۔

''زندگی بذات خود بہت تلخ ہے...... کیا آپ کو اس کا ابھی تک کوئی تجربہ نہیں ہوا......؟'' فریحہ نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''ہاں...... کم و بیش ویسا ہی...... جیسا آپ کو ہو چکا ہے'' شیر افگن نے کافی کا مگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا مطلب......؟'' فریحہ نے حیرت سے پوچھا۔

''مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے ہم دونوں ایک ہی گاڑی میں سوار ہوں...... آپ نے اپنے شوہر کو کیوں چھوڑا......؟'' شیر افگن نے ایک دم پوچھا۔

''میں نے نہیں...... انہوں نے ہمیں چھوڑا......''

''کیوں......؟''

''انہیں زندگی میں ایک چیز بہت عزیز تھی ''کامیابی'' اور وہ اپنی کامیابی کے راستے میں حائل ہر شے کو ٹھوکر مار کر گزرنا چاہتے تھے۔

''آپ کوئی شے تو نہیں تھیں؟'' شیر افگن نے حیرت سے پوچھا۔

''کاش میں کوئی شے ہوتی...... جسے دکھ تو نہ ہوتا'' اس نے کرب سے کہا اور خاموش ہو گئی...... اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

''آئی ایم سوری...... میرا مقصد آپ کو ہرٹ کرنا نہیں...... آپ کا دکھ شیئر کرنا ہے'' شیر افگن نے ملائمت سے کہا۔

''محض باتوں سے دکھ شیئر نہیں ہوتے...... دکھ تو انسان کے دل کی دیواروں کے ساتھ چمٹے ہوتے ہیں۔ اس کے اندر خون کی طرح گردش کرتے رہتے ہیں۔ جونک کی طرح چمٹے ہوئے دکھ خالی باتوں سے کس طرح انسان کے وجود کو چھٹکارا دلا سکتے ہیں۔'' فریحہ نے آہ بھر کر کہا اور آنکھیوں کی نمی میں مزید اضافہ ہونے لگا۔

''آپ کے شوہر نے کب آپ کو چھوڑا......؟'' شیر افگن نے پوچھا۔

''دس سال ہو گئے ہیں'' فریحہ نے جواب دیا۔

''کیا طلاق ہو گئی؟''

''نہیں......''

''کیوں......؟''

''معلوم نہیں''

''کیا آپ انہیں مس کرتی ہیں؟''

''نہیں''

''کیوں......؟''

''کسی کو مس کرنے کے لئے اس کے ساتھ اچھی یادوں کا وابستہ ہونا ضروری ہوتا ہے''

''کیا وہ اچھے شوہر نہیں تھے؟''

''کاش وہ اچھے انسان ہوتے!''

''پھر آپ نے ان سے شادی کیوں کی؟''

''تقدیر انسان کے فیصلوں اور ارادوں پر حاوی ہوتی ہے''

''کیا اب پچھتاتی ہیں؟''

''پچھتاوے تو ازل سے انسان کے مقدر میں ہیں......کیا آپ کبھی نہیں پچھتائے؟''

''ہاں......اکثر پچھتاتا ہوں......کہ میں نے زہرہ اور نازلی سے شادیاں کیوں کیں؟''

''کیا دونوں شادیاں ناکام ہوگئیں......؟''

''ہاں......''

''کیوں......؟''

''جب سوچ......ذہن کا......اور ذہن......جسم کا ساتھ نہ دے تو پھر کامیابی ناکامی میں تبدیل ہو جاتی ہے''۔

دونوں خاموش ہو گئے اور ہیٹر کی لو میں اضافہ ہونے لگا۔

''مجھے خوبصورت اور کامیاب عورتیں پسند ہیں......آپ جیسی......'' شیر افگن اس کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ کر بولا۔

''پلیز......کسی بھی نازک جذبے کو اپنے دل میں جنم دینے سے پہلے یہ ضرور سوچ لینا کہ میری طرف آنے والے تمام راستے بند گلی میں ختم ہوتے ہیں''

''اور بند گلی کو بھی سورج ضرور روشن کرتا ہے''

''اس بند گلی کو سورج کی روشنی کی ضرورت نہیں''

''سورج اپنی روشنی پھیلانے میں آزاد ہوتا ہے'' شیر افگن نے فرط جذبات سے مغلوب ہو کر اس کے قریب آ کر کہا۔ وہ اس کی گرم سانسوں اور بدن سے پھوٹنے والی مخصوص مہک کے حصار میں مقید ہونے لگی۔ شیر افگن نے صوفے کی پشت پر پھیلائے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھنا چاہا۔

"میری limitations مجھے اس کی اجازت نہیں دیتیں......" فریحہ نے اپنا ہاتھ چپکے سے اس کے ہاتھ کے نیچے سے نکال لیا۔

"کیا ایک دوست کے ناتے سے بھی نہیں......؟" شیر افگن نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"نہیں......" اس نے گہری سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ مجھے الجھا رہی ہیں"

"میں خود اپنے لیے ایک الجھن ہوں"

"آپ نے اپنی زندگی کو اتنا بنجر اور ویران کیوں بنا رکھا ہے......زندگی اور اس کی خوشیوں پر آپ کا بھی حق ہے"

"یہ پر امید باتیں میرے لئے بے معنی ہیں"

"اتنی ناامیدی کیوں......؟"

"اور خوش فہمیوں کا فائدہ......؟"

"زندگی یوں تو نہیں گزارتے......"

"یہاں زندگی گزار کون رہا ہے......؟ کیا آپ ویسی ہی زندگی گزار رہے ہیں جیسی آپ چاہتے ہیں؟" فریحہ نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

شیر افگن نے اس کی جانب دیکھا، گہری سانس لی اور خاموش ہو گیا۔

ڈرائنگ روم میں پھر گہرا سکوت چھا گیا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش تھے......مگر دونوں کے ذہنوں میں ان گنت سوالات جنم لے رہے تھے۔

"اب میں چلتا ہوں......" شیر افگن اٹھتے ہوئے بولا۔

وہ بھی خاموشی سے اٹھی اور اس کے ہمراہ چلتی ہوئی کوریڈور کے دروازے تک آئی۔

"آپ بہت مختلف عورت ہیں......میں اب پہلے سے بھی زیادہ آپ کی عزت اور احترام کرنے لگا ہوں......" شیر افگن نے بھرپور نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔ فریحہ نے گہری سانس لی اس کی جانب دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔

"اور......" وہ قدرے توقف سے بولا۔

فریحہ نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔

"شاید......محبت بھی......" شیر افگن نے مضبوط لہجے میں سرگوشی کے انداز میں کہا۔

فریحہ اس کی طرف دیکھتی رہ گئی اور اس کا دل بہت سالوں بعد ایک بار پھر بری طرح دھڑکنے لگا تھا۔ وہ جا چکا تھا مگر وہ کسی سحر میں گرفتار ہو چکی تھی۔

اس نے پہلے بھی 'محبت' کے نام پر دھوکہ کھایا تھا اور اب پھر محبت اس کے دل کے دروازے پر دستک دے رہی تھی جبکہ اس نے اپنے دل کے دروازے کو سختی سے بند کر رکھا تھا۔

''شیر افگن سے محبت......یا......شیر افگن کی اس سے محبت'' وہ سر تھام کر بیٹھ گئی۔اس کے خیالات منتشر ہونے لگے اور دل بے قابو ہونے لگا۔

''نہیں......مجھے ایسا کچھ نہیں سوچنا چاہیے'' اس نے تمام خیالات کو جھٹک کر سوچا اور عاصم کے کمرے میں چلی گئی۔

شیر افگن دن میں کئی کئی بار اس کا نمبر ملاتا اور پھر فون بند کر دیتا......شادیوں کے بعد وہ پھر تنہا تھا اور اسے کسی ایسی عورت کی تلاش تھی جو اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل سکے۔اس نے زہرہ سے شادی اس کے مربعوں کی وجہ سے کی......اس کے دو مربعے فروخت کر کے اس نے شہر میں اپنی انڈسٹری بنائی۔باقی دو کو بیچنے لگا تو زہرہ کے بھائیوں نے جھگڑا شروع کر دیا اور اسے خاموش ہونا پڑا۔زہرہ گاؤں کی حویلی میں اپنے دو بچوں کے ساتھ تنہا زندگی گزارنے پر مجبور تھی۔شیر افگن مہینے میں ایک بار اس کے پاس جاتا اور ہر بار ملاقات شکووں،شکایات کی نذر ہو جاتی......جھگڑا ہوتا اور اگلے روز وہ واپس شہر آ جاتا۔

نازلی......شوبز کی کامیاب اداکارہ تھی۔بہت نام اور پیسے والی خوبصورت عورت تھی شوبز میں اس کے پائے کی اداکارہ نہیں تھی۔نازلی سے شادی کے بعد اس کے پیسے سے انگلینڈ میں ایک ریسٹورنٹ شروع کیا۔جب وہ بزنس اچھی طرح اسٹیبلش ہو گیا تو دونوں میں اختلافات شروع ہو گئے......نازلی نے اپنا پیسہ واپس لینے کی ہر ممکن کوشش کی مگر شیر افگن کی چالاکیوں سے وہ ہار گئی۔اب اسے کسی اور ایسی عورت کی تلاش تھی جو اس کی کامیابیوں میں مزید اضافہ کر سکے اور اس کے لئے ایسا مہرہ ثابت ہو جو اسے بہت اوپر لے جائے......اور وہ فریحہ سے بہت متاثر ہوا تھا۔اس کے ماں باپ بہن بھائی سب امریکہ میں مقیم تھے اور بہت امیر تھے۔فریحہ خود بہت ذہین اور چارمنگ لیڈی تھی۔اس جیسی عورتیں ترقی کے زینے پر قدم رکھتے ہی بلندیوں کے سفر پر گامزن ہو جاتی ہیں......فریحہ نے اب تک ترقی کیوں نہیں کی تھی اور وہ اس کی وجہ جان کر بہت مایوس ہوا تھا......اور اس سے بھی زیادہ تب ہوا تھا جب فریحہ نے اپنے دل کے دروازے پر اس کی دستک کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی......مگر وہ عورت کے دل کو اچھی طرح جانتا تھا اسے کیسے کیسے ورغلایا جا سکتا ہے اس فن سے بھی وہ بخوبی آگاہ تھا......وہ ظاہراً کچھ اور تھا......اور......اندر سے کچھ اور تھا......وہ ہر لحہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والا انسان تھا......وہ اپنی خوبصورت پرکشش شخصیت اور متاثر کن گفتگو سے دلوں کو لبھانے کا گر جانتا تھا......فریحہ اس کا ٹارگٹ تھی۔

وہ صبح آفس جانے سے پہلے اسے مس کال دیتا......آفس پہنچ کر اسے فون کرتا۔اس سے عاصم کی خیریت اور اس کی گھریلو پریشانیوں کے بارے میں پوچھتا اور بہت سی باتوں کے بعد کسی نہ کسی طریقے سے اس تک اپنے دل کی بات پہنچاتا کوئی ایسی بات کہتا جسے سن کر وہ چونک جاتی اور خاموش ہو جاتی......رفتہ رفتہ اس کا ذہن اس کی باتوں کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔اس کا مٹھاس بھرا لب و لہجہ اس کے اندر کی تلخی کو نگلنے لگا تھا۔اس کے اندر پھیلے ویران اور بنجر چٹیل میدان میں کہیں کہیں پھول کھلنے لگے تھے۔جس روز وہ فون نہ کرتا تو وہ انتظار کرتی رہتی......اور مضطرب ہونے لگتی۔

''یہ مجھے کیا ہونے لگا ہے......میں کیوں بہک رہی ہوں......کیوں......اس شخص پر اتنا اعتماد کرنے لگی ہوں......کیوں اس کی باتیں سننے کے لئے بے تاب رہنے لگی ہوں......کیا......میں اپنا پہلا تجربہ بھول رہی ہوں......وہ شخص بھی تو میری بہت تعریفیں کرتا تھا......میری کامیابیاں اسے اچھی لگتی تھیں اور پھر وہ مجھ سے اور میری کامیابیوں سے حسد کرنے لگا......مجھے ہرگز شیر افگن پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے......'' وہ اپنے آپ کو سمجھاتی......مگر......پھر مضطرب ہونے لگتی......شیر افگن سے دستبردار ہونا اسے ناممکن نظر آتا......زندگی میں کسی نہ کسی پر تو اعتبار کرنا پڑتا ہے ورنہ زندگی کا ایک لمحہ

بھی گزارنا مشکل ہو جاتا ہے...... زندگی...... پہلے بھی تو گزر رہی تھی...... شیر افگن کے بغیر'' ذہن سوال کرتا اور وہ خود ہی تردید کرتی۔

''ہاں......'' وہ آہ بھرتی۔

''پھر...... اب کیا ہو گیا ہے؟'' ذہن پھر سوال کرتا۔

''معلوم نہیں...... شاید میں بدلنے لگی ہوں...... یا...... شیر افگن نے میرے دل کو بدل دیا ہے...... اس نے میری ساکن زندگی میں ایسا پتھر پھینکا ہے جس نے مجھے مضطرب کر دیا ہے'' وہ شدید الجھن کا شکار ہونے لگی تھی۔ وہ جس قدر اپنے آپ کو اس کی سوچوں اور خیالات سے روکتی وہ اتنا ہی اس پر حاوی ہونے لگتا۔ وہ اکثر اس کی کالز ریجیکٹ کر دیتی یا پھر فون آف کر دیتی مگر ان سب باتوں کے باوجود وہ خود کو اس کے سحر سے آزاد نہیں کر پائی تھی۔

''میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں'' شیر افگن نے ایک رات اس سے کھل کر اپنے دل کی بات کہی تو وہ چونک گئی۔

''پلیز...... میں ایسی کوئی بات سننا نہیں چاہتی'' وہ خفگی سے بولی۔

''کیوں......؟''

''میں شادی شدہ عورت ہوں''

''ایسی نام نہاد شادی کے بندھن میں آپ کب تک جکڑی رہیں گی؟''

''جب تک میرا بچہ میرے ساتھ ہے''

''میں اسے بھی اپنانے کو تیار ہوں''

''اس کا اپنا باپ اسے نہیں اپنا سکا...... کسی اور کے دل میں اس کے لئے نرم جذبات کہاں سے پیدا ہوں گے''

''کیا آپ سب کو ایک ہی نظر سے دیکھتی ہیں؟''

''ہاں...... اندر سے سب انسان کہیں نہ کہیں ایک جیسے ہی ہوتے ہیں''

''یہ آپ کی بہت بڑی غلط فہمی ہے''

''نہیں یہ میرا تجربہ ہے''

''ہر انسان کا تجربہ مختلف ہوتا ہے''

''جو آپ چاہتے ہیں...... وہ ممکن نہیں''

''سب ممکن ہے...... بشرطیکہ آپ اپنی سوچ کو بدلیں''

''پلیز...... مجھے مت الجھائیں......''

''اور آپ...... نے مجھے الجھا دیا ہے''

''میں...... تو...... خود......'' وہ بے بسی سے بولی۔

"میں آپ کو خوش دیکھنا چاہتا ہوں جب سے آپ سے ملاقات ہوئی ہے......ایک بار بھی آپ کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں دیکھی...... آپ کی آنکھوں میں اس قدر اداسی ہے کہ مجھے دکھ ہوتا ہے......اتنی خشک اور ویران زندگی کو میں بدلنا چاہتا ہوں......"

"کیوں......؟" اس نے گہری سانس لیتے ہوئے پوچھا۔

"دیکھنا چاہتا ہوں کہ آپ مسکراتی ہوئی کیسی دکھائی دیں گی......یقیناً بہت اچھی لگیں گی......خوشی سے چمکتی آنکھوں کے ساتھ مسکراتی ہوئی......میرے دل میں اتر جائیں گی......آپ میں ایسا ہی سحر ہے......کیا آپ یہ جانتی ہیں؟" شیر افگن سرگوشی کے انداز میں بولا۔

"نہیں......میں کچھ نہیں جانتی" اس نے گھبرا کر فون آف کر دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"کس پر یقین کروں......؟ اس شخص پر......یا اس پر......جس نے مجھے پانے کے لئے اپنے گھر والوں کو چھوڑ دیا......وہ بھی میرے بارے میں بہت پوزیسو تھا......اور پھر میرے وجود سے ہی اسے نفرت ہونے لگی۔ شیر افگن اپنی دو بیویوں سے مطمئن نہیں ہو سکا......تو......مجھ سے کیسے ہو پائے گا......؟ وہ سوچ میں پڑ گئی۔

شیر افگن......سمجھدار انسان ہے وہ ہر بات سوچ سمجھ کر کرنے کا عادی ہے......وہ اس کی جن خوبیوں سے متاثر تھا وہ یقینی طور پر اس میں موجود تھیں صرف شیر افگن ہی نہیں ہر کوئی اس کی پُرکشش شخصیت سے ضرور متاثر ہوتا تھا۔ وہ بہت سی باتیں سوچ کر مضطرب ہو جاتی......اور بہت سی باتیں اسے مطمئن بھی کر دیتیں......تمام الجھنوں کے باوجود وہ اپنے دل سے شیر افگن کے لئے نرم جذبات کو ختم نہ کر سکی۔

☆

ڈاکٹر محسن زیدی نے انتہائی توجہ سے ڈاکٹر رمیض کی ڈاکٹر دانش سے ملاقات کی کہانی سنی اور ان کی آنکھوں میں آنسو بھرنے لگے......چہرے پر تفکر کے تاثرات نمایاں ہونے لگے۔

"ڈاکٹر دانش کے بارے میں جان کر مجھے بہت تکلیف ہو رہی ہے......اس قدر جینئس اور لائق انسان زندگی کے کس فیز (دور) میں سے گزر رہا ہے......زندگی بھی انسان کو کس قدر عجیب و غریب حالات سے دوچار کرتی ہے کہ یقین ہی نہیں آتا......انسانی برین پر ریسرچ کرنے والے کا اپنا برین اتنا ڈسٹرب ہو گیا ہے کہ......وہ......" ڈاکٹر محسن زیدی نے آہ بھر کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور پریشانی سے ڈاکٹر رمیض کی جانب دیکھنے لگے۔

"سر......انسانی دماغ کتنا بڑا معمہ ہے......اس بات کی حقیقت پر تب یقین آتا ہے جب پریکٹیکل لائف میں اس کی صلاحیتیں ہم پر آشکار ہوتی ہیں......ڈاکٹر دانش اب بہت بہتر ہیں۔ ڈاکٹر رابرٹ نے بہت توجہ اور محنت سے ان کا علاج کیا ہے......ڈاکٹر دانش مجھ سے کونیکٹ میں ہیں......اور......وہ اگلے ہفتے ملک واپس آ رہے ہیں......" ڈاکٹر رمیض نے مسکرا کر بتایا۔

"رئیلی......اٹس اے گڈ نیوز......" ڈاکٹر محسن زیدی خوش ہو کر بولے۔

"سر......میں نے تو سوچا تھا کہ آپ کو سرپرائز دوں گا جب ان کو اپنے ساتھ لے کر آپ کے آفس میں آؤں گا مگر آپ ان کے بارے میں جان کر اتنے ڈسٹرب ہو گئے کہ مجھے پہلے ہی بتانا پڑا" ڈاکٹر رمیض نے مسکراتے ہوئے بتایا تو ڈاکٹر محسن زیدی بھی خوش ہو کر مسکرانے لگے۔

''ڈاکٹر رمیض...... یہ خبر سنا کر آپ نے میرا سارا ڈپریشن دور کر دیا ہے...... پلیز آپ ایک اور اہم کام کیجئے کہ ان کی فیملی سے ضرور رابطہ کیجئے۔ اتنے کرائسس کے بعد فیملی کا ایسے مریض کے ساتھ فرینڈلی ہونا بہت ضروری ہے کیونکہ انسان کے اندر کے جذبات کو فیملی زیادہ اچھے طریقے سے سمجھ سکتی ہے'' ڈاکٹر محسن زیدی نے سنجیدگی سے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''یو...... آر...... رائٹ سر...... لیکن فیملی سے کونٹیکٹ کیسے ممکن ہے...... میرا مطلب ہے ان کا ایڈریس......؟'' ڈاکٹر رمیض نے استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔

''میں کچھ ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو ان کی وائف کو اچھی طرح جانتے ہیں...... میں ایک دو روز میں آپ کو ان کا ایڈریس دوں گا...... میں چاہتا ہوں آپ خود ان کی مسز سے جا کر ملیں اور ڈاکٹر دانش کا پرجوش استقبال کرنے میں ہمارے ساتھ ان کی فیملی بھی شامل ہو...... اس کا ان کے ذہن پر اچھا اثر پڑے گا'' ڈاکٹر محسن زیدی نے کہا۔

''رائٹ سر...... میں ضرور ان سے ملنے جاؤں گا......'' ڈاکٹر رمیض نے اٹھتے ہوئے کہا تو ڈاکٹر محسن زیدی نے مسکرا کر ان کی جانب دیکھا اور پرتپاک انداز میں ان سے ہاتھ ملا کر انہیں رخصت کیا۔

☆

چھٹی کا دن تھا اور فریحہ گھر پر ہی تھی۔ وہ ہر چھٹی کے دن عاصم کو گاڑی میں اماں کے ساتھ بٹھا کر باہر آؤٹنگ پر جاتی کہ اس کی صحت کے لئے اسے باہر لے جانا بہت ضروری تھا مگر پچھلے دو تین ماہ سے ایسا ہو رہا تھا کہ وہ جیسے ہی اسے کسی پارک میں لے کر جاتی تو بچوں کے علاوہ مرد اور عورتیں بھی عاصم کے گرد یوں اکٹھے ہو جاتے جیسے وہ کوئی عجوبہ ہو...... سب اس کی طرف حیرت اور خوف سے دیکھتے پھر فریحہ کی طرف رحم بھری نگاہوں سے دیکھتے تو اس کا دل بری طرح کٹنے لگتا۔ اس کا وہاں بیٹھنا مشکل ہو جاتا اور وہ اسے گاڑی میں ڈال کر جلدی سے گھر لے آتی اور گھر آ کر دیر تک روتی رہتی۔ اماں اسے تسلیاں دیتی، اس کی ہمت بندھاتی مگر اس کا دل بہت پریشان رہتا۔

رفتہ رفتہ اس نے عاصم کو آؤٹنگ کے لئے لے کر جانا ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ عاصم کی وارڈ روب میں سلے کپڑے نکال کر ٹھیک کر رہی تھی جب شیر افگن کا فون آ گیا۔ وہ رفتہ رفتہ اس کے قریب آنے کی بہت کوشش کر رہا تھا۔ وہ ہر روز صبح آفس جانے سے پہلے اسے فون کر کے اس کی خیریت پوچھتا۔ آفس میں لنچ بریک میں، شام کو گھر واپس آنے پر رات کو سونے سے پہلے...... اس سے مختلف موضوعات پر بات چیت کرتا۔ گویا وہ اسے اپنا عادی بنا رہا تھا۔ نفسیاتی طور پر اس کی سوچوں کو اپنے سحر اور حصار میں جکڑ رہا تھا۔ اس کی ویران اور تنہا زندگی میں اپنے ہونے کا احساس دلا کر اس کی سوچوں کا زاویہ بدلنا چاہتا تھا۔ پچھلے ایک ماہ سے جاری اس روٹین نے فریحہ کی سوچوں کو مضطرب کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اپنے آپ سے الجھنے لگی تھی۔ ذہن ہر وقت گہری سوچوں میں غوطہ زن رہتا۔ اتنا سوچنے سے وہ خود ہی پریشان رہنے لگی تھی۔ شیر افگن اتنی خوبصورت زندہ دل اور سحر انگیز شخصیت لیے ہوئے ہر وقت اس کے ذہن پر چھایا رہتا۔ وہ کبھی کبھی نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی فون کالز کی منتظر رہتی...... شیر افگن اپنے مقصد میں کامیاب ہو رہا تھا۔ فریحہ کو اپنا منتظر پا کر وہ اندر ہی اندر فاتحانہ انداز میں مسکراتا۔

لاؤنج میں ٹیلی فون کی گھنٹی زور زور سے چلا رہی تھی۔ اماں کچن میں مصروف تھی۔ فریحہ تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد کمرے سے باہر نکلی اور ریسیور کان سے لگایا اس نے دو منٹ بات کی اور فون بند ہو گیا۔ وہ گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ کون اس سے ملنے آ رہا تھا۔ فون کرنے والے نے صرف ایڈریس پوچھا تھا اور اس کے شوہر کے بارے میں...... وہ...... ؟ کون ہے اور...... کیوں...... مجھ سے ملنا چاہتا ہے؟'' اس نے حیرت سے سوچا۔

آدھے گھنٹے بعد گیٹ بیل بجی۔ چوکیدار نے اس کو انٹر کام پر آنے والے کا نام بتایا اور اندر بھیج دیا۔

''السلام و علیکم!...... ڈاکٹر رمیض نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا اور قدرے حیرت سے فریحہ کی جاذب نظر اور دلکش شخصیت کی جانب دیکھنے لگا۔

آیئے تشریف لایئے۔ فریحہ اسے ڈرائنگ روم میں لے کر چلی گئی اور اسے صوفے پر بیٹھنے کو کہا۔

ڈاکٹر رمیض نے پرستائش نگاہوں سے اردگرد دیکھا۔

''میں اماں کو چائے کا کہہ کر آتی ہوں'' وہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گی اور ڈاکٹر رمیض حیرت سے اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہ گئے۔

وہ تھوڑی دیر بعد کمرے میں دوبارہ واپس آئی۔ ''جی...... فرمایئے...... آپ کس سلسلے میں مجھ سے ملنا چاہتے تھے؟'' فریحہ نے ڈاکٹر رمیض کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''مسز دانش...... میں......'' ڈاکٹر رمیض نے کچھ کہنا چاہا۔

''میرا نام فریحہ ہے...... جس ریفرنس سے آپ مجھے بلا رہے ہیں...... مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں'' فریحہ نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

''میں نہیں جانتا کہ اس صورت حال میں کیا کہنا مناسب ہے اور کیا نہیں...... لیکن...... کیا آپ مجھے تھوڑی دیر کے لئے اس بات کی اجازت دیں گی کہ میں ڈاکٹر صاحب کے بارے میں کچھ بات کر سکوں'' ڈاکٹر رمیض نے اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا تو فریحہ نے چونک کر ڈاکٹر رمیض کی جانب دیکھا اور خاموش ہو گئی۔

اماں چائے کی ٹرالی لے کر آئی اور فریحہ نے چائے بنا کر کپ اس کے سامنے رکھا۔

''تھینک یو......'' ڈاکٹر رمیض نے چائے کا کپ پکڑتے ہوئے کہا اور اس کی جانب استفہامیہ انداز میں دیکھنے لگا۔

''میڈم...... کیا آپ کو معلوم ہے کہ ڈاکٹر صاحب کہاں ہیں اور کن حالات میں ہیں؟'' ڈاکٹر رمیض نے آہستہ آواز میں پوچھا۔

''نہیں...... اور نہ ہی میں جاننا چاہتی ہوں'' فریحہ نے جواب دیا۔

فریحہ کی گفتگو سے ڈاکٹر رمیض کو اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ دونوں کے تعلقات خوشگوار نہیں تھے اور فریحہ ان کے ذکر سے ہی بیزار نظر آ رہی تھی۔

''میڈم...... ڈاکٹر صاحب کو ہماری...... آئی مین...... آپ کی کیئر اور مدد کی بہت ضرورت ہے...... میں ان سے انگلینڈ میں ملا تھا۔ وہ بہت مشکل میں ہیں...... بہت کرائسس میں ہیں۔ ہم ان کو زندگی کی طرف واپس لانا چاہتے ہیں؟ ڈاکٹر رمیض نے قدرے ٹھہر ٹھہر کر کہا اور اس لمحے ان

کو اپنے ہی الفاظ بڑے بے وزن معلوم ہو رہے تھے کیونکہ فریحہ کے لئے وہ بہت غیر اہم اور معمولی تھے۔ وہ ان کو سننا ہی نہیں چاہتی تھی۔

''سوری...... میں اس سلسلے میں آپ کی کچھ بھی مدد نہیں کر سکتی...... وہ شخص میرے لئے مر چکا ہے اور ہم اس کے لئے'' فریحہ غصے میں بولی۔

''میڈم...... آپ کے اختلافات کی نوعیت کیا ہے...... مجھے معلوم نہیں...... اور نہ ہی میں جاننا چاہتا ہوں۔ صرف انسانیت کے ناتے آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ بیمار ہیں اور......'' ڈاکٹر رمیض نے مزید کچھ کہنا چاہا۔

''اور...... میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ اس کو سنبھالوں...... پلیز...... آپ انہیں کسی ہاسپٹل میں ایڈمٹ کرا دیں تو بہتر ہے...... آپ مجھے اس شخص کے لئے کسی طرح بھی کنونس نہیں کر سکتے'' فریحہ نے دوٹوک لہجے میں کہا اور ڈاکٹر رمیض نے انتہائی مایوسی سے اس کی جانب دیکھا اور کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر پریشانی اور اداسی کے تاثرات نمایاں ہونے لگے فریحہ کو اس کی مایوس آنکھیں پریشان کرنے لگیں۔

''آپ دانش کے بارے میں کتنا جانتے ہیں؟'' فریحہ نے اچانک سوال کیا۔

''کچھ خاص نہیں...... بس اتنا کہ وہ ہمارے ملک کے قابل فخر ڈاکٹر اور بہت جینئس سرجن ہیں...... ایک حادثے نے ان کو شدید ذہنی دھچکا لگایا اور ان کی پرسنالٹی damage ہونے لگی...... میں اور ڈاکٹر محسن زیدی چاہتے ہیں کہ وہ دوبارہ ملک واپس آ کر نارمل زندگی گزاریں۔ وہ ایسے لائق انسان ہیں جس سے انسانیت کو بہت فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ ایسے انسان بہت نایاب اور قیمتی ہوتے ہیں۔ ان کی فیملی کو اور ارد گرد کے لوگوں کو ان کی قدر کرنی چاہیے'' ڈاکٹر رمیض نے قدرے جذباتی انداز میں کہا۔

''آپ نے کبھی بہت خوبصورت اور عالیشان عمارت کی چھت کو موسم کی پہلی طوفانی بارش میں گرتے دیکھا ہے؟'' فریحہ نے معنی خیز انداز میں سوال کیا۔

''کیا مطلب......؟'' ڈاکٹر رمیض نے چونک کر پوچھا۔

''وہ چھت اندر سے مضبوط نہیں ہوتی...... اس میں استعمال ہونے والا میٹریل ناقص ہوتا ہے اور وہ موسم کی پہلی سختی ہی برداشت نہیں کر پاتی، گر جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ساری عمارت تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ کچھ انسان بھی اندر سے ایسے ہی ناقص ہوتے ہیں...... ظاہری طور پر بہت شاندار اور پرکشش مگر اندرونی طور پر...... بہت......'' فریحہ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''کیا ڈاکٹر دانش......؟'' ڈاکٹر رمیض نے کچھ کہنا چاہا۔

''آپ ایک اچھے انسان معلوم ہوتے ہیں جو ایک اجنبی انسان کے لئے دل میں بہت نرم گوشہ اور نازک احساسات رکھتے ہیں...... آپ ان کی مجھ سے بہتر انداز میں کیئر کر سکتے ہیں'' فریحہ نے سنجیدگی سے کہا۔

''کیا آپ کے دل میں ان کے لئے کوئی نرم گوشہ نہیں'' ڈاکٹر رمیض نے پوچھا۔

''نہیں......'' اس نے قطعیت سے جواب دیا۔

''جس شخص سے اتنی قربت رہی ہو...... کیا اس سے اتنی نفرت بھی کی جا سکتی ہے؟'' ڈاکٹر رمیض نے حیرت سے پوچھا۔

''کیا آپ کی شادی ہوگئی ہے؟''فریحہ نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''جی......ہاں......دو ماہ قبل......''

''آپ نے اپنی وائف کو کیسا پایا؟''

''بہت اچھا......''

''کیا آپ ان سے جدا ہونا چاہیں گے؟''

''کبھی بھی نہیں''ڈاکٹر رمیض نے جواب دیا۔

''کیوں......؟''فریحہ نے حیرت سے پوچھا۔

''اس لئے کہ میں دریہ سے بہت محبت کرتا ہوں''

''کیا صرف محبت کی خاطر......آپ انہیں چھوڑنا نہیں چاہیں گے؟''فریحہ نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......''

اور اگر یہی دل محبت کی بجائے نفرت سے بھر جائے تو......؟

''یہ ناممکن ہے......''

''سب کچھ ممکن ہے......دلوں کو اور ذہنوں کو بدلتے ذرا بھی دیر نہیں لگتی......خدا کرے ایسا کبھی نہ ہو......لیکن اگر آپ کو زندگی میں کسی ایسے مرحلے کا سامنا کرنا پڑا تو مجھے ضرور یاد کیجئے گا......کہ جس کے دل میں صرف ایک شخص کے لئے محبت کی بجائے نفرت بھری ہے......اگر محبت طاقتور ہوتی ہے تو نفرت بھی شدید تر ہوتی ہے......اس سے بھی فرار ممکن نہیں''فریحہ نے جواب دیا۔

ڈاکٹر رمیض نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا اور خدا حافظ کہہ کر لوٹ آیا۔ اس کا ذہن بہت الجھ گیا تھا۔ فریحہ اسے بہت سمجھدار اور باوقار عورت نظر آئی تھی......اس کی باتوں میں وزن اور پختگی تھی اور ایسے لوگ محض نظریات کی بنیاد پر باتیں نہیں کرتے ان کی باتوں میں تجربہ کی جھلک نمایاں ہوتی ہے اور اس کو اتنا تلخ تجربہ ہوا تھا کہ وہ ایک لمحے کے لئے بھی ڈاکٹر دانش کے لئے نرم لب ولہجے میں نہیں بولی تھی۔

''کیا ڈاکٹر دانش اس سے مختلف انسان ہیں جو وہ نظر آتے ہیں''وہ وسوسوں کا شکار ہونے لگا تھا۔ وہ ڈاکٹر دانش کو کہاں رکھے گا......؟ کیا ایک انسان اپنے بیوی بچوں کے لئے اتنا نا قابل قبول بھی ہوسکتا ہے۔ ڈاکٹر دانش کے آنے میں صرف دو دن باقی تھے اور ڈاکٹر محسن زیدی نے کس قدر مشکل سے ان کی بیوی کا ایڈریس لے کر اسے دیا تھا اور وہ بہت پرامید ہو کر ان سے ملنے آئے تھے مگر فریحہ کے رویے سے مایوس ہو کر لوٹ رہے تھے۔ وہ ڈاکٹر محسن کو کیسے بتائیں گے کہ ان کی بیوی تو ان کا ذکر بھی سننا نہیں چاہتی......وہ کس قدر مشکل میں پھنس گئے تھے۔ وہ اپنی ہی سوچوں میں گم گاڑی ڈرائیو کر رہے تھے جب ڈاکٹر محسن زیدی کا فون آگیا اور وہ مسز دانش کے بارے میں پوچھنے لگے۔ ڈاکٹر رمیض نے ان کو ساری صورت حال کے بارے میں بتایا تو وہ بھی پریشان ہوگئے۔

''آپ رات کو میرے ہاسپٹل آ ئیے...... پھر بات کریں گے'' ڈاکٹر محسن زیدی نے کہہ کر فون آف کر دیا۔

''یہ مسئلہ تو بہت گھمبیر ہے...... ڈاکٹر دانش پہلے ہی شدید ذہنی اذیت میں مبتلا رہے ہیں...... اور اگر ان کی فیملی بھی ان کو نہیں اپناتی تو وہ مزید مضطرب ہو جائیں گے کہیں وہ پھر بکھر نہ جائیں'' ڈاکٹر محسن زیدی نے فکر مندی سے کہا۔

''میں بھی یہی سوچ کر پریشان ہو رہا ہوں'' ڈاکٹر رمیض نے جواب دیا۔

''کیا آپ نے ان کی مسز کو ان کی بیماری کے بارے میں تفصیل سے نہیں بتایا؟'' ڈاکٹر زیدی نے پوچھا۔

''سر...... ان کی زندگی میں ڈاکٹر دانش کے لئے ذرا سی بھی گنجائش نہیں......'' ڈاکٹر رمیض نے کہا۔

''یہ تو بہت پریشان کن بات ہے...... انسان کے دکھ اور تکلیف کا سب سے زیادہ اثر اس کے اپنوں پر ہوتا ہے۔ اس کو اذیت میں دیکھ کر وہ سارے شکوے اور رنجش بھول جاتے ہیں اور جو پھر بھی نہیں بھول پاتے وہ ضرور اس کی کوئی اسٹرونگ وجہ ہوتی ہے...... بہر حال یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے...... ہم کیسے ان کو مجبور کر سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ اپنے ہاسپٹل کی انیکسی میں ان کے لئے کوئی جگہ دیکھیں جہاں وہ بہتر طریقے سے قیام کر سکیں...... ان کو ہماری توجہ کی بہت ضرورت ہوگی'' ڈاکٹر زیدی نے ہمدردانہ انداز میں کہا۔

''سر...... میں اپنے گھر میں ایک کمرہ ان کے لئے صاف کرا لیتا ہوں...... ہمارے گھر میں ایک گیسٹ روم بھی ہے'' ڈاکٹر رمیض نے کہا۔

'یہ تو بہت اچھا ہے...... اس سے بہتر انتظام کہیں اور نہیں ہو سکتا۔ ان کی فلائٹ کا کیا ٹائم ہے؟'' ڈاکٹر زیدی نے پوچھا۔

''پرسوں رات بارہ بجے'' ڈاکٹر رمیض نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے میں اپنے چند ڈاکٹر دوستوں کے ساتھ ائیر پورٹ پر جاؤں گا۔ ہم ڈاکٹر دانش کا بھرپور استقبال کریں گے'' ڈاکٹر زیدی نے مسکرا کر کہا تو ڈاکٹر رمیض بھی مسکرانے لگے۔

عشق کا عین

عشق کا عین...... علیم الحق حقی کے حساس قلم سے، عشق مجازی سے عشق حقیقی تک کے سفر کی داستان، ع...... ش...... ق کے حروف کی آگاہی کا درجہ بہ درجہ احوال۔ دورِ حاضر کا مقبول ترین ناول...... ایک ایسا ناول جو آپ کے سوچنے کا انداز بدل کر آپ کی زندگی میں مثبت تبدیلی لے آئے گا۔

(۱۱)

نگار بیگم نے رینا کو جو سزا دی تھی اس نے اس کے ذہن پر بری طرح اثر کیا تھا۔ وہ نگار بیگم کے بارے میں منفی سوچنا شروع ہو گئی تھی...... اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ نگار بیگم کی اتنی خدمت رائیگاں گئی تھی۔ وہ جو خواب آنکھوں میں سمائے نگار بیگم کے پیچھے آئی تھی...... وہ خواب چکنا چور ہو رہے تھے...... وہ مایوسی کے عالم میں رات کو اپنے کمرے میں بیٹھی گزشتہ دنوں کے واقعات کے بارے میں سوچ رہی تھی...... آج نگار بیگم کا مجرا تھا اس لئے سب لوگ سرِ شام ہی اس خاص محفل کے اہتمام میں لگے تھے اور آج مہمان شخصیت بھی کوئی خاص آدمی تھا...... جو بیرون ملک سے آیا تھا...... اور اس کے کسی کزن نے جو کہ ایک وفاقی وزیر تھا۔ اس خاص محفل کا اہتمام کروایا تھا اس لئے تیاریاں بھی خاص ہو رہی تھیں...... محفل اپنے عروج پر تھی...... اور وہ اپنے کمرے میں بیٹھی ان تمام واقعات کے بارے میں سوچ رہی تھی جو جونک کی مانند اس کے دماغ کے اندرونی خلیوں سے چمٹ گئے تھے اور جن کو کھرچ کر نکالنا اس کے بس سے باہر تھا...... اسے اپنی بے عزتی کا احساس چین نہیں لینے دے رہا تھا...... بار بار اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے نمودار ہو رہے تھے...... اسے وہ رات یاد آتی تھی...... جب وہ بھوک اور پیاس سے نڈھال ہو کر فرش پر گر گئی تھی...... اور اس کا سر کمرے میں رکھی شیشے کی ٹیبل سے بری طرح ٹکرایا تھا اور وہ خون میں لت پت ہو گئی تھی۔ اگلے روز چمن بیگم اسے اٹھانے آئی تو اس کی حالت دیکھ کر گھبرا گئی اور اسے فوراً ہسپتال لے جایا گیا...... دو دن وہ ہسپتال میں رہی۔ سر میں کئی ٹانکے لگے اور نگار بیگم اسے دیکھنے ایک بار بھی ہسپتال نہیں گئی تھی اور اس بات نے رینا کے دل میں نگار بیگم کے لئے منفی احساسات پیدا کر دیئے تھے...... اور جب وہ ٹھیک ہو کر واپس آئی تو نگار بیگم نے اسے دیکھ کر منہ موڑ لیا۔

"یہ سزا تمہاری زندگی میں پہلی اور آخری ہونی چاہیے...... بہتر یہی کہ تم اس سے سبق سیکھ لو...... ہمارے ہاں نہ سزائیں دینے کا رواج ہے اور نہ ہی چوری کرنے کا...... اور اگر کبھی کبھار کوئی ایسا جرم کر لیتا ہے تو پھر وہ ہماری سزا سے نہیں بچ سکتا" نگار بیگم نے گویا اسے واشگاف الفاظ میں دھمکی دے دی تھی اور اس کے بعد وہ مزید محتاط ہو گئی تھی...... استاد چندو خان جب بھی نظر آتے وہ راستہ بدل لیتی...... چمن بیگم کی نظروں سے بھی بچنے کی ہر ممکن کوشش کرتی...... نگار بیگم کے کام پہلے جس توجہ اور لگن سے کرتی تھی اب اس کے اندر سے وہ دلچسپی اور شوق ختم ہو رہا تھا۔ وہ نگار بیگم کی نظروں سے خائف رہنے لگی تھی...... اس کے اندر بہت تلخی اور مایوسی پیدا ہو گئی تھی اور یہ مایوسی اسے کچھ کرنے پر ابھار رہی تھی کہ وہ وہاں سے بھاگ جائے مگر اسے یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ وہاں سے بھاگنا نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی آسان...... وہ اپنے چھوٹے سے کمرے کو بغور دیکھنے لگی جس میں صرف ایک پلنگ کی جگہ تھی...... اور اس کے ساتھ چھوٹا سا باتھ روم...... نہ کوئی کھڑکی نہ کوئی روشن دان...... اکثر اس کا دم وہاں پر گھٹتا تھا مگر وہ کسی سے کچھ نہ کہتی...... نگار بیگم کو سب خبر تھی...... اور انہوں نے خود ہی اس کے لئے یہ کمرہ منتخب کیا تھا، یہ کمرہ نگار بیگم کے اپنے بیڈ روم سے قدرے ہٹ کر چند

کمروں کے پیچھے تھا...... رینا جہاں کہیں بھی جاتی نگار بیگم کی نظریں اس پر ہوتیں اور نگار بیگم کی نظروں سے بچ کر کہیں جانا اس کے لئے ممکن نہیں تھا...... صرف اس رات جب وہ درگاہ سے ہو کر آتی تھی ...... تب کمرے کا دروازہ بند ہوتا تھا...... ورنہ کھلا ہی رہتا یا پھر جب کوئی خاص مہمان شب گزاری کے لئے آتا تو تیسری منزل پر ایک خاص مہمان خانے میں اسے ٹھہرایا جاتا...... اور نگار بیگم اس رات اپنے کمرے سے غائب ہوتیں...... نگار بیگم اپنے مخصوص کمرے میں کبھی کسی مہمان کو نہ لاتیں...... اور نہ ہی کسی کو اجازت ملتی کہ وہ کبھی اس کمرے کی طرف رخ بھی کرے۔ رات گہری ہو رہی تھی۔ گھنگھروؤں کی جھنکار اور نگار بیگم کی رقص و سرور کی محفل عروج پر تھی۔ رینا کا دل بہت پریشان ہو رہا تھا۔ وہ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ ہر طرف گہری تاریکی تھی...... اور اس تاریکی کو گھنگھروؤں کی جھنکار بری طرح جھنجھوڑ رہی تھی۔ اس کا دل کسی سے بات کرنے کو چاہ رہا تھا اپنے دل کی باتیں اور غم بتانے کو...... وہ پیچھے بالکونی میں جا کر کھڑی ہوگئی اور طوائفوں کے کمروں کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگی ایک کونے میں دو تین طوائفیں باتیں کر رہی تھیں...... وہ بالکونی میں سے کھسکتی ہوئی اس کونے میں پہنچ گئی جہاں لان میں کھڑی طوائفوں کی باتیں سنی جا سکتی تھیں...... اسے ان کے چہرے واضح طور پر نظر نہیں آ رہے تھے۔

''آج کی رات تو نگار بیگم کے وارے نیارے ہو جائیں گے...... سنا ہے امریکہ سے خاص مہمان آیا ہے...... خاص طور پر نگار بیگم کا رقص دیکھنے کے لئے'' ایک نے کہا۔

''نگار بیگم کے یہاں ہوتے ہوئے کوئی خاص مہمان، بھلا کہیں اور جانے کی جرأت بھی کر سکتا ہے......'' دوسری نے جواب دیا۔

''کیا مطلب......؟'' تیسری نے حیرت سے پوچھا۔

''شیریں بائی...... جیسے تم تو جانتی نہیں...... نگار بیگم کہاں یہ برداشت کرتی ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے کوئی اور طوائف آگے نکل جائے...... جانتی نہیں نغمہ بائی کا انجام...... واہ کیا رقص کرتی تھی۔ اٹھارہ سال کی عمر میں اس نے اس کوٹھے کا نام روشن کر دیا تھا...... بڑے بڑے لوگ اس کا رقص دیکھنے کے لئے خاص طور پر آتے تھے۔ کندن بیگم زندہ تھیں...... نگار بیگم، نغمہ بائی سے خائف رہنے لگی تھیں...... اور پھر اچانک نغمہ بائی کہیں گم ہوگئی آج تک کسی کو معلوم نہیں ہو سکا وہ کہاں گئی...... ؟ مر گئی یا اسے زمین کھا گئی۔ نگار بیگم کسی اور کو اپنے سے بڑھتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی...... سنا نہیں...... استاد چندو نے رینا کی تعریف کی...... تو...... نگار بیگم نے اسے کتنی سزا دی۔ بیچاری...... مجھے تو اس پر ترس آتا ہے...... نجانے کیوں وہ یہاں آ گئی...... ؟ اس سے تو وہ بھکارن ہی بہتر تھی......'' تیسری نے کہا۔

''کاش ہم سے پوچھتی تو ہم اسے بتاتے...... کہ...... یہاں کیا کچھ ہوتا ہے...... یہاں ریشمی پردوں اور رنگ برنگی شیشوں کے پیچھے کیسے زندہ لاشیں بکتی ہیں...... کسی کو کیا معلوم......؟'' پہلی نے نم آنکھوں کے ساتھ کہا۔

''ہم تو نجانے کن گناہوں کی سزا یہاں بھگت رہی ہیں...... زخمی دل لیے جسموں پر خوبصورت پوشاکیں پہنے، میک اپ کی تہوں کے نیچے نجانے کتنے غم چھپائے رکھتی ہیں...... کاش کوئی ہمارے دلوں کے اندر جھانک سکے...... ہماری روحیں کتنا سسکتی رہتی ہیں...... کاش کوئی ان کی آہوں اور سسکیوں کو سن سکے......'' دوسری طوائف نے کہا اور رونا شروع ہوگئی......

''چپ کرو...... فضہ بائی...... ہم اپنی قسمتوں سے لڑ تو نہیں سکتے...... اور لڑیں بھی...... تو...... کس بنیاد پر...... نہ ہمارے پاس گھر ہیں...... نہ رشتے اور...... نہ ہی......'' شیریں بائی نے آہ بھر کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''ہماری بنجر، سوکھی اور ویران زندگیوں میں کبھی ایسی دستک نہیں ہوئی...... جس کے انتظار میں ہم زندگی کے یہ تلخ لمحات گزارنے پر مجبور ہیں......'' تیسری طوائف نے کہا۔

''ہم بہت بے بس ہیں...... جیسے کسی بھنور میں پھنس گئے ہوں...... نہ اس بھنور سے نکل پاتی ہیں...... اور...... نہ ہی کوئی بچانے آتا ہے۔ نہ منزل نظر آتی ہے اور نہ ہی کوئی نشان منزل ہے'' شیریں بائی افسردگی سے بولی۔

''اور ہمیں زیادہ بے بس نگار بیگم نے بنا دیا ہے...... کسی اور کے کوٹھے پر طوائفوں پر ایسی سختیاں نہیں کی جاتیں جیسی...... ہم پر...... اس نے تو ہمارے ہاتھ پاؤں کاٹ رکھے ہیں...... سننے میں یہ بھی آیا ہے کہ نغمہ بائی کا کسی سے چکر تھا...... وہ نغمہ بائی سے شادی کرنا چاہتا تھا...... اور...... نگار بیگم نے کندن بیگم کے ایسے کان بھرے کہ اسے قتل کروا دیا...... اس کے بعد نغمہ بائی غائب ہو گئی...... کوئی کہتا ہے...... وہ خود ہی چلی گئی...... کوئی کہتا ہے کہ نگار بیگم نے اسے ٹھکانے لگوا دیا......'' فضہ بائی نے بتایا۔

''نگار بیگم...... اتنی مرد بیزار کیوں ہے......؟'' تیسری طوائف نے حیرت سے سوال کیا۔

''معلوم نہیں...... ہو گی...... کوئی وجہ......'' فضہ بائی نے کہا۔

''میں نے کئی بار سوچا...... یہاں سے چلی جاؤں مگر...... پورے علاقے میں نگار بیگم اور اس کی طوائفوں کی جو عزت ہے وہ کہیں اور نہیں۔ یہ بات تو ماننی پڑے گی کہ نگار بیگم نے اپنے اس فن اور پیشے میں نام بنا رکھا ہے...... وہ نہ تو طوائفوں کو اتنا بکاؤ مال بناتی ہے اور نہ خود بنتی ہے......'' فضہ بائی نے کہا۔

رینا نے اپنے پیچھے قدموں کی چاپ سنی تو اس کا دل دہل گیا اور وہ دبک کر ایک اندھیرے کونے میں بیٹھ گئی...... اس کا دل ڈوبنے لگا اور سانس تیز ہونے لگی...... قدموں کی چاپ جیسے ہی گم ہوئی وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے چپکے سے اپنے کمرے میں آ گئی...... اپنے کمرے میں آ کر اس نے سکون کی سانس لی اور آنکھیں بند کر کے بستر پر لیٹ گئی۔

☆

بے بی کے مرنے کے بعد نرگس کا برا حال تھا...... وہ ہر دم روتی رہتی تھی...... فردوس اور جمی اسے چپ کراتے...... اسے تسلیاں دیتے مگر وہ کسی طرح بھی مطمئن نہ ہوتی۔

''آپا...... اب حوصلہ کر...... ہمت کر...... رب کو یہی منظور تھا...... ہم کیا کر سکتے ہیں...... کیوں رو رو کر ہلکان ہو رہی ہے...... تو بھی مر گئی...... تو پھر ہم کیا کریں گے؟'' فردوس نے نرگس کے آنسو اپنے دوپٹے سے پونچھتے ہوئے کہا۔

''اے...... فردوس...... کیسے چپ کروں...... رب کو میری ایک خوشی نہ بھائی...... اس نے میری گود ہی اجاڑ دی...... مجھے یوں لگتا تھا جیسے

بے بی میری ہی اولاد ہو...... میں نے ہی اس کو پیدا کیا ہو...... ہائے کیسے بھولوں...... اپنے ان ہاتھوں سے اس کو کھلاتی رہی...... وہ کیسی پیاری پیاری باتیں کرتا تھا...... آئے...... ہائے...... میں...... مرجاؤں...... اس کے بغیر تو مجھے سانس لینا بھی اچھا نہیں لگ رہا...... اے فردوس دیکھ...... یہاں ادھر...... میری گود میں سوتا تھا...... میرے سینے سے لگتا تھا...... میرے ساتھ سوتا تھا...... میں تو اپنے سارے غم بھول گئی تھی...... جب سے وہ ملا تھا...... یوں لگتا تھا...... رب نے ہمیں بڑھاپے کا سہارا دے دیا ہو...... مگر رب نے خوشی دے کر چھین لی...... اگر اس نے اسے مجھ سے چھیننا ہی تھا...... تو پھر دیا ہی کیوں؟ فردوس تو نہیں جانتی...... اس کے بغیر مجھے کچھ سوجھتا ہی نہیں...... یوں لگتا ہے جیسے وہ مجھے بلا رہا ہو...... مجھے کتنے پیار سے بلاتا تھا...... سارے صحن میں اماں، اماں کرتے دوڑتا پھرتا تھا...... ابھی تو اس کے کھلونے بھی نہیں ٹوٹے...... اور...... وہ خود چلا گیا......'' نرگس دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

''آپا...... بس کر...... ہمت کر...... رب کے سامنے ہم سب بے بس ہیں۔ ہم کیا کر سکتے ہیں...... قسم...... تیری جان کی...... اگر میرے بس میں ہوتا تو میں اپنا سب کچھ بیچ کر اسے تیرے پاس لے آتی...... مگر وہ گیا ہی ادھر ہے...... جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا...... تو پھر ہم کیا کر سکتے ہیں...... سوائے چپ رہنے کے'' فردوس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''فردوس...... صبر ہی تو نہیں آتا...... کیا کروں......؟ تم سب میرے پاس تب آئے تھے جب جوان تھے...... شامو پندرہ برس کا تھا...... میں نے تو بچے کی محبت دیکھی ہی نہیں تھی...... اس نے تو میرے اندر ماما جگا دی...... فردوس تو کیا جانے...... ماں کا دکھ...... ماں کا کلیجہ کتنا پھٹتا ہے جب اس کے بچے کو تکلیف ہوتی ہے...... ارے میرا بچہ تو میرا دل ہی چیر گیا ہے...... کیا کروں...... کیسے اپنے پھٹے کلیجے کو سیوں...... ہائے...... صبر نہیں آتا'' نرگس اپنے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے بین کرنے لگی۔

''آپا...... اس کی اصل ماں کو بھی تو دیکھ...... جس نے اس کو جنم دے کر کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیا...... دیکھ اس میں بھی تو کتنا حوصلہ تھا......'' جی نے منہ بنا کر قدرے شکایتی لہجے میں کہا۔

''ارے جی...... پہلے میں بھی اس کی ماں کو گالیاں دیتی تھی...... مگر اب سوچتی ہوں...... وہ ضرور مجبور ہو گی...... دنیا کی کوئی ماں بھی اپنے بچے کو یوں نہیں پھینک سکتی...... اور اس ماں نے تو اسے اتنے مہینے اپنے پیٹ میں رکھ کر پالا...... وہ...... کیسے اس کی دشمن ہو سکتی ہے...... وہ مجبور ہو گی...... ہائے...... تم کیا جانو...... ماں کے دل کو'' نرگس اونچی آواز میں واویلا کرنے لگی۔

''اب...... ایسا کب تک چلے گا...... زندگی تو گزارنی ہے...... نا۔ ہمیں اپنے دھندے پر بھی جانا ہے...... اس کے بغیر ہم کیسے زندہ رہ سکتے ہیں'' فردوس نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''فردوس...... میرا بچہ مرگیا ہے...... اور...... تو مجھے ناچ گانے پر جانے کو کہہ رہی ہے...... نہ...... مجھ سے یہ سب نہیں ہوتا...... اری مجھ میں تو ہمت ہی نہیں رہی...... اس نے تو میری کمر توڑ کر رکھ دی ہے...... میں کیسے دوسروں کے بچوں کو لوریاں دینے جاؤں...... کیسے کسی شادی شدہ جوڑے کو اولاد کی خوشیوں کی مبارکبادیں دوں...... نہ...... فردوس میں یہ نہیں کر سکتی'' نرگس آہ بھر کر بولی۔

"آپا...... بے بی کو مرے دو ماہ ہو گئے ہیں...... اور...... تو آج بھی اسی طرح رو رہی ہے...... جیسے وہ آج مرا ہے...... میں تو یہ کہہ رہی ہوں اب اپنے آپ کو ٹھیک کر...... ہمارا کون والی وارث ہے جو ہمیں بٹھا کر کھلائے گا...... ہمیں اپنے پیٹ کا ایندھن خود ہی کمانا پڑتا ہے...... میں اور جمی کہاں تک کام کریں...... شامو بھی چلا گیا ہے...... اس نے بھی کبھی مڑ کر خبر نہ لی کہ ہم کس حال میں ہیں...... بڑا ہی بے غیرت نکلا...... خود غرض...... بے وفا...... بدلحاظ......" فردوس اسے کوسنے لگی۔

"اری...... فردوس اسے کاہے کو گالیاں بک رہی ہے...... ہم نے کونسا اس کے ساتھ اچھا کیا...... جھٹ اسے گھر سے نکال دیا یہ بھی نہ دیکھا کہ رات کتنی ٹھنڈی ہے وہ کہاں جائے گا...... شاید مجھے شامو کی ہی بددعا لگ گئی ہو...... اور...... میرا بے بی مر گیا ہے...... وہ بے بی کو بہت ناپسند کرتا تھا...... اس لئے کہ میں بے بی کو بہت چاہتی تھی۔ بے بی سے پہلے تو شامو ہی میرا سب کچھ تھا۔ وہ بے بی کے آنے کے بعد مجھ سے بہت الجھنے لگا تھا...... نجانے کیوں مجھے یہ لگتا ہے کہ شامو نے بے بی کو کوئی بددعا دی ہو گی اسی لیے وہ مر گیا ہے......" نرگس کسی الجھن کا شکار ہو کر بولنے لگی۔

"نہیں آپا...... یہ تیرا وہم ہے...... بھلا شامو کیوں بے بی کو بددعائیں دے گا...... شامو ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا...... اور تو اپنے ذہن پر بوجھ مت ڈال...... شامو چلا گیا...... اور...... بے بی بھی چلا گیا ہے کسی دن میں...... تم...... اور جمی بھی چلے جائیں گے......" فردوس نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"فردوس...... خدا کے لئے اب کسی کے جانے کی بات نہ کر...... اب میں...... ہرگز یہ برداشت نہیں کر سکوں گی...... مر جاؤں گی...... اب کوئی گیا...... سنا...... تو نے" نرگس نے مشتعل ہو کر اپنے سر کے بالوں کو نوچنا شروع کر دیا۔

"آپا...... کیا کر رہی ہو...... باؤلی نہ ہو...... تو...... ہم تمہیں چھوڑ کر بھلا کہاں جا سکتے ہیں......؟ میں تو رب کی بات کر رہی تھی...... اس نے بلایا...... تو...... پھر...... تو جانا ہی پڑے گا" فردوس نے کہا۔

"نہیں اب میں رب کے پاس بھی کسی کو نہیں جانے دوں گی...... اب وہ پہلے مجھے بلائے گا...... پھر کسی اور کو...... اب میرے دل اور کلیجے میں کسی کی جدائی برداشت کرنے کی طاقت نہیں" نرگس پھر رونے لگی تو فردوس نے اس کو اپنے گلے کے ساتھ لگایا۔

"آپا...... چپ کر...... کوئی کسی کو چھوڑ کر نہیں جائے گا...... تو بے فکر رہ" فردوس نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"اور...... نہیں...... تو...... کیا...... سب اکٹھے ہی دریا میں کود کر مر جائیں گے...... کیوں فردوس...... ٹھیک کہہ رہا ہوں نا" جمی نے قدرے مسکراتے ہوئے کہا تو دونوں اس کو دیکھ کر مسکرانے لگیں۔

"یہ ہوئی نا...... بات...... ایسی بات پر ایک دھمال ہو جائے...... اٹھ فردوس...... آج ایسا بھنگڑا ڈالیں گے کہ آپا بھی ہمارے ساتھ بھنگڑا ڈالنا شروع ہو جائے گی" جمی نے فردوس کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں...... جمی...... یہ تو نے ٹھیک کہا...... ہو...... جا شروع...... سن کوئی ڈسکو گانا...... بولنا...... آپا کو ڈسکو گانے بڑے پسند تھے......" فردوس نے ہنستے ہوئے کہا۔

اور دونوں نرگس کے گرد ناچنا شروع ہو گئے...... فردوس اپنی زنانہ مردانہ آواز میں لہک لہک کر گانا گاتے ہوئے ڈانس کرنے لگی اور جمی

گلے میں ڈھول ڈال کر اسے بے ہنگم انداز میں بجانے لگا......ان کی الٹی سیدھی حرکتیں دیکھ کر نرگس کی ہنسی نکل گئی اور اسے ہنستا دیکھ کر وہ اور جوش سے ناچنے اور گانے لگے......

''ارے بس......کرو......کیوں مجھے مارنے کا ارادہ ہے......'' نرگس نے لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے کہا۔

''آپا......ہم تو تمہیں ہرگز مرنے نہیں دیں گے......'' جمی نے چھیڑنے کے انداز میں کہا۔

''چل......نامراد......کیسی باتیں کر رہا ہے......شامو بھی اکثر ایسی چھیڑ خانی اور ہنسی مذاق کرتا تھا......'' نرگس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''آج تجھے شامو بہت یاد آ رہا ہے......خیر تو ہے'' فردوس نے دوپٹے سے اپنا چہرہ صاف کرتے ہوئے کہا جو بہت ناچنے کی وجہ سے تر ہو رہا تھا۔

''ہاں......نجانے کیوں......؟ آج وہ مجھے بڑا ہی یاد آ رہا ہے......فردوس کہیں سے اس کا پتہ تو کر......کہاں گیا ہے وہ......جب سے اس گھر سے گیا ہے......لوٹ کر ہی نہیں آیا......'' نرگس نے کہا۔

''یہاں سے جانے کے بعد سنا تھا......کہ......اس نے نائیوں کا کام شروع کیا تھا......کسی حجام کے ہاں ملازمت کرتا تھا'' جمی نے بتایا۔

''ہیں......یہ کیا کہہ رہے ہو اور تجھے کس نے بتایا؟'' نرگس نے حیرت سے پوچھا۔

''ایک لڑکے نے بتایا تھا وہ بھی اسی حجام کے پاس کام کرتا تھا......مگر میں نے اس کی بات دھیان سے نہ سنی کہ ہمیں اب اس سے کیا لینا دینا......'' جمی نے کہا۔

''کتنا بے وقوف نکلا......اپنا پیشہ چھوڑ کر دوسرا کام کرنے لگا......باؤلا......بڑا ہی سرپھرا نکلا......ہمیشہ اپنی من مانیاں کرتا تھا......جمی کسی طرح پتہ تو لگا کہ وہ گیا کہاں ہے......کیا اسی حجام کے پاس ابھی بھی کام کرتا ہے یا کہیں اور......؟'' نرگس نے التجائیہ انداز میں جمی سے کہا۔

''ٹھیک ہے......میں پتہ لگانے کی کوشش کروں گا......بس تو وعدہ کر......اب روئے دھوئے گی نہیں......'' جمی نے کہا۔

''ٹھیک ہے......تم لوگوں کے سامنے نہیں روؤں گی......اکیلے میں رونے سے تو منع نہ کر......سن جمی......مجھے بے بی بہت یاد آتا ہے......وہ پورے چار سال کا ہو کر مرا ہے......چار سالوں کو دو مہینوں میں کیسے بھلا دوں......بڑا ہی پیارا بچہ تھا......خود تو چلا گیا......مگر میرا اندر خالی کر گیا......کیسے بتاؤں......تم نہیں سمجھ سکو گے'' نرگس آہ بھر کر بولی۔

''ٹھیک ہے......تجھے اکیلے میں رونے سے منع نہیں کرتے مگر ہمارے سامنے مت رونا......بہت دل کٹتا ہے'' جمی نے کہا۔

''اچھا......مگر......تو نے اب اپنا وعدہ نہیں بھولنا......بس شامو کو ڈھونڈ نکال......میں اس سے معافی مانگنا چاہتی ہوں......میں نے اس کا دل دکھایا اور رب نے میرا دل دکھا دیا......بس مجھے وہم سا ہو گیا ہے......اور......جب تک شامو سے معافی نہیں مانگوں گی مجھے چین نہیں آئے گا'' نرگس نے کہا۔

''تو فکر نہ کر......فردوس آج اچھا سا کھانا بنا......بہت دنوں بعد آپا کا موڈ اچھا ہوا ہے......آج کی رات ہم جشن منائیں گے'' جمی نے

مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں......ٹھیک ہے......'' فردوس نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا اور نرگس دونوں کو خوش دیکھ کر مسکرانے لگی۔

☆

برکتے پورے ایک ماہ سے مسلسل بخار میں مبتلا تھی...... بخار کا زور کسی طرح بھی کم نہیں ہو رہا تھا وہ چارپائی پر پڑی نظر ہی نہ آتی تھی۔ بخار اور کمزوری نے اس کو بدحال کر دیا تھا۔ جسم بخار کی تپش سے جلتا اور دل رانی اور منے کی جدائی میں تڑپتا رہتا...... اندر اور باہر ایسی آگ لگی ہوئی تھی جو کسی طرح بھی ٹھنڈی نہیں ہو رہی تھی۔ ملکا کسی وقت کہیں سے کوئی بخار کی گولی لے آتا تو اسے کھلا دیتا...... تھوڑی دیر کے لئے بخار کا زور ٹوٹتا پھر ویسے ہی بخار ہو جاتا۔ اتنے پیسے کسی کے پاس نہ ہوتے کہ اس کے لئے کسی ڈاکٹر سے دوا لاتے۔ سارے بچے دھندے پر چلے جاتے۔ ایک دن گڈی دھندے پر نہ جاتی اور اگلے دن شبو نہ جاتی...... گھر رہ کر وہ ماں کی دیکھ بھال کرتیں۔ برکتے چارپائی سے اٹھ کر ایک قدم بھی چل کر کہیں نہیں جا سکتی تھی۔

موسم بہت گرم ہو رہا تھا۔ سورج یوں آگ برسا رہا تھا جیسے سوا نیزے پر کھڑا ہو۔ جھگی کے اندر بلا کی گرمی اور تپش تھی۔ برکتے چارپائی پر لیٹی تڑپ رہی تھی...... مگر اس کی آنکھیں مسلسل جھگی کے دروازے پر تھیں...... گڈی کہیں سے پانی کا گھڑا بھر کر لائی......

''رانی...... تو...... آ گئی......؟'' برکتے نیم بے ہوشی میں بولی۔

''اماں...... رانی...... کہاں سے آئے گی...... میں ہوں گڈی'' دس سالہ گڈی نے کہا۔

''کون گڈی...... میری دھی کا نام تو رانی ہے...... تو...... کون ہے؟'' برکتے نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''اے...... اماں...... تو بھی اچھا بولے ہے...... اب مجھے بھی بھول گئی...... کل کو سجو اور مٹھو کو بھی بھول جانا...... مگر تو اسے نہیں بھولے گی...... جو تجھے چھوڑ کر چلی گئی'' گڈی منہ بنا کر بولی۔

''کہاں چلی گئی......؟'' برکتے نے آہ بھر کر پوچھا۔

''مجھے کیا پتہ......؟ آئے گی تو پوچھ لینا...... بتا اب کیا کھائے گی...... روٹی کھانی ہے تو پکا دوں......'' گڈی نے پوچھا۔

''مجھے بھوک نہیں...... رانی کے لئے روٹی پکا دے...... اور...... سن منے کے لئے بھی دودھ بنا دیتا...... وہ بھی بھوکا ہے...... رو رہا تھا...... گڈی اس کو بھی دودھ ڈال دے...... دونوں ہی بھوکے ہیں...... رانی بھی اور منا بھی'' برکتے نیم بے ہوشی میں بڑبڑاتی رہی۔

''اماں...... بخار نے تو تجھے پاگل ہی کر دیا ہے۔ پتہ نہیں کیا کیا بولے جا رہی ہے...... جا...... بولتی رہ...... میں تو سونے لگی ہوں...... ساری رات مجھ نہیں سونے دیتے اور صبح کو تیری باتیں......'' گڈی مزاج کی تلخ تھی۔ بڑبڑا کر بولی اور تپتے فرش پر ایک پھٹا پرانا کپڑا بچھا کر سو گئی مگر برکتے کو نہ نیند آتی تھی اور نہ ہی چین...... وہ ہر سانس پر ہائے ہائے کرتی رانی اور منے کو یاد کرتی۔ اچانک بادلوں کا لشکر ٹکڑوں کی صورت میں سورج کے آگے پیچھے طواف کرنے لگا۔ بادلوں کی اوٹ میں چھپا سورج چمک کر اپنے ہونے کا احساس دلا رہا تھا اور بادل اس کی روشنیوں کے درپے تھے...... بادلوں اور سورج کی آنکھ مچولی سے زمین والے مسرور ہو رہے تھے کیونکہ آسمان پر بادلوں کی موجودگی خوش آئند تھی جو شعلے برساتے سورج کی

ہولنا کی کو کچھ کم کرے گی...... دیکھتے ہی دیکھتے گرجتے بادل چھم چھم برسنے لگے...... سوکھی، بنجر اور تپتی زمین نے بارش کی پھوار پر سکھ کا سانس لیا۔ گرمی سے جھلسے ہوئے چہرے، سوکھے درخت اور پیاسے پرندوں نے فرحت محسوس کی...... سب نے سکون کا سانس لیا...... ہر طرف خوشی کی لہر دوڑ گئی...... مگر...... برکتے کے تپتے وجود نے آہ بھر کر آسمان کی طرف دیکھا۔ جھگی کے چھیدوں میں سے برستے آسمان کو دیکھ کر سوچ میں پڑ گئی...... اگر...... نالہ بھر گیا...... تو...... ہم کہاں جائیں گے......؟ جھگی کا فرش برستی بارش میں کیچڑ ہو گیا تھا جہاں قدم رکھتے تھے...... وہیں زمین سرکنے لگتی تھی اور مضبوط قدم بھی پھسلنے لگتے تھے...... گڈی بھی گھبرا کر اٹھ گئی۔ باد و باراں کا طوفان اس قدر شدید تھا کہ جھگی کا کپڑا ہی اڑ گیا ان کا سارا سامان یوں بکھرا اور بھیگا پڑا تھا جیسے کوئی قافلہ سرعام لوٹ لیا گیا ہو...... اور بچا کھچا فالتو سامان چھوڑ دیا گیا ہو...... برکتے نے ایسی لٹی پٹی حالت دیکھ کر گھبراہٹ میں چیزوں کو سمیٹنے کی کوشش کی کہ اچانک پاؤں اس قدر زور سے پھسلا کر وہ تیورا کر زمین پر گر پڑی اور کراہنے لگی...... گڈی لپک کر اسے بچانے کو بھاگی اور بڑی مشکل سے اسے چارپائی پر لٹایا۔ وہ بے بسی سے ادھر ادھر دیکھنے لگی...... کوئی بندہ بشر، کوئی مسافر، کوئی ہمدرد، کوئی مددگار کہیں نظر نہ آیا۔ برکتے اونچی آواز میں درد سے بلبلانے لگی اور گڈی اپنی اور ماں کی لاچاری دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

وہ اس لمحے کس قدر بے بس اور مجبور تھیں...... یہ وہ جانتی تھیں...... انسان کس قدر کمزور اور بے بس ہے...... جب اپنے آپ کو لٹتے اور بکھرتے دیکھتا ہے تو کچھ کر نہیں پاتا...... وہ برستے آسمان تلے خاموشی سے کراہ رہیں تھیں سوائے رونے کے ان کے پاس کرنے کو اور کچھ نہیں تھا...... اوپر آسمان ان کی بے بسی پر رو رہا تھا اور نیچے زمین اپنے آنسوؤں کا سیلاب اگل رہی تھی۔

''یا اللہ! میں کیا کروں...... ابے کو بھیج دے...... مٹھو اور سجو کو ہی بھیج دے'' اچانک گڈی کے دل سے دعا نکلی...... برکتے مسلسل کراہ رہی تھی...... تھوڑی دیر بعد بارش تھمنے لگی...... اور شام گئے ملکا، مٹھو، سجو اور دوسرے بچے گھر لوٹے...... اجڑی ہوئی جھگی دیکھ کر سب گھبرا گئے...... برکتے کی کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی وہ درد سے چلا رہی تھی۔ ادھر سے نالے کا گندا بدبودار پانی اچھل اچھل کر ان کی جھگی کی طرف آ رہا تھا۔

''ابا...... کیا کریں...... یہ...... یہ تو بڑی مصیبت آ گئی ہے...... اور یہاں ہماری مدد کرنے کو بھی کوئی نہیں...... وہاں بستی تو اپنی تھی۔ ذرا سی بات ہوتی تھی سب دوڑے آتے تھے...... اور یہاں مدد تو کیا...... کوئی پوچھنے کو نہیں آتا......'' سجو غصے سے بولا۔

''تیرا کیا مطلب ہے...... ہم واپس چلے جائیں'' ملکے نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......'' سجو قدرے رعب سے بولا۔

''تو...... پاگل ہو گیا ہے...... ساری بستی کے لوگ منہ پر تھوکیں گے کہ پھر واپس آ گئے......'' ملکا غصے سے بولا۔

''ابا یہاں مرنے سے بہتر ہے کہ وہاں جا کر باتیں سن لیں...... یہاں مر گئے تو جنازہ پڑھنے بھی کوئی نہیں آئے گا......'' سجو نے کہا تو ملکا اس کی بات سن کر خاموش ہو گیا۔

''اور اگر سب نے پوچھا کہ رانی کہاں گئی ہے...... تو کیا کہیں گے؟'' ملکے نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

''کہہ دینا...... مر گئی ہے...... ہیضے سے مر گئی ہے...... وہ کون سا آ کر دیکھ لیں گے'' سجو نے غصے سے منہ بنا کر کہا۔

''مٹھو......تو......کیا کہتا ہے؟'' ملکے نے اس سے مشورہ چاہا۔

''ابا......سچ ٹھیک ہی کہتا ہے......یہ برا حال تو دیکھ رہا ہے......کوئی جگہ نہیں کہ رات کو کہیں سو سکیں......وہاں ہوتے......تو بستی کے سارے لڑکے مدد کو آجاتے......یہاں اماں بھی رانی کو ہی یاد کرتی رہتی ہے......وہاں جا کر اس کا دل بھی کچھ بہل جائے گا'' مٹھو نے کہا۔

''مگر اس کو لے کر کیسے جائیں گے......اس سے تو ایک قدم بھی چلا نہیں جا سکے گا'' ملکے نے کہا۔

''اس کو چارپائی پر اٹھا کر لے جائیں گے'' مٹھو نے رائے دی اور انہوں نے اسی وقت سامان اکٹھا کیا......کراہتی درد سے بلبلاتی برکتے کو چارپائی پر ڈالا اور کچرے والے ایک ٹرالر کی منت سماجت کی جو ان کے شہر کی طرف جا رہا تھا۔ سب اس پر بیٹھ کر بستی میں واپس آ گئے۔ بستی میں ہر طرف ان کے واپس آنے کا شور مچ گیا......سارے لوگ اکٹھے ہو گئے اور ان سے یوں ملنے آنے لگے جیسے وہ کسی ملک کا دورہ کر کے واپس آ رہے ہوں۔

''رانی کہاں ہے......؟ نظر نہیں آ رہی'' ہر ایک کی زبان پر یہی سوال تھا۔

''وہ......وہ......مر گئی ہے'' ملکا جواب دیتا تو درد سے کراہتی برکتے چونک کر اس کی طرف دیکھتی۔

''نہیں......نہیں......یہ جھوٹ بول رہا ہے......میری رانی نہیں مر سکتی'' برکتے ایک دم چلانے لگی۔

''صدمے نے اس کے دماغ پر اثر کیا ہے......وہ اسے بھول نہیں پائی......'' ملکا جلدی سے جواب دیتا......

''کیا اسے وہیں دفنا دیا......؟''

''ہاں......'' ملکا جواب دیتا۔

''رانی کا سن کر بہت افسوس ہو رہا ہے......یقین نہیں آتا کہ وہ مر گئی ہے......وہ تو بہت اچھی تھی......سب سے بہت پیار کرتی تھی......اسے کیسے بھولیں......'' ہر کسی کی زبان پر رانی کے لئے دکھی الفاظ تھے......سب رانی سے محبت اور ہمدردی کا اظہار کر رہے تھے اور ملکے کا خون غصے سے کھولنے لگا......اس کے اندر غم و غصے کی لہر دوڑنے لگی......وہ اندر ہی اندر رانی کو گالیاں بکتا......

''کاش وہ مر ہی جائے تو بہتر ہے'' وہ دل میں اسے بددعا دیتا......اور نم آنکھوں کے ساتھ آسمان کی طرف دیکھتا جو شاید اس کا پیغام رانی کے دل تک پہنچا رہا تھا۔

☆

رینا کا دل بری طرح بے تاب ہو رہا تھا۔ برسات کی اس رم جھم میں سب طوائفیں رنگ برنگے دوپٹے اوڑھے لان کی سرسبز گیلی گھاس پر ننگے پاؤں ایک دوسری کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر ناچ گا کر برسات کی آمد کی خوشیاں منا رہی تھیں......برستی بارش میں ان کے کپڑے اور اوڑھنیاں بھیگ کر ان کے جسموں کے ساتھ چمٹ گئی تھیں......گیلے بالوں کو کھول کر سکھایا جا رہا تھا......

نگار بیگم نے برسات کی پہلی بارش کی خوشی میں باورچن کو خصوصی پکوان بنانے کو کہا تھا......مختلف کھانوں کی سوندھی سوندھی خوشبو نے ساری حویلی کی فضا کو مہکا کر رکھ دیا تھا۔ نگار بیگم اپنے کمرے کی بالکونی میں سے نیچے طوائفوں کو ہنستے گاتے اور رقص کرتے دیکھ کر خوش ہو رہی تھی......

حویلی کے سب مکین خوب خوشیاں منا رہے تھے......چمن بیگم تو خوشی سے ادھر ادھر یوں اڑتی پھر رہی تھیں جیسے ان کے پاؤں میں کوئی پھرکی لگی ہو...... سب سے مسکرا مسکرا کر یوں بات کر رہی تھیں جیسے ان کی کوئی بڑی سی لاٹری نکل آئی ہو۔ سب ہی خوش تھے اور موسم سے لطف اندوز ہو رہے تھے مگر......

رینا کا دل بہت گھبرا رہا تھا...... جیسے جیسے بارش تیز ہو رہی تھی۔ اسے اپنی جھگی یاد آ رہی تھی...... نجانے ہماری جھگی اپنی جگہ قائم بھی رہی ہوگی یا نہیں......کہیں وہ نالے کے گندے پانی سے بھر نہ گئی ہو...... اگر ایسا ہوا ہوگا...... تو...... اماں کیا کرے گی...... بچے کہاں سوئیں گے اور ابا اپنے اپاہج وجود کو کہاں تک گھسیٹتا ہوگا...... گھر والوں کی یاد آتے ہی اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں......اور......اس کے دل سے دعائیں نکلنے لگیں۔

''یا اللہ! میرے گھر کو خیر سے رکھنا...... اماں...... ابے اور بچوں کو...... اتنی تیز بارش سے بچانا کہیں یہ ان...... کو...... برباد ہی نہ کردے ان کو سیلاب کے پانی سے بچا......'' وہ بالکونی کی دیوار کے ساتھ ٹکٹکی باندھے آسمان کو دیکھتے ہوئے دل سے دعائیں کرتی رہی اور اندر ہی اندر ایک ایک دعا کے ساتھ آہیں بھرتی رہی......

''رانی...... تجھے کیا ملا...... سارے رشتے...... ناتوں کو توڑ کر تو اس جگہ آ گئی...... تجھے تیرے لالچ نے اندھا کر دیا...... یا...... تیرے خوابوں نے تجھے جینے نہیں دیا...... نہ تو تیرے خواب پورے ہوئے ہیں نہ ہی کچھ اور حاصل ہوا ہے...... کب تک یونہی بھٹکتی رہے گی...... اس سے بہتر تھا تو وہیں رہتی...... اپنے خون کے رشتوں کے سنگ جیتی اور مرتی...... یہاں مر جائے گی تو شاید کوئی قبر میں بھی نہ ڈالے...... نہ یہاں زندگی سانس لیتی ہے اور نہ ہی موت کہیں نظر آتی ہے...... یہاں تو صرف رنگ برنگے چہرے ہیں...... جو ابھی تو ہیں کب غائب ہو جائیں...... کسے معلوم ہے......؟ اس نے آہ بھر کر سوچا......اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگیں...... اسے اپنے پیچھے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے گھبرا کر پیچھے دیکھا تو بھری آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو گالوں پر بہہ نکلے......اس کے پیچھے نگار بیگم کا ایک نوجوان کارندہ دلبر کھڑا تھا...... رینا کو روتے دیکھ کر وہ چونکا۔

''خیر تو ہے...... رینا بیگم آپ کیوں رو رہی ہیں؟ کیا کسی سے کوئی جھگڑا ہوا ہے؟ اور نگار بیگم کہاں ہیں...... میں ان سے ملنے آیا تھا بلکہ انہوں نے مجھے بلایا تھا......'' دلبر جلدی سے بولا۔

''معلوم نہیں وہ کہاں ہیں'' رینا نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھے مگر آپ کیوں رو رہی ہیں...... کیا برستے آسمان کو دیکھ کر آپ بھی......'' اس نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا۔

''ن......ن......نہیں......ایسی کوئی بات نہیں'' رینا جلدی سے بولی۔

''تو......پھر......کیا بات ہے......؟'' دلبر نے قدرے ملائمت سے پوچھا۔

''کچھ نہیں......یونہی'' رینا نے آہ بھر کر کہا۔

''رینا بیگم......آپ مجھ پر آنکھیں بند کر کے اعتبار کر سکتی ہیں......'' دلبر نے کہا تو رینا نے حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے اسے دیکھا۔

''ہاں......میرے دل میں آپ کے لئے خاص جگہ ہے......کئی بار سوچا آپ سے کبھی دل کی بات کروں......اور......آج مجھے موقع مل

گیا...... مجھے آپ شروع سے ہی بہت اچھی لگتی ہیں...... یاد ہے جس روز آپ یہاں آئیں...... تو...... سب سے پہلے میں ہی آپ کو ملا تھا...... میں سیڑھیاں اتر رہا تھا...... آپ کے چہرے پر اک معصومیت سی تھی...... مجھے آپ کے یہاں آنے کا افسوس تھا...... آپ یہاں کیوں آ گئیں......؟ مگر اب آپ آ ہی گئی ہیں تو پھر مجھے محسوس ہوا کہ آپ یہاں کی ہر طوائف سے مختلف ہیں...... آپ کبھی بھی دوسروں جیسی نہیں ہو سکتی......" دلبر اسے سب کچھ بتا تا رہا اور وہ حیرت سے سنتی رہی۔

"رینا بیگم...... یہاں ہر ایک کا کوئی نہ کوئی ہمراز ہے...... کیونکہ یہاں پر رہنے والوں کے دل اتنے رازوں سے آشنا ہو جاتے ہیں...... کہ انہیں ہمراز بنانے پڑتے ہیں...... آپ بھی مجھے اپنے دل کی بات بتا سکتی ہیں...... بتایئے آپ کیوں رو رہی تھیں......" دلبر نے اس کے قریب آ کر محبت سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ زندگی میں پہلی بار کسی مرد نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا تھا...... اس کے بدن میں ایک برقی لہر سی دوڑ گئی اس نے جھرجھری سی لی اور گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی...... اور دیوار کے ساتھ چمٹ کر کھڑی ہو گئی۔ دلبر آگے بڑھا اور اس کے گرد اپنے دونوں بازوؤں کو پھیلا کر دیوار پر یوں ہاتھ رکھے جیسے وہ کسی شکنجے میں آ گئی ہو۔

"رینا بیگم...... میری طرف دیکھیے...... کیا ان آنکھوں میں آپ کو محبت نظر نہیں آتی......" دلبر نے اس کے چہرے کے بہت قریب آ کر سرگوشی کی۔ رینا کا دل زور زور سے دھک دھک کرنے لگا۔ اس کا چہرہ سرخ پڑنے لگا اور اس نے آنکھیں جھکا لیں۔

آپ کی اسی شرم و حیا نے تو ہمارا دل ہم سے چرا لیا ہے...... کہیں تو اپنا دل آپ کو دکھا دیں...... دکھا تو نہیں سکتے مگر آپ کو اس دل کی آواز سنا سکتے ہیں اور دلبر نے آگے بڑھ کر اسے اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ رینا کے لئے یہ سب کچھ بالکل اچانک تھا...... محبت کا ایسا والہانہ اظہار پا کر وہ بے قابو ہو گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی...... وہ محبت سے اسے چمکارنے لگا...... وہ روتی رہی...... اور وہ اسے سہلاتا رہا...... بہلاتا رہا۔

"کیا میرے دل کی دھڑکنوں میں کوئی آواز سنائی دی......؟"

دلبر نے مسکراتے ہوئے اسے اپنے آپ سے علیحدہ کرتے ہوئے کہا تو وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے ہلکا سا مسکرا دی۔

"ہاں...... تو اب بتایئے کیوں رو رہی تھی......؟" دلبر نے پوچھا۔

لمحوں میں رینا کی دنیا بدل گئی تھی...... وہ جو چند لمحے پہلے اس کے لئے بالکل اجنبی تھا...... جس پر وہ اعتبار کرتے ہوئے ڈر رہی تھی...... جس کی نہ باتوں پر یقین آ رہا تھا اور نہ ہی آنکھوں پر اب وہ شخص اس کے لئے سب سے زیادہ قابل اعتماد بن گیا تھا...... اب اسے اس کی ہر بات پر یقین آ گیا تھا...... اس کے دل میں اس نے سب سے بڑا مقام پا لیا تھا۔ وہ اس کے لئے سب سے اہم ہو گیا تھا...... اجنبیت، محبت میں بدل گئی تھی...... اور...... محبت نے سارے فاصلے مٹا دیئے تھے۔ اس کی قربت نے اسے اتنا اعتماد بخشا تھا کہ وہ سب کچھ بھول گئی تھی۔ صرف یاد تھا تو دلبر اور...... اس کی محبت......

"ہاں...... تو بتائیں...... آپ کیوں رو رہی تھیں؟" دلبر نے پھر پوچھا۔

"مجھے اپنے گھر والے بہت یاد آ رہے ہیں...... اس برستی بارش کو دیکھ کر میں ڈر گئی ہوں...... کہیں ہماری جھگی ڈوب ہی نہ گئی ہو۔ میرے

ماں باپ، بہن بھائی کسی مصیبت میں نہ ہوں'' وہ اسے بتاتے ہوئے سسکنے لگی۔

''آپ کی جھگی کہاں ہے......؟'' دلبر نے پوچھا۔

''بڑے نالے کے پاس......'' اور وہ اسے راستہ سمجھانے لگی۔

''دلبر کی جان......آپ فکر ہی نہ کیجئے......میں رات کو آپ کو ساری خبر دوں گا......مگر وعدہ کریں اب آپ روئیں گی نہیں......آپ کے رونے سے دلبر کے دل کو بہت تکلیف ہوتی ہے۔ دلبر نے محبت بھرے لہجے میں اسے کہا تو وہ مسکرا کر اس کی طرف دیکھنے لگی......اس کی آنکھوں میں امید اور خوشی کے جگنو جگمگانے لگے۔

''اب میں چلتا ہوں......دلبر کی جان......اپنا بہت خیال رکھیے گا'' دلبر نے مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر انہیں چومتے ہوئے کہا تو وہ بھی مسکرا دی......وہ چلا گیا اور وہ کھڑی مسکراتی رہی۔

''محبت بھی کیا عجیب جذبہ ہے......لمحوں میں ویران دلوں میں بہار لے آتا ہے اور بے نور آنکھوں میں زندگی کی رمق......ان میں خوشیوں اور امید کے جگنو مسکرانے لگتے ہیں۔ ناامیدی کو آس اور امید میں بدل دیتا ہے......محبت مہکاتی ہے......مسکراتی ہے......لہلہاتی ہے......جگمگاتی ہے تو ساری کائنات میں زندگی کی لہر دوڑنے لگتی ہے......وہ بھی ایسے ہی جذبے سے دوچار ہو رہی تھی......یاسیت اور عجیب قسم کی بے چینی نے اس کے دل کو جتنا مضطرب کر رکھا تھا......اب سب کچھ غائب ہو چکا تھا......اب اس کے اندر اطمینان......یقین......اور امید پیدا ہو چکی تھی......وہ دلبر سے قربت کے لمحوں کو یاد کر کے زیر لب مسکرانے لگتی......وہ جو چند لمحے پہلے اپنے مرنے کی دعا کر رہی تھی......اب اس کے اندر جینے کی امنگ پیدا ہو رہی تھی......دلبر کی محبت نے اسے ایسے جذبوں سے ہمکنار کیا تھا کہ اب اسے سب کچھ اچھا لگنے لگا تھا......نیلا آسمان......برستی بارش......لہلہاتے، جھومتے درخت......جل تھل فرش، گاتی، گنگناتی، جھولے جھولتیں طوائفیں......ادھر ادھر گھومتے پھرتے لوگ......پکوانوں کی خوشبو......ہر شے اچھی لگ رہی تھی اس کا دل بھی مسکرانے اور گنگنانے لگا......

دلبر نے اس کے دل کو اپنی محبت سے بھر دیا تھا......اور وہ محبت اور امید سے دلبر کا انتظار کرنے لگی ایک ایک لمحہ دلبر کے انتظار کی نذر ہو رہا تھا......شام ہوتے ہی نگار بیگم اچانک کسی مہمان کی آمد کی وجہ سے تیسری منزل پر بنے مہمان خانے میں جا چکی تھیں......اور......رینا دلبر کے انتظار میں برآمدے کے چکر لگا رہی تھی۔ رات گہری ہونے لگی تھی مگر دلبر ابھی تک نہیں آیا تھا......وہ جتنی دیر کر رہا تھا......رینا اتنا ہی مضطرب ہو رہی تھی اس کا دل بے چینی اور بے قراری سے پریشان ہونے لگتا......رات گئے دلبر آیا تو اس کا چہرہ کچھ پریشان تھا۔

''ک......کک......کیا ہوا......؟'' رینا نے گھبرا کر پوچھا۔

''کچھ نہیں......'' وہ آہستہ آواز میں بولا۔

''کیا......میرے گھر والے آپ کو ملے......؟'' رینا نے بے صبری سے پوچھا۔

''نہیں......وہاں تو کوئی جھگی ہی نہیں......ہر طرف نالے کا گندا پانی پھیلا ہوا ہے اور اس میں اتنی بدبو ہے کہ وہاں دو منٹ بھی کھڑا ہونا

مشکل ہے..... میں نے اردگرد کے لوگوں سے بھی پوچھنے کی کوشش کی..... مگر..... کسی کو بھی کچھ معلوم نہیں" دلبر نے بتایا تو رینا کی سانس جیسے بند ہونے لگی..... اس کی آنکھیں پتھرا سی گئیں..... اور وہ دم بخود کھڑی دلبر کی طرف دیکھتی رہی۔

"کیا ہوا.....؟ آپ پریشان مت ہوں" دلبر نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"کیا وہ سب پانی میں بہہ گئے ہیں؟" وہ خود ہی بڑبڑانے لگی..... دلبر خاموش رہا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی.....

"ہوسکتا ہے..... وہ بارش کی وجہ سے کہیں اور چلے گئے ہوں۔ میں شہر سے باہر جتنی بھی جھگیاں ہیں..... وہاں سے پتہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں..... بس آپ فکر نہ کریں....." دلبر نے کہا تو اس نے چونک کر اس کی جانب دیکھا جیسے اس کے اندر امید کے دیئے پھر سے روشن ہو گئے ہوں..... دلبر کی بات سن کر وہ پھر سے پرامید ہوگئی.....

"آپ مجھ پر اعتبار کریں..... اس شہر میں وہ لوگ جہاں بھی ہوں گے..... میں پتہ کرالوں گا..... آپ پرامید رہیے" دلبر نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا تو اس نے خاموشی سے سر جھکا لیا..... دلبر نے مسکرا کر اسے دیکھا اور کچھ کہے بغیر وہاں سے چلا گیا.....

صبح نگار بیگم بہت خوش تھیں..... بات بے بات مسکرا رہی تھیں..... رینا چاندی کے بڑے سے باؤل میں پانی لائی تھی جس میں تازہ گلاب کی پتیاں بھگوئی ہوئی تھیں۔ ان کے بیڈروم میں داخل ہوئی تو نگار بیگم اس کی جانب دیکھ کر مسکرانے لگیں..... رینا نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

"کیسی ہیں آپ.....؟" نگار بیگم نے اچانک پوچھا..... تو وہ چونک گئی اور حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

"ٹھیک..... ٹھیک ہوں" وہ بمشکل بولی۔

نگار بیگم کے انگ انگ سے خوشی پھوٹ رہی تھی اور آنکھوں میں عجیب سرشاری اور خوشی تھی..... بدن سے پھوٹنے والی ملی جلی خوشبوؤں نے گرد و پیش کی فضا کو معطر کر رکھا تھا۔ رینا نے ان کے غسل کے لئے نیم گرم پانی کے ٹب میں گلاب کی پتیوں والے پانی کو مکس کیا اور مختلف باڈی واش اس پانی میں مکس کیے.....

"آپ غسل کر لیجیے....." رینا نے کہا اور نگار بیگم غسل کرنے چلی گئیں..... وہ حیرت سے نگار بیگم اور ان کی خوشی کے بارے میں سوچنے لگی..... مگر کسی سے پوچھنے کی جرأت اس میں نہیں تھی۔

نگار بیگم غسل کر کے باہر نکلیں تو رینا کو دیکھ کر مسکرانے لگیں رینا پھر چونک گئی.....

"ہم نے آپ کے لئے اپنے کچھ نئے کپڑے رکھے ہیں..... وہ چمن بیگم آپ کو دے دیں گی" نگار بیگم نے کہا تو وہ پھر چونک گئی۔

"آج ہم ناشتہ نہیں کریں گے..... آپ صرف جوس لے آیئے۔ نگار بیگم نے کہا تو وہ خاموشی سے وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ان کے لئے چاندی کی خوبصورت سی نقش و نگار والی ٹرے میں جوس کا گلاس لے کر آئی..... نگار بیگم تیار ہو رہی تھیں اور گنگنا رہی تھیں..... رینا نے استفہامیہ انداز میں ان کی جانب دیکھا۔

"اب آپ جایئے..... جب ضرورت ہوگی ہم بلالیں گے" نگار بیگم نے کہا تو وہ خاموشی سے چلی گئی..... وہ سارا دن اپنے کمرے میں

بیٹھی انتظار کرتی رہی مگر نگار بیگم نے اسے نہ بلایا......اور ایسا کبھی بھی نہیں ہوا تھا......نگار بیگم تو ہر چھوٹے سے چھوٹے کام کے لئے اس کو بلاتی رہتی تھی اور انہوں نے پورے دن میں اس کو ایک بار بھی نہیں بلایا تھا......اور اس کے لئے یہ بہت حیرانگی کی بات تھی وہ خود ہی شام کو ان کے کمرے کی جانب گئی مگر وہ بند تھا......اسے اچانک چمن بیگم مل گئیں۔

''چمن بیگم......نگار بیگم......؟'' اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا پوچھے......

''وہ باہر گئی ہیں......'' چمن بیگم نے بتایا۔

''کیوں......؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''ایک فلم والے نے ان کو بلایا ہے......'' چمن بیگم نے بتایا۔

''کیا نگار بیگم فلم میں کام کریں گی......؟'' رینا نے حیرت سے پوچھا۔

''معلوم نہیں......شاید......ہاں......'' چمن بیگم نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا تو رینا خاموشی سے ان کا منہ دیکھنے لگی۔

نگار بیگم رات کو دیر سے لوٹیں تو تھکاوٹ سے چور تھیں......کھانا کھائے بغیر ہی وہ آرام کے لئے چلی گئیں......رینا فوراً ان کے کمرے میں پہنچ گئی اور ان کا جسم دبانے لگی......اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ان سے پوچھے......کیا وہ فلم میں کام کریں گی؟ اس کے اندر عجیب سا تجسس پیدا ہو رہا تھا......بھیک مانگتے ہوئے جب بھی وہ کسی سینما گھر کے پاس سے گزرتی تو فلمی ایکٹرسز کے بڑے بڑے پوسٹرز کو حیرانگی سے کھڑی دیکھتی ہی رہتی تھی......ان کو دیکھ کر وہ گہری سوچ میں گم ہو جاتی تھی......انہیں وہ کسی دوسری دنیا کی اعلیٰ مخلوق نظر آتی تھیں......وہ انہیں دیکھ کر عجیب احساس اور سرشاری اپنے اندر محسوس کرتی تھی......اور......اب اسے نگار بیگم......ان فلمی ہیروئنز کی طرح ایک بڑی قد آور شخصیت نظر آرہی تھی جس کے ہاتھ پاؤں وہ دبا رہی تھی......اسے اک فخر سا محسوس ہونے لگا تھا......اسے یاد آنے لگا جب وہ راہ چلتے زمین پر سے کسی فلمی ہیروئن کا رنگین صفحہ اٹھا کر اپنے تھیلے میں ڈالتی اور جھگی میں جا کر اسے الٹاتی تو سب بچے جھپٹے مار کر اس کاغذ کو چھیننے کی کوشش کرتے......سب نے اپنے اپنے پسندیدہ فلمی اداکاروں کی تصویریں اپنے پاس جمع کر رکھی تھیں۔

جب نگار بیگم بہت مشہور ہو جائیں گی تو وہ مٹھو، بجو، گڈی اور شبو کو بتائے گی کہ وہ اس ہیروئن کے پاس رہتی تھی، اس کے ہاتھ پاؤں کی مالش کرتی تھی۔ اس کے بالوں کی کنگھی کرتی تھی......تو سب سن کر کتنے حیران ہوں گے......اس بات کو سوچتے ہوئے ہی وہ زیر لب مسکرانے لگی......لیکن اگر وہ مر گئے ہوئے تو وہ کس کو بتائے گی......اس بات کو سوچتے ہوئے اس نے گہری سانس لی اور افسردگی کے سائے اس کے چہرے پر لہرانے لگے۔

''رینا......کیا چمن بیگم نے آپ کو ہمارے کپڑے دے دیئے ہیں......ہم نے ان کو بولا تھا......ان کی سلائی بھی ٹھیک کر دیں'' نگار بیگم نے پوچھا۔

''جی......ہاں......سب ٹھیک ہیں'' وہ سر جھکا کر پھر انہیں دبانے لگی۔ اس کا ذہن ادھر ادھر بھٹک رہا تھا۔ کبھی وہ نگار بیگم کے بارے میں سوچنا شروع کر دیتی تو کبھی اپنے بہن بھائیوں کے بارے میں پھر اچانک دلبر بھی یاد آنے لگتا اور اس کی میٹھی میٹھی محبت بھری باتیں......اور......ان کو

سوچ کر اس کا دل دھڑکنے لگتا اور لب مسکرانے لگتے۔

اس نے جب سے محبت کی دہلیز پر قدم رکھا تھا۔ اسے اپنے آپ سے پیار ہونے لگا تھا۔ خواہ مخواہ بجنے سنورنے کو دل چاہتا...... نگار بیگم کے دیے ہوئے کپڑے پہن کر وہ کئی کئی گھنٹے آئینے کے سامنے کھڑی اپنے آپ کو دیکھتی رہتی۔ نگار بیگم کے بالوں جیسے اسٹائلز بناتی...... ان کی طرح میک اپ کرنے کی کوشش کرتی...... وہ روز بروز نکھرنے لگی تھی...... وہ جان بوجھ کر ان راستوں سے ہو کر گزرتی جہاں دلبر کی اس پر نظر پڑتی اور دونوں کی نظریں ملتے ہی وہ مسکرانے لگتے...... محبت اور چاہت کی خوشبو نے اس کے انگ انگ کو معطر اور سرشار کر دیا تھا...... وہ آئینے میں اپنے آپ کو دیکھتی تو اسے یوں لگتا جیسے دلبر اس کے پیچھے کھڑا اس کو سراہ رہا ہو...... اس سے محبت بھرے لہجے میں سرگوشیاں کر رہا ہو...... ہر کوئی اس میں واضح تبدیلی محسوس کر رہا تھا۔ وہ تین سالوں سے وہاں رہ رہی تھی مگر حلیے سے ہی غریب نوکرانی نظر آتی تھی مگر اب ایک دم اس نے جو حلیہ بدلا تو وہ دیکھنے میں ساری طوائفوں سے آگے نظر آتی تھی۔ محبت کی شفق نے اس کے گالوں کو تمتمانا شروع کر دیا تھا۔ نجانے کیسی ست رنگی شعاعیں اس کے چہرے سے پھوٹنے لگی تھیں جو دیکھنے والوں کو متاثر کرتیں...... دلبر سانولا، سلونا، دراز قد، بھرے جسم والا، عام شکل وصورت کا گھبرو جوان تھا...... وہ بھی بہت اسٹائل سے رہنے لگا تھا۔ وہ نگار بیگم کا خاص کارندہ اور باڈی گارڈ تھا۔ ہر وقت پستولوں کو لوڈ کرنے میں ہی لگا رہتا...... کسی نہ کسی بہانے سے نگار بیگم کے کمرے کے چکر لگاتا رہتا...... نگار بیگم بھی حیرانگی سے اسے دیکھ کر پوچھتیں ''کہ ابھی تو وہ یہ بات پوچھ کر گیا ہے...... پھر پوچھنے آ گیا ہے'' وہ ہڑبڑا جاتا اور مختلف بہانے بنانے لگتا۔

دونوں تنہائی میں ملتے تو ایک دوسرے کو دیکھ کر بے قرار ہونے لگتے...... دلبر کسی نہ کسی بہانے اسے اپنے قریب کر لیتا اور وہ اس قربت کے نشے سے سرشار ہو کر سارا وقت مست انداز میں گھومتی پھرتی رہتی۔

چمن بیگم اسے معنی خیز انداز میں سر سے لے کر پاؤں تک گھورتی رہتی...... اور...... اس کے نکھرنے، بننے وسنورنے کا راز جاننے کی کوشش کرتی۔

نگار بیگم بھی بہت اونچی ہواؤں میں اڑ رہی تھیں...... یوں محسوس ہوتا تھا...... جیسے ان کی حویلی پر محبت کی دیوی مہربان ہو گئی ہو...... ان کے بھی شب وروز خاص رنگینیوں کی نذر ہونے لگے تھے...... جب سے امریکہ سے آئے مہمان ''نوازش علی'' نے ان کا رقص دیکھا تھا وہ ان پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ وہ ایک فلم بنانے یہاں آیا تھا اور اپنی فلم کے لئے اسے نگار بیگم سے بڑھ کر کوئی حسین دلربا نظر ہی نہیں آ رہی تھی۔ وہ خود بہت خوبصورت، سمارٹ، اعلیٰ تعلیم یافتہ چالیس سالہ امیر کبیر شخص تھا...... جس کے پاس کسی بھی شے کی کوئی کمی نہ تھی...... وہ گفتگو بھی بہت شستہ انداز میں کرتا اور کسی کو داد وتحسین سے رجھانے کا فن بھی اسے خوب آتا تھا...... وہ ذہین بھی تھا اور موقع شناس بھی...... نگار بیگم کی عمر بتیس برس ہو گئی تھی اور اس نے پندرہ سال کی عمر میں اپنی ماں کندن بیگم کی سرپرستی میں رقص کرنا شروع کیا تھا۔ تب سے لے کر اب تک کوئی ایسا شخص نظر نہیں آیا تھا جو نوازش علی کے ہم پلہ ہوتا۔ بڑے بڑے رئیس زادے، اس کے قدموں پر جان اور روپیہ نچھاور کرنے والے، اس کی اداؤں پر مر مٹنے والے، نوازش علی کے سامنے پانی بھرتے نظر آتے...... نگار بیگم کو بائیس برس کی عمر میں ایک نوجوان شاکر علی سے عشق ہو گیا تھا...... شاکر علی یونیورسٹی کا طالب علم تھا اور ایک روز دوستوں کے ساتھ اس کا رقص دیکھنے آیا...... وہ بہت گھبرایا ہوا اور پریشان نظر آتا تھا وہ کسی اچھے خاندان سے تعلق رکھتا تھا...... اس نے ایک بار بھی نگار بیگم کی طرف سر اٹھا کر نہ دیکھا۔ سارا

وقت سر جھکائے بیٹھا رہا جیسے اپنے آنے پر شرمندہ ہو رہا ہو...... سب کے جانے کے بعد نگار بیگم نے اسے روک لیا اور اس سے اس کی پریشانی کی وجہ پوچھی تو وہ رونے لگا...... وہ ایک اچھے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اسے احساس ندامت ہونے لگا کہ وہ ایک عورت کے رقص کو دیکھنے آیا ہے جبکہ اس کے خاندان میں تو عورت کا بہت احترام اور عزت سکھائی جاتی ہے...... اس نے بتایا کہ یہ رات اس کی زندگی کی سیاہ ترین رات ہے اور وہ خود کو بہت گناہگار محسوس کر رہا ہے...... نگار بیگم اس سے بہت متاثر ہوئی اور اس کی عظمت کو سلام کرنے کے لئے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بوسہ دینا چاہا تو وہ بوکھلا گیا اور وہاں سے ایسا گیا پھر واپس نہ آیا...... اس کے دوستوں نے بعد میں بتایا کہ وہ شہر ہی چھوڑ گیا تھا......

نگار بیگم کے لئے وہ رات بہت اہم تھی۔ شاکر علی اور وہ رات اس کے اندر کہیں ٹھہر گئے تھے...... اس شخص نے جس عزت کی نگاہ سے اسے دیکھا تھا...... اس پر فریفتہ ہو گئی تھی وہ ہر ہفتے اس خاص دن کو درگاہ پر جاتی اور رات کو اپنے کمرے میں بند ہو کر اس کو یاد کرتی...... اور اپنی گندی زندگی میں گناہ سے آلودہ ان لمحوں کو یاد کرتی جو اسے ایک سیاہ لمبی تاریک رات کی مانند دکھائی دیتے اور اس سیاہ رات میں شاکر علی ایک چمکتے جگنو کی مانند اسے دکھائی دیتا...... جس کے اندر کی پاکیزگی نے نگار بیگم کی تاریک رات میں روشنی کر دی تھی۔ اس سے قبل اور بعد میں آنے والا کوئی ایک شخص بھی اس جیسا نظر نہیں آیا تھا۔ بڑے بڑے سورما، شوقین مزاج، دل پھینک، نامور خاندانوں کے چشم و چراغ اس کے کوٹھے پر آئے تھے مگر شاکر علی جیسا کوئی بھی نہیں آیا تھا...... اس کو یاد کر کے اس کی آنکھیں نم ہونے لگتیں اور وہ اس کو تصور کر کے اس سے محبت کرتی...... اس کی زندگی اور لمبی عمر کے لئے دعائیں کرتی...... شاکر علی کے بعد کوئی شخص اسے اس قابل نظر ہی نہ آیا کہ وہ اس کی طرف محبت بھری نگاہوں سے دیکھتی...... وہ پیشہ ور عورت تھی اور اپنے فن سے دوسروں کا دل لبھاتی، رات کے ساتھ ہی اس کا کھیل ختم ہو جاتا...... مگر نہ کسی سے محبت ہو پائی...... نہ کوئی اس کے دل تک پہنچ پایا......

اب پونے دس برس بعد نوازش علی نے اس کے دل پر دستک دی تھی۔ نوازش علی بہت حد تک اسے شاکر علی جیسا دکھائی دیا...... نوازش علی کافی پراعتماد اور بے باک قسم کا انسان تھا مگر وہ شاکر علی کی طرح اسے بہت مختلف لگا وہ اسے اس طرح نہیں دیکھتا تھا جس طرح دوسرے مرد دیکھتے تھے...... اس کی نظروں میں ہوس اور زبان پر خوشامدی جملے نہیں تھے...... نہ ہی وہ چرب زبان تھا اور نہ ہی خواہ مخواہ تعریفوں کے پل باندھتا تھا...... وہ بہت واضح انداز میں دوٹوک بات کرتا تھا۔ نگار بیگم حیرت سے اسے دیکھتی اور اس کی باتیں سنتی رہتی...... اس کے بولنے کا انداز اس قدر دلنشین تھا کہ وہ اپنا آداب گفتگو بھول جاتی اور اس کے لہجے کی مٹھاس کو اپنے دل کی گہرائیوں تک محسوس کرتی۔ وہ نوازش علی کی اسیر ہو رہی تھی...... اور اسے فلمیں بنانے کا شوق تھا...... وہ ایک دو کامیاب فلمیں پہلے بنا بھی چکا تھا اور اب تیسری کے لئے اسے نئے چہرے کی ضرورت تھی...... کوئی اور ہوتا تو نگار بیگم فوراً انکار کر دیتی مگر نوازش علی کو وہ انکار نہ کر سکی...... اس کے نزدیک فلم اہم نہیں تھی...... اس کو تو نوازش علی سے محبت ہو گئی تھی اور اس کی محبت کی خاطر وہ ہر آگ میں کود جانے کو تیار تھی۔ نوازش علی سے اس کی بڑھتی ہوئی ملاقاتیں اخبارات کی سرخیاں بن رہی تھیں مگر اسے کسی اسکینڈل کی پرواہ نہیں تھی۔ اسے دن میں کئی کئی فون آتے جو اس سے نوازش علی کے بارے میں پوچھتے تو وہ مسکرا کر اس انداز میں ٹالتی کہ سب مطمئن ہو جاتے۔ جب سے نوازش علی نے اس کے دل میں گھر کیا تھا...... اس کے کمرے کے دروازے خود بخود اس کے لئے کھل گئے تھے...... حویلی کے سب لوگ مرد و زن حیران تھے کہ نگار بیگم کیسی دیوانی ہو چلی ہیں کہ انہوں نے اپنے تمام اصول خود ہی توڑ دیئے ہیں...... ان کے کمرے تک کسی مہمان کو آنے کی جرأت نہ تھی اور اب وہ

اس مہمان کو خود ہی اپنے کمرے میں بلا لیتی تھیں..... نگار بیگم اور نوازش علی کے بارے میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئی تھیں، خائف طوائفوں کو شہہ مل رہی تھی۔ جب نگار بیگم محبت کر سکتی ہیں تو ہم کیوں نہیں......''

''نگار بیگم..... حویلی میں بڑی گڑبڑ ہو رہی ہے..... سب لوگ کھسر پھسر میں مصروف ہوتے ہیں..... آپ.....؟'' چمن بیگم نے بلاواسطہ انداز میں سمجھانے کی کوشش کی۔

''چمن بیگم آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟'' نگار بیگم نے چونک کر چمن بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نگار بیگم..... سرکار نوازش علی کا یہاں آنا..... حویلی کی طوائفوں کے لئے بہت مسئلے پیدا کر رہا ہے.....'' چمن بیگم نے ڈرتے ہوئے کہا۔

''کیسے مسئلے..... اور کسی کو اس بات سے کیا مطلب؟ ہم تو ان کی ایک فلم میں کام کر رہے ہیں' نگار بیگم نے کہا۔

''نگار بیگم..... جانتی ہیں..... کسی طوائف کا زوال کب شروع ہوتا ہے جب وہ اپنے دل اور کمرے کے دروازے کسی کے لئے بے دھڑک کھول دیتی ہے.....'' چمن بیگم نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

''چمن بیگم..... ہمارے خیال میں تو طوائف کا زوال اسی دن شروع ہو جاتا ہے جب وہ پہلی بار پاؤں میں گھنگھرو باندھ کر مجرا کرتی ہے..... آپ کس زوال کی بات کر رہی ہیں؟'' نگار بیگم نے اس کی جانب بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ عام طوائف نہیں.....'' چمن بیگم نے جلدی سے کہا۔

''اور ہم اتنے خاص بھی نہیں'' اس نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''آپ کا اپنا مقام ہے'' چمن بیگم نے قطعیت سے کہا۔

''ہمیں تو عورت کی حیثیت سے کوئی مقام نہیں ملا..... طوائف زادی بن کر کیا مقام ملے گا..... چمن بیگم ہم اپنی ذات پر کتنے ہی خول چڑھا کر اپنا مرتبہ بلند کرنے کی کوشش کریں..... مگر ہم وہی رہیں گے..... ''طوائف'' بازارو عورت..... کون ہمیں گھر کی زینت بناتا ہے..... کون ہمیں وہ عزت دیتا ہے جو عام گھر کی ایک عام سی عورت کو اس کے گھر والے دیتے ہیں..... ہمارے گلے میں تو قدرت نے پہلے ہی ایک طوق ڈال دیا ہے..... جس کو نہ ہم اتار کر پھینک سکتے ہیں جبکہ وہ ہمارے گلے کو بہت تکلیف بھی دیتا ہو..... چمن بیگم ہم اتنی کھوکھلی زندگیاں گزارتے ہیں..... کہ..... اس کا کھوکھلا پن ہمارے دلوں اور روحوں کو بھی کھوکھلا کر دیتا ہے..... چمن بیگم کب تک ہم اپنے گھنگھروؤں کی جھنکار، دلفریب اداؤں اور آواز کے جادو سے لوگوں کے دلوں کو لبھاتے رہیں گے..... اتنی کھوکھلی زندگی میں کیا ہمارے لئے کچھ بھی نہیں..... کوئی خوشی کے لمحے ہمارے نہیں ہو سکتے..... کوئی ایسی گھڑیاں جن کے سہارے ہم اپنا بڑھاپا گزار سکیں..... چمن بیگم ہمارے دل کے بند خانوں میں کچھ تو ایسا محفوظ ہونا چاہیے جس کی حفاظت میں ہی ہم آنے والے ماہ و سال گزار سکیں' نگار بیگم نے افسردگی سے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں..... میں نے بھی عمر کا ایک بہت بڑا حصہ یہاں گزارا ہے..... سب کچھ اچھی طرح جانتی ہوں..... کہاں اور کب کب دل ٹوٹتے ہیں..... کیسے کیسے کرچیاں اکٹھی کرتے ہمارے دل زخمی ہو جاتے ہیں..... مگر جذبات کی رو میں بہہ کر کیے جانے والے فیصلے

انسان کے مسائل اور بڑھا دیتے ہیں...... نہ تو آپ اپنی شناخت بدل سکتی ہیں...... اور...... نہ ہی اس کوٹھے سے اپنا ناتا...... نوازش علی بہار کا ایک جھونکا ہیں...... اور...... کچھ نہیں...... ہم نے ایک زمانہ دیکھا ہے۔ آپ سے عمر میں بھی بڑی ہیں...... ہماری نظریں کچھ اور دیکھ رہی ہیں...... مگر نجانے آپ کو کچھ اور کیوں نظر نہیں آ رہا...... یا...... پھر آپ دیکھنا ہی نہیں چاہتیں'' چمن بیگم نے قدرے صاف گوئی سے کہا۔

''کیا مطلب......؟ کیا نوازش علی آپ کو دوسرے مردوں سے مختلف نظر نہیں آتے؟'' نگار بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

''ہر مرد اندر سے ایک سا ہوتا ہے...... کوئی بھی دوسرے سے مختلف نہیں ہوتا'' چمن بیگم نے طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

''نہیں...... ایسی بات نہیں...... ہمارا تجربہ کچھ اور کہتا ہے...... ہماری آنکھوں نے بھی ہر رنگ کے مرد دیکھے ہیں...... مگر ہم انہیں بہت مختلف بھی دیکھتے ہیں...... اور ہمیں اپنی بصارت پر پورا بھروسہ ہے'' نگار بیگم کی آنکھوں کے سامنے شاکر علی کا چہرہ آ گیا اور وہ زخمی مسکراہٹ سے چمن بیگم کی طرف دیکھنے لگیں۔

''نگار بیگم...... اپنی آنکھوں کو محبت کی پٹی سے آزاد کریں اور صرف یہ یاد رکھیں کہ یہ دنیا مرد اور عورت کے رشتے کے بارے میں ہمیشہ مشکوک رہی ہے...... خون کے رشتوں کے علاوہ ہر رشتہ کمزور اور بودا ہوتا ہے...... عورت ہر رشتہ کے بارے میں جذباتی ہو کر سوچتی ہے جبکہ مرد ایسا نہیں سوچتا۔ وہ رشتوں کے بارے میں اتنا جذباتی نہیں ہوتا...... اس لئے آپ بھی اس قدر جذباتی نہ ہوں...... کہ...... یہ کوٹھا اس کی آن بان...... اور آپ کی عزت و مرتبہ سب اس کی نذر ہو جائیں'' چمن بیگم نے سنجیدگی سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''کیا ہم نوازش علی کو چھوڑ دیں؟'' نگار بیگم نے قدرے توقف کے بعد پوچھا۔

''نہیں...... مگر اس کی محبت پر اتنا اعتبار مت کریں...... کہ...... آپ کو اپنا سب کچھ نہ کھونا پڑے...... مرد کی محبت...... مرد کی طرح ہی بے اعتبار ہوتی ہے...... عورت جس کے لئے جان کی بازی لگا دیتی ہے...... وہ اس کے لئے معمولی بات ہوتی ہے...... وہ محبت کو کبھی اس نظر سے نہیں دیکھتا جس نظر سے عورت دیکھتی ہے...... اگر آپ کو وہ سر بازار رسوا کر کے بھوکا ننگا چھوڑ جائے تو کون آپ کو سہارا دے گا......؟ طوائف کا کوئی خاندان اور کوئی آگے پیچھے نہیں ہوتا...... جو اس کو سہارا دے...... اسے اپنا سہارا خود ہی بننا ہوتا ہے...... اس لئے...... جب تک یہ کوٹھا ہے...... آپ ہیں...... جب یہ نہیں ہوگا...... آپ بھی نہیں ہوں گی'' چمن بیگم نے واشگاف الفاظ میں کہا تو نگار بیگم خاموش ہو گئیں۔

چمن بیگم ان کی طرف دیکھتی رہی اور پھر کمرے سے باہر نکل گئیں ان کے جانے کے بعد نگار بیگم پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع ہو گئی۔

''ہم کتنی بے بس اور مجبور عورتیں ہیں...... جن کو قدرت نہ رشتوں سے نوازتی ہے نہ محبت سے...... ہمارے دل بھی اجڑے رہتے ہیں اور کوکھ بھی...... نہ کوئی ہم کو محبت کرنے کا پورا حق دیتا ہے اور نہ ہی ہم کسی کو یہ حق دے سکتے ہیں...... ہم کتنے ادھورے لوگ ہیں...... جو ادھوری زندگیاں گزار کر مر جاتے ہیں...... چمن بیگم نے جو بھی کہا ہے...... ٹھیک کہا ہے اور ہم بھی جانتے ہیں وہ سچ کہہ رہی تھیں...... مگر اس دل کا کیا کریں جو ہمیں ہر پل بہکاتا ہی رہتا ہے...... کیا ہم دنیا میں اس لئے بھیجے گئے ہیں کہ لوگوں کے ساتھ جھوٹی محبتوں کے کھیل رچا کر انہیں خوشیاں دیتے رہیں...... کیا زندگی کی سچی خوشیوں میں ہمارا کوئی حصہ نہیں'' نگار بیگم نے روتے ہوئے سوچا اور ان کی ہچکی بندھ گئی۔

ہمیں جلد نوازش علی کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا ہوگا......اس سے پہلے کہ یہ سب کچھ ختم ہو جائے۔

''نگار بیگم......نوازش علی تشریف لائے ہیں'' دلبر نے نگار بیگم کے کمرے کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے کہا۔

''ان کو اندر بھیج دیجئے'' نگار بیگم نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا......دلبر چلا گیا......اور......نوازش علی نگار بیگم کے کمرے میں داخل ہو گئے۔

☆

رات گہری ہو رہی تھی جب دلبر نے اپنی ٹارچ کی روشنی رینا کے کمرے کے روشندان کے ذریعے پیغام کی صورت میں اندر بھیجی......رینا ایک دم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ وہ سر شام ہی اس روشنی کا انتظار کرتی رہتی تھی اور جیسے وہ روشنی دلبر کا پیغام اس تک پہنچاتی وہ بھاگ کر اس مخصوص بالکونی میں پہنچ جاتی جس کو انہوں نے ملاقات کے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔ رینا نظریں چرا کر ادھر پہنچ گئی۔ دلبر اس کا منتظر تھا۔ رینا قدرے گھبرائی ہوئی تھی۔ وہ اسے لے کر بالکونی کے تاریک گوشے میں چلا گیا۔

''دلبر......کیا کوئی خبر ملی......؟'' رینا نے اس کی بانہوں میں آتے ہی پہلا سوال کیا۔

''نہیں......میں نے شہر کے ہر علاقے کی جھگیاں کھنگال ڈالی ہیں......ان کی کوئی خبر نہیں ملی'' دلبر نے اسے کہا۔

''اس کا مطلب ہے......وہ سارے سیلاب کے پانی میں بہہ گئے ہیں۔ وہ کہہ کر اس کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور وہ اسے تسلیاں دیتا رہا۔ وہ کافی دیر سسکتی رہی اور وہ اسے سہلاتا رہا۔

''میں اس وقت کو کوستی ہوں جب میں انہیں چھوڑ کر یہاں آئی'' اس نے بہتے آنسوؤں اور رندھے ہوئے گلے کے ساتھ کہا۔

''تم......کیوں یہاں آئی......؟'' دلبر نے پوچھا۔

''میری آنکھوں نے اک خواب دیکھ لیا تھا اور اس خواب نے مجھے پاگل کر دیا تھا......'' وہ آہ بھر کر بولی۔

''کیسا خواب......؟'' دلبر نے چونک کر پوچھا۔

''نگار بیگم بننے کا......'' اس نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

''کیا......؟'' دلبر نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......اس خواب نے مجھے اندھا کر دیا تھا......مجھے نگار بیگم کے علاوہ کچھ سوجھتا ہی نہ تھا......اور میں بہکتی گئی......میرے اندر کی اس شدید خواہش نے مجھے بے بس کر دیا تھا......میں اگر نگار بیگم کے پاس نہ آتی تو شاید پاگل خانے پہنچ جاتی'' وہ آہ بھر کر بولی۔

''تم نے کیوں ایسی خواہش کی......؟ کیا تمہیں اس جگہ اور نگار بیگم کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا'' دلبر نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں......میں کچھ نہیں جانتی تھی......بس نگار بیگم اور اس کے ٹھاٹ دیکھ کر یہ تمنا کر بیٹھی......اور......اس تمنا نے مجھے اپنوں سے دور کر دیا'' رینا سسکنے لگی اور دلبر اسے اپنے ساتھ لگائے محبت سے چپ کراتا رہا۔

''کیا تم اب بھی نگار بیگم بننا چاہتی ہو......؟'' دلبر نے پوچھا۔

''معلوم نہیں......'' اس نے آہ بھر کر جواب دیا۔

وہ رات گئے تک دلبر کی گود میں سر رکھے اپنے دل کی باتیں اس سے کرتی رہی۔

''اب میں چلتا ہوں......صبح ہونے کو ہے'' دلبر کہہ کر چلا گیا اور وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں آ گئی......کمرے کی خاموش اور ساکت دیواروں کے اندر اسے اپنی تنہائی اور ماں باپ سے جدا ہونے کا غم سخت دکھ دینے لگا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اسے اماں یاد آنے لگی......جس سے وہ لڑتی بھی تھی......اول فول بکتی رہتی تھی مگر اماں سے اسے پیار بھی بہت تھا......اماں اپنے دل کی ہر بات اس کے ساتھ کرتی تھی......مٹھو، ججو، پپو، گڈی، شبو......ابا سب لوگ اس سے دور چلے گئے تھے......وہ تو یہی سوچتی تھی......کسی روز یہاں سے فرار ہو کر وہ واپس چلی جائے گی مگر اب کس کے پاس جائے گی......اس کے پاس کوئی ایسی جگہ نہیں رہی تھی جہاں وہ جا سکتی......اسے پکا یقین تھا کہ اس کے گھر والے کبھی واپس نہیں گئے ہوں گے کیونکہ وہ بستی والوں کی باتوں اور اپنی عزت کے ڈر سے تو یہاں آئے تھے۔ وہ واپس کبھی نہیں گئے ہوں گے وہ یقیناً مر چکے ہوں گے......اور وہ ان سے بچھڑ کر زندہ بچ گئی تھی۔ کاش وہ بھی ان کے ساتھ ہوتی تو سب اکٹھے ہی مر جاتے......اب بھری دنیا میں اس کا کوئی بھی باقی نہیں بچا تھا......سوائے دلبر کے......جو اس سے محبت کا دعویٰ کرتا تھا......اور وہ اس کے دعوے جھٹلا کر اس آخری سہارے کو بھی چھوڑنا نہیں چاہتی تھی......وہ اس پر اندھا اعتبار کرتی تھی۔ اس کی محبت کو اپنے لئے زندگی سمجھتی تھی......اور......اس زندگی کی سانسیں دلبر کے دم سے قائم تھیں۔

وہ ساری رات روتی رہی......اور اپنے گھر والوں کو یاد کرتی رہی۔ وہ ایک لمحے کے لئے بھی سو نہ سکی تھی جیسے ہی آنکھیں بند کرتی سب اپنی اپنی کشکول اٹھائے اس کی نظروں کے سامنے گھوم جاتے تو وہ پھر رونا شروع کر دیتی۔

''میں......کیسے ان کے بغیر زندہ رہوں گی؟'' وہ اپنے آپ سے سوال کرتی۔

''اس کا مطلب ہے......اب یہ حویلی اور نگار بیگم میرا مقدر ہیں۔ میں یہاں سے کہیں نہیں جا سکوں گی......ان دیواروں میں قید رہوں گی......اگر مجھے یہاں ہی رہنا ہے......تو کیا ساری زندگی نگار بیگم کی غلامی کرنا ہوگی......اس کی اترن پہننی ہوگی......اس کا بچا کھچا کھانا پڑے گا......میرا خواب کہاں گیا......؟'' میں......اور......نگار بیگم......؟ دونوں کہاں کھڑے ہیں......کیا میری زندگی یونہی گزر جائے گی؟'' وہ مایوسی سے سوچنے لگی۔

صبح بیدار ہوئی تو چاندی کے برتن میں گلاب کی پتیوں والا پانی لے کر نگار بیگم کے کمرے میں چلی گئی......کمرے کا دروازہ تھوڑا سا کھلا تھا......وہ اندر چلی گئی......نگار بیگم کمرے میں نہیں تھی۔ ایک خوبصورت سمارٹ شخص ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا بالوں کو کنگھی کر رہا تھا جیسے وہ کہیں جانے کی تیاری کر رہا ہو۔ رینا اسے دیکھ کر انتہائی حیرت سے چونکی......حیرت اور خوف سے اس کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

''وہ......ن......نگار بیگم کہاں ہیں؟'' اس نے بمشکل پوچھا۔

نوازش علی نے اس کی طرف دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا......وہ اسے سر سے لے کر پاؤں تک گھورنے لگا۔ رینا اس کی نظروں سے خائف ہونے لگی۔

''گھبراؤ نہیں......کیا تم میری فلم میں کام کرو گی؟ میں تمہارے جیسے چہرے کی تلاش میں تھا......صرف تمہارا رنگ سانولا ہے باقی تم ویسی

ہی ہو......جیسی ہیروئن میں چاہتا ہوں‘‘ نوازش علی نے کہا اور اسی لمحے نگار بیگم کمرے میں داخل ہوئیں......انہوں نے نوازش علی کی بات سن لی تھی۔ ان کے چہرے کے تاثرات بگڑنے لگے۔ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہونے لگا۔

’’نگار بیگم......آپ نے یہ ہیرا کہاں چھپا کر رکھا تھا......بھئی مجھے تو ایسے ہی چہرے کی ضرورت ہے......میں اس کو اپنی فلم میں کاسٹ کروں گا......‘‘نوازش علی نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

نگار بیگم نے شعلہ برساتی آنکھوں سے رینا کی جانب دیکھا۔

’’تم یہاں کیوں آئی ہو......؟‘‘ نگار بیگم نے غصے سے کہا۔

’’وہ......میں......پانی دینے آئی تھی‘‘ رینا نے گھبرا کر جواب دیا۔

’’کیا ہم نے تمہیں پانی لانے کو کہا تھا؟‘‘ نگار بیگم غصے سے بے قابو ہو کر دھاڑ رہی تھیں۔

’’نگار بیگم......آپ کیوں خفا ہو رہی ہیں؟اس کا یہاں آنا اچھا ہوا......کہ......میں نے اسے دیکھ لیا......‘‘نوازش علی مسکراتے ہوئے بولا۔

’’یہ ہماری نوکرانی ہے......ہمارے پاؤں دھوتی ہے......کیا آپ اس کو فلم کی ہیروئن بنائیں گے؟‘‘ نگار بیگم نے اس قدر طنزیہ لہجے میں کہا کہ رینا کو اپنی ذلت کا شدید احساس ہونے لگا۔

’’اب......تم......جاؤ......یہاں سے‘‘ نگار بیگم نے غصے سے کہا اور رینا وہاں سے روتی ہوئی چلی گئی۔

’’آپ بھی کمال کرتے ہیں......انسان کی اوقات دیکھ کر بات کرتے ہیں......کیا وہ ہے اس قابل......کہ......اسے آپ فلمی ہیروئن بنائیں‘‘ نگار بیگم نے خفگی سے کہا۔

’’نگار بیگم......ٹیلنٹ کسی شے کا محتاج نہیں ہوتا......قسمت عام سے انسان کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہے......میں نے لوگوں کو خاک سے آفتاب بنتے دیکھا ہے......آپ کا یہ رویہ میری سمجھ سے باہر ہے......میں تو آپ کو بہت مختلف عورت سمجھتا تھا......مگر آپ کے اندر کی عورت بھی اتنی ہی حاسد ہے جتنی کہ ایک عام گھریلو عورت ہوتی ہے......میرا خیال ہے انسان جس قدر زمانے کی تلخیوں کو جھیلتا ہے......اس کا نقطہ نظر وسیع ہوتا جاتا ہے۔اس میں لوگوں کو ان کی خامیوں سمیت قبول کرنے کی زیادہ استطاعت پیدا ہوتی جاتی ہے مگر آپ نے بہت عامیانہ باتیں کر کے اپنے آپ کو میری نظر سے گرا لیا ہے‘‘ نوازش علی قدرے خفگی سے بولا۔

نوازش علی کے الفاظ نگار بیگم کے سینے میں خنجر کی مانند پیوست ہو گئے۔اپنی توہین کے احساس سے وہ تلملانے لگی......اس نے بہت مشکل سے اپنے آپ پر قابو پانا چاہا......مگر نوازش علی کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات اس کے غصے کو ہوا دینے لگے۔

’’آپ اس نوکرانی کی حمایت کر رہے ہیں......اس کی حیثیت اس کا مرتبہ ہمارے سامنے کیا معنی رکھتا ہے......؟‘‘ نگار بیگم نے کہا۔

’’نگار بیگم......آپ بھی اپنی حیثیت مت بھولیے......معاشرے میں آپ کیا مقام رکھتی ہیں۔وہ آپ بھی اچھی طرح جانتی ہیں اور میں بھی......میں جا رہا ہوں......اور دوبارہ کبھی آپ سے ملنے نہیں آؤں گا......‘‘ نوازش علی اس کے جذبوں، اس کی محبت، اس کی انا، خودداری، مقام و

مرتبے کی پرواہ کیے بغیر چند لمحوں میں اس کی عزت قدموں تلے روند کر چلا گیا اور وہ مبہوت سی کھڑی تلملانے لگی..... گزشتہ کئی ہفتوں سے محبت کا جو کھیل کھیلا جا رہا تھا وہ آن واحد میں ختم ہو گیا..... اس نے نوازش علی کو بہت مختلف مرد سمجھا تھا..... شاکر علی کی طرح..... مگر..... چمن بیگم نے ٹھیک کہا تھا۔ سب مرد ایک جیسے ہوتے ہیں..... وہ رشتوں کو جذبات کی نہیں عقل کی بنیاد پر پرکھتا ہے..... نگار بیگم نے اسے بہت چاہا تھا..... اس کے اچانک آنے سے اس کی زندگی میں بہار آ گئی تھی..... وہ گیا تو بہار کے سارے رنگ بھی اپنے ساتھ لے گیا..... خزاں کی ساری پژمردگی اور پت جھڑ کی ساری ویرانی اپنے پیچھے چھوڑ گیا تھا..... نگار بیگم ایسی ٹوٹی تھی کہ سنبھل نہیں پا رہی تھی..... نہ اسے رات کو چین آ رہا تھا نہ دن کو قرار..... اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے دل میں ہر وقت کانٹے چبھتے ہوں..... سینے میں کوئی چیز اٹک گئی ہو اور اس سے سانس لینا مشکل ہو رہا ہو۔ وہ بار بار شراب پیتی..... مگر..... شراب کا نشہ بھی اسے اس کی توہین نہیں بھولنے دیتا تھا..... ہر سوچ کے ساتھ رینا کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے آتا تو اسکی بے چینی اور بڑھ جاتی..... اس نے رینا کو اپنے کمرے میں بلایا۔ رات گہری ہو رہی تھی۔ رینا کا دل دہل گیا..... اس سے قدم اٹھانا مشکل ہو رہے تھے۔ وہ ڈرتی ہوئی نگار بیگم کے کمرے میں داخل ہوئی..... نگار بیگم نے اسے گھور کر دیکھا۔

"آ.....آ.....پ نے مجھے بلایا ہے" رینا بمشکل بولی۔

"تم..... تم..... یہاں کیا کرنے آئی ہو..... کیا نگار بیگم کی جگہ لینے..... یا اسے ذلیل کرنے..... یا پھر اسے اس کی نظروں سے گرانے..... یا پھر اس سے اس کا سب کچھ چھیننے..... یا پھر اس کا سب کچھ تباہ کرنے..... یا پھر اسے ہی برباد کرنے..... بتاؤ..... تمہیں کس نے یہاں بھیجا ہے؟" نگار بیگم نے غصے سے انتہائی اونچی آواز میں چلاتے ہوئے کہا۔

"ن.....ن.....نہیں..... نگار بیگم" وہ بمشکل تھوک نگلتے ہوئے بولی۔

"جھوٹ مت بولو..... تم نے مجھ سے میرا سب کچھ چھیننے کی کوشش کی ہے" نگار بیگم شعلہ برساتی آنکھوں کے ساتھ اونچی آواز میں چلائی۔

"کسی نے بھی نہیں....." رینا نے بھی آواز میں جواب دیا۔

"مت بولو..... جھوٹ....." نگار بیگم نے آگے بڑھ کر زور سے ایک تھپڑ اس کے چہرے پر مارا..... رینا بوکھلا گئی..... اسے قطعی امید نہ تھی کہ نگار بیگم اس کے ساتھ یہ سلوک بھی کر سکتی ہیں..... تھپڑ اس قدر زوردار تھا کہ اس کا سر چکرانے لگا۔

"نگار بیگم..... میں جھوٹ نہیں بولتی" رینا نے روتے ہوئے کہا۔

"بدزبان..... ہمارے آگے زبان چلاتی ہو..... ہم تمہاری کھال ادھیڑ دیں گے اور تمہارے منہ سے تمہاری زبان کاٹ کر پھینک دیں گے..... تو نے ہمیں جیتے جی مار ڈالا ہے....." نگار بیگم نے آگے بڑھ کر کمرے کے دروازے کو چٹخنی لگائی۔ رینا ڈر گئی..... نگار بیگم نے اپنے کپڑوں کی الماری میں سے ایک کوڑا نکالا اور رینا پر زور زور سے برسانے لگی..... وہ چیخنے چلانے لگی..... اپنی مدد کے لئے کسی کو پکارنے لگی..... مگر نگار بیگم کے حکم کے بغیر کوئی بھی اس کے کمرے کی طرف نہیں آ سکتا تھا۔ اس نے اس کو ایسی مار ماری تھی کہ اس کی کھال کا کوئی حصہ سلامت نہیں رہا تھا جس میں سے خون نہ رس رہا ہو..... وہ نگار بیگم کے قدموں میں گر گئی تھی..... اس کی منتیں کر رہی تھی۔ رو رو کر اور ہاتھ جوڑ کر اس سے معافی مانگ رہی تھی مگر نگار بیگم کو اس پر رحم ہی نہیں آ رہا تھا۔ اس کے اندر تو ایسا آتش فشاں پھٹ پڑا تھا جو تنا لاوا اگلنے کے بعد بھی کسی طور ٹھنڈا نہیں پڑ رہا تھا بلکہ اس کی شعلہ فشانی میں

مزید اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ نگار بیگم بھی اس پر یونہی تازیانے برسا رہی تھی...... وہ تڑپ رہی تھی...... رو رہی تھی...... سسک رہی تھی...... گڑگڑا رہی تھی مگر نگار بیگم اس پر صرف گرج رہی تھی...... اسے نہ اس کی خدمت یاد تھی...... نہ اطاعت شعاری اور نہ ہی کوئی رفاقت وہ تو ایک وحشی درندے کی مانند اس کی چیر پھاڑ میں مصروف تھی۔ رینا کی آنکھیں رو رو کر سرخ ہو گئی تھیں اور جسم و چہرہ کوڑے کے نشانات سے پر ہو گیا تھا۔ نگار بیگم بالکل بھول چکی تھی کہ وہ بھی ایک انسان ہے اور کس بے دردی سے ایک انسان کو مار رہی ہے...... رینا اتنی مار کھا کر نڈھال ہو کر فرش پر گر گئی تھی...... اس کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے اور ان پھٹے کپڑوں سے نظر آتے جسم سے خون رس رس کر کپڑوں کو تر کر رہا تھا...... وہ بے ہوش ہو چکی تھی...... نگار بیگم نے چمن بیگم کو بلایا کہ وہ اسے اس کے کمرے میں چھوڑ آئے۔ اتنی مار مارنے کے باوجود بھی اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ اس کی اپنی سانس پھولنے لگی تھی اور چہرہ تمتما رہا تھا...... وہ کیسی ظالم اور جابر بن گئی تھی...... صرف نوازش علی کی خاطر...... جس کے ساتھ اس نے چند روز محبت کی تھی اور جس کے ساتھ چند راتیں گزاری تھیں...... وہ تو اسے اپنا سب کچھ دے بیٹھی تھی اور وہ بدلے میں اسے کیسی کسک اور چبھن دے کر گیا تھا...... جس سے کسی پل فرار ممکن نہیں تھی...... وہ اسے پچھتاوؤں کی ایسی آگ میں جھونک گیا تھا جس کا ہر شعلہ اس کی روح کو جلا رہا تھا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار کسی سے ایسی محبت کی تھی جس کو اپنا سب کچھ پیش کر دیا تھا...... اور بدلے میں اسے کیا ملا تھا...... توہین...... بے عزتی...... ذلت اور...... ذات کی نفی...... اس شخص نے ایک لمحے کے لئے بھی اس کے بارے میں اس کی محبت کے بارے میں نہیں سوچا تھا اور وہ کس قدر بے رخی سے اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا...... اور...... یہی بات اسے دکھ دے رہی تھی...... اسے تڑپا رہی تھی...... نگار بیگم نے اس رات سب سے زیادہ شراب پی اور مدہوش ہو کر گر گئی۔

رینا کو مارنے کی خبر ساری حویلی میں پھیل چکی تھی...... ایسی مار کے بارے میں سن کر ہر کوئی حیران ہو رہا تھا اور تاسف کا اظہار کر رہا تھا۔ دلبر کو بھی خبر مل چکی تھی اور اسے بھی بہت دکھ ہوا تھا...... وہ کسی نہ کسی طرح اس کے کمرے میں پہنچنے میں کامیاب ہو گیا...... رینا خون سے لت پت فرش پر بے ہوش پڑی تھی...... اس نے اس کے رستے زخموں پر مرہم لگائی جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ گرم دودھ میں ہلدی ڈال کر اسے پلائی اور رات بھر وہ اس کے پاس ٹھہرا رہا...... زخموں سے چور بدن کو سہلاتا رہا۔ صبح ہونے سے پہلے وہ اس کے کمرے سے چلا گیا۔

نگار بیگم اتنی مدہوش تھی کہ پورا دن اس کی آنکھ نہ کھلی...... نہ کسی نے نگار بیگم کی خبر لی اور نہ ہی رینا کی...... دونوں اپنے اپنے زخموں سے نڈھال ہو کر بے ہوش پڑی رہیں۔

دن گزرتے گئے اور رینا کی طبیعت سنبھلنے لگی...... دلبر اس کا بہت خیال رکھتا...... اس کی دلجوئی کرتا...... دبے دبے الفاظ میں نگار بیگم کے خلاف بولتا...... رینا خاموش اور پتھرائی آنکھوں سے سب کچھ سنتی رہتی...... اس کی کسی بات کا جواب نہ دیتی...... دلبر اس سے پوچھتا رہتا کہ کس بات پر نگار بیگم نے اس کو مارا تھا۔ مگر وہ کوئی جواب نہ دیتی...... دلبر اس سے پوچھ پوچھ کر تھک گیا تھا مگر وہ خاموش رہتی......

''رینا...... کچھ تو کہو...... کچھ تو بتاؤ...... کوئی تو بات کرو...... میں کئی روز سے پوچھ پوچھ کر تھک گیا ہوں...... تم کوئی جواب کیوں نہیں دیتی۔'' دلبر پوچھ پوچھ کر جھنجلانے لگتا مگر وہ خاموش رہتی جیسے وہ اس کی کوئی بات ہی نہ سنتی ہو۔ جیسے اسے سکتہ ہو گیا ہو...... وہ خود ہی بول بول کر تھک جاتا اور پھر غصے میں وہاں سے چلا جاتا۔

نگار بیگم کی ساری ذمہ داری پھر چمن بیگم نے سنبھال لی تھی...... نگار بیگم بھی کئی روز گزرنے کے باوجود بھی سنبھل نہیں پا رہی تھی...... وہ

نوازش علی کو بھول نہیں پا رہی تھی...... کئی دنوں سے اس نے اپنی باری کے مخصوص دنوں میں بھی رقص نہیں کیا تھا کئی مہمان اس کی خاطر آئے اور چلے گئے...... چمن بیگم نے خود ہی کوٹھے کا انتظام سنبھال لیا تھا...... نگار بیگم کا دل ہر بات سے اچاٹ ہو گیا تھا...... جیسے اسے نہ اپنی زندگی میں دلچسپی رہی تھی اور نہ ہی کوٹھے کی زندگی سے...... وہ ہر وقت نشے میں دھت پڑی رہتی۔ چمن بیگم اسے سمجھاتی رہتی مگر اس کا دل کسی بھی بات کو سننے کو تیار نہیں تھا۔ اسے کوئی بھی بات اچھی نہیں لگتی تھی...... نگار بیگم کے یوں ٹوٹنے سے حویلی ٹوٹ رہی تھی...... ان کا کاروبار ٹھنڈا پڑنے لگا تھا...... اور...... کوٹھے پر رہنے والے ہر شخص کے لئے یہ تشویش کی بات تھی...... نگار بیگم نے جو کچھ کمایا تھا اب خود ہی اپنے ہاتھوں سے برباد کر رہی تھی...... اس نے بڑی محنت سے کندن بیگم کے بعد اپنے پیشے میں نام کمایا تھا اور اب وہی نام ڈوب رہا تھا۔

رینا کی طبیعت بہت بہتر ہو چکی تھی مگر وہ ہر وقت کچھ نہ کچھ بیٹھی سوچتی رہتی...... اپنی اس خواہش کے بارے میں...... جس کی تکمیل نگار بیگم کے ذریعے ممکن تھی اور اب سب کچھ چکنا چور ہو گیا۔ اس نے اس کے خواب بھی اس کی آنکھوں سے نوچ لیے تھے...... اور اس سے معصومیت بھی...... اس کی شرافت بھی...... اور اس کا تقدس بھی...... اس کا گھر بھی چھین لیا تھا اور گھر والے بھی۔ وہ کہیں کی نہیں رہی تھی...... اجڑ گئی تھی...... برباد ہو گئی تھی اس کا سارا کچھ تباہ و برباد ہو گیا تھا۔ اس کا وجود راکھ کا ڈھیر بن گیا تھا اور اس راکھ میں دبی چنگاریاں ہر وقت سلگتی رہتی تھیں۔

رینا صبح اٹھ کر کچن میں گئی...... چمن بیگم بڑے اہتمام سے نگار بیگم کے لئے جوس بنا رہی تھی...... وہ ہال نما کچن میں جا کر کرسی پر بیٹھ گئی اور خاموشی سے چمن بیگم کی طرف دیکھنے لگی...... جیسے کسی موقع کی منتظر ہو۔ چمن بیگم جوس بناتے ہوئے کسی کام سے کمرے سے باہر نکلی...... کچن میں کوئی بھی موجود نہ تھا وہ خاموشی سے اٹھی اور اپنے دوپٹے کے پلو سے ایک پڑیا نکالی جس میں چوہے مار گولیوں کو پیس کر سفوف بنایا گیا تھا۔ وہ اکثر چوہے مار گولیاں اپنے کمرے میں رکھتی تھی...... کیونکہ اس کے کمرے میں اکثر بہت چوہے ہوتے تھے اور دلبر نے اسے یہ گولیاں لا کر دی تھیں۔ اس نے جلدی سے سفوف جوس میں ڈال کر چمچ ہلائی اور اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گئی۔ چمن بیگم جلدی جلدی کچن میں آئی اور جوس اٹھا کر لے گئی۔ رینا کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیلنے لگی۔

ہر لمحہ...... ہر پل...... ہر ساعت وہ منتظر رہی...... حویلی میں ایک دم کہرام مچنے لگا......

نگار بیگم نے زہر کھا لیا ہے...... اس کی حالت خطرناک ہے...... اسے ہاسپٹل لے جایا جا رہا ہے...... مگر...... ہاسپٹل جانے سے پہلے ہی وہ دنیا...... حویلی...... اپنی جنت...... اور اس کی ساری رنگینیاں چھوڑ کر جا چکی تھی...... ہر آنکھ اشکبار تھی...... ہر کوئی رو رہا تھا...... بین کر رہا تھا...... اور حویلی کا مستقبل سوچ سوچ کر لرز رہا تھا۔

''نگار بیگم کی موت کی خبر ابھی حویلی سے باہر جانے نہ پائے یہی بہتر ہے'' چمن بیگم نے سارے کارندوں کو بلا کر کہا۔ سب خاموش ہو گئے...... نگار بیگم کے دکھ میں ہر دل دکھی اور افسردہ تھا...... مگر...... رینا کا دل بہت خوش تھا۔ اس نے اپنی سب سے بڑی دشمن پر فتح پا لی تھی...... یہ اس کی کامیابی کا دن تھا...... وہ اپنے آپ کو مبارک باد دے رہی تھی۔

(۱۲)

نازی کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ دلہن بنی...... باسط علی کی منتظر تھی۔ پھولوں سے سجی سیج اور خوشبوؤں سے معطر کمرے میں اس کا خوبصورت...... پری پیکر وجود کسی پرستان کا ہوشربا منظر کا عکاس تھا۔ نازی نے اس کمرے کو اپنی پسند کے مطابق آراستہ کیا تھا اور وہ کس قدر خوش تھی۔ اس کا اندازہ کوئی بھی نہیں لگا سکتا تھا۔ شاید وہ خود بھی نہیں...... وہ آنے والے حسین اور پر کیف لمحوں کا تصور کر کے ہی خوش ہو رہی تھی۔ باسط علی کو چاہنا اس کی محبت کو پانا...... اور اس کے حصول میں کامیابی تک اس کو کتنے مشکل مراحل میں سے گزرنا پڑا تھا یہ صرف وہی جانتی تھی۔ اگر اس کی جگہ کوئی کمزور اعصاب کی لڑکی ہوتی تو کب کی ہار مان چکی ہوتی مگر نازی نے اپنے اور باسط علی کے راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو اپنے مصمم ارادے سے دور ہٹایا تھا اور آج وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے پوری کائنات کو فتح کر لیا ہو...... باسط علی کو پانا اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش بن گئی تھی اور اس خواہش کی خاطر اس نے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ عبادت دعائیں اور ہر ممکن جدوجہد اور کوشش کی تھی...... اور آج اس کی خواہش...... تمنا...... آرزو پوری ہونے جا رہی تھی۔

"باسط...... علی" اس نام کو سوچتے ہی اس کا دل خوشی سے جھوم اٹھتا...... اس کے لبوں پر مسکراہٹ سی پھیل جاتی اور اس کا چہرہ تمتمانے لگتا۔

وہ ایک ایک لمحہ...... ایک ایک پل انتہائی اضطراب میں گزار رہی تھی۔

باہر باسط علی بہت بے قرار تھا۔ وہ جیسے ہی نازی کے پاس جانے کے لئے اٹھتا...... اندر سے کوئی شے...... اسے بری طرح روکتی...... کافی وقت گزر گیا تھا اور باسط علی سخت الجھن کا شکار ہو رہا تھا۔

"باسط...... علی...... نازی کی محبت کی یوں توہین مت کرو...... اس نے تمہاری خاطر...... اپنا سب کچھ ختم کر ڈالا اور اب تم" باسط علی کے دل سے صدا بلند ہوئی اور وہ اپنی ہمت یکجا کر کے اٹھا اور نازی کے پاس گیا۔ اس نے دروازہ کھول کر ایک ٹک کمرے کی جانب دیکھا...... اچانک اس کے دل کی حالت بدلنے لگی۔ ایک خوبصورت، پر لطیف اور مسحور کن احساس اس کے رگ و پے میں سرایت کرنے لگا۔ اس کے دل میں نرم و گرم جذبات پیدا ہونے لگے۔ اس کا اضطراب کم ہونے لگا اور پر جوش جذبات سر اٹھانے لگے۔ اس کا دل خوشی کے جذبات سے لبریز ہو کر دھڑکنے لگا...... اس نے بیڈ پر بیٹھی نازنین کی جانب دیکھا اور مسکرا کر اس کی طرف بڑھا۔ اس کے پاس بیٹھ کر محبت پاش نگاہوں سے اس کی جانب دیکھنے کی کوشش کی۔

اسی لمحے شاہ زیب کی نفرت، غم و غصے حسرت اور آنسوؤں سے بھری آنکھیں اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم گئیں۔ اس نے گھبرا کر نازی کی جانب دیکھا۔ اس کا گھونگھٹ اٹھانے کے لئے اس نے اپنے ہاتھ بلند کیے تھے وہ وہیں تھم گئے اس کا دل ایک دم اضطراب سے بھرنے لگا۔ اس کے اندر شدید اداسی سی چھانے لگی۔ اس کا سارا جسم کپکپانے لگا اور پسینے سے تر ہونے لگا۔

''کیا ہوا......؟'' نازی نے اس کی ایک دم بدلتی حالت دیکھ کر قدرے گھبرائے ہوئے پوچھا۔

''معلوم نہیں......'' اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔

''آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی......آپ یہاں لیٹ جائیں'' نازی نے نرم وگداز مخملیں تکیہ اس کے سر کے نیچے رکھتے ہوئے کہا۔

باسط علی نے پھر نازی کے چہرے کی جانب دیکھنے کے لئے نظریں اٹھائیں تو شاہ زیب کی آنکھیں پھر اسے گھورنے لگیں۔ وہ خوفزدہ ہونے لگا۔

''نہیں...... یہاں نہیں'' وہ گھبرا کر اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ نازی حیرت سے اسے باہر جاتے ہوئے دیکھتی رہ گئی۔ اس کے جذبات کو شدید ٹھیس لگی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی جس محبت کو پانے کی خاطر اس نے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ اس منزل تک پہنچنے کے لئے اس نے کیا کیا تکلیفیں نہیں اٹھائی تھیں۔ اس منزل پر پہنچ کر وہ پھر خالی ہاتھ کھڑی تھی۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ تشنہ اور مضطرب ہو گئی تھی۔ جیسے پیاسا کنویں کے پاس جا کر بھی پیاسا رہ جاتا ہے......مگر پیاس مزید بڑھنے لگتی ہے......اس کے مشتعل جذبات سلگنے لگے۔ وہ ہچکیاں لینے لگی اور سسکیاں بھرنے لگی۔

باسط علی کی حالت اس کے سامنے تھی......نجانے وہ کیوں اتنا بدل گیا ہے......اور اس حد تک بدل جائے گا اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

وہ اسے کیا کہے......اور اب کیا کرے......؟ وہ عجیب دوراہے پر کھڑی تھی۔ سخت مخمصے اور الجھن کا شکار ہو رہی تھی۔ اسے شاہ زیب یاد آنے لگا جو انتہائی محبت سے اس کی جانب بڑھا تھا اور اس نے اس کا محبت بھرا ہاتھ بری طرح جھٹک دیا تھا۔ شاید اس کا دل بھی یونہی ٹوٹا ہوگا......اسی طرح کرچی کرچی ہوا ہوگا......وہ رونے لگی......کبھی کبھی قدرت کس قدر خاموشی سے انتقام لیتی ہے کہ انسان کو خود بھی خبر نہیں ہو پاتی اور وہ بری طرح بوکھلا جاتا ہے......شاہ زیب......'' وہ زیر لب آہستہ آہستہ بڑبڑائی اور رونے لگی......

باسط علی نیند کی گولی کھا کر سو گیا۔ اگلے روز اس کی حالت قدرے سنبھلی تو وہ نازنین کے پاس آیا۔ نازی کا چہرہ بہت مرجھایا ہوا اور آنکھیں بہت اداس تھیں جن میں تیرتی ہوئی نمی واضح دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ہر دم پھیلی مسکراہٹ، خوشی اور شادابی کہیں گم ہو گئی تھی۔

''اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟'' نازی نے باسط علی کی جانب دیکھتے ہوئے آہستہ آواز میں پوچھا۔

''ٹھیک ہوں......'' باسط علی نے جواب دیا۔

دونوں کے درمیان گہری خاموشی چھا گئی۔ یوں......جیسے ایک دوسرے کو کچھ کہنے کے لئے الفاظ ختم ہو گئے ہوں......کسی کے پاس نہ کہنے کو بات رہی ہو اور نہ پوچھنے کو سوال مگر دونوں کے مضطرب دل اندر ہی اندر بری طرح تلملا رہے تھے۔

''مجھے معاف کر دو......'' باسط علی بہت دیر نظریں جھکائے ہوئے بولا۔

نازی جواباً خاموش رہی......اور......اس کی جانب حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتی رہی۔

''نازی......تم'' باسط علی نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے اسے پکارا نازی نے کوئی جواب نہ دیا......اور سرد آہیں بھرنے لگی۔

''نازی......تم......کچھ بول کیوں نہیں رہی؟'' باسط علی نے مضطرب ہو کر کہا اور اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھوں کو اپنے

ہاتھوں میں لیتے ہوئے وہ نم آنکھوں سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔

نازی پھر بھی خاموش رہی......اور اس کی خاموشی باسط علی کے دل کو مضطرب کرنے لگی......نازی نے خاموشی سے نظریں جھکا لیں اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ کرنے لگے۔ وہ سسکیاں بھرنے لگی۔

نازی......میں......تم سے بہت......وہ رکا اور نازی کی تھوڑی کو اپنے ہاتھ سے اوپر کر کے اس کا چہرہ بغور دیکھنے لگا۔ نازی کی خوبصورت بھیگی پلکیں، اس کے اندر شدید جذباتی کیفیت پیدا کرنے لگیں، اس کا دل بے قابو ہونے لگا۔

''میری طرف دیکھو......'' اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا تو نازی نے آہستہ آہستہ اپنی نم آنکھیں کھول کر اس کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھیں رونے کی وجہ سے سرخی مائل ہو رہی تھیں اور ان آنکھوں میں نمی کے ساتھ ساتھ بے حد اداسی اور حسرت دکھائی دے رہی تھی۔ ویسی ہی حسرت......اور......ویسا ہی دکھ......جو شاہ زیب کی آنکھوں میں دکھائی دیتا تھا۔

اس کے سامنے نازی کی غمگین......اور آنسوؤں سے بھری آنکھیں تھیں......مگر وہ ان آنکھوں میں شاہ زیب کی آنکھوں کا عکس دیکھ رہا تھا۔

وہ ایک دم گھبرا گیا......

نازی سے پیچھے ہٹ گیا۔ نازی کی طرف دیکھتے ہوئے اسے خوف آنے لگا اس کا چہرہ اور جسم پھر پسینے سے تر ہونے لگے......وہ اسے چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ نازی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے......سب کچھ بہت عجیب اور انوکھا ہو رہا تھا......اس کی آہیں اور سسکیاں کمرے کی فضا میں بلند ہونے لگیں مگر ان کو سننے والا کوئی نہیں تھا۔

☆

کئی روز سے برفباری کا سلسلہ بند ہو گیا تھا مگر ہوا میں شدید خنکی تھی۔ یخ بستہ ہواؤں نے ساری بستی کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ سر شام ہی لوگ اپنے گھروں میں دبک کر بیٹھ جاتے۔ بہت کم لوگ ادھر ادھر چلتے پھرتے نظر آتے۔ باسط علی کو چائے کی شدید طلب ہو رہی تھی۔ وہ چائے پینے کے لئے شیرے کے کھوکھے کی جانب چل پڑا۔ آہستہ آہستہ رات کے تاریک سائے ہر جانب پھیلنے لگے تھے۔ باسط علی سویٹر اور کوٹ کے اوپر ایک لمبا برساتی کوٹ پہنے سڑک پر جا رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے یخ جھونکے اس کے ہاتھ پاؤں کو سن کر رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے ہاتھ پاؤں میں جان اور حرارت ہی نہ ہو۔ اچانک اسے دور ایک درخت کے نیچے آگ کے شعلے بلند ہوتے دکھائی دیئے۔ آگ کو دیکھ کر اس کے اندر شدید تمنا پیدا ہوئی کہ وہ فوراً اس آگ تک پہنچ جائے وہ لمبے لمبے قدم اٹھاتا، اس آگ تک پہنچ گیا۔ آگ کے پاس سائیں متھا گھٹنوں میں سر دبائے بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ ٹھنڈی یخ زمین پر یونہی آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ میلا کچیلا پھٹا ہوا کمبل اس نے اپنے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ باسط علی اسے دیکھ کر ٹھٹکا۔

''آ......گئے......تم......؟ مجھے پتہ ہے......تم......کیوں بار بار میرے پاس آتے ہو......میرے پاس کچھ نہیں......کچھ نہیں ملے گا یہاں سے......اس کے پاس چلے جاؤ، سب کچھ اس کے پاس ہے......میرے پاس کچھ نہیں......کچھ نہیں......'' سائیں نے خفگی سے کہا۔

باسط علی خاموشی سے اسے دیکھنے لگا ''تو اپنے دل کو اس سے چھپائے چھپائے پھرتے ہو...... نا...... مگر اسے سب خبر ہے...... یہ پاک صاف نہیں ہوگا...... جب تک کہ تو اسے اس پانی سے نہ دھوئے...... ماسٹر کا ہے کو خوار ہو رہا ہے۔ تو بھی سچی بات جانتا ہے اور وہ بھی۔ کیا تیرے اندر اک آگ نہیں جلتی رہتی......؟'' ماسٹر نے چونک کر سائیں کو دیکھا، وہ مسکرانے لگا اور بلند آواز میں کلام پڑھنے لگا۔

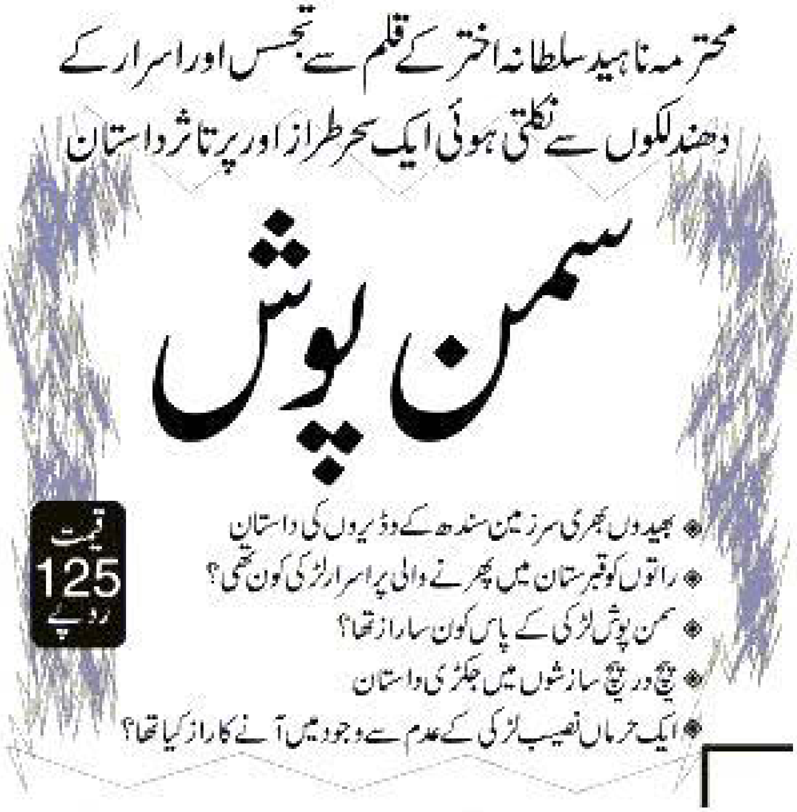

سچ آکھ، مناں کیوں ڈرنا اے
اے سچ پچھے توں ترنا اے
سچ صدا آبادی کرنا اے
سچ وست اچنبھا آئی اے
گل لوکاں رولے پائی اے
چوٹھ آکھاں تے کج بچدا اے
سچ آکھاں بھانبھڑ مچدا اے
جی دوہاں گلاں توں جچدا اے
جچ جچ کے جیبھا کہندی اے
منہ بات نہ آئی رہندی اے

ماسٹر باسط سے وہاں رکنا مشکل ہو گیا۔ انہوں نے وہاں سے جانے میں ہی عافیت سمجھی۔ سائیں ہنسنے لگا۔

☆

نازی رفتہ رفتہ شدید ڈپریشن کا شکار ہونے لگی تھی۔ ان کی شادی کو تین ماہ گزر گئے تھے اور باسط علی نے ایک بار بھی اس کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دیا تھا۔ وہ جب بھی اس کے قریب آتا۔ نجانے اسے کیا ہو جاتا اور اس کی حالت بہت عجیب ہونے لگتی۔ دل گھبرانے لگتا اور جسم پسینے سے تر ہو جاتا...... وہ بہت چاہتے ہوئے بھی ایک قدم اس کی جانب بڑھ نہیں پایا تھا۔ ہر دفعہ دونوں کے درمیان شاہ زیب آ کر کھڑا ہو جاتا تھا لیکن یہ بات صرف باسط علی جانتا تھا۔ نازی اس بات پر یقین نہیں کرتی تھی ایک دو بار باسط علی نے اسے شاہ زیب کی مداخلت کے بارے میں بتایا تو وہ غصے میں آ گئی۔

''باسط علی...... اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کے لئے...... کسی اور کو مت الزام دو...... شاہ زیب بھلا کیوں ہماری زندگیوں میں مداخلت کرے گا'' نازی نے غصے سے بپھرے ہوئے جواب دیا۔

''نازی...... میں...... سچ کہہ رہا ہوں...... وہ...... ہر بار...... میرے اور تمہارے درمیان آ جاتا ہے'' باسط علی نے نم آنکھوں سے جواب دیا۔

''اس کا...... کیا مطلب ہے؟'' نازی نے اسے غصے سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''معلوم نہیں...... میں کچھ نہیں جانتا'' باسط علی نے جواب دیا۔

’’جب تم کچھ جانتے نہیں......تو اس بات کا ذکر ہی بے معنی ہے...... میں نے تم سے محبت......شاہ زیب سے پہلے کی...... تمہاری خاطر میں نے اسے جھٹلایا...... میرا اور اس کا رشتہ تم سے زیادہ قریبی اور ٹھوس تھا۔ جب اس نے مجھے کچھ نہیں کہا......تو...... تمہیں وہ کیسے کہے گا‘‘ نازی نے غصے سے کہا۔

’’نجانے کیوں...... مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ میں نے شاہ زیب کے ساتھ کچھ غلط کیا ہے‘‘ باسط علی نے آہ بھر کر کہا۔

’’اور...... میرے ساتھ...... جو کچھ تم کر رہے ہو......اس کے لئے تمہیں کوئی افسوس......کوئی دکھ......کوئی پچھتاوا نہیں ہو رہا......‘‘ نازی نے دکھی لہجے میں پوچھا۔

’’ہوتا...... ہے......مگر......‘‘ باسط علی نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

’’مگر......شاید...... تم کسی قابل نہیں‘‘ نازی نے تلخ لہجے میں کہا تو باسط علی نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

’’کیا مطلب......؟‘‘ اس نے چونک کر پوچھا۔

’’میں نے تمہاری محبت اور چاہت کی خاطر کیا کچھ نہیں کیا۔ عزت، دولت، شان و شوکت......سب کچھ داؤ پر لگا دیا مگر تمہاری محبت کے لمس اور احساس سے ابھی تک محروم ہوں......ایک عام...... نارمل مرد......بھی محبت کے احساس کو ضرور اپنے اندر محسوس کر کے اس کا اظہار کرتا ہے اور ان تین مہینوں میں تم ایک بار بھی میرے لئے اپنے اندر محبت کی وہ آگ نہیں سلگا سکے جس کی تمنا میں...... میں نے اتنا کچھ کیا ہے۔ تم جب بھی میرے پاس آتے ہو......گیلی سلگتی ہوئی لکڑی کی طرح آتے ہو اور میرے اندر سرد راکھ کی ٹھنڈک بھر دیتے ہو...... باسط علی اگر تم اس قابل نہیں تھے......تو......پھر میرے ساتھ یہ کھیل......کیوں کھیلا...... پہلے......میرے اندر اتنی آگ بھڑکائی کہ میں باہر کی ہر آگ میں کود جانے کو تیار ہو گئی اور اتنی آگ بھڑکا کر اب اس پر خود ہی پانی ڈال رہے ہو......کیا تم میرے ساتھ ظلم نہیں کر رہے...... تمہیں احساس ہی نہیں ہو رہا کہ تم میرے اندر کیسا دھواں بھر رہے ہو......تم مجھے بنجر بنا رہے ہو...... میرا سب کچھ چھین رہے ہو...... تم...... مجھ سے وہ محبت چھین رہے ہو جس کو پانے کے لئے میں نے سب کچھ کیا...... مجھے اب تم سے محبت نہیں...... نفرت ہونے لگی ہے‘‘ نازی روتے ہوئے غصے سے بولی۔

باسط علی نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ اس کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔ اسے ہرگز یہ توقع نہیں تھی کہ نازی یوں شدید ردعمل کا اظہار کرے گی۔

’’مجھ سے......نفرت......؟‘‘ باسط علی نے حیرت سے بوکھلائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

’’ہاں...... تم سے نفرت......اور یہ نفرت بھی......اس محبت کی طرح دن بدن شدید ہونے لگی ہے...... جو میں کبھی تم سے کرتی تھی‘‘ نازی نے غصے سے پھنکارتے ہوئے کہا تو باسط علی کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔

’’یہ......تم......کیا کہہ رہی ہو؟‘‘ باسط علی نے بے یقینی سے پوچھا۔

’’وہی......جو......تم......سن رہے ہو‘‘ اس نے اکڑ کر جواب دیا۔

''ایسا.....مت کہو.....تم.....مجھ سے نفرت نہیں کر سکتی.....'' باسط علی نے پریشانی سے کہا۔

''کیوں نہیں کر سکتی.....اگر میں تم سے محبت کر سکتی ہوں.....تو.....نفرت بھی کر سکتی ہوں.....اور یہ میرے بس میں ہے'' وہ الفاظ چبا کر بولی۔

''کیا.....تم.....واقعی مجھ سے.....نفرت کرنے لگی ہو؟'' باسط علی نے گھبرا کر پوچھا۔

''ہاں.....'' اس نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

باسط علی کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگیں اور وہ روتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ نازی بھی سسکنے لگی۔

یہ سب کیا ہو گیا تھا.....اور.....کیا ہو رہا تھا.....انہوں نے ایسا تو بالکل بھی نہیں چاہا تھا.....انہوں نے تو اپنی محبت کو نبھانے کے خواب دیکھے تھے محبت کی خوبصورت راہوں پر چلنے کے.....محبت کا امرت رس پینے کے.....محبت کے سنگ زندگی گزارنے کے.....محبت کی خوشبو میں بسی سانسوں کو محسوس کرنے کے.....محبت کے میٹھے اور خوشگوار لمس کے سنگ جینے کے.....مگر.....سب کچھ الٹ ہو گیا تھا.....وہ محبت کی خوشبو.....اس کا احساس اور اس کا لمس کیسے محسوس کر پاتے.....محبت ہی ان کی زندگیوں سے کہیں غائب ہو گئی تھی جیسے چاند بادلوں کے پیچھے اپنا چہرہ ایک بار دکھا کر کہیں غائب ہو جاتا ہے۔ ویسے ہی محبت اپنی خوبصورتی دکھا کر کہیں غائب ہو گئی تھی.....شاید ہمیشہ کے لئے.....سارے خواب چکنا چور ہو گئے تھے۔ سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ بس اب راکھ باقی تھی.....اور وہ اس راکھ میں سے دبی چنگاریوں کو تلاش کرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔

باسط علی رو رہا تھا.....نازی رو رہی تھی.....مگر دونوں ایک دوسرے کے غم کو دور نہیں کر سکتے تھے۔ نازی کے دل میں پیدا ہونے والی نفرت کو باسط علی اپنی محبت سے نہیں بدل سکتا تھا.....کیونکہ اس کی محبت میں اب نہ طاقت باقی تھی نہ شدت اور نہ ہی حدت.....نازی اس سے بہت دور جا چکی تھی اور وہ نازی کی طرف قدم بڑھانے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا دونوں مضطرب تھے اور پریشان تھے.....دونوں کے دل آہستہ آہستہ محبت کے اس جذبے سے خالی ہو رہے تھے جس سے کبھی ان کے دل بہت سرشار تھے۔

☆

شہر کے بہت بڑے ہسپتال میں شاہ زیب کی آنکھوں کا آپریشن ہوا تھا۔ اس کا آپریشن بہت پیچیدہ اور مشکل تھا۔ ڈاکٹر بھی بہت پریشان تھے اور قبل از وقت کچھ نہیں بتا سکتے تھے۔ زیتون بانو کا رو رو کر برا حال ہو گیا تھا۔ تمام دوست واحباب، مزارع اور ملازمین اس کے لئے دعا گو تھے۔ اچانک کیا ہو گیا تھا۔ نازی کے جانے کے بعد شاہ زیب بے حد پریشان اور مضطرب رہتا تھا۔ اپنی ہی سوچوں میں گم رہتا.....اس نے کسی سے بات چیت کرنا بھی چھوڑ دی تھی۔ رات رات بھر جاگتا رہتا، نیند تو گویا اس سے روٹھ گئی تھی اور اس کے اندر کی حالت کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس کا دل ہر وقت بے قرار اور مضطرب رہتا۔ کسی پل چین نصیب نہ ہوتا۔ سوتے میں بھی اور جاگتے میں بھی نازی اس کی آنکھوں سے اوجھل نہ ہوتی۔ کسی سے بات کرتے ہوئے اچانک اس کی آنکھیں نم ہونے لگتیں اور تنہائی میں اس کی آنکھوں سے ہر وقت آنسو گرتے رہتے۔ اس نے اپنے دل کو سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی مگر دل اس کی کوئی بات سننے اور سمجھنے کو تیار ہی نہیں تھا۔ انہی دنوں اس سے بہت عجیب وغریب حرکتیں سرزد ہونے لگیں۔ کبھی سوتے ہوئے وہ اچانک اٹھ کر چلنے لگتا اور کبھی سب دوستوں کے درمیان بیٹھے ہوئے اور باتیں کرتے ہوئے اچانک اٹھ کر چلا جاتا۔ سب اس کی حرکتوں پر

حیران ہونے لگتے۔ کبھی اپنے کیے کام خود ہی بگاڑ دیتا اور کبھی برسوں سے بھولے ہوئے کام اچانک کرنے لگتا۔ اس کے ارد گرد رہنے والے لوگ اور قریبی ملازمین بھی اس کی حرکتوں اور اس میں آنے والی تبدیلیوں کو جان کر پریشان ہو جاتے...... ایسی ہی ایک حرکت اس نے چند روز پہلے کی تھی۔ آدھی رات کو نجانے اسے کیا ہوا تھا۔ اس نے ڈیرے سے اپنی گاڑی نکالی اور بہت تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا نا معلوم منزل کی جانب چل پڑا اور نہ اس سے قبل وہ ہمیشہ اپنے ڈرائیور کے ساتھ جاتا تھا۔ ڈرائیور ڈیرے پر ہی سو رہا تھا مگر اس نے اسے اٹھانا مناسب نہ سمجھا......

ڈرائیونگ کرتے ہوئے نازی اور باسط علی مسلسل اس کی آنکھوں کے سامنے تھے۔ اس کی آنکھوں میں بار بار نمی آ رہی تھی۔ اچانک اسے اپنی گاڑی کے سامنے کوئی جانور بھاگتا ہوا نظر آیا۔ اس نے اسے ہارن دے کر بچانے کی کوشش کی۔ اندھیرے میں...... نم آنکھوں کے ساتھ اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا کہ اس کی گاڑی کے سامنے کیا ہے۔ اس نے بریک لگانے کی کوشش کی مگر سڑک پر گہرا کھڈا دکھائی نہ دیا اور گاڑی بری طرح اچھلتی ہوئی سڑک کے کنارے ایک بہت بڑے درخت سے بری طرح ٹکرائی۔ گاڑی کے شیشے ٹوٹ کر اس کے چہرے اور آنکھوں میں گھس گئے۔ سارا چہرہ خون سے تر ہو گیا۔ وہ چلاتا رہا مگر اس کی آواز سننے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ تڑپ تڑپ کر بے ہوش ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک ٹریکٹر وہاں سے گزرا تو اس کو فوراً ہسپتال پہنچایا اور اس کے گھر میں اطلاع دی گئی۔

ڈاکٹروں نے فوراً اس کی آنکھوں کا آپریشن کیا مگر وہ کچھ زیادہ پرامید نہیں تھے۔ آپریشن کے بعد جب اس نے آنکھیں کھولیں تو ہر طرف اسے تاریکی چھائی ہوئی دکھائی دے رہی تھی...... وہ رونے لگا۔

''میں کچھ نہیں دیکھ سکتا...... کچھ بھی نہیں...... اپنے ہاتھ بھی نہیں...... اپنا جسم بھی نہیں...... کچھ بھی نہیں...... مجھے ہر طرف اندھیرا نظر آ رہا ہے......'' وہ شدت جذبات سے روتا ہوا چیخنے چلانے لگا۔

کمرے میں موجود اس کی ماں اور سب دوست واحباب اس کی حالت دیکھ کر رونے لگے۔

''ڈاکٹر صاحب...... اللہ کے واسطے کچھ کریں...... میرے بیٹے کو میری آنکھیں لگا دیں......'' زیتون بانو نے روتے ہوئے ڈاکٹر کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ باندھ کر کہا۔

''کاش...... کچھ ممکن ہوتا تو ہم ضرور کرتے...... مگر ہم بے بس ہیں...... خدا سے دعا کریں کہ وہ اپنا کرم کر دے'' ایک ادھیڑ عمر ڈاکٹر نے کہا تو زیتون بانو ان کی بات سن کر بچوں کی طرح بلکنے لگی۔ اس کے خوبصورت جواں سال بیٹے کی دنیا اندھیر ہو گئی تھی۔ شاہ زیب سے بھی یہ صدمہ برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ کئی روز کے علاج کے بعد جب وہ گھر آیا تو اسے شدید ڈپریشن ہونے لگا۔ اس کے لئے ہر جگہ تاریک تھی۔ گھر کے اندر بھی اور باہر بھی نجانے روشنیاں کہاں گم ہو گئی تھیں...... جیسے اس کی خوشیاں...... وہ دیواروں کو ٹٹول ٹٹول کر چلتا تو زیتون بانو اسے دیکھ کر رونے لگتی۔ اچانک اسے ٹھوکر لگتی اور وہ گرنے لگتا تو زیتون بانو تڑپ اٹھتی اگرچہ ڈاکٹر نے اس کے ہاتھ میں چھڑی تھمائی تھی مگر چھڑی پکڑنے کی اسے عادت ہی نہیں تھی۔ چھڑی کو زمین سے اٹھا کر چلتا تو گرنے لگتا۔ دن میں کئی بار اسے یاد نہ رہتا کہ اب وہ دیکھ نہیں سکتا اور ہڑبڑا کر بستر سے اٹھ کر کھڑا ہوتا اور اچانک ہی پاس رکھی کسی شے سے بُری طرح ٹکرا کر گرنے لگتا۔ زیتون بانو یا پاس کھڑے ملازمین بھاگ کر اس کو سہارا دیتے اور ان کے سہارے چلنے پر وہ بے

حد بے بسی محسوس کرتا۔ بیڈ پر لیٹے...... اٹھتے بیٹھتے...... ہر لمحہ...... ہر پل وہ آہیں بھرتا رہتا...... سسکیاں لیتا رہتا اور آنسو گراتا رہتا۔

''شاید...... اب یہ ٹھوکریں ہی میرا مقدر ہیں'' وہ آہ بھر کر سوچتا اور اپنی بے بسی پر آنسو بہاتا رہتا۔

''میرے مولا...... تو نے میرے بیٹے کو یہ کیسی سزا دی ہے...... اتنی بڑی آزمائش میں ڈال دیا ہے جس شخص کی آنکھیں نہ رہیں...... تو اس کے پاس...... باقی...... کیا رہ جاتا ہے۔ نہ دنیا دکھائی دے اور نہ دنیا کے لوگ...... نہ اپنا آپ نظر آئے اور نہ ہی کوئی اور...... یہ کیسی ادھوری زندگی ہے اگر اس کا باپ زندہ ہوتا تو صدمے سے ہی مر جاتا'' زیتون بانو روتے ہوئے سوچتی۔

''اماں جی...... اب میں زمینوں کی دیکھ بھال کرنے کے قابل نہیں رہا...... میرا خیال ہے آپ سب کچھ بیچ دیں'' شاہ زیب نے ایک روز ماں سے کہا جب مزارعے اس کے پاس اس کے منشی کی شکایتیں لے کر آئے۔

''شاہ زیب...... یہ تم کیا کہہ رہے ہو...... میں پشتوں سے سونا اگلتی زمینوں کو بیچ دوں...... جانتے ہو...... تمہارے باپ دادا نے کتنی محنت سے ان کو آباد کیا...... یہ زمینیں ہماری شان اور عزت ہیں...... ہم اپنی عزت کو بیچ دیں...... یہ ناممکن ہے'' زیتون بانو نے کہا۔

''تو...... پھر...... کیا کریں......؟'' شاہ زیب نے آہ بھر کر پوچھا۔

''اگر کوئی قابل اعتبار شخص مل جائے...... تو......'' زیتون بانو کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

''قابل اعتبار...... کہاں سے ملے گا؟ جس پر سب سے زیادہ اعتبار کرنے کی کوشش کی وہی سب سے بڑا بے اعتبار نکلا'' شاہ زیب نے باسط علی کے بارے میں سوچتے ہوئے جواب دیا۔

''دنیا میں صرف وہی قابل اعتبار نہیں تھا...... غلطی ہماری بھی تھی جو ہم نے بغیر جانچے پرکھے اس پر اعتبار کیا'' زیتون بانو نے جواب دیا۔

''میں نے سب کچھ جاننے کے باوجود بھی...... کر لیا؟'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

''کیا تم باسط علی کے بارے میں سب کچھ جانتے تھے؟'' زیتون بانو نے حیرانگی سے پوچھا۔

''ہاں......'' وہ آہستہ آواز میں بولا۔

''پھر بھی تم نے اس پر کیوں بھروسہ کیا؟''

''وہ نازی کی خوشی تھا...... اور...... وہ اس کی خاطر یہاں آیا تھا...... اس کے بلانے پر...... میں نے یہی سوچا کہ اگر قدرت نے میرے نصیب میں خوشیاں نہیں لکھیں تو اس میں کسی کا کیا قصور...... دوسروں کو ان کی خوشیاں ملنی چاہئیں......'' شاہ زیب نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''یہ...... ساری آگ نازی نے ہی لگائی ہے...... اگر وہ کسی اور سے دل لگی نہ کرتی تو آج تیرا گھر بسا ہوتا...... تیری اولاد ہوتی...... اور مجھے تیری کوئی فکر نہ ہوتی'' زیتون بانو نے غصے سے کہا۔

''اماں جی شاید قدرت کو نازی کی خوشیاں بہت عزیز تھیں...... اگر آج وہ میرے پاس ہوتی تو میری آنکھوں کی تاریکی اسے مجھ سے دور لے جاتی...... پھر شاید میرے لئے یہ بات بہت تکلیف دہ ہوتی...... اگر میری بیوی مجھے اس حالت میں چھوڑ کر چلی جاتی'' شاہ زیب نے کچھ سوچتے

ہوئے جواب دیا تو زیتون بانو نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

''اماں جی...... قدرت کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے شاید اس نے میرا بھرم رکھا...... یا...... پھر نازی کا'' شاہ زیب نے پھر کہا تو زیتون بانو خاموشی سے اس کی جانب دیکھنے لگی، اس کی باتوں میں چھپی سچائی نے زیتون بانو کو خاموش کر دیا۔

''اماں جی...... پہلے میں خدا سے شکوہ کرتا تھا کہ اس نے نازی کو مجھ سے کیوں چھینا...... اب آنکھیں چھن جانے کے بعد میں نے یہ شکوہ کرنا چھوڑ دیا ہے...... جانتی ہیں...... کیوں......؟'' شاہ زیب نے گہری سانس لیتے ہوئے پوچھا۔

''کیوں......؟'' زیتون بانو نے حیرت سے پوچھا۔

''نازی...... میرے دل کی خوشی تھی اور آنکھیں سب سے بڑی نعمت...... نعمت...... خوشی سے زیادہ ضروری ہے...... جب نعمت نہ رہے تو خوشی کا کیا کرنا...... شاید انسان کو خوشی کبھی نہ کبھی...... کہیں نہ کہیں مل جاتی ہے مگر نعمت ایک بار چھن جائے تو پھر کبھی نہیں ملتی'' شاہ زیب نے آہ بھر کر کہا تو زیتون بانو حیرانگی سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔

''کیا تم...... خاموش بیٹھ کر یہی باتیں سوچتے رہتے ہو؟'' زیتون بانو نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں...... اللہ سے اپنے بارے میں بہت کچھ پوچھتا ہوں'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

''کیا مطلب......؟'' زیتون بانو نے چونک کر پوچھا۔

''بہت سی باتیں بہت سے سوال...... بہت کچھ...... جو...... شاید میں اپنی روشن آنکھوں سے اس سے کبھی نہ پوچھتا...... اب وہ سب پوچھتا ہوں'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

''شاہ زیب...... بیٹا...... یہ تم کیسی باتیں کرنے لگے ہو؟ کیا تم جانتے ہو...... تم کیا کہہ رہے ہو؟'' زیتون بانو نے بے یقینی سے پوچھا۔

''ہاں...... کیا آپ کو یقین نہیں آ رہا؟'' شاہ زیب نے بھی حیرت سے پوچھا۔

''معلوم نہیں......'' زیتون بانو نے آہ بھر کر جواب دیا۔

شاہ زیب خاموش ہو گیا اور زیتون بانو اس کی بے نور آنکھوں کی جانب حسرت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

''تو...... جو کچھ مرضی کہہ...... مگر اس نے تیرے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے...... خدا اس کو کبھی سکھ نہ دے...... وہ کبھی خوش نہ رہے...... جس کو پانے کے لئے اس نے تجھے چھوڑا ہے کبھی اس کو نہ ملے......'' زیتون بانو نے نم آنکھوں سے آہ بھر کر کہا۔

''نہ...... اماں جی...... یوں...... اس کو بددعا نہ دیں......'' شاہ زیب نے گھبرا کر کہا۔

''کیوں نہ دوں...... تجھے دیکھ کر میرا دل کتنا دکھی ہوتا ہے...... کتنا روتا ہے...... اور نہ چاہتے ہوئے بھی میرے دل سے اس کے لئے بددعائیں نکلتی ہیں اور تم دیکھنا...... وہ کبھی بھی خوش نہیں رہے گی'' زیتون بانو نے روتے ہوئے کہا۔

''اماں...... جی...... ایسا مت کہیں...... اللہ ناراض ہو جائے گا......'' شاہ زیب اپنی چھڑی کے سہارے ٹک ٹک کرتا ہوا اماں کے پاس

صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔

''اور...... جو...... کچھ اس نے تمہارے ساتھ کیا...... اللہ اس سے ناراض نہیں ہوگا؟'' زیتون بانو نے غصے سے پوچھا۔

''پتہ نہیں ہوتا وہ کس سے کس بات پر ناراض ہو جائے...... اور...... اگر وہ ناراض ہو گیا...... تو...... پھر......'' شاہ زیب نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''پھر...... کیا......؟'' زیتون بانو نے حیرت سے پوچھا۔

''پھر...... انسان جیتے جی مر گیا...... اس کے پاس کچھ بھی نہیں رہتا...... اس کی کشتی ڈوب جاتی ہے......'' شاہ زیب نے دیوار کی جانب اپنی نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے جواب دیا۔

''شاہ زیب...... ہم...... دنیا دار انسان ہیں...... ہمیں انسان ہی رہنے دو...... یہ لمبی چوڑی اللہ والی باتیں مت کرو...... ہمیں غصہ بھی آتا ہے اور ہم دکھی بھی ہوتے ہیں ہم خوش بھی ہوتے ہیں اور ناراض بھی...... ہم عام انسان ہیں...... ہم ایک وقت اللہ سے شکوے اور دوسرے لمحے اس کا شکر بھی ادا کرنے والے معمولی انسان ہیں...... میں نہیں جانتی...... تم کیا کچھ سوچتے رہتے ہو مگر...... میں جو سوچتی ہوں...... وہی کہوں گی۔ اس لڑکی سے میں نے بھی بہت محبت کی۔ اسے اپنا جگر کا ٹکڑا سمجھا اور وہ مجھے ہی دھوکہ دیتی رہی...... مجھے کبھی احساس ہی نہیں ہونے دیا کہ وہ مجھے بھی دھوکہ دے رہی ہے اور مجھے بے وقوف بناتی رہی...... میرا دل کتنا جلتا ہے میں تمہیں بتا نہیں سکتی'' زیتون بانو غصے سے بولیں۔ شاہ زیب ان کی باتیں سن کر خاموش ہو گیا۔

زیتون بانو اسے گھورتی ہوئیں کمرے سے باہر نکل گئیں۔

☆

ماسٹر باسط علی شیرے کے کھوکھے میں بیٹھا چائے پینے میں مصروف تھے۔ اخبار ان کے سامنے پڑا تھا اور وہ اس پر طائرانہ نظریں دوڑا رہے تھے۔

''ماسٹر صاحب کوئی نئی تازی خبر سنائیں؟'' شیرے نے مسکرا کر ان کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کوئی خاص خبر نہیں......'' ماسٹر باسط علی نے سرسری سا جواب دیا۔

''ماسٹر جی...... یہ کیا بات ہوئی...... پورے اخبار میں کوئی خبر ہی نہیں......؟'' شیرے نے حیرت سے پوچھا۔

''وہی پرانی خبریں ہیں...... کوئی نئی نہیں'' ماسٹر باسط علی نے منہ بنا کر جواب دیا اور چائے پینے لگے۔

''کبیرا آتا ہے...... وہ تو...... بڑی مزے دار خبریں سناتا ہے...... آپ کہتے ہیں...... تو مان لیتا ہوں......'' شیرے نے بے یقینی سے کہا اور باہر جا کر چائے بنانے لگا۔

سائیں مٹھا اپنے موٹے ڈنڈے کو چھن چھن کرتا شیرے کے پاس سے گزرا۔

''ارے...... اس سے کیا خبریں پوچھتا ہے...... جسے اپنی خبر نہیں......'' سائیں نے ہنس کر کہا۔

''سائیں جی...... آپ کو کیسے پتہ چلا میں تو یہ بات کھوکھے کے اندر کر رہا تھا اور آپ تو ابھی آئے ہیں......'' شیرے نے حیرت سے پوچھا۔

''تو...... اس بات کو چھوڑ...... بتا...... تو...... کیا خبر سننا چاہتا ہے...... اور کس کی؟'' سائیں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

''میں تو...... میں...... تو......؟'' شیرا گھبرا گیا اور آنکھیں پھاڑے سائیں کی جانب دیکھنے لگا۔

''چل...... تو...... ماسٹر سے پوچھ...... بچوں کو پڑھا پڑھا کر پاگل ہو رہا ہے...... اور اپنی کتاب کھول کر نہیں پڑھتا۔ ماسٹر ایک دم بوکھلا گیا''

سائیں نے قہقہہ لگایا اور بلھے شاہ کا کلام مست ہو کر اونچی آواز میں پڑھنے لگا۔

علموں بس کریں او یار، علم نہ آوے وچ شمار
اکو الف' تیرے درکار، جاندی عمر دائیں اعتبار
علموں بس کریں او یار، پڑھ پڑھ علم لگاویں ڈھیر
قرآن، کتاباں، چار چوفیر
کردے چانن وچ ہنیر
باجوں رہبر، نہ سار
علموں بس کریں او یار
پڑھ پڑھ ملا ہوئے قاضی
اللہ مسلماں باجے راضی
ہوئے حرص دنوں دن تازی
نفع نیت وچ گزار
علموں بس کریں او یار
پڑھ پڑھ مسلے روز سناویں
کھانا شک شبے دا کھاویں
دسیں ہور، تے ہور کماویں
اندر کھوٹ باہر سچیار
علموں بس کریں او یار

سائیں پڑھتا رہا اور ماسٹر باسط علی گھبرا کر وہاں سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور باہر چلے گئے۔ شیرا حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔ سائیں بے ہنگم قہقہے لگانے لگا۔

☆

نازی کو ڈپریشن کے شدید دورے پڑنے لگے تھے۔ وہ باسط علی سے سخت نفرت کرنے لگی تھی۔ اس کی طرف دیکھتے ہی منہ دوسری جانب پھیر لیتی...... تنہائی میں روتی رہتی۔ اپنے آپ کو کوستی...... اپنے کیے پر پچھتاتی اور اپنی قسمت پر آنسو بہاتی رہتی۔

باسط علی کو ایک کالج میں سرکاری ملازمت مل گئی تھی۔ وہ زیادہ تر وقت کالج میں مصروف رہتا۔ شام کو ٹیوشنز پڑھا کر گھر آتا تو نازی کھانا اس کے سامنے رکھ کر اپنے کمرے میں جا کر دروازہ اندر سے بند کر لیتی شاید اس امید پر کہ باسط علی کبھی نہ کبھی تو اس کے دروازے پر دستک دے گا...... اور وہ اس کے لئے دروازہ کھول کر اس کے لئے اپنی نفرت کا اظہار کرے گی...... اپنے غصے کا اظہار کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکالے گی مگر باسط علی نے اسے ایسا موقع نہ دیا تھا۔ وہ منتظر رہتی اور...... وہ اسے مضطرب رکھتا۔

ان کی شادی کو پانچ ماہ گزر گئے تھے...... اور ان پانچ مہینوں کا ایک ایک لمحہ اضطراب...... بے قراری...... بے چینی اور اذیت سے پر تھا...... ایک لمحے کے لئے بھی دونوں کو سکون میسر نہیں آیا تھا...... جس خوشی کو پانے کے لئے انہوں نے ایک دوسرے سے محبت کی تھی وہ خوشی کہیں کھو گئی تھی۔ انہیں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے خوشیاں ان سے روٹھ گئی ہوں...... بس وہ زندگی گزار رہے تھے۔ سانسیں لے رہے تھے۔ دن پورے کر رہے تھے۔ ایک دوسرے سے بے زار...... اور...... متنفر......

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ باسط علی لاؤنج میں رکھے صوفے پر نیم دراز تھا اور آنکھیں بند کر کے سونے کی ناکام کوشش کر رہا تھا مگر اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اچانک نازی کے کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ ننگے پاؤں چیختی چلاتی ہوئی گیٹ کی جانب بھاگی۔ باسط علی نے چونک کر اس کی جانب دیکھا اور اس کے پیچھے لپکا...... آگے بڑھ کر اس کے بازو کو مضبوطی سے پکڑا۔

''چھوڑ...... دو...... مجھے...... مر جانے دو...... مجھے...... میں زندہ نہیں رہنا چاہتی...... چھوڑ دو مجھے......'' نازی نے غصے سے چلاتے ہوئے کہا اور اپنے بازو کو چھڑانے کی کوشش کی۔

''اندر...... چلو...... رات کے...... اس وقت...... کہاں...... جا رہی ہو؟'' باسط علی نے بمشکل کہا اور اس کو بازو سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے اندر لایا۔

''تم...... کون ہوتے ہو...... مجھے روکنے والے...... چھوڑو...... مجھے'' نازی نے پھر بازو چھڑانے کی کوشش کی۔

''نازی......'' وہ غصے سے چلایا۔

نازی نے چونک کر اس کی جانب دیکھا اور زور زور سے رونے چلانے لگی۔

''کیا تم مجھے مار ڈالو گے...... قتل تو...... تم مجھے پہلے ہی کر رہے ہو...... اب میری لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر دو گے۔ میں نے تمہارے ساتھ نہیں رہنا...... چھوڑو...... مجھے'' نازی نے پھر بازو چھڑا کر باہر کی جانب بھاگنا چاہا۔

''نازی...... چپ ہو جاؤ...... اور اندر چلو'' وہ اسے زبردستی اندر لے کر آیا اور اسے صوفے پر دھکا دے کر دروازے کو لاک لگا دیا۔ نازی بلند آواز میں چلانے لگی...... اپنے بال نوچنے لگی...... اپنے چہرے پر تھپڑ مارنے لگی۔

''یہ...... تم...... کیا کر رہی ہو؟'' باسط علی نے اس کے ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''میں زندہ نہیں رہنا چاہتی......تم نے میری زندگی عذاب میں ڈال رکھی ہے...... میں مرجانا چاہتی ہوں......زندہ نہیں رہنا چاہتی......''

نازی چیختے چلاتے اور سینہ کوبی کرتے ہوئے بولی۔

''میں......میں......تم......سے'' باسط علی کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے......وہ مایوسی اور شرمندگی سے نظریں جھکائے اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

''تم دنیا کے سب سے زیادہ ظالم اور کمینے انسان ہو......تم نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا ہے'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ اس قدر شدت سے رو رہی تھی کہ باسط علی اس کے رونے سے گھبرا گیا۔

اس کو پھر ابال اٹھا اور وہ پھر باہر کی جانب بھاگنے لگی۔ باسط علی نے پھر اس کو پکڑا اور اپنے سینے کے ساتھ لگا کر رونے لگا۔ وہ بھی سسکنے لگی۔ جیسے اچانک تپتی دھوپ میں کسی شجر سایہ دار کے نیچے آ کر پرسکون ہوگئی ہو۔ وہ اسے پیار سے سہلاتا رہا۔

''میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا'' باسط علی نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

''اور......میں......تمہاری محبت کے بغیر......مر جاؤں گی'' نازی نے سسکتے ہوئے جواب دیا۔

باسط علی اس کی بات سن کر خاموش ہوگیا۔

''تم میں کیا خامی ہے......جو تمہارے اور میرے درمیان حائل ہو رہی ہے'' نازی نے اپنا موڈ بدل کر نم آنکھوں سے قدرے نرم لہجے میں پوچھا۔

''شاہ زیب......'' میں جب بھی تمہارے قریب آتا ہوں اور تمہیں چھونے کی کوشش کرتا ہوں......نجانے وہ کہاں سے آجاتا ہے اور میری طرف غم و غصے اور حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا ہے کہ میں خوفزدہ ہو جاتا ہوں......نازی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے......جیسے ہمیں شاہ زیب کی بددعا لگ گئی ہے۔ ہم ایک دوسرے کے پاس اور اتنے قریب ہو کر بھی ایک دوسرے کو نہیں پا سکتے'' باسط علی نے صاف گوئی سے اسے بتا دیا۔

''بددعا......اور......شاہ زیب......نہیں......کبھی نہیں......وہ کبھی ہمیں بددعا نہیں دے گا......وہ ایسا انسان نہیں تھا'' نادانستہ نازی کے منہ سے نکلا۔

''ہاں......اور......ایسے انسانوں کا بدلہ خدا......خود لیتا ہے......نازی......تم......میری بات کا یقین کرو......ہمارے ساتھ ضرور کچھ ایسی بات ہو رہی ہے کہ......'' باسط علی الجھتے ہوئے بولا۔

''ایسا......کچھ بھی نہیں......میں نہیں مانتی......مجھے ایسا کچھ محسوس نہیں ہوتا......یہ صرف تمہارا وہم ہے اپنے ذہن سے سب کچھ نکال دو......آج صرف تم اور میں......صرف ہم دونوں......آج ہم ایک دوسرے کو محسوس کریں گے......ایک دوسرے کا محبت بھرا لمس......'' نازی نے محبت سے اس کے سینے کے ساتھ لگ کر کہا۔ نازی کی محبت بھری میٹھی باتوں اور سرگوشیوں سے باسط علی کے اندر برق روسی دوڑنے لگی۔ اس کا اندر متحرک ہونے لگا اور اس کے جذبات رفتہ رفتہ بیدار ہونے لگے۔ اس نے محبت سے نازی کی پیشانی پر اپنے لب رکھ دیئے۔ وہ مسکرانے لگی جیسے برستی پھوار سے لطف اندوز ہو رہی ہو۔ نازی نے اپنی بند آنکھیں آہستہ آہستہ کھول کر اس کی جانب مسکرا کر محبت بھرے انداز میں کہا۔

''تمہاری محبت کالمس کتنا میٹھا ہے'' نازی نے سرگوشی کی۔

باسط علی نے بھی مسکرا کر اس کی جانب دیکھا اور پھر دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ اسے نہیں......شاہ زیب کی آنکھوں کو دیکھ رہا تھا......وہ ایک دم گھبرا گیا اور پسینے سے تر ہونے لگا۔ اس کا جسم بری طرح کانپنے لگا۔

''وہ......پھر......'' وہ کہہ کر بجلی کی سی سرعت کے ساتھ نازی کے پاس سے اٹھا اور باہر بھاگنے لگا۔

''آج......تم......یوں......نہیں جا سکتے......مجھے......تشنہ چھوڑ کر......'' نازی نے چلاتے ہوئے اس کا بازو پکڑا۔

''میں......نہیں......جانتا......مجھے کیا ہو رہا ہے'' باسط علی بے بسی سے بولا۔

''باسط......علی......اپنی کمزوریوں پر پردے مت ڈالو......تم......میرے جذبات کے ساتھ کھیل رہے ہو......اگر......آج......تم......مجھے چھوڑ کر چلے گئے......تو......پھر......دوبارہ کبھی میری طرف نہیں آ سکو گے......کبھی بھی نہیں'' نازی نے خونخوار آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے دھمکی دی اور تن کر اس کے آگے کھڑی ہو گئی۔ باسط علی مخمصے کا شکار ہو گیا۔

''تم......سمجھتی کیوں نہیں؟'' وہ بے بسی سے بولا۔

''میں......کچھ نہیں سمجھنا چاہتی'' اس نے قطعیت سے جواب دیا۔

''کیا......تمہیں......مجھ پر یقین نہیں رہا؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں''

''اور......میری محبت پر بھی نہیں......؟''

''تم نے اس کا اظہار کب کیا ہے......جس پر میں یقین کروں'' نازی نے خفگی سے جواب دیا۔

''میں......بہت......مجبور ہوں......کوئی شے اندر سے مجھے تمہاری طرف آنے سے روکتی ہے'' باسط علی نے نم آنکھوں سے جواب دیا۔

''کب تک ایسا ہوتا رہے گا......؟'' نازی نے غصے سے پوچھا۔

''معلوم......نہیں'' وہ آہ بھر کر بولا۔

''ٹھیک ہے......میں اب تمہارا انتظار نہیں کروں گی......باسط علی اب ہم دونوں ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ ہمیں ایک دوسرے کو چھوڑنا پڑے گا'' نازی نے رک رک کر کہا۔

''چھوڑنا......پڑے گا......یہ......یہ......تم کیا کہہ رہی ہو......؟ خدا کے لئے......ایسی باتیں مت سوچو'' باسط علی نے گھبرا کر کہا۔

''میں سوچ نہیں رہی......اب ایسا کر کے دکھاؤں گی'' وہ قدرے جذباتی انداز میں بولی۔

''کیا......تم......مجھے چھوڑ دو گی؟'' باسط علی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......'' اس نے قطعیت سے جواب دیا۔

''کیا...... تم جانتی ہو...... تم کیا کہہ رہی ہو؟ کیا تم......؟'' باسط علی حیرت سے بولا۔

''ہاں...... میں...... تمہیں چھوڑ دوں گی...... اور تمہارے بغیر زندہ بھی رہوں گی...... عورت اگر کسی سے شدید محبت کرتی ہے تو وہ اس سے کہیں زیادہ نفرت بھی کر سکتی ہے اور...... اب تم میرے دل سے نکل چکے ہو...... میں تم سے نفرت کرتی ہوں...... مجھے تم سے طلاق چاہیے'' نازی نے اس کی طرف دیکھ کر...... آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''طلاق......'' وہ چلایا۔

''ہاں...... طلاق...... آج...... ابھی...... اور اسی وقت......'' وہ جذباتی انداز میں بولی۔

''نہیں...... میں...... تمہیں طلاق نہیں دے سکتا'' باسط علی نے سسکتے ہوئے کہا۔

''اب...... میں...... مزید کوئی بات نہیں سنوں گی...... میں نے تمہاری خاطر بہت کچھ کیا...... مگر تم بہت بے قدرے نکلے...... تم نے میری محبت اور میری قربانیوں کی ذرا بھر قدر نہیں کی...... میں اب تم سے محبت کی مزید بھیک نہیں مانگ سکتی...... تم نے مجھے...... میری ہی نظروں میں بے وقعت کر دیا ہے...... میری عزت اور انا کو بری طرح کچل دیا ہے...... اب مجھے تم پر اعتبار نہیں رہا...... تم بہت بے قدرے...... کم ظرف...... حقیر اور ظالم انسان ہو'' نازی نے قدرے چلاتے ہوئے کہا۔

''نازی...... خدا کے لئے...... طلاق کا ذکر مت کرو...... ہم...... بہت...... جلد......'' باسط علی نے پھر کچھ کہنا چاہا۔

''نہیں...... اب کچھ بھی ممکن نہیں...... مجھے ابھی طلاق چاہیے'' وہ پرزور الفاظ میں بولی۔

''کیا...... کوئی راستہ......؟'' باسط علی نے پھر کچھ کہنا چاہا۔

''کچھ بھی ممکن نہیں...... اب...... مجھے مزید مت آزماؤ...... میں تم سے نجات چاہتی ہوں...... میں تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی...... مجھے تم سے نفرت ہے...... شدید نفرت...... اتنی نفرت کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے...... اس محبت سے کئی گنا زیادہ نفرت...... جو میں نے تم سے کی...... اور شاید جو میری بہت بڑی بھول تھی'' نازی غصے سے نفرت بھرے لہجے میں بولی۔

''ٹھیک ہے میں تمہیں طلاق دیتا ہوں...... میں تمہیں طلاق دیتا ہوں...... میں تمہیں طلاق دیتا ہوں'' وہ بمشکل بولا...... اور کہہ کر جلدی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

نازی بلند آواز سے رونے لگی...... چلانے لگی...... ماتم کرنے لگی...... اپنی قسمت پر نوحہ خوانی کرنے لگی...... جب انسان کچھ پانے کے لئے آخری حد تک کوشش کرتا ہے...... اور اسے بری طرح مات ہوتی ہے تو وہ کتنا تلملاتا ہے...... کتنا تڑپتا اور کتنا روتا ہے۔ اپنے آپ کو کتنا بے بس اور بے وقعت پاتا ہے...... اس پر اس کی حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے...... تب اسے اپنی حیثیت اور اوقات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے...... کہ...... وہ کیا ہے......؟ اور کیا نہیں......؟ اپنی بے وقعتی اور کم مائیگی کا احساس اسے شدت سے دلاتا ہے جس خواہش اور امید کے بھروسے پر وہ بہت کچھ کر گزرنے کے خواب دیکھتا ہے اور اس خواب کو حقیقت کا رنگ دینے کے لئے اپنی ہر ممکن کوشش کرتا ہے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیتا ہے...... اور جب وہ خواب ٹوٹتا ہے...... حقیقت بے رنگ ہو جاتی ہے...... خواہش اور امید...... مایوسی و ناامیدی میں بدل جاتی ہے...... تب اس کا اندر زرہ زرہ خاک میں بدل جاتا

ہے......سب کچھ ختم ہو کر رہ جاتا ہے......نازی کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔اس نے اپنی محبت کو پانے کے لئے ہر طرح کی جدوجہد اور قربانی دی تھی مگر منزل تک پہنچ کر وہ بالکل خالی ہو گئی تھی۔اس کے ہاتھ میں سوائے راکھ کے کچھ نہیں آیا تھا......اور باسط علی کا بھی سب کچھ ختم ہو گیا تھا......وہ بھی اپنی محبت میں بہت پر جوش تھا اور نازی کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار تھا۔اس کی خاطر اس نے ملک میں ہوتے ہوئے دیس نکالا منظور کیا تھا۔ اپنے ماں باپ اور بہنوں سے جدائی برداشت کی تھی......وہ بھی نازی کی طرح پر عزم تھا مگر اس کے ہاتھ بھی کچھ نہیں آیا تھا۔شاید دونوں کو کسی کی بری نظر لگ گئی تھی یا پھر کوئی بددعا......دونوں کا سفر رائیگاں گیا تھا......دونوں کی جدوجہد اکارت گئی تھی اور دونوں نامراد ٹھہرے تھے۔دونوں کے پاس سوائے تاسف......دکھ اور مایوسی کے کچھ باقی نہیں رہا تھا۔

☆

شاہ زیب ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا۔اس نے بہت عجیب خواب دیکھا تھا۔اس نے باسط علی اور نازی کو روتے ہوئے دیکھا تھا۔وہ پریشان ہو گیا اور اپنی چارپائی سے اٹھنے لگا۔چارپائی کے ساتھ رکھی اپنی چھڑی ٹٹولنے لگا مگر وہ ہاتھ نہ آئی تو مایوسی سے پھر بیٹھ گیا۔

نجانے رات کا کون سا پہر تھا۔اب اسے کچھ اندازہ نہیں ہوتا تھا دن کا پتہ اسے پرندوں کی آوازوں اور لوگوں کی باتوں سے ہوتا تھا...... اور رات کا تعین وہ اس کی خاموشی اور گیدڑوں کی آوازوں سے لگاتا۔

وہ کئی راتوں سے یہ خواب دیکھ رہا تھا۔کبھی نازی کو پریشان دیکھتا تو کبھی باسط علی کو......اور اب دونوں کو روتے ہوئے دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا تھا۔

''یہ......ناممکن ہے......ایسا کبھی نہیں ہو سکتا......دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہیں......اور نازی نے اس کی محبت کو پانے کے لئے مجھے جھٹلایا......مجھے اپنے قریب نہ آنے دیا......اپنا سب کچھ اس کی خاطر چھوڑ دیا میرا یہ خواب جھوٹا ہے......''شاہ زیب نے اپنے دل میں سوچا۔

''مگر......''وہ اگلے ہی لمحے سوچ میں پڑ گیا......اس کے ساتھ کچھ عرصے سے ایک عجیب معاملہ ہو رہا تھا۔وہ اکثر ایسے خواب دیکھنے لگا تھا جو اگلے ہی دن یا اس سے اگلے دن سچ ثابت ہو جاتے تھے۔وہ بہت چونکنے لگا تھا......اور اس نے ڈرتے ہوئے اس بات کا ذکر کسی سے نہیں کیا تھا......یا......یوں ہونے لگا تھا......کہ جیسے ہی اس کے ذہن میں کوئی بات آتی......آئندہ چند گھنٹوں میں وہ بات ویسے ہی سچ ثابت ہو جاتی......ایسا اس کے ساتھ اس کی بصارت کے زائل ہونے کے تھوڑے عرصے بعد ہونا شروع ہو گیا تھا اور اسے اپنے آپ پر بہت تعجب اور حیرانگی ہونے لگی تھی۔ وہ اپنے آپ سے الجھنے لگا تھا۔

زیتون بانو نے اپنے ایک بھانجے بہرام خان کو دوسرے گاؤں سے اپنی زمینوں کی دیکھ بھال کے لئے بلایا تھا۔بہرام خان ایف اے پاس سنجیدہ مزاج اور سلجھا ہوا انسان تھا۔اس کے ساتھ اس کی بیوی اور چھ سالہ بیٹا خرم خان بھی آ گئے تھے۔ان لوگوں کے آنے سے حویلی میں بہت رونق ہو گئی تھی۔شاہ زیب کا دل خرم کے ساتھ بہت زیادہ لگ گیا تھا۔بہرام خان روزانہ شاہ زیب کو ڈیرے پر لے جاتا اور ہر بات میں اس سے صلاح مشورے کرتا۔مزارعوں کے مسائل اور زمینوں وفصلوں کے بارے میں ساری ہدایات شاہ زیب کی مانی جاتیں۔بہرام خان بہت ایماندار اور نیک دل انسان تھا۔اس کے آنے سے زیتون بانو اور شاہ زیب دونوں پرسکون ہو گئے تھے۔

شاہ زیب بہت رنجیدہ ہو رہا تھا۔ وہ نازی اور باسط علی کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا۔ رات کو وہ نیند سے بیدار ہوا تھا اور اب سہ پہر ہو رہی تھی مگر اسے چین نہیں آ رہا تھا۔ اسے نازی اور باسط علی یاد آ رہے تھے...... اس کا دل چاہ رہا تھا وہ کسی سے ان کے بارے میں پوچھے مگر...... کس سے؟ کسی کو بھی ان کے بارے میں کوئی خبر نہ تھی......

''شاہ زیب بھائی...... آپ اتنے اداس کیوں بیٹھے ہیں؟'' بہرام خان شاہ زیب کے پاس چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''کچھ نہیں...... یونہی......'' شاہ زیب نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''کیا...... آپ...... اپنی آنکھوں کی وجہ سے پریشان ہیں؟'' بہرام خان نے پوچھا تو شاہ زیب کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

''نہیں...... اپنی...... بے بسی پر'' شاہ زیب نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''کاش...... کچھ ممکن ہوتا'' بہرام خان نے افسردگی سے جواب دیا۔

''ہاں...... لیکن کچھ باتیں ممکن ہوتے ہوئے بھی ناممکن ہو جاتی ہیں...... انسان تو ہر معاملے میں بے بس ہے نا...... سانسوں سے لے کر...... اپنی قسمت تک...... ہر اک بات میں'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

''ہاں...... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں...... لیکن آپ یوں اداس مت ہوں...... خوش رہا کریں...... زندگی کو بھرپور طریقے سے گزاریں۔ بزرگوں سے سنا ہے کہ جب خدا اپنے بندوں سے کوئی ایک نعمت چھینتا ہے تو اس کے بدلے میں اسے...... اس سے بڑی نعمت سے نوازتا ہے...... ہوسکتا ہے...... اللہ آپ کو اپنے کسی بہت بڑے کرم سے نواز دے'' بہرام خان نے کہا۔

''ہاں...... وہ...... نواز رہا ہے...... میں بھی یہ محسوس کر رہا ہوں'' نادانستہ شاہ زیب کے منہ سے نکلا۔

''کیا مطلب......؟'' بہرام خان نے چونک کر پوچھا۔

''کچھ نہیں......'' شاہ زیب بوکھلا گیا...... مگر اس کا چہرہ اس کی زبان کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔

''شاہ زیب...... بھائی...... بتائیں...... آپ کیا بات محسوس کر رہے ہیں؟'' بہرام خان نے اصرار کرتے ہوئے پوچھا۔

''بہت عجیب...... سی...... باتیں...... میں اکثر جو کچھ سوچتا ہوں وہ اسی طرح پورا ہو جاتا ہے...... اور جو خواب دیکھتا ہوں وہ حقیقت بن جاتے ہیں...... اور...... وہ رکا اور...... کیا......؟'' بہرام خان نے متجسس ہو کر پوچھا۔

''اور...... جب کسی بات کی خواہش اچانک دل میں پیدا ہو جائے تو وہ فوراً پوری ہو جاتی ہے...... اور...... ذہن میں کوئی سوال اٹھتا ہے...... تو...... اللہ...... مجھے وہ سب کچھ سمجھا دیتا ہے...... مختلف عجیب نہ سمجھ آنے والے سوالات کی شکلیں اور تصویریں میرے ذہن میں آنے لگتی ہیں۔ بہرام خان میں بہت حیران ہونے لگا ہوں...... اس سے پہلے...... کبھی میرے ساتھ ایسا نہیں ہوا تھا...... جب سے میری آنکھیں چلی گئی ہیں...... تب سے ایسا ہونے لگا ہے'' شاہ زیب نے کہا۔

''واہ...... شاہ زیب بھائی...... یہ تو بڑی ہی عجیب باتیں ہیں...... شاید دنیا والوں کی نظر میں یہ کوئی اہمیت نہ رکھیں...... مگر...... اللہ والوں کی نظر میں یہ اللہ کا آپ پر بہت بڑا کرم اور اس کا انعام ہے......'' بہرام خان نے فرط جذبات سے لبریز آواز کے ساتھ کہا۔

''بہرام خان......ان باتوں کا ذکر کسی سے نہ کرتا......نجانے کیوں مجھے بہت ڈر لگتا ہے'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

''آپ......فکر نہ کریں......آپ مجھے اپنا ہمراز سمجھیں......'' بہرام خان نے محبت سے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کہا تو وہ مسکرا دیا۔

بہرام خان رفتہ رفتہ اس کی پہلے سے بھی زیادہ عزت اور احترام کرنے لگا تھا۔ وہ اسے یوں کھڑا ہو کر ملتا جیسے وہ کوئی بہت معزز اور قابل احترام ہستی ہو......صبح اس سے......رات کو دیکھنے والے خواب کے بارے میں پوچھتا اس کے ذہن میں اچانک ابھرنے والی سوچوں اور خیالات کے بارے میں پوچھتا ہر کام کرنے سے پہلے اس کی دعائیں لیتا......اور اس کو دیکھتے ہوئے بہت سے کارندے اور مزارعے بھی اس سے دعائیں کرنے کو کہتے......اور وہ ہر بار صرف مسکرا دیتا۔

☆

الف اللہ چنبے دی بوٹی مرشد من وچ لائی ہو
نفی اثبات دا پانی ملیا ہر رگے ہر جائی ہو
اندر بوٹی مشک مچایا جان پھلن پر آئی ہو
جیوے مرشد کامل باہو جنہیں ایہہ بوٹی لائی ہو

سائیں مٹھا......سڑک کے عین وسط میں بلند آواز میں صوفیانہ کلام پڑھتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ اس نے اپنی کشکول کو رسی سے باندھ کر گلے میں لٹکا رکھا تھا اور ہاتھ میں اکتارہ پکڑا ہوا تھا۔ کبھی رک کر وہ دھمال ڈالنے لگتا اور کبھی بلند آواز میں کلام پڑھنا شروع کر دیتا۔

ماسٹر باسط علی نے اسے دور سے دیکھا تو سائیں کی پرسوز آواز کے سحر سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا......اور اس کے قدم خود بخود اس کی جانب اٹھنے لگے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب آ گیا......سائیں نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا اور پھر کلام پڑھنے لگا۔

عاشق ہوویں تے عشق کماویں
دل رکھیں وانگ پہاڑاں ہو
لکھ لکھ بدیاں ہزار الاہے
کر جائیں باغ بہاراں ہو
منصور جیے چک سولی دتے
جیہڑے واقف کل اسراراں ہو

''ماسٹر جی......کاہے کو وقت ضائع کر رہا ہے میں تجھے بار بار کہہ رہا ہوں......جا......چلا جا......اگر نہ گیا تو ساری زندگی ہاتھ ملتا رہ جائے گا......وقت گزر جائے تو پھر واپس نہیں آتا......وہ بھی چلا گیا......تو پھر واپس کبھی نہیں آئے گا......تو اسے ڈھونڈتا رہ جائے گا......ساری زندگی'' سائیں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"کیسے جاؤں......اور......کس منہ سے جاؤں...... ہمت نہیں کر پاتا...... میں بہت کمزور انسان ہوں...... بہت کمزور" ماسٹر باسط علی نے آہ بھر کر جواب دیا۔

"ارے......انسان تو...... ہے......ہی......کمزور...... پر...... ہمت کرے تو...... پہاڑ سے بھی زیادہ ہمت اس میں آجاتی ہے......مولا سے مدد مانگ...... یہاں......اوھر......ادھر...... پھرتا رہتا ہے...... وقت ضائع کرتا ہے......اس کے پاس چلا جا...... تجھے سکون آجائے گا......" سائیں نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"ڈر لگتا ہے......" باسط علی نے آہستہ آواز میں کہا۔

"کس بات سے......؟" سائیں نے حیرت سے پوچھا۔

"اگر......اس نے مجھے دھتکار دیا......تو......پھر......کہاں جاؤں گا......پھر......میں......برداشت نہیں کر پاؤں گا" ماسٹر باسط علی نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

"تو......اسے جانتا نہیں......اس کا دل سمندر ہے......"

دل، دریا سمندروں ڈونگے
کون دلاں دیاں جانے ہو

"ہمت کر......کوشش کر......مرد بن......کاہے کو پاگل ہو رہا ہے یوں وقت ضائع کرتا رہا تو ایک دن یہیں مر جائے گا...... پاگل نہ بن" سائیں نے خفگی سے کہا اور پڑھنے لگا

رات اندھاری مشکل پینڈا اسے سے آون ٹھڈے ہو

"اچھا......دیکھتا ہوں" ماسٹر باسط علی نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

"تو...... بڑا ہی بزدل ہے......جا دفعہ ہو......مر یہاں سے......" سائیں نے ایک دم غصے سے کہا اور اسے گھورتے ہوئے سڑک پر لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

ماسٹر باسط علی تاسف سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔

"سائیں ٹھیک کہتا ہے...... مجھے......ہمت کرنی چاہیے۔ اس سے ایک بار ملنے کی کوشش کرنی چاہیے" ماسٹر باسط علی نے پہلی بار اپنے دل کو سمجھانے کی کوشش کی اور آگے بڑھ گیا۔

☆

نازی......ثروت کے گھر......دو دنوں سے بے ہوش پڑی تھی۔ اس کا بخار کسی طرح کم نہیں ہو رہا تھا...... وہ تھوڑی دیر کے لئے آنکھیں کھولتی......پھر رونا شروع کر دیتی......ہچکیاں بھرتی، کبھی سسکیاں لیتی اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی۔ ثروت مسلسل اس کی تیمارداری کر رہی تھی۔ اسے بہت سمجھاتی مگر وہ تو گویا ثروت کی کوئی بات سننے کو تیار ہی نہ تھی۔ ثروت بولتی رہتی اور وہ اس کی جانب یوں دیکھتی جیسے اس کی کوئی بات سن ہی نہ

رہی ہو...... یا...... پھر چھت کو گھورتی رہتی۔

''نازنین...... میں سوچ رہی ہوں...... کیوں...... نا تمہیں ہاسپٹل ایڈمٹ کرادوں...... کیونکہ تمہارا بخار تو کسی طرح کم ہی نہیں ہو رہا'' ثروت نے تھرما میٹر سے اس کا بخار چیک کرتے ہوئے کہا۔

نازی مسلسل چھت کو گھور رہی تھی۔

''تمہیں نجانے کیا ہو گیا ہے...... ہاسپٹل جانے سے تمہیں کیوں خوف آتا ہے...... وہاں ڈاکٹرز کی کیئر میں رہو گی...... مجھ سے...... تو...... تم...... دوائی بھی نہیں کھاتی...... اور یہ بخار اسی لئے کم نہیں ہو رہا...... کیونکہ تم میڈیسنز نہیں لیتی......'' ثروت نے قدرے خفگی سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ نازی کی آنکھوں سے آنسو مسلسل بہہ بہہ کر اس کے تکیے میں جذب ہو رہے تھے۔ اس نے ثروت کی کسی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ بس چھت کو گھور رہی تھی اور آنسو اس کی آنکھوں سے مسلسل بہہ رہے تھے۔

''کب تک...... کب تک...... تم یونہی پڑی رہو گی؟'' ثروت نے اس کے قریب کرسی پر بیٹھ کر اس کا گرم، تپتا ہوا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے قدرے نرمی سے کہا، نازی نے کوئی جواب نہ دیا۔

''نازنین...... تم...... کچھ تو کہو...... جس روز سے تم یہاں آئی ہو...... ایک بار بھی مجھ سے بات نہیں کی...... مجھے کچھ تو بتاؤ...... باسط علی کہاں ہے......؟ میں اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہی ہوں...... مگر وہ کہیں نہیں مل رہا...... وہ کہاں چلا گیا ہے؟'' ثروت نے حیرت سے پوچھا تو باسط علی کا نام سن کر اس کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے اور وہ پھر ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع ہو گئی۔

''کیا بات ہے...... تم رو کیوں رہی ہو؟ کیا باسط علی سے کوئی جھگڑا ہوا ہے؟'' ثروت نے اس کے چہرے پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

نازی کی ہچکیوں میں اضافہ ہونے لگا۔

''خدا کے لئے...... نازنین...... کچھ تو بتاؤ...... نہ تم کچھ بتا رہی ہو...... اور...... نہ ہی اس سے رابطہ ہو رہا ہے...... پھر مجھے کیسے پتہ چلے گا...... کہ...... تم لوگوں کی پرابلم کیا ہے......؟'' ثروت نے پھر نرم لہجے میں اسے کہا۔

نازی پھر خاموش رہی...... اور کوئی جواب نہ دیا۔

ثروت حیرت سے اس کے چہرے کی جانب دیکھتی رہی۔

''ٹھیک ہے...... تم نے کچھ نہیں بتانا...... تو...... نہ بتاؤ...... میں ہاسپٹل میں فون کرتی ہوں کہ وہ ایمبولینس بھیج دیں...... اور...... اب میں تمہیں زبردستی ہاسپٹل میں ایڈمٹ کراؤں گی'' ثروت نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

نازی کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے اور اس نے گھبرا کر ثروت کی جانب دیکھا۔

''مجھے...... مر جانے دو...... میں زندہ نہیں رہنا چاہتی'' نازی ایک دم چلاتے ہوئے بولی۔

''کیوں...... زندہ نہیں رہنا چاہتی؟'' ثروت نے چونک کر پوچھا۔

''اس نے مجھے دھوکہ دیا ہے...... بہت بڑا دھوکہ'' نازی اسے بتا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''کس نے...... کیا باسط علی نے......؟'' ثروت نے پھر چونک کر پوچھا۔

''ہاں...... جس کی خاطر...... میں نے سب کو چھوڑا...... سب کچھ قربان کیا...... سب کچھ...... '' وہ رونے لگی اور اپنے سر کے بال اپنے ہاتھوں کی مٹھیوں میں بھر کر انہیں نوچنے لگی۔

''کیسا...... دھوکہ......؟ کیا...... وہ کسی اور میں دلچسپی لینے لگا ہے؟'' ثروت نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں...... اس نے میری محبت کو جھٹلایا ہے...... مجھے...... مجھے دھتکارا ہے......'' وہ پھر رونے لگی۔

''کیا...... کیا ہے...... اس نے...... مجھے ٹھیک طرح سے بتاؤ'' ثروت نے جھنجھلا کر کہا۔

''اس نے مجھے طلاق دے دی ہے'' نازی نے کہا اور پھر شدت سے روتے چلاتے ہوئے بے ہوش ہو گئی۔

''طلاق......'' ثروت حیرت سے بڑبڑانے لگی۔ اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

''اوہ...... نو...... نازنین...... اٹھو...... اٹھو......'' وہ گھبرا کر اسے ہلانے لگی۔

''تیمور...... تیمور...... جلدی آؤ......'' ثروت نے دروازے کی جانب کھڑے ہو کر بلند آواز میں کسی کو بلایا۔

ایک انتہائی خوبصورت نوجوان قدرے تیزی سے کمرے میں داخل ہوا۔

''کیا بات ہے......؟'' اس لڑکے نے حیرانگی سے پوچھا۔

''جلدی سے ہاسپٹل فون کر کے ایمبولینس بلاؤ...... آج نازنین بار بار بے ہوش ہو رہی ہے'' ثروت نے پریشانی سے کہا تو لڑکا باہر نکل گیا۔

اور ثروت...... نازی کو ہوش میں لانے کی کوشش کرتی رہی مگر وہ آنکھیں ہی نہیں کھول رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ایمبولینس ان کے گھر کے پورچ میں داخل ہوئی اور نازی کو ہاسپٹل لے جایا گیا۔

''میں بھی ہاسپٹل چلتا ہوں...... شام ہو رہی ہے، میری ضرورت پڑ سکتی ہے'' تیمور نے کہا۔

''ہاں...... ٹھیک ہے...... چلو...... آؤ......'' ثروت نے اپنی گاڑی کی چابی پکڑتے ہوئے کہا۔

''امی...... نازی کی طبیعت بہت خراب ہے...... میں اور تیمور ہاسپٹل جا رہے ہیں...... یہ موبائل پاس رکھ لیں...... میں فون کرتی رہوں گی...... فقیر حسین کچن میں ہے اور کرم علی گیٹ پر...... آپ پریشان مت ہونا'' ثروت نے وہیل چیئر پر بیٹھی اپنی ادھیڑ عمر معذور ماں کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''میری فکر نہ کرو...... تم جاؤ......'' مسز وقار نے پریشان ہو کر کہا۔

''چلو...... تیمور'' ثروت نے تیمور کی جانب دیکھتے ہوئے کہا اور دونوں باہر نکل گئے۔

(کہانی کی طوالت کے پیش نظر، اس ناول کو دو حصوں میں پیش کیا جا رہا ہے۔ دوسرا حصہ آئندہ ہفتے آن لائن کیا جائے گا)